

V1355 ii Date 17/12/09

Title - MABADI SIYASIVANT .

Author - Hassan Khan Sheerani .

Publisher - Maktaba Jamia (Delhi) .

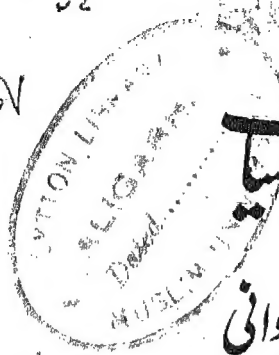
Year - 1940

Pages - 608 .

Subjects - Styasiyat .

✓ و غیبست (۱۹۱۱)

۲۶۷



مبادی سیاست

مؤلفہ

ہارون خاں شروانی

پیرا ہاں

علی

ایم۔ اے (اکن)؛ ایف، آر، ایچ، ایس؛

پیشہ پڑھ لا

صدر شعبہ تاریخ و سیاسیات، جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن

رکن کورٹ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

Faher

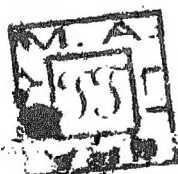
مدرسہ ہارون خاں شروانی

مدرسہ ہارون خاں شروانی

مدرسہ ہارون خاں شروانی

مدرسہ ہارون خاں شروانی

مدرسہ ہارون خاں شروانی



مکتبہ جامعہ

دہلی نئی دہلی، لاہور، محضو، ممبئی

بیت صلا

بیت صلا

5



۲۵
۸۱۷۸
۱۳۵۵

جید پرس دہلی
۱۳۵۵



۱۳۵۵

CHECKED

2002

M.A. LIBRARY, A.M.U.



U1355

دیباچہ طبع دوم

خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ کتاب ”مبادی سیاسیات“ جس کی دوسری اشاعت ناظرین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے، ملک میں مقبول ہوئی اور اہل فکر نے اسے غایت مہربانی سے اٹھوں ہاتھ لیا۔ اس اشاعت میں کتاب کے دونوں حصے یکجا کر دئے گئے ہیں تاکہ مضمون کا تسلسل پہلے سے بھی زیادہ نمایاں ہو جائے۔ ۱۹۳۶ء سے اب تک، یعنی پہلی اشاعت سے دوسری اشاعت تک، ونسپا کی سیاسیات نے اس درجہ پختہ کیا ہے کہ کتاب ایک بڑی حد تک از سر نو لکھی گئی اور جیسے پہلے ستمبر ۱۹۳۳ء تک کے واقعات سے نتائج اخذ کئے گئے تھے ویسے ہی اب ۱۵ اپریل ۱۹۳۹ء تک کے واقعات سے نتیجے نکالے گئے ہیں بعض مضامین کو دلچسپی یا افادی پہلو کے اعتبار سے حذف کر دیا گیا ہے یا ان میں کمی کر دی گئی ہے اور بعض میں ذرا زیادہ وضاحت کی ضرورت سمجھی گئی ہے۔ اصطلاحات کی بجائے ایک کے دو فقرتیں منسلک ہیں، ایک میں اردو اصطلاحات کا انگریزی میں اور دوسری میں انگریزی اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ لکھا گیا ہے اور زمانے کے تقاضے کے اعتبار سے اردو اصطلاحات میں پہلے سے بھی زیادہ آسانی کا ملحوظ رکھی گئی ہے۔ امید ہے کہ یہ اشاعت نقش اول سے بھی زیادہ مفید اور مقبول ثابت ہوگی۔

ہارملن خاں شروانی حیدر آباد دکن
۱۵ اپریل ۱۹۳۹ء

میں نے
۱۵ اپریل ۱۹۳۹ء

اقتباسات از طبع اول

پہلی جلد

اس جلد کے ابواب پر... مکمل نظر ثانی کر کے اس امید سے پیش کیا جا رہا ہے کہ اس سے موجودہ زمانے کے بچ و بچہ سیاسی حالات کے سمجھنے میں آسانی ہوگی؛ نیز جامعات ہند کے ان طلبہ کے لئے بھی یہ حصہ مفید ہوگا جنہوں نے مضمون 'نظری سیاسیات' لیا ہے.....

۳ جون ۱۹۳۶ء

دوسری جلد

جلد اول..... جس میں زیادہ تر مملکت کے متعلق نظریات تھے، اردو داں اصحاب نے اٹھوں اٹھلی..... موجودہ جلد میں زیادہ تر حکومت کے کل پرزوں اور بین الاقوامی ہیئت پر بحث کی گئی ہے اور پیرایہ ایسا رکھا گیا ہے کہ یہ حصہ نہ صرف ان طلبہ کے لئے مفید ہو جنہوں نے بی اے یا ایم اے میں سیاسیات متقابلہ لیا ہو بلکہ وہ تمام حضرات بھی جنہیں سیاسیات حاضرہ سے دلچسپی ہو اس سے کما حقہ استفادہ حاصل کر سکیں..... ساتھ ہی ابواب متعلقہ کے تحت قانون حکومت ہند کا مکمل تجزیہ کیا گیا ہے۔

۳ اکتوبر ۱۹۳۶ء

سیا

20/1/86

باب

تمہید

سیاسیات کو تعریف اور اُس کا تعلق دیگر ہم جنس علوم کے ساتھ
سیاسیات اہمیت۔ انسان کی اجتماعی حیثیت۔ ترتیب و تنظیم سیاسیات کی تعریف
اور اقسام۔ طرز تدلل۔ تاریخ سے تعلق۔ عمرانیات سے تعلق۔ معاشیات
سے تعلق۔ مذہب و اخلاق سے تعلق۔

سیاسیات کی اہمیت۔ جنگ عظیم کے بعد سے دنیا میں جو تلاطم اور انقلابی کیفیت
رونما ہے اس میں سب سے مؤثر عنصر سیاسیات کا نظر آتا ہے، اور یورپ ہو یا
ایشیا، کسی برعظیم اور کسی تنگ میر کوئی شعبہ زندگی اس قدر جاذب توجہ نہیں جیسے
سیاسیات۔ ایسے ممالک اور ایسے طبقے جو صدیوں سے جمود کی حالت طاری تھی،
صرف اپنے ملکوں کی بلکہ تمام عالم کی سیاسی کیفیات میں اپنی گہری دلچسپی کا اظہار
کر رہے ہیں، اور جب کبھی دنیا میں ایڑیاں تھیں، جھگڑوں یا معاشری، معاشی اور بین الاقوامی
تغیرات کا ذکر سننے میں آتا ہے تو یہی وہ علم ہے جس کی طرف شعوری یا غیر شعوری طور پر ہماری
توجہ مبذول ہوتی ہے، اور جو اصطلاحیں اور نو ساختہ الفاظ ہم اخبارات میں پڑھتے ہیں۔

ان میں کوئی نہ کوئی سیاسی پہلو ضرور ہوتا ہے۔ یوں تو ہر نئی اصطلاح، مادی شے یا غیر مادی خیال کی تعریف ویسے بھی ضروری ہے۔ لیکن جب چند الفاظ ایسے پڑھنے میں آئیں جو زبان زد خاص و عام بھی ہوں تو ان کی تعریف لازمی رہ جاتی ہے، اس لئے کہ عوام کے خیال میں جو معنی کسی خاص لفظ کے ہوتے ہیں وہ مزید مستحاصل مفہوم سے ہٹے ہوئے ہوتے ہیں اور جب کسی علم یا فن کی ماہریت دریافت کر کے کسی گوشش کی جائے تو تجسس کرنے والے کا اولین فرض یہ ہے کہ پہلے صحیح مفہوم خود سمجھ لے اور پھر اسے دوسروں پر ظاہر کر کے کی گوشش کرے۔

انسان کی اجتماعی حیثیت۔ سیاریات میں ایک مخصوص عمر یا ادارے سے بحث کی جاتی ہے جسے مملکت کہتے ہیں۔ انسان کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں، ایک انفرادی یعنی وہ حیثیت جو اسے بطور ایک فرد واحد کے مائل ہے، دوسرے اجتماعی یعنی وہ حیثیت جو اسے بطور رکن معاشرے کے مائل ہے۔ جس طرح انسان اپنی انفرادی حیثیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ وہ ایسی زندگی بسر کرے جس میں دیگر افراد کو دخل نہ ہو۔ علاوہ خاندانی تعلقات کے، جو ہر انسان کو اپنے ماں باپ یا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہوتے ہیں، انسانی فطرت اس کی مقتضی ہے کہ وہ دوسروں سے بھی تعلقات پیدا کرے۔ سب سے پہلے وہ اپنے سن کرڑسو کو پہلے مرتبہ اپنے بظاہر ویران و سنان جزیرے میں انسان کے باؤں کا نشان نظر آیا ہوگا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی ہوگی۔ گو اس نے اپنی زندگی کچھ ایسے قالب میں ڈھال لی تھی کہ وہ اپنے طریقے اور اپنی بکری ہی سے دل بہلانا کافی سمجھتا تھا اور گوا سے معلوم نہ تھا کہ پاؤں کا نشان کس شخص کا ہے، لیکن وہ محض انسان ہونے کی وجہ سے اس جستجو میں

لگ گیا کہ اس کا پتہ لگائے۔ الغرض بوجہ اس کے ہر شخص کو فطری طور پر بہت سے دوسرے اشخاص سے تعلق ہوتا ہے اس لئے نہ صرف اپنی ذات کے متعلق فرائض و حقوق حاصل ہوتے ہیں بلکہ دوسروں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے بھی وہ اپنے اقوال و افعال کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

جہاں تک بعض انفرادی ذمہ داری کا تعلق ہے، یعنی جہاں تک انسان اپنی ذات کی خدمت کرتا ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، آرام کرتا ہے وہاں تک اس کا تعلق علم سیاسیات سے نہیں ہوتا، سیاسیات کا میدان صرف اس وقت شروع ہوتا ہے جب انسان کا ذکر بطور رکن معاشرے کے کیا جائے۔ ترتیب و تنظیم معاشرے کے قیام و استحکام کے لئے کسی نہ کسی قسم کی ترتیب و تنظیم کی ضرورت ہے، اس لئے کہ اگر اس کا فقدان ہو تو انسانی مجموعے میں تواحد کی کیفیت نہیں پیدا ہو سکتی۔ تہذیب، جس سے شائستگی کا مفہوم لیا جاتا ہے، اس کے معنی ہی ترتیب کے ہیں۔ اگر نام نہاد معاشرے میں کسی قسم کی تنظیم نہ ہوگی تو وہ ایک غیر مرتب غول سے زیادہ وقعت نہیں رکھے گا اور اس میں اجتماعی کیفیت کلیتہً مفقود ہوگی۔ اس کیفیت کے لئے یہ لازم ہے کہ ایک شخصیت ایسی ہو (خواہ وہ مفرد ہو یا مرکب) جس کے احکام ہر فرد عام طور سے ماننے اور اگر کوئی انھیں ماننے سے انکار کر دے تو اسے مجبور بھی کیا جاسکے۔ اس شخصیت کے حکم کا مرتبہ قانون کا ہوگا اور جماعت کی تنظیم کی بنا اس کے دئے ہوئے احکام یا اس کے تسلیم کئے ہوئے قواعد ہوں گے۔ الغرض سیاسی معاشرے کا قیام صرف اسی وقت ممکن ہے جب اس میں ایک حاکم کی شخصیت اور محکوم جماعت ہو اور یہ محکوم جماعت اس حاکم شخصیت کے مسئلہ

قواعد کے ذریعے سے منظم، مرتب اور مہذب رہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر جماعت کے افراد اپنی بہکاری اور تعال کے ذریعے سے جماعت کو منظم کرنا نہ چاہیں تو حاکم شخصیت کو بڑی بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور ممکن ہے کہ آخر الامر منظم جماعت از سر لویے ربط و غول کے شکل میں تبدیل ہو جائے، چنانچہ مستقل ترتیب و تنظیم کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ افراد میں مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت اور خواہش ہو اور ان کا نصب العین یہ ہو کہ اپنے افعال سے وہ حتی الامکان معاشرے کو فوٹتر نہ ہونے دیں گے۔

نظام معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ادارہ جس میں ایک شخصیت پر قواعد نظم کا کلیتہ دار و مدار ہو اور کوئی شخص انھیں تسلیم کرنے سے منکر ہو تو اسے سزا بھی دے سکے۔ ایسے ادارے میں آزادی کا فقدان ہوگا۔ لیکن یہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ جب تک ہر فرد دوسرے فرد کی خواہشات رجحانات اور میلانات کا مکافقہ خیال نہ رکھے گا اس وقت تک خود اس کی خواہشات، رجحانات اور میلانات کی پرواہ دوسرے افراد کو بھی نہ ہوگی اور ملک میں اس افراتفری کے باعث ابتری اور کشاکش پھیل جائیگی۔ دوسروں کی آزادی کا خیال رکھنے کے معنی ہیں کہ ہر فرد ایک خاص حد تک پابند ہو اور چونکہ منظم پابندی کا نام ہی ضبط ہے اس وجہ سے تنظیم و ترتیب اس وقت تک ناممکن ہیں جب تک پابندی اور نظم نہ ہو، اور جس طرح انسانی آبادی ملکیت کے لئے لازم اور ضروری ہے اسی طرح یہ عنصر بھی اس کا جز و لا ینفک ہے۔ یہ منظم ضبط کی کیفیت جس ادارے کے ذریعے سے قائم کی جاتی ہے اسی کو حکومت کہتے ہیں۔

سیاسیات کی تعریف اور اقسام - اس پیچیدہ ادارہ یعنی مملکت سے جس علم کا تعلق ہے اسے سیاسیات کہتے ہیں۔ علم سیاسیات میں حکم دینے والے اور محکوم کے باہمی تعلقات کا ذکر کیا جاتا ہے، اگر حکومت ایک مرکب جماعت ہو تو اس کے اجزاء کے باہمی تعلقات، اور اگر حاکم فرد واحد ہو تو اس کے حقوق و فرائض شمار کئے جاتے ہیں اور ساتھ ہی فی نفسہ مملکت کے حقیقی مقاصد اور ان کے حصول کے ذرائع پر غور کیا جاتا ہے۔

اس علم کے دو پہلوؤں میں فرق ہے وہ بالکل عیاں ہے۔ ایک طرف تو سیاسیات میں مجرد مملکت کی ابتدا، اس کی خصوصیات و مقاصد، نیز اصول حکومت و اصول مداخلت پر بحث ہوتی ہے، اور دوسری جانب اس امر پر غور کیا جاتا ہے کہ مختلف ممالک میں کس قسم کی حکومتیں قائم ہوں، ان کے مقاصد کیا تھے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے کیا کیا تدبیریں اختیار کی گئیں، آیا کسی خاص مطمح نظر کو پیش رکھا گیا یا نہیں، کج کل مختلف ملکوں میں کس طرف جا رہی ہیں اور ان کا راستہ سیدھا ہے یا ان میں کسی قسم کی پیچیدگی پائی جاتی ہے۔ ان دونوں تخیلات کے مابین بہت بڑا بعد ہے ایک میں نفس مملکت پر بلا کسی خاص ملک کے حوالہ کے بحث کی جاتی ہے اور دوسرے میں واقعت پر نتائج کا اظہار کر کے مختلف ملکوں کے طرزائے حکومت کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ ہم دونوں اصناف میں سے ایک کو نظری سیاسیات اور دوسرے کو عملی سیاسیات کہیں گے۔

طرز استدلال - اسی سلسلے میں یہ بیان کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ

سیاسیات پر غور کرنے اور سیاسی نتائج اخذ کرنے کے لئے متعدد طریقے اختیار کئے جاسکتے ہیں۔ جتنے علوم سے اس وقت تک انسان واقف ہوا ہے ان کی تقسیم و تقوّل میں ممکن ہے۔ وہ علوم جن سے تجربہ کے بعد نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں یعنی وہ جن کا تعلق سہولیات قدرتی و طبعی سے ہے، انھیں قطعی علوم کہتے ہیں۔ لیکن وہ علوم جن کا تعلق انسان کی دماغی کیفیات، عادات و تعلقات سے ہے ان میں کسی قسم کے ارادی تجربہ کی گنجائش نہیں اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا معمل بنایا جائے جس میں ارادۂ انسانی فطری خصوصیات کا آزادانہ تجربہ کر کے نتیجے نکلے جاسکیں۔ جب تجربہ کا دور دورہ مسدود ہو گیا تو سیاسیات کے لئے دوسری طریقی باقی رہتے ہیں، ایک یہ کہ تجسس کرنے والا خود اپنے دماغ پر زور ڈال کر نفس مملکت کے آغاز، ارتقاء اور مقاصد پر غور کرے اور دوسرے یہ کہ وہ دنیا کے گزرے ہوئے اور موجودہ دستوروں کا مقابلہ کر کے ایسے نتائج اخذ کرے جو اسے سیاسیات میں مدد دے سکیں۔

مفصلہ بالا بیان سے خود بخود اس اعتراض کا جواب مل جائے گا جو بعض مرتبہ سیاسیات پر کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ سیاسیات کو مدون علم کا رتبہ حاصل نہیں۔ اگر مدون علم کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح ریاضی و طبیعیات و دیگر ہم جنس علوم میں ہم چند اشیا پر ایک خاص عمل کر کے چند عالمگیر نتائج پر پہنچ جاتے ہیں تو یقیناً سیاسیات کو مدون نہیں کہا جاسکتا۔ انسانی عادات و اطوار، دماغی کیفیات یا فطری خواص، جغرافیائی اثرات اور تاریخی روایات میں اتنا عظیم الشان تنوع پایا جاتا ہے کہ ان کے متعلق کسی کلیہ کا قیام ناممکن ہے اس لئے کہ جو سیاسی ادارہ ایک قوم کے لئے مفید

ہو گا وہ ممکن ہے کہ دوسری قوم کے لئے مضر ہو یا کم از کم اتنا مفید نہ ہو کہ اسی وجہ سے بعض نہایت ممتاز سیاست دان سیاسی استدلال کے تاریخی یا مقامی طریقے کو بے کار سمجھتے ہیں۔ تاریخی طرز استدلال وہ ہے جس میں ایک ہی ملک یا ایک ہی قوم کی درجہ بدرجہ سیاسی ترقی اور مختلف طرز اُسے حکومت پر جو اس ملک میں قائم ہوئے ہوں، غور کیا جائے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ اس قوم یا ملک کے سیاسی مقاصد کیا سے کیا ہو گئے اور ان مقاصد کی کس حد تک تکمیل کی گئی۔ یہ طرز استدلال درحقیقت مقامی طرز کا ہی ایک شعبہ ہے جس میں ایک ہی ملک کے مختلف زانوں کے طرز اُسے حکومت اور مختلف ممالک کے موجودہ و سابق مقاصد کے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ کسی خاص ملک یا کسی خاص حصہ دنیا کی سیاسی روش کیا ہے اور اس کو مد نظر رکھ کر آئندہ کی بابت کوئی خیال قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جن علمائے اس طرز استدلال کی تنقید کی ہے ان کا قول ہے کہ یہ طریقہ نہایت مغالطہ آمیز ہے۔ مغالطہ ہم جنس اشخاص یا ادارات کا کیا جاتا ہے، غیر جنس کا نہیں اور جب مکان یا زمان میں اصولی تبدیلی پیدا ہو گئی تو پھر مغالطہ کیسے ممکن ہے۔ اسی بنا پر بعض کا خیال ہے کہ جب تک کوئی مجموعہ افراد تمدن کی ایک مخصوص حد تک نہ پہنچ جائے اس وقت تک اس کے افعال دائرہ سیاسیات میں نہیں آسکتے اور اُن سے کوئی سیاسی استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ غالبیت دونوں اصولوں موجود ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ زمان یا مکان کا لحاظ کئے بغیر محض مقابلے یا کسی اور طرز استدلال کے ذریعے سے ایسے نتیجے قائم کئے جاسکتے ہیں جو ہر ایک حالت پر جاری ہوں، یقیناً وہ غلطی پر ہیں۔ اسی طرح نئی نوع انسان کی ایک خاص جمہوری حیثیت ہے

اور اس کے ایک حصہ کے سیاسی تجربات سے یقیناً دوسرا حصہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔
 تاریخ سے تعلق۔ یہ بحث ہیں ایک دوسرے موضوع کی طرف
 لے جاتا ہے، یعنی علم سیاسیات کا دیگر ہم جنس علوم کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ لیکن تو
 مختلف مصنفوں نے اس بحث پر بہت کچھ طبع آزمائیاں کی ہیں اور سیاسیات کا تعلق
 قطعی علوم مثلاً علم ہندسہ، ریاضی، کیمیا، اور طبیعیات تک سے بنایا ہے، لیکن اختصار
 کو مد نظر رکھ کر یہاں اس کا تعلق محض ہم جنس علوم سے دکھایا جائے گا۔ مفصلہ بالا
 بیان سے علم تاریخ کے ساتھ سیاسیات کا تعلق معلوم ہو گیا ہوگا۔ ایک بہت بڑے
 فرانسیسی سیاست دان کا قول ہے کہ تاریخ انسانی زندگی کا علم ہے اور اسے سیاسی
 استدلال میں اولین رتبہ حاصل ہے۔ یہ اور بیان کیا جا چکا ہے کہ قطعی علوم اور انسانی
 علوم اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ موخر الذکر کے لئے کوئی مصل یا تجربہ خانہ تیار نہیں
 کیا جاسکتا بلکہ ہم مجبور ہیں کہ نئی نوع انسان کے قدیم تجربوں سے فائدہ اٹھائیں۔
 تاریخ اس تجربہ خانہ یا مصل کی کمی کو پورا کرتی ہے۔ وہ بے شمار واقعات، انسانی
 احساسات، دوستیوں اور دشمنیوں، جنگ و صلح، صعود و زوال، علی اور فی ترقی اور
 ارتقاء کی مدارج کا ایک سمندر ہے اور نہ صرف انسانی علوم کے محقق کو، بلکہ جتنے بھی
 علوم اس دنیا میں پائے جاتے ہیں سب کے خوشہ چنیوں کو اس سے مدد ملتی رہتی
 ہے۔ سیاسیات بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں اور بہت سے سیاسی اصول ایسے ہیں

لے موسیو کے لائبر M. DESLANDRES جن کے مقولے کو ریڈیو سرج و کھارنر

W. GARNER نے اپنی کتاب "تہدید سیاسیات" باب میں نقل کیا ہے۔

✓ **عمرانیات سے تعلق**۔ سیاسیات کو عمرانیات سے بھی گہرا تعلق ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سیاسیات حکومت کا علم ہے۔ عمرانیات میں نیکو دوسرے امور کے اصول حکومت اور ان کی ترویج کے جوازمات معاشرے پر پڑتے ہیں ان پر بحث کی جاتی ہے۔ گویا اس علم کا براہ راست تعلق دستوروں کے ارتقا اور حکومت کی شکلوں سے نہیں، تاہم جس طرح سیاسیات میں تاریخی مواد کو کام میں لایا جاتا ہے اسی طرح محقق عمرانیات سیاسی مواد کو اپنے کام میں لاتا ہے۔ کسی ملک کے باشندوں کے معاشری ارتقا کے ساتھ سیاسی ارتقا لا بد لازمی ہے، چنانچہ جب مٹھی یا تصویر سی خیالات پیدا ہوتے ہیں تو ان کی زد سے حکومت اور سیاسی تخیلات بھی نہیں بچ سکتے۔ جیسا ایک عالم عمرانیات نے کہا ہے، "انسانوں کا کوئی ایسا مجموعہ نہیں ہے جسے معاشری اکائی تصور کیا جاسکے" بدین سبب ہیں ایک سیاسی اکائی یعنی "قوم" کو عمرانی اکائی بھی بنالینا پڑتا ہے، اسی وجہ سے سیاسیات اور عمرانیات کا چولی دھن کا ساتھ ہو جاتا ہے اور کسی ملک کی سیاسی تنظیم دراصل اس کی معاشری تنظیم کا ایک جزو بن جاتی ہے۔

✓ **معاشیات سے تعلق**۔ سیاسیات کا تاریخ سے جس قدر گناؤں سے اس سے شاید کچھ ہی کم سبب سیاسیات اور معاشیات کا باہمی تعلق ہے جس طرح سیاسیات میں حاکم و محکوم کے باہمی ربط پر بحث ہوتی ہے اسی طرح معاشیات کا سر و کار ان کے

۱۔ بیک مار، "مادی عمرانیات" BLACKMAR: ELEMENTS OF

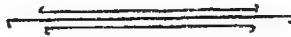
۲۔ اب Sociology.

۳۔ روس، "عمرانیات" ROSS: SOCIOLOGY. باب ۱۔

کسب معاش، کھانے پینے، داد و ستد، ملکی درآمد و برآمد، ننگان اور انگذاری سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں، چنانچہ کسی زمانے میں ان دونوں علوم کے درمیان کسی قسم کی تفریق نہیں کی جاتی تھی اور معاشیات کو بھی علم "سیاستِ مدن" میں شامل سمجھا جاتا تھا۔ تا وقتیکہ کسی ملک کی تنظیم نے ترقی کے ایک خاص درجہ کو عبور نہ کر لیا ہو، اس وقت تک وہ معاشی اعتبار سے ترقی نہیں کر سکتا، اور اسی طرح جب تک اس ملک میں درآمد و برآمد کے لئے قوانین مرتب نہ ہوں اور ننگان و انگذاری کے حدود مقرر نہ کئے جائیں، اس وقت تک یہ اندیشہ بگاڑ ہے گا کہ کہیں سیاسی تنظیم بیکار نہ ہو جائے۔ آج کل درجہ میں جتنی عالمگیر معاشی تحریکات پھیلی ہوئی ہیں، جیسے آزاد و مامون تجارت، خالی املاک کی گمرانی اور حق ملکیت کے اصول، کاشتکاروں اور زمینداروں کے تعلقات، ان میں سے اکثر و بیشتر کا تعلق براہ راست مملکت سے ہے۔ سیاسیات اور معاشیات کا تعلق اب تو پہلے سے ہی قریب تر ہو جاتا ہے، چنانچہ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ سب حدائیں جو آج کل آسمان سیاسیات کو پھاڑے ڈالتی ہیں، جیسے بوشویت، فاشیت، سرمایہ داری، اشتراکیت وغیرہ ان میں سے سب کی سب تقریباً خاص معاشی اصول پر مبنی ہیں۔ الغرض ان دونوں عمرانی علوم کا باہمی رشتہ ایسے مسائل سے ظاہر ہوتا ہے جن کا تعلق براہ راست تنظیم مملکت یا اختیارات حکومت سے ہے۔

اخلاق و مذہب سے تعلق۔ یوں تو انسانی علوم کو دو کٹی ہوئی شقوں کے علاوہ بہت سی دوسری شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جن میں سے ہر ایک

کا کچھ نہ کچھ تعلق سیاسیات سے ہونا ضروری ہے بلکہ بہ نظر اختصار اس وقت صرف
 اخلاق و مذہب سے جو واسطہ ہے اس کا بیان کافی ہو گا۔ ابتدائی معاشری حالت
 میں جب انتظام مملکت میں اتنی پیچیدگیاں نہ تھیں، اور جب انسان نسبتاً سادگی
 زندگی بسر کرتا تھا، اس وقت ان تینوں میں بہت ہی کم فرق سمجھا جاتا تھا۔ ایک ہی
 فعل کی سزا میں مجرم کے بھائی بند کا حقہ پانی بند کر دیتے تھے، حکومت کی جانب سے
 کسی نہ کسی قسم کی جہائی سزا دی جاتی تھی اور اگر مجرم نے کفارہ نہ دیا ہو یا اقرار گناہ نہ
 کیا ہو یا تائب نہ ہوا ہو تو اسے طرح طرح کی روحانی سزائوں کا خوف دلایا جاتا
 تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ معاملات زندگی میں پیچیدگیاں بڑھتی گئیں اور انسان کے افعال
 کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر لیا گیا۔ بجائے اس کے کہ حکمران ہی سرگردہ معاشرہ اور مذہبی
 سردار ہو، اس کی حیثیت محض سیاسی رہ گئی اور زندگی کے دوسرے شعبوں پر اس کا
 کام صرف نمکدانی تک محدود ہو گیا۔ حال کے زمانہ میں سیاسی اثرات نے اس قدر
 ترقی کی ہے کہ نہ صرف سیاسی زندگی کی اصلاح کی غرض سے قوانین نافذ کئے جاتے
 ہیں بلکہ مذہب اور اخلاق تک میں سیاسیات نے دخل حاصل کر لیا ہے، چنانچہ شادی
 بیاہ کے قوانین جن کا تعلق کسی زمانے میں محض مذہب کے ساتھ تھا، اب رفتہ رفتہ
 حکومت کے زیر اثر آتے جاتے ہیں اور اخلاقی قواعد جن کی خلاف ورزی کی سزا صرف
 اس قدر ممکن تھی کہ معاشرہ ملزم سے کنارہ کشی اختیار کر لے، مدت دراز سے براہ راست
 سیاسی اثر سے متاثر ہو چکے ہیں۔



STATE

باب ۲

مملکت اور اُس کے ہم جنس ادارات

مملکت کے عناصر۔ آبادی۔ حاکم و محکوم۔ خود مختاری۔ تعالٰیٰ دہم کاری۔

مملکت کی تعریف۔ حکومت۔ قوم۔ ریاست اور پرو

عناصر مملکت۔ اور بیان کیا جا چکے ہیں کہ سیاسیات میں ایک مخصوص معاشرہ کی ادارے یعنی مملکت کے تخیل، اس کے ارتقا، اس کی مختلف صورتوں، اس کے آئینہ کار یعنی حکومت و دیگر مسائل متعلقہ پر بحث کی جاتی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ نفس مملکت کے مفہوم کو واضح کر دیا جائے اور جہاں تک ہو سکے اس کے اور دوسرے ہم قسم ادارات جیسے معاشرہ انسانی، قوم، ملک اور حکومت کے مابین فرق ظاہر کر دیا جائے۔

آبادی۔ مملکت کی تعریف تقریباً ہر ایک سیاسی مفکر نے مختلف انداز سے کی ہے، لیکن ان تمام تعریفوں میں چند عناصر مشترک پائے جاتے ہیں اور اگر غور کیا جائے تو ان مفکرین کے تخیلات کے درمیان کوئی اصولی فرق نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ مملکت کے قیام کے لئے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ انسانوں کی ایک کثیر آبادی ہے۔ اس امر کا تعین ناممکن ہے کہ مملکت کی آبادی

کتنی ہونی چاہئے، اس لئے کہ تاریخ میں ایک طرف تو ایسی چھوٹی چھوٹی ملکوں کا ذکر آیا ہے جیسے یہ نان قدیم میں ایس اور دورس یا قدیم بنی اسرائیل کی مملکت کنعان، جن کی آبادی چند ہزار نفوس سے زیادہ نہ تھی، دوسری طرف چلیز دیہور کنشک اور اشوک اعظم کی عظیم الشان سلطنتیں پائی جاتی ہیں۔ زمانہ موجودہ میں بھی آبادی کی تعداد کا کوئی معیار نہیں، اور ہم انگلستان، وینچیم، برازیل، ورکس، البانیہ اور ڈنمارک، سب کو بلا امتیاز ملکوں کا لقب دیتے ہیں۔ لیکن ہم انسانوں کے ایسے مجموعے کو مملکت کا لقب نہیں دیں گے جو کسی مخصوص رقبے میں نہ رہتے ہوں بلکہ دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر ہوں، خواہ ان میں کیسی ہی کچھ کیوں نہ پائی جاتی ہو۔ مثلاً باوجود بے حد کوشش کے اس وقت تک دنیا کا کوئی رقبہ آزاد یہودی قوم کے لئے مخصوص نہیں کیا جاسکا اور گو یہودی خواہ کسی مملکت میں بود و باش رکھتے ہوں ان پر اکثر اپنے توأمین کا عملدرآمد ہوتا ہے لیکن انھیں مملکت نہیں کہا جاسکتا۔ اس لئے کہ اس قسم کی سیاسی کیفیت میں مملکت کے دوسرے عناصر کا وجود ممکن ہو جائیگا۔ ایسے ملکوں کی مثال ضرور پائی جاتی ہے جس کے شہری منتشر ہوں لیکن ان سے وہ سیاسی تعلق قائم رکھنا چاہئے۔ مثلاً حال ہی (وسط ۱۹۳۶ء) میں جرمنی کے الحاق آسٹریا کے موقع پر نہ صرف جرمنی میں رہنے والے جرمنوں کی بلکہ ہر جرمن شہری کی خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں رہتا ہو لڑے لی گئی تھی۔ مگر اس میں اور یہودیوں کے سلسلے میں یہ فرق ہے کہ یہاں ایک باغیا بلطہ رقبائی مملکت کا وجود ہے اور ذل ایسا کوئی رقبہ نہیں جہاں یہودیوں نے ایک آزاد مملکت قائم کر لی ہو۔

حاکم و محکوم۔ مملکت کے قیام کے لئے دو مزید امور لازمی ہیں۔ اول

تو ایک ایسی شخصیت جس کو یہ حق حاصل ہو کہ معاشرے کے افراد میں تنظیم قائم رکھنے کے لئے ایسے احکام صادر کرے جن پر کاربند ہونا ہر فرد اور ہر جماعت کا فرض ہو اور خلافت ورزی کی حالت میں ملزم کہ سزا بھی دے سکے۔ یہ شخصیت مفرد اور مرکب دونوں ہو سکتی ہے یعنی اس کا مرکز ایک شخص بھی ہو سکتا ہے اور بہت سے لوگوں کی جماعت بھی، چنانچہ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ کسی ملک کے باشندوں نے بلا خارجی توسط کے براہ راست مملکتیں قائم کر لیں اور آج کل کے زمانے میں بھی بہت سی ایسی مملکتیں ملیں گی جہاں رعایا براہ راست اپنے قائم مقاموں کے ذریعے سے حکومت کرتی ہے۔

خود مختاری۔ مملکت کے قیام کے لئے خود مختاری بھی ایک نہایت ضروری عنصر ہے۔ خود مختاری کی دو تئیں کی جا سکتی ہیں، ایک تو وہ صورت حال جس میں ملک قہرسم کے بیرونی دباؤ سے آزاد ہو، یعنی نہ صرف اندرونی معاملات میں اسے پوری آزادی حاصل ہو بلکہ بین الاقوامی قوانین اور معاہدوں کے علاوہ خارجی معاملات میں وہ کسی بیرونی قوت کا پابند نہ ہو۔ عام طور پر مملکت ایسے ہی سیاسی ادارہ کو کہا جاتا ہے، لیکن آج کل کے زمانے میں بعض طاقتور ملکوں کی جبراع ارضی کے باعث شاید یہ کوئی کمزور ملک ایسا رہے گا جس پر کوئی نہ کوئی خارجی پابندی عائد نہ کر دی گئی ہو، کہیں تو عجلہ خارجی معاملات کسی بڑی سلطنت کے سپرد ہیں، جیسے ہندوستانی ریاستیں، کہیں کسی مخصوص سیاسی اصول کے تحت کمزور ملک پر مختلف قسم کی بندشیں عائد کر دی گئی ہیں، جیسے مسقط، کویت اور زنجبار پر کہیں خارجی معاملات کے دائرہ کو چھوڑ کر ملک کے اکیات پر قبضہ کر لیا گیا ہے جیسے چین، بھارت اور کہیں

اندرونی اور خارجی اختیارات دینے کے باوجود، فوج رکھ کر آزادی میں غل ڈال گیا ہو جیسے مصر میں۔ غرض اگر ملک کا معیار یہی ہو کہ ملک کی اندرونی و خارجی آزادی نامہ حاصل ہو تو علاوہ پانچ سات سلطنتوں کے اور کسی کو ملک نہیں کہا جاسکے گا۔ اس لئے بہ نظر سہولت علم سیاسیات کو مفید بنانے کی خاطر مناسب یہ ہے کہ لفظ ملک میں ان ملک کو بھی شامل سمجھا جائے جن کو کم از کم اندرونی معاملات میں آزادی حاصل ہو۔

تعالیٰ و ہم کاری۔ ملک کے اہم ترین عناصر میں سے باشندگان ملک کے تعالیٰ اور ملک کی بہتری کی خواہش کو رکھنا چاہئے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ کسی قسم کا اختلاف نہ ہو لیکن یہ اختلاف محض طرز کار کا ہونا چاہئے نہ کہ مقصد کا۔ تاہم آبادی کے جملہ افراد اس مسئلے پر متفق و متحد نہ ہو جائیں گے کہ ان کا سب سے بڑا دینی مقصد اپنی ملک کو فروغ دینا ہے اس وقت تک ملک کو استحکام نصیب نہ ہوگا بلکہ شاید اس کا قیام بھی ناممکن ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ بغیر اس احساس خدمت کے چھوٹے سے چھوٹا ملک بھی ملک نہیں بن سکتا اور یہ احساس ہو تو پھر بڑے سے بڑا قہر بھی ملک بن جاتا ہے۔ افغانستان ایک چھوٹا سا ملک ہے، لیکن اس وقت اس کے باشندوں میں اپنے ملک کی خاطر ہر طرح کی قربانی کا جذبہ موجود ہے اور خواہ طرز کار کی بابت ان کی رائے کچھ بھی ہو، اصل مقصد سب کا ایک ہی ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود ایسی طاقتور سلطنتوں کی ہمسائیگی کے جیسے برطانیہ اور روس، وہ اپنی آزادی کو برقرار رکھنے ہوئے ہے۔ اور روس کا علاقہ جو دنیا کے ساتویں حصے پر حاوی ہے ایک ہی ملک بنا ہوا ہے۔

حکومت کی تعمیر و ترقی۔ مندرجہ بالا بیانات سے ملک کی اہمیت

ظاہر ہو جاتی ہے مملکت انسانوں کی ایسی منظم سیاسی کیفیت کا نام ہے جو کسی مخصوص جغرافیائی رقبے میں سکونت پذیر ہو جس میں حکم دیے والی ایک شخصیت موجود ہو جس کے باشندوں میں ملک کی بہتری کی خاطر تقابل اور ہم کاری کا احساس موجود ہو اور جسے کم از کم اپنے اندرونی حالات کے انصرام و انتظام پر معمولاً قدرت حاصل ہو۔

GOVT. حکومت - اس سے معلوم ہوا کہ مملکت دراصل انسانوں کی ایک منظم جماعت کا نام ہے جو سیاسی رشتے میں منسلک ہو گئے ہوں، نیز یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ نہ صرف آج کل کے زمانے میں جب مملکتوں کے حدود وسیع سے وسیع تر ہوئے ہیں بلکہ زمانہ کی شہری مملکتوں میں بھی باشندوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انتظام مملکت ہر جگہ ایک نئی مختصر جماعت کے سپرد کر دینا پڑتا تھا۔ اسی لئے مملکت کا ایک جزو لا ینفک یہ ہے کہ باشندوں کے آپس میں حاکم و محکوم کے تعلقات پیدا ہو جائیں اور حکومت اس کل کا نام ہے جس کے ذریعے سے مملکت کے کاروبار انجام کو پہنچتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے کہ حکومت کو محض مرتبہ تمام مملکت پر حاوی سمجھ لیا جاتا ہے مملکت اور حکومت کا وہی رشتہ ہے جو آقا اور ملازم کا ہے جس طرح آقا اپنے ملازم کو تبدیل کر سکتا ہے اور ملازم کی علیحدگی کی وجہ سے اس کی ہیئت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں پیدا ہوتی اسی طرح حکومتیں اپنی رتبی ہیں مگر مملکت اس وقت تک مسلسل قائم رہتی ہے جب تک وہ نظم اور حکم و ضبط خود مختار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی ایسے ملک میں جہاں موروثی بادشاہ کی حکمرانی ہو بادشاہ مرتبہ تو اس کے دلی عہد کے اعلان جانشینی سے پیشتر ہی فوراً اس کو حکمران تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ بادشاہ کوئی ہو، وزیر کوئی ہو، پارلیمنٹ نشست کر رہی ہو

یا بر خاست ہو گئی ہو، ملک کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں آتا اور اگر ملک کے لازمی عناصر مثلاً تنظیم، مستقل آبادی، باشندوں کا باہمی تعامل اور آزادی قائم رہی اور طرز حکومت بدل جائے، یعنی بادشاہی سے جمہوریت یا جمہوریت سے دستوری بادشاہی ہو جائے تو بھی ملک برابر قائم رہتی ہے۔

قوم۔ ملک کو ایک اور ادارہ سے میٹر کرنا ضروری ہے۔ آج کل تقریباً ہر ایک حصہ دنیا میں سب سے زیادہ جس سیاسی اصطلاح کی آواز کالوں میں گونجتی ہے وہ لفظ قوم ہے، لیکن یہ بات عجیب ہے کہ گو مشرق میں بھی ہر ایک شخص قوم، قوم پکارتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ مغرب میں بھی معاملات ”قومی“ اثر سے متاثر ہوتے ہیں، لیکن مشکل سے دو ملک کے باشندے ایسے ہوں گے جو اس لفظ کے ایک ہی معنی سمجھتے ہوں۔ آج کل کے زمانہ میں ایک طرف ایٹکلو میکسن قوم میں نہ صرف انگلستان، ملک متحدہ امریکہ اور آسٹریلیا کے باشندے شامل سمجھے جاتے ہیں، بلکہ جنوبی افریقہ کے ”ولندیزی“، کناڈا کے ”فرانسیسی“، ویکٹور کے ملک اور سکاٹ لینڈ کے ملک انہیں شامل سمجھے جاتے ہیں۔ فرانسیسی قوم میں صرف وہ افراد شامل سمجھے جاتے ہیں جو جمہوریہ فرانس کے تحت اپنی زندگی بسر کرتے ہیں، لیکن مشرقی بحیم کے والون اور مغربی سوئزرستان کے فرانسیسی بولنے والے اس ذمہ میں شمار نہیں کئے جاتے۔ بعض مرتبہ تو قوم اور قومیت کی وجہ سے ملک کے ملک غیر آباد ہو گئے ہیں، مثلاً صلیخانہ لوزان کی رود سے یہ قرار پایا کہ قسطنطنیہ کے یونانی بولنے والے باشندوں کے علاوہ جمہوریہ ترکیہ کے تمام یونانیوں کو یونان کے تمام ترکوں سے تبدیل کر لیا جائے اور اس سے جو صعوبتیں

اور مشکلات اٹھانی پڑی ہوں گی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ تیز حال ہی میں ترکی نے اعلان کیا ہے کہ وہ بلغاریہ اور رومانیہ کے ترکی آنے والے مسلمانوں کو (جو فی الواقع ترکی ہنس ہیں) ترک وطن کر کے ترکی میں آباد ہونے کے لئے آسائیاں بہم پہنچائیگی بہر حال مغربی اعتبار سے ایک عام میلان معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تنک ہو سکے ہم نسل افراد کو ایک ملک میں شامل کر لیا جائے اور اس میلان کا شاید سب سے اہم اور متنازع مظاہرہ وہ ہے جس کے بموجب نازی جرمنی سے یہودی صرف اس بنا پر ملک بدر کئے جارہے ہیں کہ وہ "آریہ" جرمنوں سے مختلف ہیں۔

تین اسی مثالیں کم یا ب نہیں کہ ایک ہی بنیادی قوم کے مختلف مجبوروں نے مختلف ممالک میں آباد ہو کر اپنی اپنی ملکیتیں قائم کر لی ہوں اور ان میں ایسا شخص پیدا ہو گیا ہو کہ ہر ملک کے باشندے اپنی قوم علیحدہ علیحدہ تصور کرنے لگے ہوں۔ برازیل اور ترکی کے باشندے، ہم نسل، ہم زبان، اور ہم مذہب ہیں اور برازیل کسی ریلے میں پڑے گاں ہی کی نو آبادی تھی، دونوں کی روایات یکساں ہیں، لیکن برازیل کی

نہ نازی جرمنی کے مؤسس اور رہنما "ہٹلر کی کتاب" میری مجددہ "Hitler Mein Kampf" میں اس اصول کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے "نیت" کے اس لفظ نظر کو خود ہٹلر کے الفاظ میں رسالہ "دنیا کا نسلی تخیل" "Racial Conception of the World" میں دکھایا گیا ہے جو جداگانہ "خمن" "محبان یورپ" "Friends of Europe Society" نے طبع کی ہے۔ تیز دیکھو باب ۵، پارہ ۲۔

ملکت بالکل جداگانہ ہے اور آج یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ پرگنائی اور برازیلی "ہم قوم" ہیں۔ یہی کیفیت ان اقوام کی ہے جو جنوبی افریقہ کے مختلف حصوں میں آباد ہیں اور باوجود یکہ ان کے رسم و رواج، زبان اور مذہب ایک سے ہیں لیکن وہ محض انہی جداگانہ انفرادی حیثیت کی وجہ سے متحد نہیں ہوتے۔ اسی طرح ایسے بھی ممالک ہیں جہاں متعددسانی مجموعے دوش بدوش آباد ہیں اور ہر ایک انہی انفرادی حیثیت کو قائم رکھے ہوئے ہیں، جیسے بیجم میں داوان اور فلپینک سویٹستان میں جرمن، فرانسیسی اور اطالوی۔

اب مشرق کی طرف آئیے، جہاں مغرب میں عموماً قوم کے معنی ہم نسل افراد کے مجموعہ کے لئے جاتے ہیں، وہاں ہندوستان میں قوم سے مراد ہم مذہب شخص سے ہوتی ہے۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان میں جو مسلمان ہیں ان کا صرف بارہواں حصہ ابتدائے غیر ممالک سے آکر یہاں آباد ہوا ہوگا اور اس قلیل تعداد میں سے شاید نصف بھی ایسے نہ نکلیں جن کے اجداد اپنی عورتوں سمیت یہاں آئے ہوں، لیکن چونکہ بظاہر ان تمدن جداگانہ نے اس لئے مجموعی حیثیت سے مسلمان ایک "قوم" سمجھے جاتے ہیں یہی کیفیت اس ملک کے عیسائیوں، سکھوں اور دیگر اقوام کی ہے۔
چند سال پیشتر تک مشرقی دنیا کے تقریباً ہر ملک کے باشندوں کی تقسیم کشم

۱۰
۱۱
۱۲
۱۳
۱۴
۱۵
۱۶
۱۷
۱۸
۱۹
۲۰
۲۱
۲۲
۲۳
۲۴
۲۵
۲۶
۲۷
۲۸
۲۹
۳۰
۳۱
۳۲
۳۳
۳۴
۳۵
۳۶
۳۷
۳۸
۳۹
۴۰
۴۱
۴۲
۴۳
۴۴
۴۵
۴۶
۴۷
۴۸
۴۹
۵۰
۵۱
۵۲
۵۳
۵۴
۵۵
۵۶
۵۷
۵۸
۵۹
۶۰
۶۱
۶۲
۶۳
۶۴
۶۵
۶۶
۶۷
۶۸
۶۹
۷۰
۷۱
۷۲
۷۳
۷۴
۷۵
۷۶
۷۷
۷۸
۷۹
۸۰
۸۱
۸۲
۸۳
۸۴
۸۵
۸۶
۸۷
۸۸
۸۹
۹۰
۹۱
۹۲
۹۳
۹۴
۹۵
۹۶
۹۷
۹۸
۹۹
۱۰۰
۱۰۱
۱۰۲
۱۰۳
۱۰۴
۱۰۵
۱۰۶
۱۰۷
۱۰۸
۱۰۹
۱۱۰
۱۱۱
۱۱۲
۱۱۳
۱۱۴
۱۱۵
۱۱۶
۱۱۷
۱۱۸
۱۱۹
۱۲۰
۱۲۱
۱۲۲
۱۲۳
۱۲۴
۱۲۵
۱۲۶
۱۲۷
۱۲۸
۱۲۹
۱۳۰
۱۳۱
۱۳۲
۱۳۳
۱۳۴
۱۳۵
۱۳۶
۱۳۷
۱۳۸
۱۳۹
۱۴۰
۱۴۱
۱۴۲
۱۴۳
۱۴۴
۱۴۵
۱۴۶
۱۴۷
۱۴۸
۱۴۹
۱۵۰
۱۵۱
۱۵۲
۱۵۳
۱۵۴
۱۵۵
۱۵۶
۱۵۷
۱۵۸
۱۵۹
۱۶۰
۱۶۱
۱۶۲
۱۶۳
۱۶۴
۱۶۵
۱۶۶
۱۶۷
۱۶۸
۱۶۹
۱۷۰
۱۷۱
۱۷۲
۱۷۳
۱۷۴
۱۷۵
۱۷۶
۱۷۷
۱۷۸
۱۷۹
۱۸۰
۱۸۱
۱۸۲
۱۸۳
۱۸۴
۱۸۵
۱۸۶
۱۸۷
۱۸۸
۱۸۹
۱۹۰
۱۹۱
۱۹۲
۱۹۳
۱۹۴
۱۹۵
۱۹۶
۱۹۷
۱۹۸
۱۹۹
۲۰۰
۲۰۱
۲۰۲
۲۰۳
۲۰۴
۲۰۵
۲۰۶
۲۰۷
۲۰۸
۲۰۹
۲۱۰
۲۱۱
۲۱۲
۲۱۳
۲۱۴
۲۱۵
۲۱۶
۲۱۷
۲۱۸
۲۱۹
۲۲۰
۲۲۱
۲۲۲
۲۲۳
۲۲۴
۲۲۵
۲۲۶
۲۲۷
۲۲۸
۲۲۹
۲۳۰
۲۳۱
۲۳۲
۲۳۳
۲۳۴
۲۳۵
۲۳۶
۲۳۷
۲۳۸
۲۳۹
۲۴۰
۲۴۱
۲۴۲
۲۴۳
۲۴۴
۲۴۵
۲۴۶
۲۴۷
۲۴۸
۲۴۹
۲۵۰
۲۵۱
۲۵۲
۲۵۳
۲۵۴
۲۵۵
۲۵۶
۲۵۷
۲۵۸
۲۵۹
۲۶۰
۲۶۱
۲۶۲
۲۶۳
۲۶۴
۲۶۵
۲۶۶
۲۶۷
۲۶۸
۲۶۹
۲۷۰
۲۷۱
۲۷۲
۲۷۳
۲۷۴
۲۷۵
۲۷۶
۲۷۷
۲۷۸
۲۷۹
۲۸۰
۲۸۱
۲۸۲
۲۸۳
۲۸۴
۲۸۵
۲۸۶
۲۸۷
۲۸۸
۲۸۹
۲۹۰
۲۹۱
۲۹۲
۲۹۳
۲۹۴
۲۹۵
۲۹۶
۲۹۷
۲۹۸
۲۹۹
۳۰۰
۳۰۱
۳۰۲
۳۰۳
۳۰۴
۳۰۵
۳۰۶
۳۰۷
۳۰۸
۳۰۹
۳۱۰
۳۱۱
۳۱۲
۳۱۳
۳۱۴
۳۱۵
۳۱۶
۳۱۷
۳۱۸
۳۱۹
۳۲۰
۳۲۱
۳۲۲
۳۲۳
۳۲۴
۳۲۵
۳۲۶
۳۲۷
۳۲۸
۳۲۹
۳۳۰
۳۳۱
۳۳۲
۳۳۳
۳۳۴
۳۳۵
۳۳۶
۳۳۷
۳۳۸
۳۳۹
۳۴۰
۳۴۱
۳۴۲
۳۴۳
۳۴۴
۳۴۵
۳۴۶
۳۴۷
۳۴۸
۳۴۹
۳۵۰
۳۵۱
۳۵۲
۳۵۳
۳۵۴
۳۵۵
۳۵۶
۳۵۷
۳۵۸
۳۵۹
۳۶۰
۳۶۱
۳۶۲
۳۶۳
۳۶۴
۳۶۵
۳۶۶
۳۶۷
۳۶۸
۳۶۹
۳۷۰
۳۷۱
۳۷۲
۳۷۳
۳۷۴
۳۷۵
۳۷۶
۳۷۷
۳۷۸
۳۷۹
۳۸۰
۳۸۱
۳۸۲
۳۸۳
۳۸۴
۳۸۵
۳۸۶
۳۸۷
۳۸۸
۳۸۹
۳۹۰
۳۹۱
۳۹۲
۳۹۳
۳۹۴
۳۹۵
۳۹۶
۳۹۷
۳۹۸
۳۹۹
۴۰۰
۴۰۱
۴۰۲
۴۰۳
۴۰۴
۴۰۵
۴۰۶
۴۰۷
۴۰۸
۴۰۹
۴۱۰
۴۱۱
۴۱۲
۴۱۳
۴۱۴
۴۱۵
۴۱۶
۴۱۷
۴۱۸
۴۱۹
۴۲۰
۴۲۱
۴۲۲
۴۲۳
۴۲۴
۴۲۵
۴۲۶
۴۲۷
۴۲۸
۴۲۹
۴۳۰
۴۳۱
۴۳۲
۴۳۳
۴۳۴
۴۳۵
۴۳۶
۴۳۷
۴۳۸
۴۳۹
۴۴۰
۴۴۱
۴۴۲
۴۴۳
۴۴۴
۴۴۵
۴۴۶
۴۴۷
۴۴۸
۴۴۹
۴۵۰
۴۵۱
۴۵۲
۴۵۳
۴۵۴
۴۵۵
۴۵۶
۴۵۷
۴۵۸
۴۵۹
۴۶۰
۴۶۱
۴۶۲
۴۶۳
۴۶۴
۴۶۵
۴۶۶
۴۶۷
۴۶۸
۴۶۹
۴۷۰
۴۷۱
۴۷۲
۴۷۳
۴۷۴
۴۷۵
۴۷۶
۴۷۷
۴۷۸
۴۷۹
۴۸۰
۴۸۱
۴۸۲
۴۸۳
۴۸۴
۴۸۵
۴۸۶
۴۸۷
۴۸۸
۴۸۹
۴۹۰
۴۹۱
۴۹۲
۴۹۳
۴۹۴
۴۹۵
۴۹۶
۴۹۷
۴۹۸
۴۹۹
۵۰۰
۵۰۱
۵۰۲
۵۰۳
۵۰۴
۵۰۵
۵۰۶
۵۰۷
۵۰۸
۵۰۹
۵۱۰
۵۱۱
۵۱۲
۵۱۳
۵۱۴
۵۱۵
۵۱۶
۵۱۷
۵۱۸
۵۱۹
۵۲۰
۵۲۱
۵۲۲
۵۲۳
۵۲۴
۵۲۵
۵۲۶
۵۲۷
۵۲۸
۵۲۹
۵۳۰
۵۳۱
۵۳۲
۵۳۳
۵۳۴
۵۳۵
۵۳۶
۵۳۷
۵۳۸
۵۳۹
۵۴۰
۵۴۱
۵۴۲
۵۴۳
۵۴۴
۵۴۵
۵۴۶
۵۴۷
۵۴۸
۵۴۹
۵۵۰
۵۵۱
۵۵۲
۵۵۳
۵۵۴
۵۵۵
۵۵۶
۵۵۷
۵۵۸
۵۵۹
۵۶۰
۵۶۱
۵۶۲
۵۶۳
۵۶۴
۵۶۵
۵۶۶
۵۶۷
۵۶۸
۵۶۹
۵۷۰
۵۷۱
۵۷۲
۵۷۳
۵۷۴
۵۷۵
۵۷۶
۵۷۷
۵۷۸
۵۷۹
۵۸۰
۵۸۱
۵۸۲
۵۸۳
۵۸۴
۵۸۵
۵۸۶
۵۸۷
۵۸۸
۵۸۹
۵۹۰
۵۹۱
۵۹۲
۵۹۳
۵۹۴
۵۹۵
۵۹۶
۵۹۷
۵۹۸
۵۹۹
۶۰۰
۶۰۱
۶۰۲
۶۰۳
۶۰۴
۶۰۵
۶۰۶
۶۰۷
۶۰۸
۶۰۹
۶۱۰
۶۱۱
۶۱۲
۶۱۳
۶۱۴
۶۱۵
۶۱۶
۶۱۷
۶۱۸
۶۱۹
۶۲۰
۶۲۱
۶۲۲
۶۲۳
۶۲۴
۶۲۵
۶۲۶
۶۲۷
۶۲۸
۶۲۹
۶۳۰
۶۳۱
۶۳۲
۶۳۳
۶۳۴
۶۳۵
۶۳۶
۶۳۷
۶۳۸
۶۳۹
۶۴۰
۶۴۱
۶۴۲
۶۴۳
۶۴۴
۶۴۵
۶۴۶
۶۴۷
۶۴۸
۶۴۹
۶۵۰
۶۵۱
۶۵۲
۶۵۳
۶۵۴
۶۵۵
۶۵۶
۶۵۷
۶۵۸
۶۵۹
۶۶۰
۶۶۱
۶۶۲
۶۶۳
۶۶۴
۶۶۵
۶۶۶
۶۶۷
۶۶۸
۶۶۹
۶۷۰
۶۷۱
۶۷۲
۶۷۳
۶۷۴
۶۷۵
۶۷۶
۶۷۷
۶۷۸
۶۷۹
۶۸۰
۶۸۱
۶۸۲
۶۸۳
۶۸۴
۶۸۵
۶۸۶
۶۸۷
۶۸۸
۶۸۹
۶۹۰
۶۹۱
۶۹۲
۶۹۳
۶۹۴
۶۹۵
۶۹۶
۶۹۷
۶۹۸
۶۹۹
۷۰۰
۷۰۱
۷۰۲
۷۰۳
۷۰۴
۷۰۵
۷۰۶
۷۰۷
۷۰۸
۷۰۹
۷۱۰
۷۱۱
۷۱۲
۷۱۳
۷۱۴
۷۱۵
۷۱۶
۷۱۷
۷۱۸
۷۱۹
۷۲۰
۷۲۱
۷۲۲
۷۲۳
۷۲۴
۷۲۵
۷۲۶
۷۲۷
۷۲۸
۷۲۹
۷۳۰
۷۳۱
۷۳۲
۷۳۳
۷۳۴
۷۳۵
۷۳۶
۷۳۷
۷۳۸
۷۳۹
۷۴۰
۷۴۱
۷۴۲
۷۴۳
۷۴۴
۷۴۵
۷۴۶
۷۴۷
۷۴۸
۷۴۹
۷۵۰
۷۵۱
۷۵۲
۷۵۳
۷۵۴
۷۵۵
۷۵۶
۷۵۷
۷۵۸
۷۵۹
۷۶۰
۷۶۱
۷۶۲
۷۶۳
۷۶۴
۷۶۵
۷۶۶
۷۶۷
۷۶۸
۷۶۹
۷۷۰
۷۷۱
۷۷۲
۷۷۳
۷۷۴
۷۷۵
۷۷۶
۷۷۷
۷۷۸
۷۷۹
۷۸۰
۷۸۱
۷۸۲
۷۸۳
۷۸۴
۷۸۵
۷۸۶
۷۸۷
۷۸۸
۷۸۹
۷۹۰
۷۹۱
۷۹۲
۷۹۳
۷۹۴
۷۹۵
۷۹۶
۷۹۷
۷۹۸
۷۹۹
۸۰۰
۸۰۱
۸۰۲
۸۰۳
۸۰۴
۸۰۵
۸۰۶
۸۰۷
۸۰۸
۸۰۹
۸۱۰
۸۱۱
۸۱۲
۸۱۳
۸۱۴
۸۱۵
۸۱۶
۸۱۷
۸۱۸
۸۱۹
۸۲۰
۸۲۱
۸۲۲
۸۲۳
۸۲۴
۸۲۵
۸۲۶
۸۲۷
۸۲۸
۸۲۹
۸۳۰
۸۳۱
۸۳۲
۸۳۳
۸۳۴
۸۳۵
۸۳۶
۸۳۷
۸۳۸
۸۳۹
۸۴۰
۸۴۱
۸۴۲
۸۴۳
۸۴۴
۸۴۵
۸۴۶
۸۴۷
۸۴۸
۸۴۹
۸۵۰
۸۵۱
۸۵۲
۸۵۳
۸۵۴
۸۵۵
۸۵۶
۸۵۷
۸۵۸
۸۵۹
۸۶۰
۸۶۱
۸۶۲
۸۶۳
۸۶۴
۸۶۵
۸۶۶
۸۶۷
۸۶۸
۸۶۹
۸۷۰
۸۷۱
۸۷۲
۸۷۳
۸۷۴
۸۷۵
۸۷۶
۸۷۷
۸۷۸
۸۷۹
۸۸۰
۸۸۱
۸۸۲
۸۸۳
۸۸۴
۸۸۵
۸۸۶
۸۸۷
۸۸۸
۸۸۹
۸۹۰
۸۹۱
۸۹۲
۸۹۳
۸۹۴
۸۹۵
۸۹۶
۸۹۷
۸۹۸
۸۹۹
۹۰۰
۹۰۱
۹۰۲
۹۰۳
۹۰۴
۹۰۵
۹۰۶
۹۰۷
۹۰۸
۹۰۹
۹۱۰
۹۱۱
۹۱۲
۹۱۳
۹۱۴
۹۱۵
۹۱۶
۹۱۷
۹۱۸
۹۱۹
۹۲۰
۹۲۱
۹۲۲
۹۲۳
۹۲۴
۹۲۵
۹۲۶
۹۲۷
۹۲۸
۹۲۹
۹۳۰
۹۳۱
۹۳۲
۹۳۳
۹۳۴
۹۳۵
۹۳۶
۹۳۷
۹۳۸
۹۳۹
۹۴۰
۹۴۱
۹۴۲
۹۴۳
۹۴۴
۹۴۵
۹۴۶
۹۴۷
۹۴۸
۹۴۹
۹۵۰
۹۵۱
۹۵۲
۹۵۳
۹۵۴
۹۵۵
۹۵۶
۹۵۷
۹۵۸
۹۵۹
۹۶۰
۹۶۱
۹۶۲
۹۶۳
۹۶۴
۹۶۵
۹۶۶
۹۶۷
۹۶۸
۹۶۹
۹۷۰
۹۷۱
۹۷۲
۹۷۳
۹۷۴
۹۷۵
۹۷۶
۹۷۷
۹۷۸
۹۷۹
۹۸۰
۹۸۱
۹۸۲
۹۸۳
۹۸۴
۹۸۵
۹۸۶
۹۸۷
۹۸۸
۹۸۹
۹۹۰
۹۹۱
۹۹۲
۹۹۳
۹۹۴
۹۹۵
۹۹۶
۹۹۷
۹۹۸
۹۹۹
۱۰۰۰

اسی اصول پر کی جاتی تھی، چنانچہ جب اسلام میں ملک چین میں جمہوریت قائم ہوئی تو دونوں کے علم پر ملک کی پانچ ممتاز اقوام کے لئے ایک ایک رنگ رکھا گیا، لیکن پچھلی جنگ عظیم کے بعد مغربی ایشیا میں جو نیا جل پیدا ہوئی یعنی ترکی میں جمہوریہ قائم کیا گیا، اور ایران میں خاندان قاجار ہمیشہ کے لئے تخت سے محروم کیا گیا تو ساتھ ساتھ ان ممالک میں بھی کم و بیش مغربی طرز کی قوم کا تخیل پیدا ہو گیا، جس کا ایک نہایت دلچسپ مظاہرہ یہ ہے کہ ہندوستان کے پارسی یہ کہہ کر شکر ہے ہیں کہ ان کے ”ہم قوموں“ یعنی ایرانیوں اور خروان کے درمیان ربط و اتحاد بڑھ جائے۔ اسی طرح فلسطین کے باشندوں کی جو فریق بندی کی گئی ہے اس میں عربی بولنے والے فلسطینی، خواہ وہ عیسائی ہوں یا مسلمان، ایک طرف نظر آتے ہیں، اور عبرانی بولنے والے یہودی دوسری طرف۔

اسلام نے جیسے دوسرے دنیوی معاملات میں ایک انقلاب عظیم برپا کیا اسی طرح سیاسیات میں بھی بعثت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے، قرآن مجید کا مخاطب کسی خاص گروہ کی طرف نہیں بلکہ نبی نوع انسان کی طرف ہے، اور اس میں صریحاً لکھا ہے کہ جہاں بھی کلمہ اور قبیلے ہیں ان کا مقصد صرف ایک کو دوسرے سے پہچاننا ہے، ورنہ ایک فرد اور دوسرے فرد کے درمیان جو اصلی فرق ہے وہ محض کردار کا ہے نہ کہ حسب نسب کا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ ذَكَرٍ وَجَعَلَكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتَقْوَمُ (قرآن مجید، سورہ ۴۹، آیت ۱۳)

ریاست اور قلمرو۔ ملکیت کو ایک اور ادارہ یعنی ریاست سے ممیز کرنا چاہئے۔ دیکھئے تو ”ریاست“ کے لغوی معنی ایک ایسے مجموعہ افراد کے ہیں جن کا کوئی سرگروہ یا رئیس ہو، لیکن سیاسی اصطلاح میں اس لفظ کا انطباق عام طور سے آزاد ملکوں پر نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا اس سے پیشتر بیان کیا جا چکا ہے، دنیا میں بہت سے ممالک ایسے ہیں جن پر کسی نہ کسی طاقتور سلطنت کا اثر ہے، اور ان پر سلطنت براہ راست حکومت نہیں کرتی، بلکہ اپنی سہولت کی غرض سے اس نے اکثر اندرونی انتظامات کو وہیں کے مقامی حکمرانوں پر چھوڑ رکھا ہے۔ علاوہ ان دنوں دنیا میں ایسے بھی ممالک ہیں جن پر خواہ جغرافیائی وسعت کے سبب سے خواہ تاریخی تنوع کے لحاظ سے، براہ راست حکومت نہیں کی جاتی، بلکہ چند اختیارات جو ملک کو متحدہ اور طاقتور رکھنے کے لئے ضروری ہوں، مرکزی حکومت کے سپرد کر دئے جاتے ہیں، اور ایسے اختیارات جن کا تعلق انفرادی بود و ماند سے ہو، مقامی ادارت کے قبضہ میں رہنے دئے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ قاعدہ بنادیا جاتا ہے کہ مرکزی حکومت کو ان اختیارات میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ان دونوں قسم کے ادارات کو، یعنی جہاں کہیں بیرونی ذی اقتدار سلطنت نے اندرونی انتظامات کسی مقامی حاکم کے قبضہ میں رہنے دئے ہوں، یا ملک کے مختلف حصوں کے اختلاف روایات کے باعث انھیں بعض شعبہ جات حکومت میں مختار کی بنا دیا گیا ہو اور دوسرے شعبے کسی مرکزی حکومت کے سپرد کر دیئے گئے ہوں سیاسی اصطلاح میں ”ریاست“ کہتے ہیں۔ اول الذکر قسم کی ریاستوں کی بہترین مثال ہندوستانی ریاستیں ہیں اور دوسری قسم کی ریاستوں کی بہترین مثال ممالک

متحدہ امریکہ، برازیل اور روس کی منفرد ریاستیں ہیں، جہاں اکثر اندرونی اختیارات ریاستی حکومتوں کو حاصل ہیں اور مرکزی حکومت صرف ایسے اختیار پر قیامت کرتی ہے جو ملک کی عظمت و اقتدار کے اجناسے لاینفک ہوں۔ بہر حال اگر ہم ملکیت میں ایسے انسانی جمہوروں کا شمار کریں جن کو اندرونی اختیارات تمامہ حاصل ہوں پھر بھی ریاستوں سے ان کی تفریق کر دینا مناسب ہو گا۔ آزاد ممالک کے مختلف اجزاء کو کسی حالت و صورت میں ملکیت کا لقب نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ عام طور پر بہت سے داخلی معاملات پر بھی مرکزی حکومت حاوی ہوتی ہے، جیسے سکہ سازی، شاہراہیں اور قومی ریلوں کا انتظام، بعض محاصل عائد کرنے کا اختیار وغیرہ، اب رہا ماتحت علاقوں کا سوال، یہاں غور طلب یہ امر ہے کہ آیا ذی اقتدار سلطنت غیر ملکی حصہ اپنی سہولت کی خاطر ان رقبوں کے قبضے میں اندرونی اختیارات چھوڑ دے، یا ملک کی رفتار آزادی کی جانب ہے اور ان اختیارات سے ان غیر سلطنت کو مجبوراً دست بردار ہونا پڑا ہے۔ ہندوستان کی اکثر و بیشتر ریاستوں کو ملکیت کا لقب نہیں دیا جاسکتا، اس لئے کہ جس طرح خارجی معاملات میں ان پر قیود عائد ہیں اسی طرح اندرونی معاملات میں بھی اگر بالادست سلطنت چاہے تو ان پر دباؤ ڈال سکتی ہے، بلکہ بعض حالات میں شاید رئیس کو تخت سے بھی ہٹا کر سکتی ہے، گویا جہاں تک ایسی ریاستوں کا تعلق ہے، بالادست سلطنت اندرونی اور بیرونی دونوں قسم کے اختیارات پر حاوی ہوتی ہے۔

فلورڈ کی حیثیت اس سے مختلف ہوتی ہے۔ فلورڈ اصل وہ علاقہ ہے جو کسی زمانے میں کسی زبردست ملک کے پوری طور سے دست نگر تھے بلکہ جنہیں

امتداد زمانہ سے خود مختاری اور ایک حد تک خارجی اختیارات حاصل ہو گئے ہیں۔ ایسی قلمروں کی مثالیں سلطنت برطانیہ میں ملتی ہیں، جسے اب اسی مناسبت سے ”برطانوی دولت عامہ اقوام“ کا لقب دیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اب بھی برطانیہ کو جنوبی افریقہ، کینا ڈا اور آپرستان میں کسی قسم کے ”قانونی“ اختیارات بھی حاصل ہوں، لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس کے لئے ان اختیارات کو کام میں لانا خارج از امکان اور خارج از بحث ہے اور آپرستان کی حال کی تاریخ سے یہ امر بڑی طرح سے واضح ہو گیا ہے کہ قلمرو کچھ بھی کرے، برطانوی حکومت دخل نہ دے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ برطانیہ کا بھی جو اختیارات قلمروں کے معاملات پر رہ گیا ہے اس کی بنیاد سلطنت کی سہولت پر نہیں بلکہ خود ان قلمروں کی خوشی پر ہے، اس لئے کہ وہ بالفعل اس کے لئے تیار ہیں کہ ایسے معاملات سے جیسے بحری مدافعت، خارجی امور وغیرہ میں اپنے آپ کو بالکل انحصار سے آزاد کر لیں۔ ایسے ترقی یافتہ سیاسی بھروسوں کو، مملکت کا لقب دینا یقیناً غلط بیانی نہ ہوگی۔

۱۹۳۰ء تاؤن ویلٹ کمیشن کی رپورٹ سے برطانیہ کو اپنی قلمرو پر قانونی دباؤ کا حق باقی نہیں رہا۔
قلمروں کی تفصیلی کیفیات کے لئے دیکھو باب ۲۰

ORIGIN OF THE STATE

باب ۳

تخیل مملکت کا آغاز اور اس کا ارتقا

تنظیم مملکت - ہندی نظریہ - چینی نظریہ - اسلامی نظریہ - یورپی نظریہ - ہوبز - لاک - ڈیوٹو -
ان نظریوں کا مشترک عنصر، اصول معاشرہ کی نشیہ - نظریہ تخلیق ربانی - پدمری اور دیگر
آئندہ کا نظریہ - نظریہ جبر حقیقی ارتقاء مملکت -

تنظیم مملکت - علامہ ابن خلدون نے اپنی مشہور آفاق تاریخ کے مقدمہ
میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مملکت تمام دنیوی خیرات و حسنات کا مجموعہ اور نفسانی و
جسمانی امیدوں اور آرزوں کی غایت الغایات ہے۔ مملکت کے حقیقی مقاصد پر آئندہ
بحث کی جائے گی؛ اس وقت یہ بتادینا کافی ہے کہ ابن خلدون نے جو اسے
اتنا گراں بہا اور بجا ہے تو اس کا اپنی سبب مملکت کی تنظیم کیفیت معلوم ہوتی
ہے جو اس کا جزو لا ینفک اور اس کی عظمت کی گویا جان ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا
ہے کہ مملکت کی تنظیم کبھی یہ کبھی ضرور عمل میں آتی ہوگی اور معاشرہ انسانی پر ایک

۱۔ مقدمہ ابن خلدون حصہ دوم، فصل اول۔

۲۵ دیکھو آئندہ باب ۱۱۔

زمانہ ضرور ایسا گذرا ہوگا جب اس میں سیاسی کیفیات پیدا نہیں ہوتی تھیں، یعنی جب حاکم و محکوم کے تعلقات کا وجود نہ ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ذائد از دو ہزار سال سے مشرق اور مغرب کے ممالک مختلف واقعات کو پیش نظر رکھ کر ان کیفیات کو از سر نو مرتب کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں جو مملکت کی تنظیم سے بیشتر معاشرہ انسانی کی ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ اس ضمن میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ سب محض نظریات پر مشتمل ہے اور شاید تاریخ میں کسی ایسے انسانی معاشرہ کا ذکر نہیں ہے جس میں سیاسی تحلیل کا کلیتہً فقدان ہو۔

ہندی نظریے۔ تحلیل مملکت کے آغاز کے متعلق شاید سب سے پہلے نظریہ کا ذکر جو دنیا کے سامنے پیش کیا گیا، بودھ مت کی کتابوں میں ملتا ہے۔ دیکھ چکاتے ہیں لکھا ہے کہ مہاتما گوتم بودھ نے کسی کے سوال کے جواب میں یہ کہا کہ ابتدا میں انسان کی حالت بالکل مکمل تھی اور رنج و فکر کا پتہ نہ تھا۔ رفتہ رفتہ فائدان قایم ہو گئے، ذاتی ملک کا رواج ہو گیا، قوم چاروںوں میں تقسیم ہو گئی، لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا اور اس کی ضرورت پیش آئی کہ کسی نہ کسی طرح سے زیادتیوں اور ظلم و ستم کا انسداد کیا جائے۔ ان فرض تمام لوگ یکجا جمع ہوئے اور انھوں نے یہ طے کیا کہ ان زیادتیوں کا انسداد اسی وقت ممکن ہے جب ایک ایسا حکمران منتخب کیا جائے جو ملزموں کو سزا دے، بد شخصوں میں لڑائی جھگڑا ہو تو ان کا فیصلہ کرے اور ملک میں امن و امان قایم رکھے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی جماعت میں سے سب سے خوب رہے، سب سے بہترین اور سب سے طاقتور شخص کو اپنا حکمران منتخب کیا اور اس سے یہ مطالبہ کیا کہ اگر وہ فرائض منصبی ادا کرے تو اسے ایک مقررہ معاشرہ دیا

جائے گا۔

اس کے بعد جو نظریہ ہندوستان کے سیاسی میدان میں سب سے متاثر ہے وہ کولتیا کا نظریہ ہے جس کے مطابق مملکت سے بیشتر بالکل زراعت کی سی کیفیت تھی، اس زمانہ میں مفقود تھا، ہر شخص دوسرے کی ایذا رسانی اور اپنی خواہشات کو پورا کرنے پر تیار ہوا تھا اور انسانی مجموعہ کی کیفیت وہی کیفیت تھی جو سمندر کی پھیلیں کی ہوتی ہے یعنی ہر زبردست شخص اپنی خواہشات کی تکمیل کے درپے تھا اور جس طرح بڑی پھلی چھوٹی پھلیوں کو نگل جاتی ہے اسی طرح وہ بھی اپنے منہ کے سامنے کسی کی حقیقت نہیں سمجھتا تھا کولتیا اس صورت حال کو منیا نیا یعنی "منطق باہمی" کا لقب دیتا ہے اور اس طرح گفت میں ایک نئی اصطلاح کا اضافہ کرتا ہے۔ بہر حال اس کے نزدیک جب صورت حال اس قدر ناقابل برداشت ہوئی تو لوگوں نے ایک حکمران کی ماتحتی قبول کر لی۔ کولتیا یہ نہیں کہتا کہ اس حکمران کا انتخاب باضابطہ ہوا ہوگا، بلکہ وہ محض حکمران کے احکام کو تسلیم کر لینا ہی اس انتخاب کے واقعے کے لئے کافی تصور کرتا ہے۔

سنگھوش "ہندو کے سیاسی نظریوں کی تاریخ" *Ethoshal : A History of Hindu Political Theories*,

بنی پرشاد "ہندو قدیم میں مملکت" *Beni Parshad : The State in ancient India*.

چینی نظریے۔ تقریباً اسی زمانے میں چینی فلسفی موہتی نے بھی مملکت سے قبل کی حالت کا تجزیہ کیا۔ وہ کہتا ہے کہ مملکت کے قیام سے پہلے ہر شخص کے نزدیک حق اور ناحق کا خیال جدا گانہ تھا، چنانچہ ایک شخص کسی بات کو حق سمجھتا تھا تو دوسرا شخص نہ صرف اسی کو ناحق تصور کرتا بلکہ شخص اول کو اپنے زعم میں گمراہ سمجھتا تھا۔ اسلامی نظریے۔ ان نظریوں اور سولہویں اور سترہویں صدی کے یورپی نظریوں کے درمیان یکاڑوں برس کا جو فاصلہ ہے وہ ابتدائی مسلمانوں کی سیاسی فکر سے پر ہو گیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ جن تخیلات کو آگے چل کر یورپی مفکرین نے پیش کیا وہ ایک بڑی حد تک نویں اور دسویں صدی عیسوی میں ہی منظر عام پر آچکے تھے۔ مثلاً حکیم فارابی نہ صرف ان مصادر پر نظر ڈالتا ہے جن کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے سے روابط پیدا کرتے ہیں بلکہ اس نظریے کی بھی ایک بڑی حد تک پیش بندی کرتا ہے جسے بعد میں چلکمر "معاشری معاہدہ" کا لقب دیا گیا۔ وہ مزید فروخت کے معاہدے کی ماہیت کا تجزیہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس معاہدے کی گواہان یہ ہے کہ فریقین کی حیثیت اور ان کا رتبہ بالکل سادی ہوں پس جس لوگ دوسروں سے زیادہ طاقتور تھے اور اپنے کمزور بھائیوں کو طرح طرح سے زیر کرنے کی کوشش کرتے تھے، جس کی وجہ سے بدامنی اور شورش ہوتی رہتی تھی اور کسی طرح کی

شہنشاہ کے مکرکار "ہندوؤں کے سیاسی ادارات و نظریات" : Bonoy Kumar
Sarkar : The Political Institutions and
Theories of the Hindus.

داد و مستد ممکن نہ تھی۔ جب لوگ اس ضرورت سے بالکل غاری آگئے تو انھوں نے آپس میں یہ معاہدہ کیا کہ ہر شخص اپنے اپنے اقتدار سے دست بردار ہو جائیگا جس کے ذریعے سے وہ دوسروں کو زیر کرنے کی کوشش نہ کرے اور اس معاہدے سے لوگوں میں مکمل مساوات کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

ابن خلدون یہ کہتا ہے کہ انسان فطرتاً ایک معاشری حیوان ہے اور اس کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ منظم معاشرے میں رہے۔ خداوند تعالیٰ نے انسان کو کچھ اس انداز سے پیدا کیا ہے کہ بغیر تعالیٰ اور ہمکاری کے زندگی ہی محال ہو جائیگی چنانچہ انسان کو نہ صرف دوسروں کی مدد مسلسل درکار ہوتی ہے بلکہ وہ بھی دوسروں کی برابر مدد کرتا رہتا ہے۔ امام غزالی نے اس سے دوسو برس پہلے ہی اسی تخیل کو تفصیل سے بیان کر دیا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ چونکہ انسانوں کے مجموعوں میں طرح طرح کے جھگڑے پیدا ہوتے رہتے ہیں اس لئے انھیں چکانے کے لئے ایک مستقل نظم کی ضرورت ہے اور یہ نظم حکومت کی شکل میں بہرہ منہن ملک میں موجود رہے۔

۱۰ تا ۱۲۰۰ء تا ۱۲۰۰ء تا ۱۲۰۰ء ابن خلدون ۱۲۰۰ء تا ۱۲۰۰ء غزالی ۱۰۵۰ء تا ۱۲۰۰ء
۱۱ تا ۱۲۰۰ء دیکھو شروانی ۱۲ تا ۱۲۰۰ء اسلامی سیاسی فکر اور سیاسیات کی اسکیم میں اس کا رتبہ ۱۱
Sherwani: Islamic Political Thought: its

place in the Scheme of Political Science.

زیرِ زح ۱۲۰۰ء تا ۱۲۰۰ء شروانی ۱۲ تا ۱۲۰۰ء غزالی کے خیالات سیاسی نظریوں اور اس پر رقبہ ۱۲

یورپی نظریہ۔ یورپ میں مملکت کے قیام سے پہلے کی حالت کا تجزیہ سولہویں صدی عیسوی سے پیشتر کسی نے نہیں کیا۔ پہلا شخص جس کی تحریریں میں ہیں اس کا پتہ چلتا ہے 'وہ گریس ہے۔ مگر کے بعد جرمن پروفیسر ڈورف اور ولندیزی ایسی نوزائے بھی اس کے تجزیے کی کوشش کی لیکن اس موضوع پر سب سے پہلی مرتبہ کامل بحث و مباحثہ کا سہرا انگلستان کے فلسفی ٹامس ہوبز کے سر ہے جس نے ۱۶۵۱ء میں اپنی کتاب لیوایاٹھن کو شائع کر کے جس پر سیاست والوں کے لئے ایک نیا بحث پیدا کر دیا۔

ہوبز۔ کوئی کیا کی طرح ہوبز کے نزدیک بھی مملکت سے پیشتر مٹیائی کی کیفیت ہوگی۔ چونکہ اس فطری حالت میں قانون کا بالکل فقدان تھا اس لئے حق و باطل، انصاف و بے انصافی کا وجود ہی نہ تھا۔ ہر شخص کو اپنی جلیغہ نشانی نفسانی کے پورا کرنے کی کامل آزادی حاصل تھی، اور چونکہ انسان فطرتاً خود بین اور

(فقیر ۲۲۲) Sherwani: El-Ghazzali on the Theory and practice of Politics.

Sherwani: Al- حیدر آباد دکن ۱۹۳۶ء؛ شرذاتی: الغزالی کے سیاسی نظریے؛ Farabi's political theories, علی گڑھ ۱۹۳۳ء۔

ان مفکروں کے بعض سیاسی خیالات حسب ذیل کتابوں میں ہیں گے: فارابی،

"أولاء أهل المدينة الفاضلة"؛ غزالی، "احیاء العلوم" جلد سوم باب ۶ فصل ۵؛ ابن خلدون، ۱۔ مقدمہ

Hobbes: Leviathan.

خود غرض ہے اس لئے ہمیشہ مختلف لوگوں کی خواہشات میں باہم تصادم ہوتا رہتا تھا۔ یہ صورت حال اس قدر ناقابل برداشت ہو گئی کہ لوگ اپنی زندگی تک سے ہماری سو گئے اور انہوں نے آپس میں معاہدہ کیا کہ ہر شخص اپنی قوت عمل سے بالکل دست بردار ہو جائے، بشرطیکہ باقی اشخاص بھی دست برداری سے دیں ساتھ ہی جہ افراد نے باتفاق رائے اپنے اد پر حکومت کرنے کا اختیار ایک ہی شخصیت کے سپرد کر دیا جسے ”مقتدرِ اعلیٰ“ کا لقب دیتا ہے۔ چونکہ یہ کارروائی محض اس لئے ہوئی تھی کہ بغیر اس کے ملک میں امن و امان رہنا ناممکن تھا اس لئے مقتدرِ اعلیٰ کا پہلا فرض یہ ہوا کہ ملک میں امن و امان قائم رکھے اور لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کرے، چنانچہ جب تک وہ اس اساسی شرط کو پورا کرتا رہے گا یعنی جب تک وہ امن رکھے گا اس وقت تک اس کا حکم ماننا ہر شخص پر فرض ہو گا، خواہ وہ حکم بادی النظر میں کیسا ہی بے انصاف نہ کیوں نہ ہو۔

لوگ۔ جو بزرگ کے بعد فلسفی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا وہ بھی اس کی طرح ایک انگریزی سی جان کوک تھا، جس نے اپنے زمانہ ۱۶۹۰ء میں شروع کئے۔ گو جو بزرگ کے نزدیک مقتدرِ اعلیٰ کا مطلق العنان ہونا قیامِ مملکت کے لئے لازمی تھا، لیکن جو بزرگ کے وقت سے لے کر کوک کے زمانہ تک یہی امر شاہ انگلستان اور عیاں نے انگلستان کے درمیان باہم الزام رکھا کہ بادشاہ کو حقوق مطلق العنان حاصل ہیں یا نہیں۔ انگریز چارلس اول کا سر قلم کر چکے تھے انہوں نے جیمز دوم کو کوک

سے نکال دیا تھا، اور اکثر شاہی اختیارات سلب کر کے ایک پریسی وکیم سوئم کو تخت انگلستان پر بٹھا دیا تھا۔ لیکن باوجود ان تمام انقلابات اور باوجود سب کے نظریہ کے انگلستان کی مملکت برابر قائم تھی۔ لوگ نے یہ محسوس کیا کہ اس کے بیشتر کے نظریہ میں کچھ نہ کچھ خافی ہے اور اس کی ضرورت بھی کہ ایک نیا نظریہ دنیا کے سامنے پیش کرے لوگ کے نزدیک یہ غلط ہے کہ مملکت کے آغاز سے بیشتر کسی قانون کا

نفاذ نہ تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت بھی قانون قدرت رائج تھا، ہر انسان میں عقل و شعور کے جذبات موجود تھے اور وہ حق اور باطل، انصاف اور بے انصافی میں تمیز کر سکتا تھا۔ ہر شخص کو ہر چیز پر قبضہ کرنے کا قدرتی اختیار تھا، بشرطیکہ وہ دوسروں کا سدراہ نہ بنے، لیکن اس قانون کی تاویل کرنے کا استحقاق بجائے کسی ثالث کے ہر ایک فرد کو حاصل تھا۔ اس صورت حال میں ایک سقم یہ تھا کہ چونکہ ہر شخص اپنے افعال کا خود ہی جج تھا، اس لئے اکثر و بیشتر کسی خاص امر کے متعلق مختلف افراد کے فیصلوں میں تصادم ہوتا رہتا تھا۔ اس کے باوجود بھی یہ نہایت آرام دہ کیفیت ناقابل برداشت نہ ہو جاتی، اگر بعض طاع اوٹس پرست افراد دوسروں کی مقبوضہ اشیاء پر جبراً قبضہ کرنا نہ چاہتے، جس کی وجہ سے نہ صرف لوگوں کے مقبوضات بلکہ ان کی آبرو اور زندگی بھی معرض خطر میں پڑ گئی۔

لوگ کے نزدیک معاشرہ سیاسی کا اولین مقصد انسان کی زندگی، آزادی آبرو اور املاک کی حفاظت ہے۔ اسی مقصد کی تکمیل کے واسطے ابتدائی انسانوں نے آئیں میں سمجھوتہ کر کے یہ معاہدہ کر لیا کہ وہ قانون فطرت کی خود ہی تاویلیں اور نفاذ کرنے کے بجائے اس اہم فرض کو کل قوم یا قوم کی اکثریت کے سپرد کر دیں گے۔

اور جب اس طرح معاشرہ سیاسی قائم ہو گیا تو سب نے ایک شخص واحد کو اپنا حکمران قرار دے کر اپنی جانب سے اس کو نفاذ قوانین اور تادیب قوانین کا اختیار دیا، بشرطیکہ وہ ابتدائی معاہدے کے مقصد اولین کو پورا کرتا رہے، یعنی افراد کی آزادی، زندگی، آبرو اور الماک کی حفاظت کرتا رہے۔ ساتھ ہی آپس میں یہ بھی طے ہوا کہ کثرت رائے ہمیشہ اقلیت پر حاوی رہا کرے گی۔ لوگ کی رائے ہے کہ اس معاشری حالت کی ابتدا کا ثبوت بعض منطقی دلیلوں ہی سے نہیں دیا جاسکتا، تاہم بالکل ممکن ہے کہ اس کی بنیاد تاریخی واقعات پر ہو، اور بعض اس لئے کہ ہمارے پاس اس کا ثبوت کم ہے، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ واقعہ مطلقاً پیش نہ آیا ہو گا۔

روسو - تیسرا امتناز سیاست دان جس نے معاہدہ معاشری پر قلم اٹھایا، جلیس کا باشندہ نراں تراک روٹسو تھا، جس نے اپنی مشہور کتاب ”معاشری معاہدہ“ کو مشاعرے میں شائع کیا۔ وہ لکھتا ہے کہ اپنی فطری حالت میں انسان کی زندگی نہایت آرام و آسائش سے بسر ہوتی تھی، انصاف یا اخلاق کا تخیل تو بالکل مفقود تھا، لیکن ہر شخص بالکلیہ آزاد ہوئے کی وجہ سے فطرتاً دوسروں کے احساسات و جذبات کا پاس کرتا تھا۔ اس حالت میں کوئی چیز کسی کی ملوکہ نہ تھی، بلکہ غیر مقررہ چیز پر ہر شخص کو قبضہ کرنے کا حق تھا۔ یہ عہد زریں ایک ایسا عہد تھا جس کا خاتمہ مستقل الماک کے رواج اور قوی دزد و دار افراد کی حوص کی وجہ سے ہمیشہ کے واسطے ہو گیا۔ جب مختلف اشیاء مختلف افراد میں تقسیم ہو گئیں اور زبردست، زبردست پر مظالم ڈھالے لگا

تو اس قیام کرنے کی صرف ایک صورت نظر آئی کہ وہ یہ کہ تمام افراد متحد اور مجتمع ہو کر ظالموں اور غاصبوں کا مقابلہ کریں۔ چنانچہ ہر ایک شخص نے اپنی ذات اور اپنے جدا افتد اختیارات سے دست بردار ہو کر اپنے آپ کو تمام قوم کے اقتدار کے ماتحت کر دیا۔ رکوس کا خیال ہے کہ اس ترکیب سے غاصب اور ظالم مغلوب ہو گئے اور ساتھ ہی چونکہ ہر شخص اس نئی جماعت کا ایک رکن تھا اس لئے آزادی میں بھی کمی پیدا نہیں ہوئی۔

۱۰ ہوبز ٹوکٹ اور رہسوکے نظریوں کے اختلافات کے باعث ان کے قیام کئے ہوئے حکمرانوں کے اختیارات میں بھی بٹاؤ فرما دیا۔ ہوبز کہتا ہے کہ لوگوں نے اپنی فطری عادات سے تنگ آکر اپنے جملہ اختیارات ایک "مقتدرِ اعلیٰ" کے سپرد کر دیئے۔ اس کے نزدیک خواہ یہ "مقتدرِ اعلیٰ" شخص واحد ہو یا ایک مرکب جماعت، اسے سوا وسیعہ کا کلی اختیار حاصل ہے اور شخص کو اس کے احکام کے سامنے تسلیمِ حرم کرنا ضروری ہے۔ ٹوکٹ "مقتدرِ اعلیٰ" کی اصطلاح استعمال نہیں کرتا اس کے نزدیک خود تا وقتیکہ وہ جان دال اور آبرو کی حفاظت کرنا چاہے گا اس کا اقتدار قائم رہے گا اور نہ لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کیلئے اقتدارِ اعلیٰ اس سے چھین کر کسی اور کو دیدیا۔ رہسوکے خیال کے مطابق مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ باشندگانِ مملکت ہی کو حاصل ہے اور وقتی حکمران کی حیثیت خادم سے زیادہ نہیں ہے۔

ان تینوں سیاست دانوں کے نزدیک باشندگانِ مملکت اور مقتدرِ اعلیٰ میں جو تعلق ہے وہ مفصلہ ذیل شکلوں سے واضح ہو سکتا ہے۔

(۱) ہوبز کے نزدیک مقتدرِ اعلیٰ معاہدہ کرنے والوں میں شامل نہیں تھا، لہذا اس پر معاہدے کا اثر نہیں پڑتا، چنانچہ مقتدرِ اعلیٰ مطلق العنان ہے۔

(بقیہ صفحہ ۳۹ پر)

ان نظریوں کا مشترک عنصر۔ ان تمام نظریوں میں ایک چیز مشترک ہے، وہ یہ کہ ہر نوع انسان کی تاریخ دو بڑے بڑے حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے (۱)

(بقیہ صفحہ ۴۰)



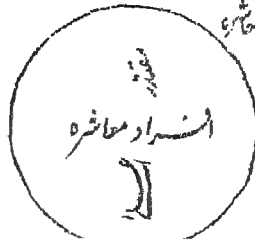
(۲) لوگ کے نزدیک پہلے معاشرہ سیاسی نظم ہوا، اس کے بعد معاشرے یا اس کی اکثریت کے

سہرہ اس شرط پر اختیارات کر دئے گئے کہ جان و مال اور آبرو کی حفاظت کی جائے گی۔



(۳) دوستوں کے نزدیک افراد معاشرہ

ہی کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہے۔



یعنی تنظیمِ مملکت سے پیشتر کا زمانہ اور اس کے بعد کی حالت۔ مملکت کے قیام سے پہلے کی کیفیت کی بابت سیاست دانوں کے درمیان اختلاف ہے اور اس اختلاف کی اصل بنا انسان کی فطری حالت کی حقیقت ہے۔ بعض کے نزدیک انسان فطرتاً ہی سے حریص، خود غرض، لڑاکو اور افسوسناک ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ خواہ اس کی حالت منظم ہو یا نہ ہو، وہ چند قوانین قدرت کا اتباع کرتا ہے اور اس میں اور انسانی جانداروں میں جو امتیاز ہے وہ عقل، فہم و ادراک کے وجود پر مبنی ہے۔ آخر الذکر فلسفی کہتے ہیں کہ انسانیت کے معنی ہی یہ ہیں کہ مختلف انسانوں میں فہم و ادراک کی صفات موجود ہوں، اور یہ کہنا کہ ازل سے ہی انسان محض خود غرض یا محض حریص ہے، صریح غلط بیانی ہے۔ لیکن یہ لوگ بھی یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ رفتہ رفتہ بعض زبردست افراد میں خود غرضی اور حرص کے جذبات پیدا ہو گئے، چنانچہ ہر ایک کے نزدیک معاہدہ معاشرتی سے پیشتر ہی نوع انسان میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا اور اسی کے انداز کی غرض سے آخر کار معاشرہ سیاسی قائم کرنا پڑا۔

اصول معاہدہ معاشرتی کی تنقید۔ یورپ اور امریکہ پر ان نظریوں کا اثر نہایت عظیم نشان پڑا۔ ممالک متحدہ امریکہ اور فرانس کے انقلابی دستوروں کے بہت سے فقرے روس کی تحریروں سے لئے گئے ہیں لیکن اٹھارہویں صدی کے اواخر میں سیاسوں میں اس کے خلاف رد عمل پیدا ہو گیا اور ایٹمڈ ہکس جیمری بنیم اور ڈاؤد میوٹ نے اپنے دلائل سے گویا کہ اس کا خاتمہ کر دیا۔ نوک کا یہ قول کہ عدم شہادت سے عدم واقعہ ثابت نہیں ہوتا، بالکل لائق ہے۔ جو بزرگ نے نظریے کی بنیاد بھی ایک حد تک واقعات اور منطقی استدلال پر مبنی، لیکن نوک کا

ایک طرف تو ثبوت کے فقدان کو تسلیم کر لیتا اور دوسری جانب معاہدے کو بطور ایک واقعہ کے پیش کرنا، ایک امر لا طائل سے ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے فرض بھی کر لیا جائے کہ کسی وقت میں ہی نوع انسان یکجا بیٹھے، اور انھوں نے آپس میں یا کسی شخص ثالث سے کسی قسم کا معاہدہ کیا، تاہم یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ان ابتدائی معاہدہ کرنے والوں کی اولاد پر بھی اس کے شرائط کی پابندی فرض ہے دوسرے ہم جانتے ہیں کہ موجودہ بیچ در بیچ قانونی تخیلات، صدیوں کے ذہنی ارتقاء کا نتیجہ ہیں۔ جب انسان تنظیم ہی نہ تھا اور جب آپس کے تعلقات تقریباً مفقود تھے تو پھر معاہدہ جیسے پیچیدہ قانونی تشکیل کا احساس پیدا ہونا، اس احساس پر ان کا عمل کرنا، اور ہر ایک فرد کا، خواہ وہ زبردست ہو یا کمزور، چھوٹا ہو یا بڑا، حتیٰ سے کار بند ہو، نام دش نام کمالات سے معلوم ہوتا ہے۔ نیز یہ مسئلہ بھی قابل غور ہے کہ آخر اس معاہدے کو انتظام کیوں حاصل ہوا۔ اس کے دو ہی اسباب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ مقتدر، اعلیٰ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے معاہدے کا قیام چاہتا ہے، اور دوسرے یہ کہ افراد معاشرہ امن و امان کے خواہاں ہیں۔ لیکن اگر محض مقتدر، اعلیٰ کی خواہش ہی پر قیام معاہدہ کا دار و مدار ہے تو پھر معاشرہ سیاسی جبری پر مبنی ہوگا، اور اگر اس کی بنیاد افراد معاشرہ کی خواہش پر ہے تو ایک دور رس نقاد یہی سوال کر سکتا ہے کہ آخر افراد کوئی انجمن امن و امان کی خواہش کیوں ہوتی ہے۔ تقریباً اسی قسم کی تنقید سوئے لوک، روسو اور ڈیٹم ان سیاستوں کے نظریوں کی کی جاسکتی ہے جنھوں نے معاہدہ معاشری کے تخیل کو پیش کیا ہے۔ آخر میں صرف یہ کہنا باقی ہے کہ روسو کے نزدیک جماعتی ہدایت

پیدا ہونے کے بعد ہر ایک شخص پہلے کی طرح بالکل آزاد رہا اس نظریے میں جو منالطہ ہے وہ منالطہ ظاہر ہے۔ ہر شخص کی دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک انفرادی دوسری اجتماعی۔ اجتماعی حیثیت جمہور افراد کی انفرادی حیثیتوں کا نام نہیں بلکہ وہ ایک علیحدہ تخیل ہے جو کہ ان تمام انفرادی حیثیتوں کی کیمیائی ترکیب سے بنا ہے، چنانچہ خود روسوان و دونوں تخیلات کے امین امتیاز کر کے اجتماعی اداروں کو "نشار عامہ" اور انفرادی اداروں کے مجموعے کو "نشار انفرادی" کا لقب دیتا ہے۔

ہم نے نظریہ معاہدہ معاشری کو دو اسباب کی بنا پر اس قدر اہمیت دی ہے ایک تو یہ کہ کم و بیش پانچویں صدی ق م سے انیسویں صدی عیسوی تک مشرق و مغرب دونوں کے بعض بڑے بڑے نظریہ سازی یکے بعد دیگرے اسی نظریہ کے منالطے میں پڑے رہے، دوسرے مختلف سیاسوں نے اس کی مختلف شکلیں قائم کی ہیں؛ لہذا اس کی ضرورت پیش آئی کہ اس پر ذرا تفصیل سے بحث کی جائے۔

Divine origin theory

نظریہ مخلوق ربانی - نظریہ معاہدہ معاشری کے بعد دوسرا کم و بیش عالمگیر نظریہ مخلوق ربانی کا ہے، جس کے مطابق مملکت کی آفرینش اور قیام انسان کا کام نہیں بلکہ خدا کا کام ہے۔ اس کے متفقہ یہ بھی استدلال کرتے ہیں کہ خدا نے اپنے چند برگزیدہ مندوں کو تخت و تاج عطا کر کے ان کے سپرد معاشرہ انسانی کی تنظیم کر دی ہے، لہذا حکمرانوں کو جو حقوق حاصل ہیں ان سے انھیں محروم نہیں کیا جاسکتا۔ اس نظریہ نے مغربی ممالک پر نہایت گہرا اثر ڈالا، تا آنکہ جرمانیہ کے شہنشاہ کو شہنشاہیت کے ایک خاص معنی میں دوسرے عیسائی بادشاہوں سے مقدس و ممتاز سمجھا گیا اور انگلستان میں شاہان اسٹورٹ نے اپنی شخصی حکومت کا

دار و مدار اسی پر رکھا۔ مشرق میں بھی اس کا ایک خاص اثر پڑا، اور شاید یہی اصول ہے جس کے تحت بادشاہوں کو پُلّ اللہ کہا جالے لگا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو گواہی دیتی ہے کہ مملکت کو خدا کے پیدا کیا ہے اور اسی نے انسانوں کو منظم کر کے معاشرہ سیاسی کی بنیاد ڈالی ہے، لیکن اس سے کسی قسم کا استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ خدا نے ہر چیز بنائی ہے، ہر مادی شے اور غیر مادی شے کا مبداء وہی ہے، اس نے نہ صرف انسان ہی معاشرہ قائم کر کے کی صلاحیت پیدا کی بلکہ جانوروں میں بھی ایک قسم کی تنظیم قائم کر دی جس سے خود انسان بھی سبق لے سکتا ہے۔ یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں ملکیت یا فکر انوں کو کوئی خاص امتیاز حاصل ہے جو دوسری مخلوقات کو حاصل نہیں۔ خدا ہر چیز کا سبب اول ہے، اسی لئے جب ہم کسی خاص تخیل کے مبداء کی تحقیقات کرتے ہیں تو غور و رسانی کے اصول کو پہلے ہی سے تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور سبب اول کی تلاش کی بجائے محض سبب ثانی کی جستجو کو کافی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ یہ خیال کہ چونکہ مملکت کی تخلیق خدا نے کی ہے لہذا مزید تحقیقات نہیں کرنی چاہئے، نہ صرف بیکار ہے بلکہ شاید نقصان رساں بھی۔

پدر سری اور مادری سری اقتدار۔ نظریہ معاہدہ معاشری اور نظریہ تخلیق ربانی کے بعد جس نظریہ نے زمانہ حال کے سیاسی تخیل پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے وہ پدر سری یا مادری سری نظریہ ہے۔ ارسطو طالیس کے زمانے سے لے کر انیسویں صدی عیسوی تک شکل سے کوئی عہد ایسا گزرا ہوگا جس میں سیاسی مفکروں کی ایک جماعت نے پدر سری نظریہ کی تائید میں قلم نہ اٹھایا ہو۔ اس کے مطابق ملکیت دراصل

خاندانوں کے ایک مجموعے کا نام ہے اور جس طرح ابتدائی زمانوں میں سر خاندان میں باب کو اختیارات مطلق حاصل تھے اسی طرح مملکت میں بھی ایک شخصیت کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے۔ اس نظریہ کے پیش کرنے والے اس کے ثبوت میں مندرجہ متحرک خاندانوں کے سربراہ کاروں، نبی اسرائیل کے بطریقوں اور روہن "پدری اقتدار" کے اصول کو پیش کرتے ہیں۔ زمانہ حال میں اس نظریہ کی پیکل قائم کی گئی ہے کہ ابتدائی خاندان کا سرگروہ ایک فرد واحد ہوتا تھا جس کا حکم جملہ اہل خاندان مانتے تھے اور بعض مقامات میں اس گروہ کو اپنے دست نگر افراد پر موت و زلیست کا بھی اختیار ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ خاندان کے افراد میں توسیع ہوئی اور انھوں نے گنیم یا نسب کی صورت اختیار کر لی اور یہ خیالی لوگوں کے دلوں میں اس قدر جا گریں ہوا کہ قبیلے کے افراد اپنے آپ کو ایک ہی مورث اعلیٰ کی اولاد ظاہر کرنے لگے۔ جب قبیلوں کی تنظیم میں امتداد و زمانہ سے استعمال و قوت پیدا ہو گئی تو انھیں اپنے ہمسایہ قبائل کو مغلوب کرنے کا خیال پیدا ہوا جس کے بعد خواہ مخوبراً اور نہ اراداً، مختلف قبائل ایک ہی سلسلے میں منسلک ہو گئے اور بنا محنت و ازدواج کے تو ان میں مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ مرد و ایام سے ہم نسل ہونے کا خیال بھی زائل ہونے لگا یہاں تک کہ آخر کار مملکت پیدا ہو گئی۔

اس نظریہ کو انیسویں صدی عیسوی کی ابتدا تک ایک حد تک عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا اور اسے پہلی رنگ اس وقت کی جب لوگوں نے دنیا کا سفر کر کے دور افتادہ اقوام کے حالات کی تحقیق کرنی شروع کی۔ اس کے متقدموں کو معلوم کر کے بہت تعجب ہوا کہ دنیا میں بعض ممالک ایسے بھی ہیں جن میں ایک ایک عورت کو متحرک

مردوں سے نہ صرف نکاح کرنے کی اجازت ہے بلکہ عادتاً اور دا جا ایسا بھی کیا جاتا ہے؛ مثلاً لمباڑ کی بعض ذاتوں میں ایک عورت کئی مردوں سے شادی کر سکتی ہے جس کے باعث خاندان کی سرگروہ دی ہوئی ہے اور اسی کے واسطے سے خاندانی جائیداد کی وراثت پساندگان کو پہنچتی ہے۔ یہی کیفیت نیپال اور تبت کی بعض اقوام کی ہے جہاں اگر کوئی عورت ایک شخص کے نکاح میں ہو تو وہ اس کے تمام بھائیوں کی منکوحہ بھی جاتی ہے۔ غرض ان امکانات کے بعد دوسری نظر یہ کے حافی نہیں کہہ سکتے تھے کہ ابتدا میں ہر جگہ باپ ہی خاندان کا سرگروہ ہو گا؛ علاوہ ازیں حال ہی میں پروفیسر ٹکس نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بعض ممالک میں قدیم ترین سیاسی ادارہ خاندان نہیں، بلکہ قبیلہ ہے جو رفتہ رفتہ گھرانوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، اور انھوں نے اپنے اس خیال کا ثبوت آسٹریلیا کی اہلی اقوام اور کلت قوم کی تنظیم سے دیا ہے۔ وہ یہ کہنے ہیں کہ آسٹریلیا میں خاندان کو مطلق کوئی اہمیت حاصل نہ تھی، بلکہ ”قوم“ چند مجموعوں پر مشتمل تھی، جن میں سے ہر ایک کے لئے ایک نشان مخصوص تھا، مثلاً ایک مجموعے کے لئے سانپ کی تصویر، دوسرے کے لئے کسی پرند کی تصویر، اور مناکحت و ازدواج کے قوانین اسی تفریق پر مبنی تھے؛ مثلاً کوئی شخص اپنے ہی نشان کی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ کم و بیش وہی

لے آج بھی ٹراڈیمور کی ریاست میں اسی الٹی اصل کے مطابق لڑکی کا حقدار جہا راجہ کا بیٹا نہیں ہوتا بلکہ اسکا بھائی ہوتا ہے۔

لے جنکس: ”مملکت اور قوم“ *Jenks: The State and the Nation*

صورت حال ہے جو ہندوؤں کی بعض ذاتوں میں پائی جاتی ہے، یعنی بعض ذاتوں میں ایک ہی گوتہ کے دو افراد باہم شادی کر سکتے ہیں، بعض میں نہیں۔ اور اسکا چستان اور ایرستان میں بھی قبیلوں کو جتنی اہمیت حاصل ہے اس کا عشر عشر بھی خاندان کو حاصل نہیں ہے۔

نظریہ جبر۔ بعض یا سوں کے نزدیک مملکت کی بنا بعض جبر و قوت پر ہے۔ ابتدائیں غالباً ایسا ہی ہوا ہو گا کہ کسی دوزین عقلمند اور قوی شخص نے پہلے تو بہت سے لوگوں کو اپنے زیر اثر کیا اور پھر ان کو ساتھ لے کر قرب و حوا کے باشندوں کو اپنی اطاعت پر مجبور کیا۔ جب اس کی قوت بڑھ گئی اور اس کا اثر لوگوں کے دلوں پر مستقل طور پر قائم ہو گیا تو اس نے انھیں اپنا حکم مانتے پر مجبور کیا، یہاں تک کہ وہ ان کا متحمل فرماں روا بن گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کو مان کر کسی ملک میں آزادی اور حقوق انسانی کا نام بھی مانتی نہیں رہنا چاہئے اور جس طرح محض معاہدہ باہمی مملکت کی بنیاد قرار نہیں دیا جاسکتا اسی طرح محض جبر پر ہی اس کا مدار نہیں ہو سکتا۔ آج کل کے زمانے میں دنیا کے ملک یا تو عیسیت پسند یا ان میں ایک خاص قسم کی مطلق العنان حکومت یعنی آمریت کا رواج ہے جہاں عیسیت ہے وہاں تو ظاہر ہے کہ یہ ادعا کیا ہی نہیں جاسکتا کہ حکومت کی بنا جبر پر ہے؛ جہاں آمریت ہے وہاں آمر کا یہ قول ہے کہ اس کے حکومت کی

بوجود حسب نسب کی اہمیت کے عربوں کی تنظیم بھی خاندانوں پر نہیں بلکہ قبائلی پر مبنی ہے اور ہر قبیلہ واسطے اپنے آپ کو ایک ہی جد کی اولاد تصور کرتے ہیں۔

بنیاد جبر پر نہیں بلکہ دراصل وہ قوم کا قائم مقام ہے اور قوم اس کے کردار کی موید اور ہوتا ہے۔

حقیقی ارتقاء ملکیت۔ اس موضوع پر جتنی دلیلیں اس وقت تک پیش کی گئی ہیں وہ سب کی سب انہدامی ہیں، یعنی مختلف نظریے پیش کر کے ان میں سے تقریباً ہر ایک کا بطلان کیا گیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ واقعاً ملکیت کیسے قائم ہوئی۔ سب سے پہلے بات جو ذہن نشین ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ جلد سیاسی ادارات ایک تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ایسا تاریخی واقعہ ہم کو نہیں ملتا جس کی بنا پر ہم یہ کہہ سکیں کہ ملکیت کا شل انسانوں کے کسی مجموعے کے دماغ میں بلا پرونی اثرات کے یک بیک پیدا ہو گیا ہوگا۔ اس خیال کو مد نظر رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ گو مفصلہً بالا نظریات میں سے کوئی بھی بالکل صحیح نہیں، بہر کیف ہر ایک میں کچھ نہ کچھ حقیقت کا پہلو ضرور ہے۔ اصطلاحیں اپنی مشہور آفاق کتاب "سیاسیات" میں کہتا ہے کہ ملکیت ایک تدریجی ادارہ ہے اور انسان نظر ثانی ایک سیاسی حیوان ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے یہ معنی ہوئے کہ خالی اکبر نے نبی نوع انسان کے ہر ایک فرد کے لئے یہ لازم کر دیا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل کر اپنی زندگی گزارے، اور ساتھ ہی اس کو یہ قابلیت و رعیت کی ہے کہ باہمی تعلقات کو مرتب و منظم کرے، ساتھ ہی شاید سب سے پہلے اثرات جنھوں نے انسان کو قانون و آئین کی پابندی پر آمادہ کیا، وہ مذہبی قواعد

ہوں گے۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ مملکت کا انتظام و انصرام صرف اسی طرح ممکن ہے کہ مختلف افراد کو قانون کی پابندی پرستی سے مجبور کیا جاسکے اور خلاف ورزی کرنے والوں پر مناسب تشدد روا رکھا جائے۔ ان سب امور کے بعد بھی مملکت کا قیام اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ہر ایک فرد مملکت نہیں تو ایک عظیم نشان تعداد افراد نہ صرف اپنے دل میں بلکہ اپنے عمل کے ذریعے سے یہ ثابت نہ کرے کہ باوجود ان تمام سختیوں کے وہ مملکت کے قیام کا ہمتن خزانہ ہے۔

اس خیال کو ذرا تفصیل کے ساتھ شاید سب سے پہلے امام غزالی نے اپنی مشہور کتاب "احیاء العلوم" میں پیش کیا۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ احیاء کے چند پاروں کا ہو بہو ترجمہ کر دیا جائے تاکہ ہم اس کا اندازہ کر سکیں کہ باوجود تقریباً ایک ہزار سال کے بعد کے امام غزالی کا خیال کس درجہ جدید ہے۔ مملکت کے ارتقاء کے سلسلے میں وہ کہتے ہیں "انسان کی آفرینش کچھ اس طرح عمل میں آئی ہے کہ وہ تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا بلکہ ہمیشہ اس کا خوالہ رہتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ مل کر رہے۔ اس خواہش کے دو اسباب ہیں۔ ایک تو یہ ساتھ نبی نوع انسان کی بقا کے لئے ضروری ہے اس لئے کہ جنسی اختلاط کے بغیر اولاد کا ہونا ناممکن ہے، اور دوسرے اس کے کھانے پینے کے اور اولاد کی تعلیم و تربیت کے واسطے بھی اسے غیروں کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جنسی اختلاط سے اولاد ہوتی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی شخص اپنے بیوی بچوں کے لئے اپنے آپ کو ہمیشہ گھر میں بند نہیں رکھ سکتا، چنانچہ اپنی زندگی گزارنے کے لئے اسے بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ تعامل کرنا پڑتا ہے جو کسی تجارت یا حرفت میں لگے ہوئے

ہوں۔ پھر یہ تجار اور باہلی حرنہ بھی اپنے اپنے پیشے میں آزاد نہیں رہ سکتے، مثلاً کسی
 کاشتکار کے لئے یہ ناممکن ہے کہ بغیر آلہ جات کشتکاری کے وہ اپنا کام کر سکے اور
 آجر جات کشتکاری کے لئے بڑھئی اور لوہا ضروری ہیں، نہ وہ بغیر کھانے پینے کے
 زندہ رہ سکتا ہے جس کے واسطے اسے پسہ پار سے اور پورچی کی مدد لینی لازمی
 ہوگی۔۔۔۔۔۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان بغیر دوسروں کی مدد کے تنہا
 زندگی بسر نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔۔ ہم اس سے واقف ہیں کہ جب بہت سے شخص
 ایک جابج ہوتے ہیں تو جھگڑے لڑنے لازمی ہوتے ہیں، اور انھیں بڑھنے دیا جائے
 تو باہمی لڑائیاں اچھٹیں ایسی ہوں گی کہ ختم ہونے کا نام نہ لیں گی جس سے انسان
 ایک دوسرے کا خاتمہ کرنے کے درپے ہو جائیں گے۔۔۔۔۔۔ ان اسباب کی
 بنا پر ضرورت اس کی ہوئی کہ بعض نئے فنون اور صنائع سے کام لیا جائے، چنانچہ
 مساحت، کانوئی، باضابطہ جنگ اور اسلحہ سازی کے فنون نے نشوونما پائی تاکہ
 کی تلاش کی جائے، حقوق کی پہچان ہو سکے اور مملکت کو ان کی زد سے محفوظ رکھا
 جاسکے۔ ساتھ ہی ساتھ ثالثی حکومت کی بھی ضرورت ہوئی تاکہ جھگڑوں کو رفع کیا
 جاسکے۔۔۔۔۔۔ ان سب امور کی کارگزاری کے لئے بعض مخصوص کردار کے
 لوگوں کی ضرورت داعی ہوئی جن میں علم، عقل اور نگہ رانی کی اہلیت ہو۔ اس کے

۱۵ احیاء العلوم ۶، ۵ - نیز دیکھو رولف کا انگریزی رسالہ النظمی کے خیالات سیاسی نظریوں

اور ایل پر "El-Gharxali on the theory

and practice of Politico جدیداً اردکن ۱۹۳۶ء

بعد انا مغلزالی حکومت کے عہدوں کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ملکیت کی صحیح
انصرام کے لئے ایک بادشاہ یا امیر کی ضرورت ہے جو ہر چیز کی نگرانی رکھے اور مختلف
عہدوں پر لائق اصحاب کو مقرر کرے۔

انفرنس ملکیت کے ارتقاء کے یہ تمام عناصر مدد و معاون ہوتے ہوئے ہوں گے، غالباً
ابتداء میں یہ چند ہی افراد کے دماغ میں سیاسی حس پیدا ہوئی جو رفتہ رفتہ عالمگیر ہو گئی
لیکن جس شخص ایک خیال کی حد تک محدود تھی، اور حقیقی سیاسی دواؤں اور قوانین
کی تعلیم میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں سال صرف ہوئے۔ رفتہ رفتہ ان قوانین کے حکمت
اور سیاسی ادارات کے استحکام کے لئے عمل کی ضرورت، لاحت ہوئی اور اس طرح گویا
منظم ملکیت عہد سے وجود پا گئی۔

شاہ دیکھو گارنر "تہذیبیات" Garner: Introduction to
Political Science.

باب ۴ ملکت کی آبادی اور اس کا رقبہ

آبادی۔ ایشیائی مملکت۔ یونان۔ روم۔ جزائری انٹرات۔ اسلامی تسلیم۔ خلافت۔ زمانہ وسطی
عالمگیر سلطنت کا خاتمہ۔ موجودہ یورپ۔ مملکت کے دور۔

آبادی۔ مملکت کی تعریف کے سلسلے میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ منجانب دیگر
اجزائے لائیک کے اس کے قیام کے لئے وہ لازمی عناصر یعنی انسانوں کی کثیر تعداد
اور مستقل رقبہ لازمی بھی ہیں۔ آبادی کے لئے مختلف سیاسوں نے مختلف نظریے قائم
کئے ہیں۔ ارسطو کا پس نے چونکہ شہری مملکتوں کے ملک بینی یونان میں نشوونما پایا تھا
اس لئے اس کے دماغ میں کسی ایسی مملکت کا تخیل آ ہی نہیں سکتا تھا جس کی آبادی
چند ہزار نفوس سے زیادہ ہو، اور وہ یہ کہتا ہے کہ مملکت کی آبادی پر حکومت کو
پورے طور سے نگرانی کرنی چاہئے اور اس سے ایک خاص تعداد سے زیادہ بڑھنے
نہ دینا چاہئے۔ وہ قوم اور مملکت میں یہی فرق سمجھتا ہے کہ قوم میں تو انسانوں کی
تعداد کم و بیش غیر محدود ہوگی لیکن مملکت میں (جس سے اس کی مراد شہری مملکت ہے)
وہ نسبتاً کم اور غیر محدود ہوگی۔ روس کے نزدیک مملکت کے باشندوں کی تعداد جس قدر

سے ارسطو کا پسین با "سیاسات" ۶۲، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴

زیادہ ہو اسی مناسبت سے ہر ایک کی آزادی کا حصہ کم ہوتا ہے، اس لئے کنشاعاً جو اس کے نزدیک معتدرا علی ہے، دراصل تمام باشندوں کی خواہشات سے مرکب ہے چنانچہ اگر باشندوں کی تعداد کم ہوگی تو ہر ایک کا منشاء عامہ میں نسبتاً زیادہ حصہ ہوگا اگر تعداد زیادہ ہوگی تو کم ہوگی۔ مونسیکیو بھی غالباً اسی اصول کو مد نظر رکھ کر کہتا ہے کہ آزادی ان ہی ممالک میں زیادہ ہوتی ہے جن کی آبادی نسبتاً کم ہو، بلکہ وہ اس سے بھی ایک قدم بڑھا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ بڑے بڑے ملکوں کے لئے مطلق العنانی ہی بہترین حکومت ہے اور انفرادی آزادی ان ہی ملکوں میں زیادہ شاداب ہوتی ہے جن کا رقبہ اور آبادی کم ہو۔

(پانچویں باب) Plato: Republic (۴۲۳ ج ۲) میں کہتا ہے کہ ملکت کی آبادی کم بیش ۵۰۰۰ ہونی چاہئے، اس سے کم آبادی ہوگی تو ملکت اپنے پاؤں پکڑی نہیں ہو سکتی، اور اس سے بہت بڑی ہوگی اور انتظام شکل پر جائیگا۔ ارسطو طالس اس تعداد کو بھی (جو ۵۰۰۰ کے نزدیک تھوڑی بہت بڑا تصور کرتا ہے) اور کہتا ہے کہ علاوہ غلاموں اور تاجروں کے جو شہر میں شامل نہیں تصور کئے جاتے تھے، ہر شہری کو ہر دوسرے شہری سے واقف ہونا ضروری ہے، دیکھو چانس "جب فلسفی بادشاہ ہوں" Chance: When philo-
sophers are kings ۱۹۵۰

Rousseau: Le Contrat Social. "معاہدہ معاشری"

Montesquieu: L'Esprit des lois "روح قوانین"

ایشیائی مملکت - یہ ظاہر ہے کہ انتظام و انصرام میں جس قدر بہت چھوٹے ملکوں میں ہوتی ہے وہ ان ملک میں شکل ہے جن کا رقبہ یا آبادی نسبتاً کثیر ہو۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ جہاں پر اعظم ایشیا کے قدرتی حصوں کا رقبہ نہایت وسیع ہے اور نظرت نے اس میں قسم قسم کی آب و ہوا، وسائل اور انسانی کی اکثریتیں پیدا کی ہیں، وہاں پر پ میں زندگی کی کشمکش ایشیا سے نسبتاً زیادہ ہے، اور پہاڑوں اور دریاؤں کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے رقبوں کی بھی مستقل حد بندی ہو گئی ہے۔ ایشیا کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی بڑی سلطنتوں کے حالات سے یہاں کے ہر حصے کے دقائع بھرے پڑے ہیں اور گو آریہ اور سانی اقوام دونوں میں مقامی ادارات کو کم و بیش خود مختاری حاصل ہوتی ہے، خواہ وہ گاؤں کی شکل میں ہوں یا قبیلے کی شکل میں، لیکن ملکت کا عام رجحان وسعت کی طرف ہے آج سے ڈھائی ہزار سال پیشہ خود ہندوستانیوں نے سلسلہ ساز دہجھاؤم یا "اتحاد قومی" کی بنیاد رکھ کر گویا اس امتیاز کو مٹانے کی کوشش کی تھی جو ارسطاطالیس کے نزدیک ملکت اور قوم میں پایا جاتا ہے اور اس بظاہر شہنشاہیت پسند سلسلے کے پرے میں ہندوستان کے ہر حوصلہ مند حکمران کا یہ فرض سمجھا گیا تھا کہ وہ ہمالیہ پر بہت سے لاکھوں لاکھوں تک تمام ملک کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کر دے۔ ہندوستان سے پہلے متعدد حکمرانوں نے، جن میں اشوک اعظم، سمرگپت، علاؤ الدین خلجی، محمد تغلق اور

لکھ اس بحث کے لئے دیکھو مادھا کمال کر جی کی قابل قدر تصنیف "شرقی عزمین" Radha

Kamal Mukerjee: Democracies of the East.

اورنگ زیب عالمگیر کے نام متنازع ترین ہیں۔ علاوہ ایک نہایت مختصر حصہ ملک کے باقی جملہ اطراف و اکناف ہند کو اپنی سلطنت کے فیروزہ میں منسلک کر کے اپنے آپ کو ”سارو بھوم“، چکر درتن“ یا شاہ جہاں کا مصداق بنا دیا یہی کیفیت دیگر ممالک ایشیائی بھی ہے، اور یہیں یہاں اور تیسرے بہمن اور دار پوتش، چنگیز اور لاگو حضرت عمرؓ اور مارون الرشید، سلیمان اعظم اور حضرت علیؓ پاشا کی وسیع فطرت کے قصے دہرانے کی حاجت نہیں۔

یونان۔ جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے، کم از کم وسطی، مغربی اور جنوبی یورپ میں عظیم الشان سلطنتوں کی گنجائش نہیں ہے، اور فطرت نے براعظم کا چھٹہ چھوٹی چھوٹی ملکوں کے آغاز اور نشوونما کے لئے گویا کہ وقف کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیار یورپ کا سیاسی تخیل ابتدا میں محض شہری ملکت ہی تک محدود تھا، جس کا رقبہ نہایت مختصر یعنی چند مربع میل سے زیادہ نہ ہوتا تھا، اور جو کلیہ خود مختار ہوتی تھی۔ اس سیاسی تخیل کا سب سے ممتاز مظاہرہ ارض یونان میں ہوا جہاں آغاز تاریخ ہی سے سینوں چھوٹے چھوٹے آزاد شہر نظر آتے ہیں، اور گولہ مضمرہ یا اسپارٹا، ہیریتہ یا اکانہہ، قرب و جوار کے بلدیات پرست اور پالیتے ہیں لیکن یہ قابو دیر پا نہیں ہوتا اور اپنے زوال تک یونان شہری ملکوں کا جلال نگاہ بن رہتا ہے۔

روما۔ سلطنت روما کے قیام سے ایک جدید تخیل کی ابتداء ہوئی، وہ یہ کہ جس قدر بھی ملک حاصل کیا جائے خواہ وہ یورپ میں ہو خواہ ایشیاس، وہ سب ایک بلدی نظام کے تحت ہو۔ تخیل ترقی کرتے کرتے ایک عالمگیر سلطنت کی شکل میں

ظاہر ہوا، جس کا اصول یہ تھا کہ عیسوی یعنی یورپی دنیا میں جتنی بھی سلطنتیں ہیں وہ سب کی سب شہنشاہ کی ماتحت ہیں۔ گو یا کوشش یہ کی گئی کہ جس طرح ایشیائی بڑی بڑی سلطنتیں قائم تھیں اسی طرح یورپ کی بھی شیرازہ بندی ہو جائے لیکن یورپ میں مرکز گیر اثرات اس قدر قوی تھے کہ ابتدا سے اس سلطنت کی مخالفت ہونے لگی، اور آخر کار اس کی کیفیت ایک نہایت مکرر ردی ڈھالی عہدیت سے زیادہ نہیں رہی۔

جغرافیائی اثرات۔ ملکوں کی حد بندی اور ان کے مستقبل پر جغرافیہ کا ایک عظیم الشان اثر پڑتا ہے۔ علامہ ابن خلدون سے لے کر مونٹسکیو اور ہیکل تک ایک بہت سے ریاستوں نے اس بحث پر قلم اٹھایا ہے کہ آب و ہوا، کیفیت ارضی اور سامان خورد و نوش کے اثرات کسی حد تک مختلف اقوام کی ترقی یا تزلزل کا باعث ہوتے ہیں، اور ان سب نے نہایت تفصیل سے اس کے متعلق چند حسیں کیا تھیں اصول بدین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ مختلف انسانوں کے طبائع اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ بعض مرتبہ ایک ہی دانہ کا دو اشخاص پر بالکل جدا جدا اثر پڑتا ہے، اس لئے کسی خاص اصول کی تدوین کم و بیش ناممکنات سے ہے۔ لیکن جغرافیائی اثرات کو نظر انداز کرنا بھی بہت بڑی غلطی ہوگی۔ جیسا ایڈمنڈ ہیکل نے

۵۴ مقدمات تاریخ ابن خلدون، مقدمات ۴ و ۵

۵۵ مونٹسکیو، روح قوانین، حصہ جات ۱۶ و ۱۷

۵۶ ہیکل، تاریخ تمدن، Buckle: History of Civilization

اپنی ایک تقریر میں کہا تھا، اس ناصیلے کو جو انگلستان اور اُس کی امریکی نوآبادیوں کے مابین واضح ہے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور یہ امر ناگزیر ہے کہ اوقیانوس جیسے وسیع سمندر کے حائل ہونے کے باعث موزالذکر کی حکومت میں کمزوری پیدا ہو جائے۔ تاریخ انگلستان یا تاریخ جاپان کے واقعات اُس وقت تک پوری طور پر سمجھ میں نہیں آسکتے جب تک مطالعہ کرنے والا یہ بدی اثر پیش نظر نہ رکھے کہ برطانیہ عظمیٰ اور جاپان دو جزیرے ہیں اور ان کی سرحد کسی دوسرے ملک کی سرحد سے نہیں ملتی۔ اسی طرح افغانستان اور سوویتان اپنے اپنے ملک کے پہاڑوں کا منہ ہونا چاہئے، کیونکہ یہی وہ عنصر تھا جس کے باعث عظیم الشان سلطنتوں کے قرب و جوار کے وہ اب تک آزاد ہیں۔ علاوہ ازیں ایشیا اور یورپ کے اکثر ممالک کے حدود قائم کرنے میں اونچے اونچے پہاڑوں، بڑے بڑے دریاؤں اور وسیع صحرائوں کا ضرور لحاظ رکھا جاتا ہے۔ لیکن واضح ہو کہ یہ حکم امریکہ اور آسٹریلیا کی اندرونی حدود پر نہیں لگایا جاسکتا، اس لئے کہ ان دونوں براعظموں میں بین الاقوامی یا بین ریاستی سرحد کی شکل بعض درجہ ایک خط مستقیم جیسی ہے جو کسی عرض البلد یا طول پر ہو کر گزرتی ہے اور جس میں پہاڑوں، دریاؤں، شہروں اور قریوں کے مواقع کو نظر بہا نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

۱۷۷۵ء ایڈمنڈ برگ کی وہ تقریر جس نے امریکی نوآبادیوں سے مغاہمت کے اصول پر راجح کر برطانوی ایلان عام میں کی۔

۱۷۷۵ء کناڈا اور ممالک متحدہ امریکہ کے درمیانی سرحد اقصائے مغرب سے (بقیہ صفحہ ۵۷ء)

اسلامی تعلیم۔ یہاں ایک خاص امر کی طرف توجہ مبذول کرنی ضروری ہے۔ تعلیم اسلام کے بعد دنیا میں ایک بالکل جدید خیال کی ابتدا ہوئی، یعنی اسلام کا نام لیا خواہ کسی ملک کا رہنے والا ہو، کوئی زبان بولتا ہو، کسی نسل سے ہو، رنگ روپ کوئی ہو وہ مرکز اسلام سے وابستہ ہے۔ ویسے تو تقریباً ہر مذہب عالمگیر بھائی چالنے کے اصول پر مبنی ہوتا ہے لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کو اپنے علم سے پورا کر دکھایا۔ وہ ایسے فرد فرید تھے۔

جنہیں دور و نزدیک سب گرامی برابر تھے کئی و ذنگی دستانہ
نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ ان کے

خلیفہ تھے امت کے ایسے نگہبان ہو گئے کا جیسے نگہبان چوپاں

سچتھے تھے ذمی و مسلم کو یکساں نہ تھا عہد و عریں تفاوت نمایاں

کس نیر اور بانو تھیں آپس میں ایسی

زبانے میں مال جانی نہیں ہوں جیسی

(بقیہ صفحہ ۵۸) ایک آف دی وڈو تک بارہ سو کل خط تقیم کے طرح عرض البلد اہ پر واقع ہے اور پہاڑوں، دریاؤں، شہروں، گاؤں اور بعض مرتبہ مکانات تک کو کاٹتی ہوئی چلی جاتی ہے یہ بین الاقوامی امن و امان کے اسکان کا ایک زبردست مظاہرہ ہے کہ باوجود اس خط کے غیر محفوظ ہونے کے ان دو ملک کے درمیان سلامتی سے کوئی جنگ نہیں ہوئی۔

شلہ مدین مدو جزا اسلام مصنف مولانا سالتی مرحوم حصہ موسومہ "دعا"

الضیاء حصہ موسومہ "خلافت راشدہ"

شلہ

گو یا اسلام نے مسلمانوں کو ایک طرف تو حُبِّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِيْمَانِ کا سبق پڑھایا اور دوسری جانب انھیں یہ سکھایا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اَخْرُكُ یعنی تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ خود بہتر اسلام علیہ التختہ و السلام نے اپنے جاں نثاروں سے اس کا عملی ثبوت یہ دلایا کہ جب مکہ کے مہاجر آپ کی بیادت میں مدینہ پہنچے تو مدینہ والوں کو یہ اصول بتایا گیا کہ ان میں اور مہاجروں میں کوئی نسلی رشتہ نہیں، لیکن اسلامی بھائی چارے کی بنا پر دونوں ایک برادری کے افراد ہیں۔

خلافت۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مسلمانوں نے نہ صرف عرب کے قرب و جوار کے ملک پر قبضہ کر لیا تھا، بلکہ مصر، شام، ایران اور عراق تک ملکات اسلامیہ میں شامل ہو گئے تھے، اور خلفاء بنی امیہ کے ابتدائی عہدید دیکھا سندھ سے کوہِ برانس تک دنیا کے جملہ ملک اسلامی قائلوں کے پیرو اور بیت المال کے باجگذاہن بن گئے تھے۔ جب تک انتظام میں مرکز بیت قائم رہی اس وقت تک عربستان اور اسلامی بھائی چارے کے دونوں اصولوں کی یہ یک وقت انطباق کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، اس لئے کہ اسلام نے لوگوں کی عادت و خصلاات، طرز معاشرت اور عام ذہنیت میں اس قدر فرق پیدا کر دیا تھا کہ وہ نہ صرف اپنی وطنیت کو بھول

تھ حضرت محمدؐ جب ہجرت کر کے یثرب (یعنی مدینہ منورہ) تشریف لے گئے تو وہاں مہاجرین کی مسلمانوں کے مسائل کا یہ انتظام کیا کہ ایک ایک مہاجر کو انصار (یعنی مدنی مسلمانوں) میں سے ایک ایک کا گویا بھائی بنا دیا تاکہ کفالت بھی ہو اور غیر ضروری تکلیف بھی نہ ہو۔ اسے اصطلاح میں ”مروءات“ یعنی بھائی چارہ کہتے ہیں۔

گئے تھے، بلکہ بعض اقوام کی تو زبان تک بدل گئی تھی۔ یہ واقعہ بنیائیت عجیب و غریب ہے کہ قرنِ اول کے بعد جس تمدن کا نشوونما ہوا اس میں عربی اور عربی دونوں عناصر موجود تھے، چنانچہ اس عہدِ زریں میں جتنے بڑے بڑے امام، فقیہ، مدبر اور وزرا گزریے ہیں ان میں سے اکثر نسلاً نجفی تھے، مگر اخوتِ اسلامی کی لطیفی میں اس قدر مضبوطی کے ساتھ منسلک تھے کہ ان کے واسطے اس سے علیحدگی قطعاً ناممکن تھی، حقیقت یہ ہے کہ اس عالمگیر ملکیت کی بنا متزلزل ہونے اور جگہ جگہ مسلمان حکمرانوں کے اپنی اپنی سلطنتیں قائم کر لینے کے بعد بھی عرصہ دراز تک ہر ایک مسلمان فرمانروا خلیفہ وقت کا ادب و احترام کرتا تھا، اور کم از کم مذہبی معاملات میں مرکزِ خلافت ہی کی طرف منجھتا ہی اٹھتا نہیں۔

یہی وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر ۱۹۲۴ء کے خاتمہ خلافت تک ہر مسلمان خواہ وہ ہندو ہو یا مصری، ایرانی ہو یا عجمی، خلفائے آل عثمان کے مساقہ اپنا ایک خاص رشتہ تصور کرتا، گویا سیاسی حیثیت سے اس سے ترکوں کے ساتھ کوئی لگاؤ نہ تھا۔ بلاشبہ نام نہاد خلفاء صدیوں سے عیش و عشرت میں مشغول، اپنے ذاتی مفاد کی خاطر نظم و نسق کے لئے تیار طرز عمل میں متبدل اور اصولِ اسلامی سے بہت دور جا پڑے تھے، تاہم اس لفظ ”خلیفہ“ کے ساتھ قرنِ اول کی اتنی روایات وابستہ تھیں کہ ہر مسلمان پراس کا ایک خاص اثر تھا۔ یہی وہ محفل ہے جسے یورپی قوتیں ”ہمہ اسلامیہ“ کا لقب دیتی ہیں۔ اس کی وجہ سے پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہندوستان و دیگر بلادِ اسلامیہ میں تحریک ”خلافت“ کی ابتدا ہوئی جس کا مقصد حق یہ تھا کہ مرکزِ خلافت کو انگریزوں کی دست برد سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے۔

زمانہِ وسطیٰ۔ بخیر اسی قسم کی کیفیتِ یرب میں زمانہِ وسطیٰ میں بھی پانی جاتا

ہے۔ یوں تو اپنے عروج کے زمانے میں سلطنت روما حدود ایران سے لے کر بحر اوقیانوس تک اور رھائن اور ڈینیوب سے نیل تک پھیلی ہوئی تھی، لیکن اول تو اس ابتدائی عہد میں کوئی ایسی ملکت نہ تھی جو اس کا مقابلہ کر سکتے، دوسرے ہلدیہ روما سے بالآخر اس عظیم الشان سلطنت کا انتظام نہ ہو سکا! چنانچہ پہلی صدی عیسوی ہی میں اس کے دو حصے کر دیے گئے، ایک وہ جو روما کی محض سینات کے زیر انتظام رہا اور دوسرا وہ جو قیصر کی ماتحتی میں آ گیا۔ آٹھ سو برس تک عیسوی دنیا برابر اپنے جوئے بدلتی رہی، یہاں تک کہ ۲۵۴ء میں شہنشاہ کو روما میں چارلس اعظم کی تاج پوشی عمل میں آئی اور اس طرح اس عالمگیر ”مقدس سلطنت روما“ کی ابتدا کی گئی جو مختلف صورتوں اور پیمانوں میں صدیوں تک قائم رہی۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس جدید سلطنت کے ساتھ قدیم روما کی بعض روایات ضرور وابستہ ہوں گی، لیکن یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ جب شہنشاہ میں اس جدید عیسوی سلطنت کی تنظیم کی گئی تو اسی زمانے میں خلفائے نبی عباس کے زیر سیادت اسلامی عالمگیر سلطنت دن و دن رات چو گئی ترقی کر رہی تھی۔ اگرچہ خداوند کے حکم کی تنظیم کا عیسوی دنیا پر اثر نہیں پڑا، لہذا یہ ایک ایسا عجیب و غریب تاریخی توار ہے جس کی نظیر فی ناممکن ہے۔ تیرھویں صدی میں جب عیسوی سلطنت کا زوال ہو چکا تھا اور جب یورپ میں اس کے علاوہ مسلمانوں کی اندکسی حکومتیں

۱۲۰ دیکھو براؤن: ”مقدس سلطنت روما“ Bryce: The Holy

Roman Empire. باب ۴۔

اور لیوں، فرانس، انگلستان، ہنگری اور پستان کی عیسوی سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں۔ اُس وقت بھی دانٹے الی گلی ایری اسی عالمگیر سلطنت کا راگ گاتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان کا مقصد اعلیٰ یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی ان دامن سے گزاردے اور اعلیٰ اور جتنے جھگڑے پیدا ہوں وہ سب نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ طے پا جائیں، اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب ایک عالمگیر حکمران برسرِ اقتدار ہو اور اطراف و اکناف عالم کے فرمانرواؤں کے درمیان جو تنازعات ہوں ان کا وہ فیصلہ کر سکے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مختلف اقوام کے مخصوص قوانین میں باہمی اختلاف ہو گا، لیکن عالمگیر ملکت کا بادشاہ ان تمام قوانین کو باہم منسلک کر سکے گا اور حتیٰ الوسع ان کے باہمی تضاد کو دور کر سکے گا۔ الغرض دانٹے کے نزدیک بہترین طرزِ حکومت وہی ہے جو تمام دنیا پر حاوی ہو۔

عالمگیر سلطنت کا خاتمہ۔ خواہ خلافت نبی امیہ و خلافت نبی عباس

کا اثر یورپ پر پڑا ہو یا نہیں، اس میں شبہ نہیں کہ دونوں کا نشوونما، دونوں کا عروج اور دونوں کا زوال تقریباً ایک ہی طرح ہوا اور جیسے نبی امیہ کی مسند نشینی سے تین سو برس کے اندر جگہ جگہ نئی سلطنتیں قائم ہو گئیں اور دسویں صدی عیسوی میں طولونیوں

ملکہ دانٹے الی گلی ایری: "ملوکیت" Dante Alighieri :

De Monarchia باب یہ اقتبارات ڈیٹنگ کی کتاب "نظریات سیاسی اہم تقدیم

دعوتِ برپا" Dunning: Political Theories, Ancient and Medieval

باب و فصل ۴۴ و ۴۵ ترجمہ شائع کر وہ جامعہ عثمانیہ سے لے گئے ہیں

فاطمیوں، سہانویں، غزنویوں اور سلجوقیوں نے جگہ جگہ خود مختار حکومتیں قائم کر لیں۔ بالکل ویسے ہی بارہویں اور تیرہویں صدی میں بلکہ اس سے بھی پہلے یورپ میں عالمگیر سلطنت کا تخیل ہی تخیل باقی رہ گیا اور فرانس، برائٹن برگ، سوئیڈن، برعوبیہ، روسیہ اور ایسی بہت سی کم و بیش آزاد سلطنتیں قائم ہو گئیں، یہاں تک کہ جس طرح ہلاکو نے خلافت کا جس کی اس وقت محض خیال سے زیادہ وقعت نہ رہی تھی، ۱۲۵۸ء میں خاتمہ کیا اسی طرح ۱۴۹۲ء میں صلیب نامہ ویسٹ فالتیا پر دستخط کرنے والی سلطنتوں نے، جن میں خود نام نہاد "مقدس سلطنت روما" بھی شامل تھی، یہ اعلان کر دیا گیا کہ عالمگیر عیسوی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا ہے اور اس کے حکمرانوں پر ایک ایسے نظام کی بنیاد رکھ دی گئی ہے جس میں ہر ملک بجائے خود ایک سلطنت یا مملکت کا رتبہ رکھے گا۔

موجودہ یورپ۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ کوشش کی گئی کہ مختلف ممالک یورپ کے حدود ہی ہوں جو یہاں کی مختلف نسلوں اور مختلف زبانیں بولنے والی قوموں کے ہیں۔ لیکن وسطی یورپ میں اس اصول کے انطباق میں بہت سی قبائلی پیش آئیں۔ ایک طرف تو ترکی سرحد سے لے کر ہیوریا تک اور کینیسی سے سے ویسٹ تک تمام علاقہ شہنشاہ آسٹریا کے ماتحت تھا جس میں روسانی، مجار،

۱۵ صلیب نامہ ویسٹ فالتیا کا وہ فقرہ جس کا یہاں مطلب بیان کیا گیا ہے، تھامس ویکسٹ ڈاکٹر
لیکاک کی کتاب "مبادی سیاسیات" Deacons: Elements
of Political Science.

جرمن، اطالوی، ہنگری، سلوفاک، پولستانی، سربیا، کروٹی، کازخانی اور بہت سی مختلف نسل اقوام آباد تھیں، اور جنوب میں ایک بڑا علاقہ ترکوں کے ماتحت تھا جس میں اسلامی عنصر غالب تھا۔ ۱۸۷۶ء، ۱۸۷۷ء اور ۱۸۷۸ء کے جنگوں کے بعد یورپ کے اسلامی نہ صرف بالکل آزاد ہو گئے بلکہ بعض جگہ مثلاً چیخو سلوفاکیا میں تو غیر اسلامی آبادی پر بھی تسلط ہو گئے، اور آج بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جنگ عظیم کے بعد یورپ میں جو پرانی سلطنتیں باقی ہیں یا نئی حکومتیں قائم ہوئی ہیں ان میں ہمیشہ ہم زبان، ہم مذہب یا ہم نسل قوموں کو ایک ہی ملکت کے ماتحت رکھا گیا ہے۔ مگر دراقوام پر تسلط یا غیر ملکیوں پر قبضہ آج بھی اتنا ہی قابل ستائش سمجھا جاتا ہے جتنا ۱۸۷۶ء سے پیشتر جنوبی ٹیرویل کا اٹلی میں الحاق، آسٹریا اور شہرہ انگلٹ کی جرمنی سے جبراً علیحدگی، ٹیمیسوار پر رومانیوی تسلط، زنجیرہ کارپے تھین کے جرمانیوں کا چیخو سلوواکیا میں شمول، ایک بہت بڑی ترکی آبادی کا حسب سابق روس، رومین اور بلغاریہ کے ماتحت رہنا، یہ اور بہت سی دوسری مثالیں ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپی ذہنیت میں زیادہ فرق پیدا نہیں ہوا۔

۱۸۷۶ء اگر زندہ اجسام سیاسی کی قطعہ دید کی بابت معلومات حاصل کرنے ہوں تو کتاب "خفیہ عہد نامے" نولڈ سیمور کوکس *Seymour Coxe: The Secret Treaties* کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ نیز حال ہی میں منچوریا پر جاپان کے اور حبشہ پر اٹلی کے قبضے سے نیز بحیرہ روم کے مشرقی و مغربی حصہ پر اٹلی کی ریشہ دوانیوں سے ظاہر ہو گیا ہے کہ اچھی دنیا آزادی کے اصول سے کس قدر دور ہے۔ ۱۹۱۴ء میں "شہر" رہنمائے جرمنی کے (لقبہ صلیبیہ)

مملکت کے حدود مفصلہ بالا حالات سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ مملکت کا تحصیل اتنا دو زمانہ سے برابر تبدیل ہوتا رہا ہے، اور قبائلی تعلقات، مذہبی روابط یا جزائی کیفیات اور جنگی فتوحات کے ذریعے سے مملکتوں کی شیرازہ بندی ہوتی آئی ہے۔ بلاشبہ کسی انسانی اروے کے متعلق کوئی قطعی حکم لگانا ناممکن ہے اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مملکت کے حدود آخر کیا ہونے چاہئیں؟ تاہم خواہ رشتہ آؤں کوئی بھی کیفیت ہو، اس میں شبہ نہیں کہ زور دار اور دیر پا مملکت کے لئے یہ بدرجہا بہتر ہے کہ جس قدر ممکن ہو اس میں ہم جس کیفیات زیادہ ہوں، اور اگر مملکت میں مختلف اجنس قوتیں ہوں تو پھر ان کے لئے باہمی تعاون و تعامل کی خواہش بالکل لازم و ملزوم ہے، ورنہ اس کے بغیر مملکت ایک دن کے لئے بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان حصہ جات دنیا کا میلان، جہاں آزادی و خود مختاری کا احساس غالب ہے، ہم زبان ہم نسل مملکتوں کی طرف زیادہ ہے، اس لئے کہ ان ہی دو کیفیات سے برکاری کی امید بندھ سکتی ہے۔ اگر ان کا بھی فقدان ہو اور ساتھ ہی لوگوں میں باہمی اتفاق کی کیفیت بھی حد سے بڑھ گئی ہو یعنی تعامل کی خواہش جاتی رہی ہو یا پیدا ہی نہ ہوئی ہو تو مملکت کا خیال محال سے زیادہ وقت نہیں رکھتا۔

واقعہ مذکور (آسٹریا اور جینوینا) کے جرمن حصے کو فتح کر لینے سے وٹلی پروپ کے ایک بڑے حصے کا کم از کم نسلی مسئلہ تو طے ہو گیا۔

باب ۵ خواہشِ تعالٰی

خواہشِ تعالٰی کی ہمیت۔ نسل۔ زبان۔ مذہب۔ جذبہ تعالٰی
خواہشِ تعالٰی کی اہمیت۔ اس سے قبل مملکت کے لازمی اجزاء کے
سلسلے میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اہم ترین محرکین مملکت میں سے باشندوں کی خواہشِ تعالٰی
بھی ہے۔ یہ عنصر اس درجہ اہم ہے کہ اگر باقی تمام لوازمات مملکت موجود بھی ہوں اور
افراد آبادی میں باہمی تعالٰی کا جذبہ نہ ہو تو مملکت قائم نہیں ہو سکتی۔ خواہشِ تعالٰی کے
یعنی نہیں کہ باشندوں کے درمیان کسی قسم کا اختلاف رائے نہ ہو، اس لئے کہ یہ ممکن
ہے کہ لاکھوں، کروڑوں باشندے ہر معاملے پر مکمل اتفاق رائے رکھتے ہوں، بلکہ
اس سے صرف یہ مراد ہے کہ مملکت کے قیام و استحکام کا سوال پیدا ہو تو پھر ہر فرد
خواہ اس کی کوئی بھی رائے کہوں نہ ہو، ایک دوسرے کا ہیزاں ہو جائے گا اور اس
کی بقا اور آزادی پر اپنے آپ کو قربان کر لئے سکے لئے تیار ہو جائے گا۔ ہم دیکھتے
ہیں کہ دنیا میں ایسے ممالک موجود ہیں جہاں خدا کا دیا ہوا سب کچھ ہے، لیکن چونکہ
ان کے باشندوں کا سطحِ نظر ایک نہیں، اس لئے مملکت بے بساطِ عالم میں ان کے لئے کوئی
جگہ نہیں! اس کے برعکس ایسے ملک ہیں جن کے رہنے والے جہاں بظاہر مختلف نہیں آباد

ہیں، مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں، مختلف مذاہب مانجے ہیں، لیکن جو کمال سب
بائوں کے باوجود باشندوں میں ایک دوسرے کے ساتھ سیاسی تعالٰی کا جذبہ موجود
ہے اس وجہ سے وہ ملک کی شکل میں ترقی کے راستے پر گامزن ہیں۔

نسل۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون کون سی خصوصیات ہیں جن سے
یہ خواہش تعالٰی پیدا ہوتی ہے۔ ان میں سب سے پہلے تو نسل کو لیجئے مثلاً مشہور
ہے کہ خون کے جوش کے آگے کچھ نہیں رہتا، یعنی جب خون ایک ہوگا تو انصاف
و اتحاد کا امکان قوی ہو جائے گا۔ ہادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ایک
قبیلہ والے متحد ہو کر ایک جگہ رہتے ہیں اسی طرح اگر نسل ایک ہو تو گمان غالب
ہے کہ لوگ متحد ہو کر سیاسی معاشرہ یعنی ملک قائم کریں گے۔ یوں تو انقلابِ فرانس
سے نسل، قوم اور ملک تقریباً ہم سی کیفیات شمار کی جاتی ہیں، لیکن حال کے
زمانے میں جب سے جرمنی میں نازی فزق برسرِ اقتدار ہوا ہے، اس تخیل میں بہت
زیادہ قوت پیدا ہو گئی ہے اور ہمارے کان جیٹنی اور اس کے آم ٹھنکری نسلیت
اور آبائیت کی آوازوں سے سن ہوئے جاتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ٹھنڈے دل سے

مثلاً دیکھو "نسل" "ذہنیت اور روح" L. G. Trala: Race, mind
and soul اسی اصل پر انجمن "محبانِ یورپ" Friends of Europe
نے حال ہی میں ایک چھوٹا سا کتابچہ "نسلیت" Racism کے نام سے شائع
کیا ہے جس میں ٹیڈ کی کتاب "میری جدوجہد" Hitler: Mein Kampf کے وہ
اقتباسات درج ہیں جن پر نازیہ حال کی جرمن "آریہ" نسلیت کا دار و مدار ہے۔

دیکھیں تو یہ سب ایک بہت بڑا ڈھکوسلا ہے، اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان ملکوں میں بھی، جہاں کے باشندے غیروں کے ساتھ شادی بیاہ کرنے سے احتراز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، وہاں کے خون میں بھی میل نہیں ہے۔ کونسا ایسا ملک ہے جس پر کبھی نہ کبھی باہر والوں کا حملہ نہ ہوا ہو اور جہاں کی عورتوں کے ساتھ ان حملہ آوروں نے جنسی تعلقات پیدا نہ کئے ہوں؟ انگلستان، واسے کیلیٹوں، بھارتیوں، (فرمنیوں) آسٹریلیوں اور جرمنوں کی اولاد ہیں، تو جرمن فرانکوں، اسلاویوں، شتالیوں اور جنوہیوں سے پیدا ہیں۔ ہندوستان کے باشندوں کو نسلیاتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں ایک طرف ایرانی اور یونانی خون ہے تو دوسری جانب منگول اور رٹھوڑی آثار پائے جاتے ہیں۔ ہندی ملالوں میں سے شاید کسی کو اس سے زیادہ اپنی بے میل "شرافت" پر فخر نہ ہوگا جتنا یہاں کے بھگوانوں کو، لیکن کونسی ایسی قوم ہے جس نے ہندوستان پر شمال و مغرب سے حملہ کیا ہو اور اقلیتیں ان میں اپنے اثرات نہ چھوڑے ہوں؟ بعض ایسے ممالک بھی نظر آتے ہیں جو ایک دوسرے کے ایک حد تک ہم نسل ہیں لیکن جن میں سے ہر ایک کو سیاسی تفرد حاصل ہے۔ ایسی مثالیں سوئیڈن اور نوروے، جرمنی اور آسٹریا، چلی اور پیرو اور بہت سے دوسرے ممالک میں ملے گی۔ الغرض ایک طرف تو کسی رشتے کے باشندوں کا کلیہ ہم نسل ہونا ہی دشوار ہے، اور دوسری جانب محض ہم نسل ہونے سے کوئی حجب و حجاب لازماً متحدہ وطن نہیں ہوتا، نہ اس کی وجہ سے بغیر دوسرے عناصر کے وجود کے مملکت ہی قائم ہوتی ہے۔

زبان - دوسرا عنصر جو ان لوگوں کے اتحاد و اتفاق میں مدد دیتا ہے، زبان

ہے۔ یہ مسئلہ نہایت اہم ہے اور حال کے زبان میں ہندوستان میں اس مسئلے نے صحیح طور پر ایک خاص اہمیت حاصل کر لی ہے۔ زبان وہ عنصر ہے جس کی مدد سے ایک انسان دوسرے کے سامنے اپنا مطلب آسانی سے ادا کر سکتا ہے۔ اگر ہم تاریخ عالم پر نظر ڈالیں تو ایک تمدن کے ایک وسیع رقبے میں پھیلنے میں کسی ایک عنصر نے شکل سے اتنی مدد دی ہوگی جتنی زبان نے، اور اس کے زور سے بڑے بڑے ممالک کو سرنگوں ہونا پڑا ہے۔ مثلاً دو زبانوں یعنی عربی، اور فرانسیسی کو لیجئے۔ عربی ایک خانہ بدوش قوم سے نکلی، لیکن ایسی قوم سے جو اپنی زبان پر فخر کرتی تھی کہ جو اسے نہ بول سکتا تھا اسے ”عجمی“ یعنی گونگا کہتی تھی۔ اپنے دلس سے نکل کر اس نے اپنا سکہ جانا شہر و مع کیا، عراق اور شام، مصر، الجزائر اور مراکش تک اس قدر رفرغ ہوئی کہ عراقیوں، شامیوں، قبطیوں، بربروں اور مغربیوں کو بالکل عرابیادیا، یہاں تک ان قوموں اور اصل عربوں میں شکل سے کوئی امتیاز باقی رہا۔ مشرق کی سرزمین میں ایران، مادر اللہ اور وسطی ایشیا میں جہاں ایک عظیم الشان ایرانی تمدن پہلے سے موجود تھا۔ عربی اصل زبانوں کو شکست دے گئی لیکن وہاں کی علمی زبان بن گئی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں عربی زبان کی بہت سی تصانیف عجیبوں سے ملتی ہیں۔

فرانسیسی زبان عجمی نام سے اس پر پیر کے تمدنی اتحاد کا ایک بڑا ذریعہ بن چکی ہے۔ شاید ان خدوین میں فرانسیسی کے زبردست دشمنوں میں سے ایک۔ فرانسیسی عظیم الشان پریشا تھا، لیکن آج بھی اس کے محل وقوع پولس درام جازاں کے محل کا نام فرانسیسی پارک کے محل کے معنی ”پارک“ کے ہیں۔ محل میں داخل ہوا

ایک پوری سمت فرانسیسی فلسفی اور انقلاب فرانس کے پیشرو دلتیر کے لئے وقف نظر آئیگی، آگے بڑھو اور فریڈرک کے کتب خانے کی کوئی الماری کھولو تو اکثر کتاب فرانسیسی زبان میں چھپی نظر آئیں گی۔ انھیں فرانسیسی زبان فرانسیسی تمدن کو نہ صرف یورپ میں بلکہ ایران و ترکی کے ممالک میں بھی پھیلانے میں مدد ہوئی اور رفتہ رفتہ واحد بین الاقوامی زبان بن گئی۔ خود فرانس میں ایک نوع کی عصبیت کی وجہ سے یہ ملک جواز منہ سٹی اس میں بیسیوں جاگیروں میں منقسم تھا، اس میں ایک اعلیٰ درجہ کی مرکزیت پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے وہ نسبتاً آسانی سے یورپی ممالک کی صفات اول میں آ گیا۔

لیکن غیر ممالک میں اس قدر اثر پیدا کرنے کے باوجود فرانسیسی زبان بلیٹیم اور مغربی سوئیٹن کو فرانس میں مدغم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی اور آج بھی باوجود سیکہ وہ ان دونوں ملکوں کے ایک متحدہ جہتہ کی مادری زبان ہے تاہم یہ فرانس سے بالکلیہ آزاد ہیں۔ اسی طرح صدی ہادی تک جرمن زبان بولنے والے سیکڑوں ریاستوں میں منقسم رہے، اور ۱۹۱۴ء تک جرمنی اور آسٹریا کے باشندے، اگر یہ سب کے سب ایک ہی زبان بولتے تھے، سیاسی اعتبار سے یہ قدر نفرتیں ہو سکتی تھیں کہ ہر فرانس کے اس پار جانو تو دیکھ گے کہ اس بیسویں صدی عیسوی میں جب ہر طرف قومیت کا ڈھنگ رہا ہے، کس طرح ہسپانوی جو سب کے سب تقریباً ایک ہی قسم کی برلیاں بولتے ہیں، ایک دوسرے کے سگے کاٹے ہیں۔

”Sans Souci“

تھ (صفحہ ۷۰)

پھر یہ بھی ممکن ہے کہ دو مختلف النوع زبانیں بولنے والے ایک دوسرے کے ساتھ سیاسی طور پر مدغم ہو جائیں۔ ویلز کی زبان انگریزی سے اتنی ہی مختلف ہوگی جتنی برہم زبان سے اردو، تاہم ویلز اور انگلستان کے درمیان سات سوہریں سے جو سیاسی یکجہ رنگت ہے وہ دوسروں کیلئے باعثِ رشک ہے۔ یہی کیفیت برٹنی اور فرانس کی ہے جہاں کی زبانوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بلجیم میں دو زبانیں یعنی فلیمش اور فرانسیسی بولی جاتی ہیں، کناڈا اور جنوبی افریقہ میں دو دو زبانیں سرکاری طور پر تسلیم ہیں اور روس میں تو جتنی ریاستیں شامل ہیں اس سے زیادہ زبانیں مانگ ہیں۔ شاید دنیا کے کسی ملک میں مختلف زبانیں بولنے والوں کا ایسا عجیب و غریب ذخیرہ نہیں ملے گا جیسا ممالک متحدہ امریکہ میں، تاہم یہ ایک واقعہ ہے کہ مشکل سے کسی ملک کے باشندوں کے درمیان اس قدر اتفاق و اتحاد ہوگا جتنا اس ملک میں۔

۱۷۵۰ء میں اب بھی شمالی مغربی باسک، وسطی قفقازیہ، مشرقی قفقازیہ اور جنوبی اندلس کے درمیان میں معتد بہ فرق ہے۔

۱۷۵۰ء ممالک متحدہ امریکہ کی مختلف النوع آبادی کا اندازہ اس سے ہو جائے گا کہ صرف ریاست نیو یارک میں غیر زبانوں کے رسالہ جات و اخبارات کی تعداد ۱۷۵۰ء میں حساب لگائی تھی ۱۔

ہسپانوی ۱۳؛ اطالوی ۲۶؛ جرمن ۱۱؛ پولش ۹؛ فرانسیسی ۶؛ چھوٹا فلانڈ ۳؛ عربی ۴؛ یونانی ۱؛ سویڈش ۳؛ پرتگیزی ۱؛ یوگوسلاو فلانڈ ۵؛ چینی ۳؛ روسی ۵؛ عبرانی ۱؛ پیش ۱۶؛ جاپانی ۱؛ ویلز ۱؛ آرمینی ۱؛ رومانی ۱؛ ڈنمارکی ۱؛ تنھوائی ۳؛ رومانی ۴؛ یوکرینی ۱؛ دیگر ممالک ۱۰۔

میرین - Stateo -

ان سب باتوں کو مد نظر رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی اتحاد کے لئے سانی اتحاد لازمی نہیں ہیں اور سانی اتحاد کے باوجود ایک ہی زبان بولنے والوں کا متعدد آزاد مملکتوں میں منقسم ہونا ممکن ہے۔

مذہب۔ تیسرا عنصر جسے مملکت کے قیام میں مدد و معاون سمجھا جاتا ہے مذہب ہے، یہ ایک عزیز ناک واقعہ ہے کہ گو ہر مذہب دنیا کو امن و امان کا سبق دینے اور نبی نوع انسان میں بھائی چارہ قائم کرنے کے لئے آتا ہے لیکن اکثر چونکہ اپنے اخلاقی اصول اور بود و ماند کے طریقوں کی وجہ سے وہ ایک مخصوص تمدن کا علمبردار ہو جاتا ہے اس لئے اس کے نام لیراؤں اور دوسرے مذاہب کے پیروں کے درمیان تفریق پیدا ہو جاتے ہیں اور ایک مذہب دوسرے مذہب واپوں پر تفریق حاصل کرنے کے لئے خون کی ندیاں بہا دیتے ہیں۔ تاریخ عالم کے مطالعے سے معلوم ہو گا کہ مذہب کسی زمانے میں مملکت کی بنیاد بن چکا ہے، چنانچہ اشوک اعظم کی سلطنت، خلافت اسلام اور مقدس سلطنت روما ایک بڑی حد تک مذہبی اصول پر قائم تھیں، اور جن افراد کا مذہب حکومت کا مذہب ہوتا تھا انھیں مملکت میں ایک خاص امتیاز حاصل ہوتا تھا۔ لیکن جیسا ہم ایک آئندہ باب میں زرا تفصیل سے بیان کریں گے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مذہب کو مملکت کے استحکام کے لئے بہ نسبت ایشیا کے یورپ میں زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ یورپ کے تقریباً ہر ملک کی تاریخ میں مذہبی سختیوں کی بے شمار مثالیں ملیں گی حکیم سقراط کو زہر کا پیالہ پلایا

جانا، عیسوی مذہب کے ابتدائی سینیں میں عیسائیوں کے ساتھ غایت بے رحمی کا برتاؤ پھر چارلس اعظم کا جرمنی کو بزورِ شمشیر عیسائی کرنا، ہسپانوی مسلمانوں اور عثمانی ترکوں کے ساتھ صرف اس وجہ سے سختی کا برتاؤ کہ وہ مذہبِ مسلمان تھے، انگلستان کی ملکہ میری کی اور ملکہ الیزبتھ کے عہدوں میں روٹن کیچھولک اور احتجاجیوں کا ایک دوسرے کے خلاف سخت ترین تشدد، پیرس میں شہرِ بارٹولومیو کے دن والا قتل عام ایسی بے شمار مثالوں سے تاریخِ یورپ بھری پڑی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغرب میں مذہب کو کس طرح سیاسی تفوق کا آلہ کار بنایا گیا۔ مشرق میں جب کبھی ایک مذہب والوں اور دوسرے مذہب والوں کے درمیان آویزش ہوئی ہے تو وہ مذہبی تفوق کے خاطر نہیں بلکہ محض سیاسی تفوق کی خاطر، اور ایسے زمانوں میں بھی (جیسے خلافتِ نبویؐ، دہلی عباسیوں کا زمانہ) جب حکومت کی بنیاد مذہبی اصول پر تھی، دوسرے مذہب والوں کے ساتھ انتہائی رواداری برتی گئی ہے۔ حال ہی میں جب انگریزوں نے ترکوں سے ارضِ فلسطین کو فتح کیا تو اسے "آخری صلیبی جنگ" کا لقب دیا گیا تھا، اور آج بھی لاکھوں یہودی، جرمنوں کو اپنے پشتینی جنم بھوم کو بحال دیا گیا ہے اور جو رہ گئے ہیں ان کے لئے دنیا تنگ کر دی گئی ہے۔ آزادی اور رواداری کی سب سے بڑی جائے بنیاد انگلستان کو تصور کیا جاتا ہے لیکن اس ملکیت کے انتظام و انصرام میں مذہب کو خاصہ دخل ہے۔ نہ صرف یہ کہ دارالامرا میں کلیسائے انگلستان کے تیس نمایندگان نشست کرتے ہیں اور کنیٹر برٹس کے صدر اسقف کو پریوی کونسل میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے، بلکہ قانونِ بندر بست سنہ ۱۸۸۹ء کی رو سے بادشاہ انگلستان کے لئے کلیسا کے انگلستان کا پروردہ بنا

لازم قرار دیا گیا ہے، چنانچہ اگر شاہ انگلستان کلیسا سے انحراف کریں تو انہیں تخت کو خیر باد کہنا پڑے گا۔

بائیں ہم یہ نہیں کیا جاسکتا کہ آج کل مملکت کا قیام مذہبی یکجانیت کی وجہ سے عمل میں آتا ہے۔ اصلاً مذہب کا تعلق انسان کی ذاتی ضمیر اور اس کے ذاتی اخلاق سے ہے، اور گو انفرادی اخلاق ہی سے تمدن کی ترکیب ہوتی ہے تاہم ہم کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے ملکوں میں روز بروز مذہب، ایک اجتماعی کیفیت سے نکل کر محض انفرادی تاثرات کی طرف گامزن ہے۔ کسی زمانے میں جب عقیدے کو مذہب میں آج سے زیادہ دخل تھا یہ ممکن تھا کہ انسانوں کے بڑے بڑے عظیم انسان مجموعوں کو مذہب ایک دیر پا میاسی رشتے میں منسلک کر دیتا ہو، لیکن آج کل جب عقیدے پرستی دلائل کا غلبہ ہو چلا ہے اور تقریباً ہر شخص کے مذہب کا تغیر جدا گانہ ہونے لگا ہے، تو مذہب انسانوں کی مجموعی کیفیت کو مستحکم نہیں کر سکتا اور رجحان ایک حد تک اس طرف ہے کہ مذہب سیاسیات سے بے تعلق ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل سیاسی اصطلاح میں جس جذبے کو ”مذہب“ کا لقب دیا جاتا ہے وہ برائے معنی میں مذہب نہیں بلکہ ایک خاص قسم کے تمدن کا نام ہے ہندوستان ہی کو لیجئے۔ یہاں بہت کم ایسے مسلمان رہتا ہیں جو اسلامی سیاسی اصول پرستی سے عمل کرتے ہوں لیکن جب کبھی سرکاری خدمات یا مجالس مقننہ پیش کشوں

۱۹۵۱ء و ۱۹۵۲ء دارالامین دو صدراعظم اور ۱۲ سابقہ نخست کرتے ہیں۔ دیکھو آئیں ”توازن و تنویر“
جلد ۱ باب ۱۰ قانون بدوبست کے لئے دیکھو ملاحظہ ”منتخبہ“ *Select Chapters* : *Stability*

کے تناسب کا مسئلہ آتا ہے تو ان ہی رہنماؤں کی آوازیں سب سے بلند دیا لہوتی ہیں۔ ایسے رہنماؤں کی پیروی میں جو نقص ہے وہ یہی ہے کہ ایک طرف تو مذہبی اصول سے انحراف کیا جاتا ہے اور دوسری جانب اسی مذہبی اصول کے نام پر حقوق طلب کئے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے کوئی ذریعہ ان کی بات کو سنجیدگی سے سننے یا اس پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ لیکن یہ ان اصحاب کا قصور نہیں بلکہ جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے مذہبی سیاسی اصول میں وہ جذب نہیں رکھتا کہ اس کے ذریعے سے انسانوں کے سیاسی مجبوروں میں استحکام کی کیفیت پیدا ہو۔ عیسائی اپنی مذہب کے سیاسی اصول کو، جس کے بموجب انھیں سیاسیات سے تعلق نہیں ہونا چاہئے، صدیوں سے چھوڑ بیٹھے، ہندو اپنے سیاسیات کو مدت ہوئی چھوڑ دیں سے چھین چکے اور یہ امر کچھ تعجب خیز نہیں کہ مسلم عوام بھی اسی راستے پر چل پند کر رہے ہیں۔

۱۱ حضرت عیسیٰ کا فرمودہ تھا کہ ”جو قیصر کا ہے وہ قیصر کے سپرکار اور جو خدا کا ہے وہ خدا کے“
 ۱۲ ۱۹ اپریل ۱۹۷۹ء کو مسٹر محمد علی جناح نے اپنے ایک بیان میں صاف کہہ دیا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی کسی مذہبی جماعت نہیں بلکہ وہ ایک خالص سیاسی جماعت ہے۔ اس کے تین ہی روز بعد ان کو شری ٹنگرا چادری ڈاکٹر کریم کوئی نے ایک تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت جس چیز کی ضرورت ہے وہ خدا کا دھیان لگانا نہیں بلکہ ملک کا دھیان لگانا ہے۔ اسلامی سیاسی اصول کے لئے دیکھو مولف کا رسالہ ”اسلامی دولت وامر کی ابتدا“ Sherwari: The Origins of Islamic polity. حیدر آباد دکن ۱۹۷۹ء

جذبہ تعالیٰ۔ مختصر یہ ہے کہ اگر سیاسی اتحاد و اتفاق کے اصول کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو چیز انسانی جمہوروں کو قائم و مستحکم کرتی ہے وہ کوئی موضوعی عنصر مثلاً زبان، نسل یا مذہب نہیں بلکہ ایک خالص معنوی جذبہ تعالیٰ ہے۔ جیسا ایک فاضل فرانسیسی نے لکھا ہے، "سیاسی اتحاد و اتفاق کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے، ایک یہ کہ باشندگان ملک کے مقاصد متضاد نہ ہوں، دوسرے ان کے قلب میں جوش اور گرمی ہو اور تیسرے ان کا مجموعی ضمیر ایک مخصوص اخلاقی کیفیت پر مبنی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مملکت کے قیام کے لئے سب سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ باشندگان ملک سچے دل سے مملکت کے ہی خواہ ہوں۔ یہ تو ناممکن ہے کہ ہر ایک کا طرز کار ایک سا ہو، لیکن جب تک ملک کا مقصد یہ ہو کہ وہ مل کر مجموعی طور پر ایک مملکت قائم کرے کے لئے کوشش کرے اور قوت کی قسم کا استحکام قطعاً ناممکن ہوگا۔ دوسرے ضرورت اس کی ہے کہ باشندوں میں قلبی جوش ہو۔ اس کے معنی ہیں کہ مملکت اس وقت تک مستحکم نہیں ہو سکتی جب تک ملک والے وقت آنے پر اپنے "ن" میں "و" سے اس کی آزادی اور ترقی کے لئے قربان ہو جانے کے لئے تیار نہ ہوں۔ محض زبانی جمع خرچ سے کام نہیں نکلتا، اور ہر مملکت کی تاریخ میں ایسے زمانے آتے ہیں جب مملکت کی بقا کی خاطر ہر طرح کی تکالیف برداشت کرنی پڑتی ہیں مثلاً اتحاد و اتفاق کی

۵۵ ریناں: "قوم کیسے؟" *Reman: Qu'est ce qu'une nation?*

۵۵ جیسا قرآن مجید ۱۵۵ میں آیا ہے، "اور ہم تمہارا امتحان کریں گے ڈر سے اور ہموک سے اور اہل جہل اور بھولوں کے نقصان سے" (وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ مِنْ أَلْحُوتِ وَالْجُوعِ وَنَقْصِ مَوَالِي الْأَنْفُسِ وَالْإِثْمِ)

کیفیت ہونی چاہئے کہ جہاں تک ملک کی بہتری اور دشمن سے بچاؤ کا تعلق ہے،
باشنہ گان ملک اپنے اپنے ذاتی مفاد کی بجائے مشترک مفاد کو مد نظر رکھیں اور ملک
کے اجتماعی مفاد کے ساتھ ان کا انفرادی تعلق حق اور صداقت پر مبنی ہو۔

یہ سب امور دو الفاظ میں شامل ہو سکتے ہیں، یعنی خواہشِ تعالیٰ، اور یہی
وہ چیز ہے جس کی قیامِ مملکت کے لئے سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اگر کسی ملک
والے ایسے گروہوں میں تقسیم ہوں جن کا نقطہ نظر ایک دوسرے سے متضاد ہو اور جو اپنے
ملک کی خاطر قربانیاں کر لے کے لئے تیار نہ ہوں، تو ایسی حالت میں باوجود قدرتِ الہی
کی دی ہوئی جسم کی نعمتوں کے وہ ملک مملکت کے رستہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ ٹھیکاً دنیا میں
کسی ملک کی اتنی آبادی نہیں ہے جتنی چین اور ہندوستان کی، لیکن یہاں کے باشندوں
میں باہمی تعلق کی خواہش کے فقدان کے باعث یہ دونوں ملک دنیا کے خود دار اور
مستمرانِ ممالک میں کی صفِ آخر میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ایسے ممالک
جیسے، 'فرض کیجئے' سوویتان، بحیم اور بہت سے دوسرے ممالک ہیں جہاں کے
لوگ باوجود انجیلی، لسانی اور مذہبی اختلاف کے اپنی اپنی مملکتوں کے قیام و استحکام
کے لئے دوش بدوش کو شاں ہو کر ترقی کی شاہ راہ پر چلنے والوں کی پہلی صف میں نظر
آتے ہیں۔ بلاشبہ اگر آباری اپنے آپ کو ہم نسل سمجھے یا ان کی زبان یا مذہب ایک
ہو تو یہ عناصر خواہشِ تعالیٰ کے پیدا ہونے میں مدد ہوں گے۔ لیکن جمہیا ہم دیکھ چکے ہیں،
اس خواہش کے لئے درحقیقت نہ ہم نسل ہونے کی ضرورت ہے نہ ہم لسان ہونے کی
نہ ہم مذہب ہونے کی۔

Sovereignty SOVEREIGNTY

باب ۶ اقتدارِ اعلیٰ

اجتماعی کیفیت کی اہمیت - اجتماعی قوت ارادی خصوصیات اقتدارِ اعلیٰ - تکثیری نظریہ
علیٰ اقتدارِ اعلیٰ - ہیئت حاکمیت کی تقسیم تفویض و تحدید - مناسط - اقتدارِ اعلیٰ کا تعین -
اجتماعی کیفیت کی اہمیت - ہم اس سے پیشتر بیان کر چکے ہیں کہ
انسان کی دو شخصیتیں ہیں، ایک تو اس کی انفرادی حیثیت دوسرے اجتماعی حیثیت
اور عوام عمرانی میں اس کی خالص انفرادی حیثیت کو نظر انداز کر کے صرف اجتماعی
حیثیت پر غور کیا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ امور
علوم عمرانی میں شامل نہیں سمجھے جاتے جن کا تعلق فرد کی ذات محض سے ہو اور
جن میں فرد کے تعلقات دیگر افراد کے مجموعوں سے نہ دکھائے جائیں۔ سیاسیات
بھی علوم عمرانی میں سے ہیں، اور عیسایہ علم کی تعریف کے ضمن میں دکھایا گیا ہے
اس میں انسان کی ایک ایسی اجتماعی کیفیت پر بحث کی جاتی ہے جس کا شاید
اہم ترین عنصر تعامل، ترتیب و تنظیم ہو۔

یہ ظاہر ہے کہ سب انسان ایک سے نہیں ہوتے۔ کوئی عقلمند سب سے تو
کوئی ہو تو فاضل، ایک امیر سے دوسرا غریب۔ اسی طرح بعض افراد میں نظر اتنا ترتیب

”تنظیم کا مادہ ہوتا ہے، بعض میں اس مادہ کا کلینہ نقدان ہوتا ہے، اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو ترتیب و تنظیم کے ساتھ کسی منظم کیفیت میں خود اپنا پول بالا رکھنا چاہتے ہیں۔ شیخ سعدی شیرازیؒ نے خوب فرمایا ہے:-

کے بے باسان و کے بادشاہ	کے داد خواہ و کے تاج خواہ
کے نشادمان و کے دروہند	کے کامران و کے مستمند
کے باجدار و کے تاجدار	کے سرفراز و کے خاکسار
کے بر حصیر و کے بر سریر	کے در پلاس و کے در حریر

کے در جہان جلالت میسر	کے در کنبہ حوادث اسیر
کے در گشتارِ راحت میغم	کے با غم و رنج و محنت ندیم

کے مقل و عالم و ہر شیار
کے مدب و جاہل و شر ملار
غرض اگر ایک ہی مقام کے جملہ افراد کو باہم سیاسی طور منسلک ہو جائے گی ہدایت کر کے
چھوڑ دیا جائے اور کسی قسم کا تہدیدی عمل روانہ نہ رکھا جائے تو اس جماعت کے افراد میں
جو لوگ اپنی سیادت کے خواہاں ہیں ان میں بلاشبہ لڑائی جھگڑے، بلکہ شاید کشت و
خون تک کی نوبت آجائے گی، اور اگر بالفرض کوئی شخص اتنا خود غرض نہ بھی ہوتا
تھا، ان اصولوں کی بابت اختلاف ہونا اور اس اختلاف کی وجہ سے جھگڑے پیدا

ہونا لازمی ہے، جن پر نئی مملکت بنی ہوگی۔ بہر حال خواہ کوئی بھی صورت حال پیدا ہو، سیاسی اندلک باہمی، یعنی مملکت کے ساتھ کسی نہ کسی عظیم الشان تہدیدی قوت کا قیام قطعاً لازم ہے۔ اس کے بغیر نہ انسان کی اجتماعی کیفیت قائم رہ سکتی ہے نہ مملکت، اور نہ ایسی جماعت پر (اگر اسے جماعت کا لقب دیا بھی جائے) علم ریاسیات کا انطباق ہی ہو سکتا ہے۔ یہی وہ قوت ہے جس کو اقتدارِ اعلیٰ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ایک دوسرے پہلو پر نظر ڈالئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی حیثیتیں دونوں اس کے وجود کے لازمی اجزاء ہیں، اور ان دونوں میں سے کسی سے بھی وہ گریز نہیں کر سکتا بلکہ اس کے خاتمہ تک یہ برابر قائم رہتی ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ بہت سے امور ایسے پیش آتے ہیں جن میں انسان کا ذاتی مفاد اس کی جماعت کے مفاد سے ظاہراً مختلف ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں قسم کے مفادوں کے درمیان ولادت سے وفات تک ایک عظیم الشان کشمکش جاری رہتی ہے، اور کبھی ایک کا پتہ بھاری نظر آتا ہے کبھی دوسرے کا۔ انسان کا فی نفسہ کسی جماعت کا مستقل رکن بننا اس کا مقصد ہی ہے کہ جب کبھی ان دونوں میں باہمی مخالفت نظر آئے اور ساتھ ہی سیاسی جماعت کا مفاد اس جماعت کے قیام و استحکام کے لئے لازمی ہو، تو وہ اپنے ذاتی مفاد کو اس اجتماعی مفاد پر قربان کر دے۔ لیکن جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے، ہر شخص کا سیاسی احساس جداگانہ ہے بعض از خود اپنے نفس کو مارنے یعنی ایثار اور سیاسی قربانی کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جنہیں اس طرز عمل پر آمادہ کرنے کے لئے جبر کی ضرورت ہے۔

اور جب تک ایسی شخصیت موجود نہ ہو جو ہر کن سلطنت پر مساوی طور پر عادی ہو اس وقت تک مملکت قائم نہیں ہو سکتی۔
 اجتماعی قوتِ ارادی۔ اگر نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو مملکت میں بائندگان ملک کی اجتماعی کیفیت ہی مملکت میں سب سے زیادہ قوی و ذی اقتدار ہوتی ہے اور یہی الحقیقت مملکت ہی کا دوسرا نام ہے۔ چونکہ بعض افراد صاحبِ وسائل ہوتے ہیں، بعض قوی ہوتے ہیں، بعض ذی اثر ہوتے ہیں، بعض کے دوستوں کا حلقہ وسیع ہوتا ہے، اس لئے اس کی ضرورت پیش آتی ہے کہ افراد کے سیاسی رشتہ کو ملک اور اجتماعی کیفیت کو قائم رکھنے کے لئے خود جملہ باشندوں کی اجتماعی قوتِ ارادی سے کام لیا جائے تاکہ ہر کس و نا کس، بڑے اور چھوٹے کی انفرادی خواہشات و عادات پر غلبہ پانے کا امکان ہو۔ ورنہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، مرکزِ گریز تو ہیں اپنے عمل سے مملکت کو قائم نہیں رہنے دیں گی۔ یہی وہ تخیل ہے جسے مملکت کے اقتدارِ اعلیٰ کا لقب دیا جاتا ہے اور جسے ہونہار لغو و ہائپر (مذللے ابدی کے مقابلے میں "معبود فانی" کا لقب دیتا ہے۔ مملکت کے اسی اقتدارِ اعلیٰ کے

۱۔ وڈرووڈسن نے اپنی کتاب "موسم" مملکت *Woodrow Wilson: The State* باب میں کیا خوب کہا ہے کہ "انضباط سے مراد یہ ہے کہ جہاں تک ہر کے ہر شخص کے لئے ہر شے ایک میں ہو، قوت کی مساوات ہو جائے۔"

۲۔ "لیا ایتھن" *Democracy* باب ۱۴۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس لفظ "انتہائی" کے اعلیٰ اعلیٰ معنی میں بڑا (بڑا) ہے۔ عام طور پر اس سے مراد زیادہ تر بادشاہ (بقیہ صفحہ ۸۱)

متعلق علامہ ابن خلدون نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مملکت میں ایک عصبیت تمام عصبیتوں سے قوی اور پر زور ہوتی ہے، اسی وجہ سے وہ سب پر غالب آتی ہے اور تمام عصبیتیں اس میں شامل و دخیل ہو جاتی ہیں۔ ”وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ”یہ عصبیت عام ایسی چیز کے مزاج کی مانند ہے جس کی نگہیں مختلف عناصر سے ہوتی ہیں، لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جملہ افراد کے انفرادی حیثیات لازماً انفرادی میلانات کے مجموعے کے مترادف ہوں گے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ملک کا مفاد بہت سے امور میں باشندگان ملک کے انفرادی مفاد سے مختلف ہوتا ہے۔

انفرض جیسا اس سے پیشتر بیان کیا جا چکا ہے، مملکت کے قیام کے لئے حاکم و محکوم دونوں کا ہونا لازمی ہے، محکوم تو باشندگان ملک کی حیثیت افراد کے ہوتے ہیں اور حاکم نہ اقتدار ان ہی باشندوں کی اجتماعی سیاسی کیفیت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے، اور یہی کسی مملکت میں اعلیٰ ترین اقتدار ہے۔

خصوصاً یہاں **اقتدار اعلیٰ** مملکتی اقتدار اعلیٰ کی اس توضیح کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی خصوصیات اور لوازمات مختصر طور پر بیان کئے جائیں۔ ظاہر ہے

بقیہ صفحہ ۸۰۔

بازمانہ کی ذات سے لی جاتی ہے۔ سیاسی اعلیٰ اصطلاح میں یہ وہ شخصیت ہے (مفرد و یا مرکب) جو تمام ادارات مملکت پر حاوی ہوتی ہے۔

علامہ مقدمہ تاریخ ابن خلدون، حصہ ۲، فصل ۱۰۔

۵۵ مقابلہ کردہ روسو ”معاہدہ معاشری“ Rousseau: Contrat
Social ۲، ۴۔ نیز دیکھو باب ۳، بالا عنوان ”اصول معاہدہ معاشری کی تنقید“

کہ یہ اقتدار ایسی ملکیتوں میں جنہیں کم و بیش اندرونی و بیرونی آزادی حاصل ہو، ہر باشندہ اور ہر مجموعہ افراد پر حاوی ہو گا، جس کے معنی ہیں کہ جب تک کوئی شخص حدودِ مملکت میں پود و پاش رکھے گا، اور جب تک وہ اس مملکت کے زیر سایہ زندگی بسر کرے گا اس وقت تک وہ برابر اس کے اقتدار کے ماتحت رہنے پر مجبور ہو گا۔ یہ ناممکن ہے کہ اگر کوئی شخص خواہ وہ اس مملکت کا شہری ہو یا نہ ہو جس میں وہ رہتا ہے، اپنی آپ کو اقتدارِ اعلیٰ سے آزاد کر لے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض مشرقی ممالک ایسے بھی ہیں جنہیں غیر ملکیتوں کو اس اقتدار سے مستثنیٰ ہونے کی اجازت ہے، مثلاً جاپان سے پہلے سلطنت عثمانیہ میں نام نہاد اصول ”مراعات“ کے تحت یورپی باشندوں کو چند ایسے حقوق حاصل تھے جو ترکی اقتدارِ اعلیٰ کے بالکل منافی تھے، اور آج بھی چین کے بعض حصوں میں اسی اصول کا اتباع کیا جاتا ہے، لیکن محض مشنریات میں جن سے ہمارے کلیہ کی حقیقت پر متدبیر اثر نہیں پڑتا۔

علاوہ ازیں ہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ مملکت کو مستقل طور پر اقتدارِ اعلیٰ ہوتا ہے۔ حکام کی تبدیلی، حدودِ مملکت کی کمی بیشی، عہد ناموں صلح ناموں سے

لے مراعات کے لئے دیکھو:-

(۱) ٹوئنٹی بی ڈگریز ترکی *Modern Turkey* Toynbee & Kirkwood: باب (۲)

(۲) میرزہ ”ترکیِ حالیہ“ *Mears: The Modern Turkey*.

(۳) ٹانگ یا ٹانگ لی: ”باغی چین“ حصہ سوم موسومہ ”چین دستِ دہانتہ“ *Tangleangli*

China in Rivot, Chapter "China in Chair."

مہر لا اس اقتدار میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اصول اس قدر قطعی ہے کہ بعض مصنفوں کی تو یہ رائے ہے کہ خود مملکت کو بھی یہ اقتدارِ اعلیٰ کسی دوسرے ادارے کو تفویض کرنے کا اختیار نہیں ہے، لیکن اس خیال کے برعکس ایسی مثالیں روزمرہ ملتی ہیں کہ چند روز یا عرصہ دراز کے لئے مملکت مسلم اقتدارِ اعلیٰ یا اس کے کسی جزو سے دست بردار ہو گئی ہو۔ مثلاً جب ایک ملک دوسرے ملک کو فتح کر کے اپنا ماتحت بنا لیتا ہے تو عملاً مفتوحہ مملکت اپنا اقتدارِ اعلیٰ فتح کے سپرد کر دیتی ہے اور چونکہ واقعاً وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوتی ہے اس لئے اسے یہ بھی اختیار ہوتا ہے کہ جب وہ اس حالتِ مجبوری سے نکلنے کے قابل ہو جائے تو اپنے مکھڑے ہوئے اقتدارِ اعلیٰ کو واپس لے لے۔ اسی طرح جب متعدد مملکتیں اپنی مجموعی قوت میں اضافہ کرنے کی غرض سے وفاقہ کی شکل میں ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہو جاتی ہیں تو عملاً وہ اپنے اقتدارِ اعلیٰ کا ایک جزو مرکزی ادارے کے سپرد کر دیتی ہیں۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب مملکت کو فرد پر اس قدر عظیم الشان اقتدار حاصل ہو گیا تو بیچارے فرد کی حالت نہایت ہی زبوں ہو جائے گی۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آدلی تو مملکت خود افراد کی سیاسی اجتماعی حیثیت کا نام ہے، دوسرے انسان یا ادارات انسانی اپنے جملہ اختیارات کو بیک وقت کبھی کا نہیں

لکھنؤ کے لئے گارڈ تھیوریات *Gannet: Introduction to Political Science.*

باب ۸، جزو ۲ کا مطالعہ کیا جائے۔

نہیں لاتے۔ ہم کو یقیناً یہ اختیار حاصل ہے کہ جس جائز چیز کو جی چاہے کھائیں یا جہاں جی چاہے، جائیں، لیکن ہم یقیناً نہ ہر چیز کھاتے ہیں نہ ہر جگہ جاتے ہیں معاشرہ سیاسی کے قیام اور مرکز گزیر اثرات کی مدافعت کے واسطے اقتدار علی لازم و ملزوم ہے لیکن عام طور سے مملکت اس اقتدار کو محض ضرورت کے وقت کام میں لاتی ہے اور اکثر بیشتر اختیارات سے از خود دست بردار ہو جاتی ہے علاوہ ازیں بہت سی ایسی قوتیں ہیں جو اس اقتدار کے خلاف رد عمل کرتی رہی ہیں اور پوری طور سے اس کے مفاد کو جائز نہیں رکھیں۔ اسی کو عرف عام میں مصلحت کہتے ہیں، یعنی وہ کیفیت جس کے تحت کسی کو اپنے اقتدار کے ماتحت اختیار پورا ہو، لیکن مخالف حالات کے مد نظر وہ اپنے اختیار کو کام میں نہیں لے۔ اس کا بہترین مظاہرہ کسی خاص طبقے کی ناراضی کا درجہ ہے بشرطیکہ اس ناراضی میں غلوار بغاوت کا خطرہ لگا ہوا ہو۔

مکثری نظریہ۔ حال میں دو اعتبار سے نظریہ اقتدار علی میں ترمیم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک طرف بعض متنازع سیاست دانوں نے، جن میں فرانسیسی دیوگی اور انگریز لاکے متنازع ہیں اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے۔ لاکے بہ خیال پیش کرتا ہے کہ مملکت کو دوسرے ادارات پر کوئی اخلاقی نفوذ نہیں اس لئے کہ جن افعال کو مملکت کا افعال کہا جاتا ہے وہ دراصل صرف ان لوگوں کے افعال ہوتے ہیں جو کسی دسے ہوئے زمانہ میں برسر اقتدار ہوتے ہیں۔ مملکت انسانوں کی ایسی ہی آئین ہے جیسے ان کے دوسرے ادارات، اور اسے ان ادارات کو زیر کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ دیوگی اس سے بھی آگے بڑھا

ہوا نظر آتا ہے اور کہتا ہے کہ حقیقی شخصیت صرف انسان کی ہے اور مملکت کو محض فرضی طور پر شخص کا مرتبہ دید یا گیا ہے تاکہ چند افراد دوسروں پر اس بہانے سے ظلم کر سکیں۔ وہ کہتا ہے کہ قانون پر عمل محض اس لئے لازمی ہے کہ اس سے معاشری ضروریات پوری ہوتی ہیں نہ کہ اس لئے کہ وہ مقتدر اعلیٰ کا حکم ہے۔

اس خیال میں جسے "تکثیری نظریہ" کہتے ہیں، دراصل انسانی آزادی اور عمویت پر زور دیا گیا ہے، اور اس میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں ایک طرف تو حکومت اور مملکت کے مابین غلط بحث سا نظر آتا ہے اور دوسرے اس میں قانونی اور اخلاقی نقطہ نظر کو ایک دوسرے سے کافی متنازعہ نہیں کیا ہے۔ اصل میں یہ اس نظریہ کو سب سے زیادہ محسوس سطحی یورپ میں گی ہے جہاں مسیحی اور ٹیکلے نے حکومت اور مملکت کو ایک دوسرے کا مترادف گردان کر یہ صرف تفریباً تمام اختیارات ایک مرکز کے سپرد کر دئے ہیں بلکہ غور سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ افراد کے اختیارات کلیتہً سلب کر دئے گئے ہیں، اور کچھ ایسا افسوں پڑھ کر پھونکا ہے کہ افراد اس حکمت عملی سے بالکل خوش اور مطمئن معلوم ہوتے ہیں۔ اگر اعلیٰ اور جتنی کے داخلی طرز عمل کو اصولاً غلط بھی تصور کیا جائے تو بھی ہم دیوگی اور لا سکی سے کہہ سکتے ہیں کہ جب دوسرے "انسانی ادارات" کے درمیان فیض ہو تو کیا کسی بالاتر شخصیت کی دخل اندازی یا ثالثی کی ضرورت نہ ہوگی، اور اگر اس شخصیت کے احکام سے ایک فریق کنار کشی اختیار کرے تو کیا کسی طرح کے بغیر امن و امان قائم رہ سکے گا۔ اسی شخصیت کو تو مقتدر اعلیٰ کا لقب دیا جاتا ہے۔

شہ تکثیری نظریہ کا بیان گیتل کی کتاب "تاریخ تخیلات ریاستہ" *Gottel: History* (صفحہ ۸۶ پر)

علی اقتدارِ علی - یہاں تک تو اقتدارِ علی کا صرف نظریہ بیان کیا گیا۔ اب اس کی ضرورت ہے کہ نظری میدان سے نکل کر اُسے عملی جامہ پہنا یا جائے۔ مملکت خود ایک مجر فلسفیانہ شخصیت ہے، لہذا اُس کے اقتدارِ علی کی کم و بیش یہی نوعیت ہوگی۔ اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ جملہ باشندوں کی سیاسی ہمیت اجتماعی ہر فرد یا محبوبہ افراد پر غالب ہوگی اور اُس کے احکام اُس ہوں گے لیکن علی سیاست باز کو یہ دریافت کرنے کی ضرورت ہے کہ مملکت اپنے احکام کیسے صادر کرتی ہے، وہ کون سا طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے باشندگان ملک کو اس کی خواہشات کا علم ہو جاتا ہے، اور وہ کس قسم کی کل ہے جو لوگوں کو اُس کے سامنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی وہ مسئلہ ہے جسے ”علی اقتدارِ علی“ کا مسئلہ کہنا چاہئے۔

(نوٹ بقیہ کا) *of Political thought* میں ہے کہ
نیز اس کے لئے لاسکی کا رسالہ ”مسئلہ اقتدارِ علی“ *Problem of Sovereignty*
اور اس کی کتاب ”صرف و نحو سیاسیات“ *Grammar of Politics*
دیکھی جائے۔

۱۹ اس کے بعد جو کچھ استدلال اس ضمن میں کیا گیا ہے۔ وہ ناظرین کو کسی دوسری کتاب میں نہیں
سنے کا تعجب ہے کہ ”ہمیت حاکم“ کے تخیل پر جو حقیقت واقعات پر مبنی ہے، کسی نے اب
تک بحث نہیں کی اور اقتدارِ علی جیسی علی چیز کو محض نظریے کے حد تک چھوڑ دیا گیا ہے، بلکہ
میرا معنون ”اقتدارِ علی“ کا ایک جدید نظریہ *A new Theory of*
Sovereignty خاتمہ بیگزین جدا، ۱۰۵۵

ہمکیتِ حاکمیت۔ مملکت کے حقیقی نفسِ ناطقہ یعنی ایسے ادارات کا
تعیین جس کے ذریعے سے اُس کی خواہشوں کا تا حد امکان علم ہو، ان قواعد کے ذریعے
سے ہوتا ہے جنہیں مجموعی طور پر دستوری قوانین کا لقب دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے
کہ یہی وہ قاعدے ہیں جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کس ملک میں حکومتی کل کے
پرزے کس طرح منظم ہیں، اور ان عظیم الشان اختیارات کو، جنہیں مجموعی طوراً اقتدارِ
اعلیٰ کہتے ہیں، کس طرح ملکی جامعہ پہنایا گیا ہے۔ گویا کہ وہ ادارات جن کے سپرد دستوری
قانون کے ذریعے سے خاص خاص اختیارات کر دئے جاتے ہیں، اصل میں مملکت
کے تمام ہی جنہیں اپنے دستوری فرائض منصبی سے بٹنے کا اختیار نہیں۔ واقعہ یہ
ہے کہ جو کچھ اُن سے سرزد ہوتا ہے اپنی مرضی سے سرزد نہیں ہوتا بلکہ اُن کے
ہر ایک جائز دستوری فعل کے ساتھ مملکت کی مرضی وابستہ ہوتی ہے، اور اُن سے
کوئی ایسا فعل سرزد ہو جو دستوری حدود سے تجاوز کر جائے تو وہ کام مملکت کی خواہش
اور مرضی سے مغایر ہوتا ہے۔ اگر اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو جملہ حکومتی ادارات
جن میں نہ صرف تنخواہ دار ملازم بلکہ وہ سب باشندگان ملک شامل ہیں جو اس کے
پاسی کار و بار میں حصہ لیتے ہیں، دراصل مملکت کے مختار سے زیادہ حیثیت نہیں
رکھتے۔ ساتھ ہی دستوری قانون کے ذریعہ سے اُن کے واسطے طریق کار بھی مقرر کر دیا
گیا ہے جس سے گریز کر کے پران کا فعل محض ایک ذاتی حیثیت اختیار کر لیتا ہے
ادراں کے اختیارات میں سدراہ ہوتا ہے۔ ایسے ادارات مملکت کو ہمکیتِ
حاکمیت کا لقب دینا مناسب ہو گا۔

۱۱۔ اس ہمکیتِ حاکمیت میں جملہ اداراتِ حکومت شامل ہیں، یعنی حکومت اگر عمومی (پبلک) ہے

یہ ضروری نہیں کہ ہر ملک کے دستوری قانون کا میلان اعلیٰ نیت یا عمویت ہی کی طرف ہو، بلکہ جس طرح آج کل کی اعلیٰ وجہی اور دوسرے ممالک کی آمریتوں اور ازمنہ وسطی کی ملکیتوں کا حال تھا، یہ ممکن ہے کہ مملکت کا اعلیٰ اقتدارِ علی ایک شخص واحد کے ساتھ وابستہ ہو اور حالات و واقعات اس کے متقاضی ہوں کہ دستور پر آئندہ نظر ثانی تک ملک کے جملہ انتظامات اسی کی سپردگی میں رہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جملہ انسانی ادارات میں دم بدم تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اس لئے کہ یہ ادارات مختلف اثرات اور بحول کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب تک حالات و واقعات اس کے متقاضی رہیں گے کہ ملک میں مطلق العنانی کا دور دورہ ہو اسی وقت حکمران کے لئے اپنے شخصی اختیارات کو کام میں لانا جائز ہوگا، لیکن جب حالات میں تبدیلی ہونے کی وجہ سے مملکت کی حیثیت بدل جائیگی تو نئے دستور کے رواج کے باعث یہی شخصی اختیارات اس حکمران کے لئے قطوعاً ناجائز ہو جائیں گے۔ اسی طرح

بقیہ ص ۸۹) لئے ہوئے ہوں اس میں رائے دہندے اور اگر اس کی نیا مطلق العنانی بادشاہ یا ام ہو تو اس کے ہا اختیارِ ندما و ذرا بھی شامل ہوں گے۔ یہی وہ نسبتِ حاکمیت ہے جس کے ذریعے سے یہاں مملکت کی اصلی خواہشات کا علم ہوتا ہے۔

شجرہ حکومت ۱۔

مملکت
نسبتِ حاکمیت
حکومت

اعضائے حکومت (یعنی مقننہ، عدلیہ
محکمہ جات حکومت)

اگر قانون سازی یا نافذ قانون یا کسی دوسرے شعبہ میں اس منضبطہ دستور میں سے گزر کیا جائے جو اس کے لئے معین کر دیا گیا ہے تو ایسے افعال محض غیر سرکاری و خانگی حیثیت اختیار کریں گے اور قابل لحاظ نہ ہوں گے۔

اس کی تقسیم، تفویض و تحدید یہ مفصلہ بالا امور کو مد نظر رکھ کر یہ ظاہر ہو جائے گا کہ علی اقتدارِ اعلیٰ تفویض ہو سکتا ہے، تقسیم بھی کیا جا سکتا ہے اور اس کی تحدید بھی ممکن ہے۔ علی سیاسی مسائل اس درجہ پیچیدہ ہوتے ہیں کہ ان کے حل کرنے اور انتظامِ مملکت کو کامیاب بنانے کے لئے جملہ افعیاتِ راست و فراموش ایک ہی ادارے کے سپرد نہیں کیے جاسکتے، بلکہ اولاً تو ایک حکومت قائم کی جانی پڑے جو گویا ہیئتِ حاکمیت کے سامنے ذمہ دار ہوئی ہے۔ بعد ازاں جس طرح کسی زندہ عضوہ کے اعضاء سرکار ہوتے ہیں ویسے ہی ملک کا انتظام مختلف اعضاءِ حکومت کو تفویض کر دیا جاتا ہے۔ یہ ساقط ہی جیسا اور یہ بیان کیا گیا ہے؟ بالکل ناممکن ہے کہ کوئی مملکت اپنا پورا اقتدارِ اعلیٰ یا اس کا ایک جز و صوبوں کو تفویض کر دے۔

مغالطے۔ اس ضمن میں اب صرف نام نہاد "قانونی" اور "سیاسی"

اللہ تعالیٰ "اصل قانون" *Holland: Jurisprudence* باب ۳ میں "مقتدر" "نیم مقتدر" اور "مقتدرِ ماتحت" کی مثالیں دی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں اقتدار کی تقسیم کی بہترین مثال ملک متحدہ امریکہ سے دی جاتی ہے، جہاں یہ اقتدار مرکزی دستور سازِ جامعہ مرکزی حکومت ریاستی دستور سازِ جامعہ اور ریاستی حکومتوں میں تقسیم ہے۔

مقتدرِ اعلیٰ کا فرق اور باہمی لغت دکھانا باقی ہے۔ ”قانونی“ اقتدارِ اعلیٰ کا جو مفہوم عام طور پر سمجھا جاتا ہے اور اس کا سیاسی اقتدارِ اعلیٰ سے جو امتیاز کیا جاتا ہے وہ نہایت مغالطہ آمیز ہے، اور یہی وجہ ہے کہ شاید ہی کوئی ریاست داں اس بارے میں متفق ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ اس ضمن میں کیا گیا ہے اس میں اکثر بیشتر حکومت اور مملکت کے درمیان غلط بحث کر دیا گیا ہے، اور اگر غور کیا جائے تو اسطرح ایں اور گرد و تنوس سے لے کر آسٹن اور زمانہ حال کے علماء سیاسیات تک اس مسئلے کو صاف نہیں کر سکے کہ آخر کار اقتدارِ اعلیٰ کس شخصیت کے وابستہ ہے۔ کہیں تو بودیک کی طرح وہ اس اقتدار کو محدود کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کہیں آسٹن کی طرح وہ ایسے مفکر کو دیکھتے ہیں جس سے بالاتر کوئی شخصیت نہ ہو، اور کہیں وہ مملکت کو محض ایک مجرد ہیئت اجتماعی تصور کر کے یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ اس کی حقیقت اور صفات کا تعین محض سیاسی یا قانونی نظریوں کے ذریعے سے کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ایک طرف تو مملکت کی وقعت محض ایک مجرد تخیل سے زیادہ نہیں رہتی، دوسری جانب اس کی کو قانون جیسے ادارے کا واحد منبع و ماخذ

لکھ دویں نے مملکت اعلیٰ کے اختیارات کی جو تحدید کی ہے اس کے لئے دیکھو ڈنگل: ”نظریاتِ سیاسی از ڈنگل“ *Dunning: Political Theories from*

Luther & Montesquieu باب ۱۲ ص ۱۰۰۔

آسٹن: ”اسولِ قانون“ *Austin: Jurisprudence*

ولنگھب: ”قانونِ عام“ *Willoughby: Public Law*

قرار دیا جاتا ہے۔ اگر ہم مملکت کی "ہئیت حاکمہ" کو (جو دراصل ایسے شہروں کی اجتماعی کیفیت کا نام ہے جو سیاسی امور میں حصہ لیتے ہوں) اس کا نفسِ ناطقہ قرار دیں تو یہ تمام ذمئیں رافع ہو جائیں گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مملکت یعنی جملہ باشندگان مملکت کی سیاسی ہئیت اجتماعی ایک مجرد تخیل ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ یہ مجرد تخیل ہی نہیں بلکہ واقعتاً قابلِ لمس ہستیوں کا مجموعہ ہے ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جو ملک کے سیاسی انتظام میں مطلق حصہ نہیں لیتے، اور بہت سے حصہ لیتے ہیں۔ موزر الذکر جن میں سیاسی تنظیم کا دار و مدار ہے، ہئیت حاکمہ میں شامل ہیں اور واقعی اقتدارِ عالی ان ہی کے ساتھ وابستہ ہے۔ لیکن مملکت یعنی باشندوں کی اجتماعی حیثیت اس "ہئیت حاکمہ" کی نہ کیسب کو جب چاہے بدل سکتی ہے، یعنی اُسے اپنی مرضی سے وسیع یا تنگ کر سکتی ہے۔ ہر دفعہ ڈاکٹری اور ان کے پیروں کے نزدیک برطانوی پارلیمنٹ کو قانونی اقتدارِ عالی حاصل ہے۔ لیکن یہ امر بحث طلب ہے کہ آیا یہ اصول آج بھی اتنا ہی حقیقت پر مبنی ہے جتنا پر دفعہ صاحب موصوفہ کی کتاب کی اشاعت کے وقت تھا۔ بالفرض اگر یہ واقعہ بھی ہے تو بھی کیا یہ ناممکن نہیں کہ کسی انقلاب

فلسفہ داکٹری "تہذیبِ قانون دستوری" *Dacey: Introduction to the law*

of the Constitution تہذیبِ حصہ اول، باب اول۔

مصلح غریب ملک یہ ہے کہ اگر انگلستان میں عام انتخاب کے بعد دارالعوام میں کسی خاص سیاسی گروہ کی اکثریت ہو تو پارلیمنٹ کو زیادہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں یا کسی مرکزِ نقل مجلس کا بنیہ کی طرف ہٹ جاتا ہے۔

کے بعد ایک ایسا برطانوی دستور مرتب ہو جس کے بموجب یہ نام نہاد اقتدار
اعلیٰ پارلیمنٹ سے سلب کر کے براہ راست رائے دہندوں کے سپرد کر دیا
جائے۔

برحال ان اصولوں کو جن کی توضیح اوپر کی گئی ہے، مد نظر رکھ کر ”وقتی“
اور ”استحقاقی“ ”قانونی“ مقتدر کا مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ عام طور پر استحقاقی
مقتدر اصطلاح اس شخصیت کے لیے استعمال کی جاتی ہے جس کے اقتدار کی
بنیاد ملک کے دستور پر ہو۔ اکثر و بیشتر یہی واقعی مقتدر بھی ہوتا ہے۔ لیکن بعض مرتبہ ایسا
بھی ہوتا ہے کہ ”وقتی مقتدر“ کوئی قانونی استحقاق نہ ہو۔ اس کی بہت سی
مثالیں لارڈ براکس نے پیش کی ہیں، اور کہا ہے کہ طویل پارلیمنٹ کی ریفاست
کے بعد ایلیور کرائون، فرانس کی مجلس نظام کے ریفاست کے بعد پولین اعظم
اور (مسلطہ تکبر) مصر کا امیر واقعی مقتدر تھے، گو ان میں سے کسی کو قانونی
استحقاق حاصل نہ تھا۔ لیکن اگر اقتدار عالی درحقیقت مملکت کے ساتھ وابستہ ہے
اور مملکت کی خواہشات دستوری قانون کے چند مخصوص مضامین کے ذریعے
سے معلوم ہوتی رہتی ہیں تو پھر یہ بحث کم و بیش بے کار ہے۔ اگر کرائون، پولین
اور انگریزوں کے اقتدار کو انگلستان، فرانس اور مصر کی مملکتوں نے تسلیم کر لیا تھا
تو انہیں واقعی اور استحقاقی اقتدار ہو گیا ورنہ سیاسی اعتبار سے تو اس اقتدار کی

مثال براکس اور مطالعات تاریخ اصول قانون Bryce: Studies in

History of Jurisprudence. جلد ۲ خطبہ ۱۰ ص ۷۴

حیثیت خلافِ قانون اور بد اخلاقت ہے جسے زیادہ نہیں ہے۔

اقتدارِ اعلیٰ کا تعین۔ مملکت میں عملی مقتدرِ اعلیٰ کے تعین کا مسئلہ دنیا کے اہم ترین ممالک کے دستوروں پر غور کرنے سے واضح ہو جائے گا۔ کسی مملکت کے دستوری سے یہ امر واضح ہو سکتا ہے کہ عملی اقتدارِ اعلیٰ منقسم ہے یا غیر منقسم، اور وہ جس ادارے کے ساتھ وابستہ ہے اس کی بنا قانون پر ہے یا محض رواج پر، اور اس کا منہج و مآخذ دراصل وہی مملکت ہے جس میں اس کا وجود ہے یا اسے کسی اور مملکت نے تفویض کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اس امر کا تعین ہو جائے کہ اقتدارِ اعلیٰ کس کس ادارے کے ساتھ وابستہ ہے تو ساتھ ہی یہ بھی صاف ظاہر ہو جائے گا کہ مملکت کی بہت ترکیبی کیا ہے، اور جیسے جیسے ہم مقتدرِ اعلیٰ کے مسئلے کا تجزیہ کرتے جائیں گے ویسے ہی ہمارے سامنے گویا مملکت کا صحیح نقشہ آتا جائے گا۔

اگر ہم دنیا کے مختلف دستوروں پر غور کریں تو ہم سب سے کم پیچیدگی اس مملکت کے دستور میں پائیں گے جو اندرونی اور بیرونی معاملات میں بالکل آزاد ہو، اور جس میں جملہ اختیاراتِ حکومت ایک ہی مرکز کے ساتھ وابستہ ہوں۔ عام طور پر ایسی مملکت کو ”فردیہ“ کہتے ہیں، اور اس کی ممتاز ترین مثالیں انگلستان اور فرانس کی مملکتیں ہیں۔ انگلستان میں کوئی ایسا دستاویز نہیں جس کو ”دستور کا لقب دیا جاسکے، بلکہ دستور سازی اور معمولی قانون سازی دونوں پردوں کی پارلیمنٹ حاوی ہے۔ اس پارلیمنٹ کے تین طبقے یا اجزاء قرار دئے جاتے ہیں، یعنی بادشاہ دارالامرا اور دارالعوام، لیکن یہ امر قابلِ انکار ہے کہ علاوہ رائے دینے کے بادشاہ

کاب کوئی سیاسی اقتدار باقی نہیں رہا، اور اب تو شاہ انگلستان کسی سیاسی حکمت عملی میں شاید رائے دینا بھی پسند نہیں کرتے۔ رہا دارالامرا، تو اگر دارالعوام کسی خاص امر پر اڑ جائے اور انتخاب جدید یا امتداد زمانہ سے یہ بھی ثابت ہو جائے کہ ملک کی عام رائے اس رائے کے موافق ہے، تو دارالامرا کو قانون منظور کرنے کے سوا چارہ باقی نہیں رہتا۔ گویا کہ علی اقتدار اعلیٰ یہاں عام طور پر رائے و منہ دل اور ان کے اُن نمائندوں کے ساتھ وابستہ ہے جنہیں دارالعوام میں نشست کرنے کا حق حاصل ہے۔

فرانس کی صورت، آلات ذرا مختلف ہے۔ ۱۷۹۰ء کے دستور کے مطابق جس میں ۱۷۹۰ء میں اہم ترمیم کی گئیں چند خاص خاص امور میں اس وقت تک ترمیم نہیں ہو سکتی جب تک اس ترمیم کے لئے ایک مخصوص طریق کار پر عمل نہ کیا جائے، گویا کہ یہاں علی اقتدار اعلیٰ دستور ساز جماعت اور معمولی پارلیمنٹ کے درمیان منقسم ہوتا ہے۔ مثلاً دستور فرانس کا ایک جزیہ یہ بھی ہے کہ پارلیمنٹ ہمیشہ دواویائی ہوگی

۱۷۹۰ء دیکھو، کاؤنٹ گری، "۲۵ سالہ عمر گزشت" Viscount Grey:

Twenty-five years. جلد باب ۱۲

۱۸۱۹ء اس کے لئے مطالعہ کیا جائے قانون پارلیمنٹ ۱۷۹۰ء جس پر فیئرڈاکی نے اپنی کتاب

"تقریب قانون دستور" Dicey: Introduction to the Law

of the constitution (۱۹۱۲ء) کی تہدید میں بحث کی ہے۔

۱۸۹۰ء "ڈروون" Woodrow Wilson: The State، ملک

اس اصول میں اس وقت تک ترمیم نہیں ہو سکتی جب تک یہ مسئلہ ایک خاص ضابطے کی رو سے ”جمہیت قومی“ کے سامنے نہ لایا جائے۔ اس کے عکس رلئے دہی کا مسئلہ تحریری دستور فرانس کا جزو نہیں یعنی اس میں ترمیم معمولی قوانین کی طرح ممکن ہے۔
 فردیہ سے کہیں زیادہ پیچیدگی ان ملکوں میں پائی جاتی ہے جہاں اختیار شدہ حکومت میں سے بعض تو مرکزی ادارات کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں اور بعض مملکت کے مختلف اجزاء کے درمیان اصطلاح میں ”ریاست“ کہتے ہیں اس پر کردئے جاتے ہیں۔ لیکن اس سیرورگی کا اختیار مرکزی ادارات کے بجائے ایک یا ایک سے زیادہ دستور ساز جماعتوں کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ اس قسم کی مملکت کو ”وفاقہ“ کا لقب دیا جاتا ہے، اور اس کی ممتاز ترین مثالیں ملائکہ متحدہ امریکہ، برازیل، کیناڈا، آسٹریلیا، سوئیڈن اور روس ہیں۔ ایسی مملکتوں کے اقتدار اعلیٰ کے متعلق ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ ان میں یہ اقتدار مرکزی اور ریاستی ادارات کے درمیان تقسیم ہوتا ہے لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں ان دونوں قسم کے ادارات سے بالاتر ایک اور ادارہ ہے جس کے ذرائع سے دستوری یعنی مرکزی اور ریاستی ادارات کے درمیان تقسیم کاری ترمیم ہو سکتی ہے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ یہ دستور ساز ادارہ ہی مقتدر اعلیٰ ہے۔ حقیقت میں یہی نظریہ ہے جو عام طور پر قبول کیا جاتا ہے لیکن دستور ساز ادارہ نہایت کم کار فرما رہتا ہے، اس لئے کہ سالہا سال میں ایک آدھ ہی مرتبہ میں دستور میں تبدیلی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ کہاں تک مناسب ہے کہ ایک ایسے ادارے کو جو اکثر و بیشتر خفہ سے مقتدر اعلیٰ کا لقب دیا جائے۔ اس لئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ وفاقوں میں

اقتدارِ عالی چار مختلف ادارات میں منقسم ہوتا ہے۔ جہاں تک ان امور کا تعلق ہے جو موجودہ دستور کی بنا پر بلا دستور سراجِ جماعت یا جماعتوں کی منظوری کے طے نہیں ہو سکتے، ایسے امور میں یہ جماعت یا جماعتیں مقتدرِ عالی ہوتی ہیں، ان کے علاوہ جہاں تک روزمرہ کے انتظامات کا تعلق ہے، اقتدارِ عالی کا ایک جزو جو مرکزی ادارات اور دوسرا ریاستی ادارات کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے، مثلاً جہاں ایک طرف ممالک متحدہ امریکہ کی کوئی ریاست خارجی معاملات اور سکہ سازی میں مداخلت نہیں کر سکتی، وہاں مرکزی حکومت کو تعزیری قوانین و مناکحت و ازدواج کے قوانین میں دست اندازی کرنے کی قطعاً ممانعت ہے۔ ظاہر ہے کہ مختلف ممالک کے واسطیہٴ ان کے حسبِ حال ہوتے ہیں، لہذا اس قسم کے اصول میں بھی ممانعت ہر نا لازمی ہے۔

زمانہِ حالیہ کی مملکتوں میں دو قسم کی مملکتیں ایسی ہیں جن کا ذکر کرنا ابھی باقی ہے ایک تو برطانوی سواراجی قلمروں اور دوسرے وہ ممالک جن کے اختیارات میں نامساعد متبذمانہ سے تحدید ہو گئی ہے۔

ان میں سے برطانوی سواراجی نوآبادیوں کی سیاسی حیثیت میں بعضیں اب ”قلمروں“ کا لقب دیا گیا ہے، ایک عظیم الشان تبدیلی ہو گئی ہے۔ گویا بیسویں صدی عیسوی کے وسط سے برطانیہ کا طرزِ عمل یہ رہا ہے کہ جب کسی نوآبادی کو خود مختارانہ اختیارات دے دے جائیں تو ان میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے، اور اسی وجہ سے عام طور پر کنڈا، آسٹریلیا، جزیرہ آفریقہ جیسی قلمروں کے معاملات میں مداخلت نہ

۱۱۰ یہ آخری خیال میراثی خیال ہے۔

سے انگریزی حکومت نے اپنے حق امتناع کو استعمال نہیں کیا تھا لیکن یہ صورت حال کسی صریح قانون پر مبنی نہیں تھی، بلکہ بقول پروفیسر ڈاکسی کے شہنشاہی پارلیمنٹ برابر سلطنت برطانیہ کے ہر حصے پر اپنے اقتدار اعلیٰ کی دعویٰ کرتی تھی لیکن قانون دسٹنسٹر ۱۸۹۱ء کے بموجب اب یہ طے ہو گیا ہے کہ قلمروں کی کسی حالت اور صورت سے انگریزی حکومت کے ماتحت نہیں ہیں اور اب سلطنت برطانیہ کی حیثیت تقریباً وہی ہو گئی ہے جو ۱۹۰۱ء سے پیشتر سوئڈن اور ناروے کی تھی، یعنی مختلف قلمروں کا واحد نقطہ اتصال بادشاہ کی ذات باقی رہ گیا ہے۔ اس کے معنی ہوئے کہ جہاں ۱۹۲۳ء سے پیشتر سلطنت برطانیہ میں اقتدار اعلیٰ برطانوی ادارات کو حاصل تھا، وہاں اب وہ ہر ایک قلمرو کے ادارات کو علیحدہ علیحدہ حاصل ہو گیا ہے۔ راجا بادشاہ کا واقعی حق امتناع، تو نہ وہ ۱۹۲۳ء سے پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ یہ سلسلہ اور بھی زیادہ صاف ہو جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نومبر ۱۹۲۶ء کے اعلان امپریل کانفرنس میں یہ صریحاً بیان کر دیا گیا ہے کہ یہ قلمروں "برطانوی دولت عامہ انوام" میں محض انہی خوشی و خاطر سے شامل ہیں، جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ اگر کوئی قلمرو چاہے تو وہ اس مجموعے سے

۱۹۲۶ء "قانون دستوری" Law of the Constitution" اشاعت کے وقت
 ۱۹۲۶ء کے دستور کے مطابق ایک قلمرو یعنی ایرستان نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ وہ مقتدر
 اعلیٰ خود مختار اور عمومی حکمت ہے "اس دستور بادشاہ کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔ دیکھو سالنامہ
 برلن" Stateman's year Book ۱۹۳۰ء ص ۱۵۷۔

بغیر کسی قسم کے جبر واکراہ یا جنگ و جدال کے علیحدہ ہو سکتی ہے۔
اب صرف ان ممالک پر نظر ڈالنا باقی رہ گیا ہے جن کے کسی نہ کسی ادارے کو
کسی زمانے میں اقتدار اعلیٰ حاصل تھا لیکن اب وہ کہیں انتقال ہو گیا ہے۔ ایسے ممالک
کی بہارے لئے ایک بدیہی مثال خود ہندوستان ہے، جہاں کی مملکت یا مملکتوں
کا اقتدار اعلیٰ علاوہ چند مشتے زمانوں کے، اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط تک
مسلط نہیں مملکتوں کے اندرونی ادارات کو حاصل تھا۔ اس صورت حال میں ایک
بہت بڑی تبدیلی ۱۷۵۷ء میں ہوئی جب شہنشاہ ہند نے بنگالہ، بہار، اڑیسہ
اور کراچیک کے دیوانی اختیارات انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپرد کر دیے لیکن
اقتدار اعلیٰ خانوآباد شاہی کو حاصل رہا، اور کراچیک و بنگالہ میں انگریز، جنوب میں
فرانسیسی اور وسط ہند میں مرہٹے یہ سب بادشاہ ہندوستان کی طرف سے حکومت
کرتے رہے۔ لیکن ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب دراقع اس بادشاہ کے حکومتی اختیارات
سلب کر لئے گئے اور اقتدار اعلیٰ پہلے انگریزی تجارتی کمپنی کو اور پھر تاج برطانیہ کو حاصل

۱۷۵۷ء اس اصول کا ایک نہایت دلچسپ مظاہرہ مارچ ۱۷۵۷ء میں ہوا جب جنوبی افریقہ کے وزیر اعظم
جنرل ہنزوگ کے شہنشاہی کانفرنس کی قراردادوں کی توثیق کی تحریک کرتے ہوئے دہلی کے ایوان
جمعیت میں ایک تقریر کے دوران میں میرا کے ظاہر کی کہ ہنزو کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی جنگ میں جس
میں برطانیہ ایک فریق ہو، اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دے۔ نیز دسمبر ۱۷۵۷ء میں ڈچی و ولیم
صدر مجلس عاملہ ایرسٹان نے اعلان کیا کہ شاہ انگلستان کو ایرسٹان کے صرف خارجی مسائل پر
وہ بھی ایک حد تک تفرق باقی رہ گیا ہے۔

ہو گیا۔ ہیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ اختیار محض مفوضہ ہے؛ کوئی مملکت کلیتہً اپنے اقتدار اعلیٰ سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہونا پسند نہیں کرے گی، اور آج کل ہندوستانی اختیارات کی جو حدائیں ہوا میں گشت لگا رہی ہیں ان کے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ ہم درجہ مملکت ہند اپنے ان اختیارات کو جو اسے کسی زمانہ میں انگریزوں کے سپرد کر دینے پڑے تھے، ہندو تاج یا وقت واہدی واپس لینا چاہتی ہے اور اس طرح دوبارہ خوددار ملکوں کی صف میں بیٹھنے کی آرزو کا اظہار کر رہی ہے۔

LAW

باب ، قانون

قوانین کے امتیازات - قانون ساز - قانون اور عادل حقیقی انسانی قوانین میں پردہ ہوتے ہیں۔

قانون کا اخذ - انسانی قانون کے اقسام

پچھلے باب میں دکھایا جا چکا ہے کہ ملکیت کا قیام اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کوئی ایسی شخصیت موجود نہ ہو جو نہ صرف افراد کے باہمی مناقشات کو طے کرنے اور اپنے احکام کا نفاذ بشرط ضرورت بالجبر کرانے کی اہل ہو، بلکہ جو اس تعداد کو بھی دور کر سکتی ہے جو باشندگان ملک کے انفرادی احساسات و فداات اور ملک کی اجتماعی ضروریات کے مابین پیدا ہو جائے۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ وہ شخصیت سیاسی اصطلاح میں مقتدر اعلیٰ کہلاتی ہے، اور جس آلہ کار کے ذریعے سے وہ اپنے فرائض منصبی انجام دیتی ہے اُسے ”ہیئتِ حاکمیت“ کا لقب دیا جاتا ہے۔ اس ہیئتِ حاکمیت سے کوئی ایک شخص مراد نہیں، بلکہ وہ جملہ ایسے افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو از روئے دستور اس ملک کے سیاسی امور میں اپنے اختیارات کو حد تک مصروف ہوتے ہیں۔

قوانین کے امتیازات - ظاہر ہے کہ ایسے مرکب معاشرے ہیں

کوئی نہ کوئی ایسا مرکز ضرور ہو گا جس کے احکام اٹل اور جس کی تجاویز ناقابل تردید ہوں گی، اس لئے کہ اگر اس معاشرے کے مرکز مختلف ہوں تو یقین ہے کہ بہت جلد اس کا شیرازہ بکھر جائے گا اور ملکیت منتشر ہو جائے گی۔ اسی مرکز کے احکام کو قانون کہتے ہیں، اور اگر غور کیا جائے تو اسی پر جماعت و ملکیت کا کلیتہ دار و مدار ہے۔ سب سے پہلا مسئلہ جس پر غور کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آخر قانون کا ٹھیک منہوم کیا ہے۔ آج کل دو تین اصول ایسے زبان زد خاص و عام ہیں جن سے قانون کا التباس نہ صرف ممکن ہے بلکہ اگر نظر غائر ڈالی جائے تو اغلب ہے۔ ہم روزمرہ ایسے الفاظ جیسے ”قانون فطرت“ ”ہدائی قانون“ ”بین الاقوامی قانون“ ”قانون“ ”قانون معاہدہ“ ”قانون جرایم“ سنتے ہیں، اور جب ہم ان پر ذرا بھی غور نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان سب ”قوانین“ کے مابین اصولی فرق نظر آتا ہے، جس کی وجہ سے اصلی اور واقعی انتہائی قانون جس ملکیت کی شیرازہ بندی ہوتی ہے اور دوسرے ”قوانین“ کے مابین امتیاز کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اگر اس انتہائی قانون کو پیش نظر رکھا جائے تو روزمرہ کی اصطلاح میں اس میں اور انصاف میں بہت ہی کم فرق معلوم ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس محکمہ ملکیت کو بھی، جس میں اس ”قانون“ کا نفاذ ہوتا ہے ”عدالت“ کا لقب دیا جاتا ہے۔ بدین سبب اس کی ضرورت ہے کہ قانون کا ٹھیک منہوم اچھی طرح دیکھ لیں کر لیا جائے۔

سب سے پہلے تو انتہائی قوانین کا اس قسم کے قوانین سے جیسے قوانین فطرت، خدائی قوانین، بین الاقوامی قوانین، وغیرہ سے امتیاز کرنا چاہئے۔ انتہائی

قوانین دراصل ان ملکی یا قومی قوانین کا نام ہے جن کا مقصد راعی نے سببیت حاکم کے کسی جزو مجاز کے ذریعہ سے نفاذ کیا ہو، اور جس سے روگردانی کے بعد روگردان کو یا تو سزا کا سخت سمجھا جائے ورنہ اسے کسی قسم کی تکلیف یا دقت کا سامنا کرنا پڑے۔ یہ کیفیت ”قوانین فطرت“ کی نہیں ہے۔ قوانین فطرت ان مضر و مضہ قوانین کا نام ہے جنہیں تمام نئی نوع انسان پر حاوی سمجھا جاتا ہے، اور جن سے نئی آدم کے باہمی تعلقات کا تعین ہوتا ہے۔ ”قوانین الہیہ“ ان قوانین کو کہتے ہیں جن کا منبع ذات باری تعالیٰ کو سمجھا جاتا ہے؛ یہ قوانین فطرت سے زیادہ متعین ہوتے ہیں، چنانچہ بہت سے ممالک میں یہ اثباتی قوانین کے منافع و مافذ بھی بن جاتے ہیں۔ ”بین الاقوامی قوانین“ ان اصول کا مجموعہ ہیں جن پر مختلف ممالک کے باہمی تعلقات و عہد نامہ جات مبنی سمجھے جاتے ہیں؛ جب تک قوانین کسی ملک کے اثباتی قوانین کی شکل اختیار نہ کر لیں اس وقت تک انہیں صحیح معنی میں قوانین کہنا مناسب نہیں، اور ان کی خلاف ورزی پر ملزم کو عام طور پر کوئی ایسی قانونی سزا دی جاتی جس سے اسے کسی خاص قسم کی تکلیف پہنچے۔ اسی طرح اثباتی قوانین کو ماتحت قاعدہ ساز ادارات مثلاً مجلس بلدیہ یا مجلس ریلوے کے قواعد سے بھی ممیز کرنا چاہئے اس لئے کہ یہ موثر الذکر قواعد محض کسی نہ کسی اثباتی قانون کے تحت عدم سے وجود میں آئے ہیں اور ایک دوسرا اثباتی قانون انہیں یک نام نہ نہ کر سکتا ہے۔ اثباتی قانون مملکت پر اس درجہ حاوی ہو سکتا ہے کہ ایک جس

بیاست وال کہتا ہے کہ ملک کی حکومت کا دائرہ عمل کلیۃً قانون کے حدا اختیار سے محدود ہے اس لئے کہ ملک کے احکام سے خلاف ورزی کرنے والے کو صرف اسی کے ذریعے سے مجبور کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح عام طور پر قانون اور انصاف کو ہم معنی قرار دیا جاتا ہے اور دونوں کو اخلاق پر مبنی سمجھا جاتا ہے۔ یہ لازمی نہیں کہ جو قانون مروجہ ہو وہ بالکلینہ نام نہا انصاف پر مبنی ہو۔ مثال کے طور پر اگر ذید نے کچھ رقم غمرو سے قرض لی اور اس کے دعوے میں حامدی عارض ہو گئی تو ایسی صورت میں انصاف کا تقاضا یہ ہوگا کہ ذید وہ رقم کو وہ رقم واپس لے لے، لیکن غمرو کسی قانونی چارہ جوئی کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا۔ دراصل انصاف کی بنا اخلاق پر ہے، اور عیا انگلستان کا ایک نامور عادل لارڈ کوکرج اپنی ایک تجویز میں کہتا ہے: ”گو قانون اور اخلاق ایک دوسرے کے مترادف نہ ہوں اور بہت سے ایسے افعال بد سمجھے جائیں جو خلاف قانون نہ ہوں، تاہم اگر اخلاق کو قانون سے کلیۃً علیحدہ سمجھا جائے گا تو اس کے نتائج بہت ہی بُرے نکلیں گے“ ممکن ہے کہ کوئی شخص شخصیت ایک شوہر یا باپ یا بھائی یا اتاد کے کمال اخلاقی معیار پر پورا نہ اتر سکے لیکن ساتھ ہی اس سے کسی قسم کا خلاف قانون عمل سرزد نہ ہوا ہو اور وہ قانون کی زد میں نہ آتا ہو بعض اخلاقی اہل کی ترویج میں یہ کمزوری رہ جاتی ہے کہ اس کی خلاف ورزی سے کوئی لازمی نقصان مرتکب کو نہیں پہنچتا، بلکہ بعض مرتبہ تو اسے بظاہر مادی فائدہ ہی حاصل ہوتا ہے،

در آنجا یکہ خلاف ورزی قانون کی صورت میں جلد وسائل مملکت اس کے خلاف استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اگر اخلاق مردوجہ اور قانون جاریہ کے اصول ایک دوسرے سے متعلق ہوئیں تو یہ مملکت کے لئے بہترین صورت حال ہوگی۔

Legislature

”قانون ساز“۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ قانون مملکت کے امن احکام کو کہتے ہیں جن کا ماننا ہر فرد مملکت کا فرض ہے، اور اس سے روگردانی کی حالت میں مملکت اپنی قوت و جبروت روگردال کی سزا اور بدامنی کے دفعیہ میں صرف کر دیتی ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر مملکت میں کوئی نہ کوئی ایسا شخص ضرور ہوگا جس کے سپرد قانون سازی کا فرض ہوگا، یعنی جسے یہ اختیار ہوگا کہ ملک کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر ایسے قواعد بنائے جن کے ذریعے سے بدامنی نہ ہونے پائے اور افراد مملکت کے مابین تعلقات داد و ستد بے کھٹکے قائم رہ سکیں۔ ساتھ ہی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر مملکت میں، خواہ اس کی حکومت شخصی ہو یا جمہوری، پارلیمنٹری ہو یا صدارتی، کوئی نہ کوئی قانون ساز شخصیت ضرور ہوتی ہے۔ بعض مرتبہ یہ منصب شخص واحد مثلاً بادشاہ کے متعلق ہوتا ہے، جسے خاص طور پر قانون سازی

۳۵ حیدرآباد کے ایک نہایت لغت آؤں مقدمے میں یہ اکیس ناک انکشاف ہوا کہ برطانوی ہند (اور اس کے انتہا میں حیدرآباد) میں یہ قانونی جرم نہیں کہ کوئی شخص اپنی تحریکات میں سے کسی کے ساتھ شخصی براخلائی کا مرتکب ہو۔ اس مقدمے کو اب (۱۹۳۲ء میں) چار سال ہونے کوئے اور اس وقت تک حیدرآباد یا برطانوی ہند کی مجلس مقننہ کے کسی رکن نے یہ رسم قانون کی کوئی تحریک پیش نہیں کی!

کا اہم خستہ پارہ جسے اس کے علم یا ادارک یا موردی اثر کے باعث دیا جاتا ہے بعض مرتبہ اسے اہم ترین اختیار تصور کر کے ایک ایسی جماعت مقننہ کے سپرد کر دیا جاتا ہے جس میں تقریباً ہر شعبہ زندگی کے نمایندے ہوتے ہیں، تاکہ وہ موجودہ قوانین کی خامیوں کو سمجھ کر اور ملک کی، یا کسی خاص طبقے کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر قانون بنائے یا اس میں ترمیم کرے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ قانون ساز شخص یا جماعت خواہ کتنی ہی سمجھ دار کیوں نہ ہو یہ ناممکن ہے کہ وہ تمام ایسے واقعات کے لئے قواعد بنائے گی جو اس وقت تک پیش نہ آئے ہوں۔ مثلاً جس شخص یا جماعت کے سپرد قانون سازی ہو وہ چوری کی سزا مقرر کر سکتا ہے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ آئندہ جتنے طریقوں سے چوری کی جائے گی وہ سب اس کے پیش نظر ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ قانون ساز شخص یا جماعت کسی جرم کی قطعی سزا مقرر نہیں کرتی بلکہ حاکم عدالت کو بہت بڑا اختیار تیزی دے دیتی ہے کہ ایک حد کے اندر جتنی چاہے سزا دے۔

ہیں ایک اور طرح نظر رکھنا چاہئے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ حقیقی قانون ساز یعنی ایسے احکام دینے والا جنہیں قانون کا رتبہ حاصل ہو، کوئی قانون الفطرت ہی سمجھ جائے اور دنیوی حکام کے سپرد ان احکام کا نفاذ اور ان کی تادل کرنے سے زیادہ اختیار تادل یا ان اصول کو موجودہ صورت حال پر مطبق کرنے کا اختیار ہو۔ یہ اختیار اس قدر عظیم الشان ہے کہ اس پر ایک بہت بڑے نظام قانونی کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔ مثلاً جن ممالک میں اصول اسلامی کا رواج ہو ان کے قوانین کا دائرہ کار قرآن مجید اور احادیث نبوی پر تھا، لیکن ساتھ ہی ضروریات زمانہ کے امتداد سے بڑے بڑے علماء و ائمہ نے جو اس کی تاویلیں کیں اور صورت حال کو مد نظر رکھ کر جو

قائمے شائع کئے جن سے وہ عظیم الشان نظام قانونی نکلا جسینی ابجدہ شرع اسلامی کا لقب دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ممالک میں جہاں کسی قسم کا الہی قانون رائج ہوا اور جہاں کا حاکم اس کا پابند ہو، وہاں دوطرح کے حکام ملیں گے، ایک وہ جو ضروریات زمانہ کے اعتبار سے خود اس کی توسیع کرے یا علحدہ اور کم وقت سے کرے، دوسرے حکام عدالت جو ان توسیع شدہ قوانین کو واقعات حالیہ پر تطبیق کریں اور حسب حال وقتی احکام شائع کریں۔

قانون اور عدول۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قانون کی کون سی شکل کا تعلق حقیقتاً افراد ملکیت سے ہے اور وہ کون سے احکام ہیں جو دراصل ملکیت کے اجزاء کو انتشار و افتراق سے روکتے ہیں۔ بلاشبہ وہ اصول جو احکام الہیہ میں منضبط ہوں یا وہ قواعد جو قانون ساز نے منظور کئے ہوں، بہت اہم ہوتے ہیں، اور انہیں پرملکی قوانین کا دار و مدار ہوتا ہے لیکن جیسا اوپر کہا جا چکا ہے، تا دقتیکہ مقدمہ کی واقعی نوعیت نہ معلوم ہو، قرین ثانی پر کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ جب جان اسٹین یہ کہتا ہے کہ قانون مقدر الہی کے حکم کا نام ہے، تو وہ فوراً اپنی کمزوری محسوس کر لیتا ہے اور معاً یہ بھی کہتا ہے کہ جس امر کی مقدر الہی اجازت دے وہی بنیاد اس کے حکم کے لئے ہے، اور ظاہر ہے کہ اجازت ظاہری بھی ہو سکتی ہے اور معنوی بھی۔ اس سے یہ صاف پایا جاتا ہے کہ خود اسٹین کو اپنی تعریف کی کمزوری کا علم تھا، وہ جانتا تھا کہ جماعت متفلسفہ یا شخص

قانون ساز کے بنائے ہوئے قواعد دراصل ملکی قوانین کا محض عشر عشر ہیں، اور بہت سے ایسے معاملات زیر بحث آسکتے ہیں (اور درحقیقت روزمرہ آتے ہیں) جن کا حل ان قواعد و قوانین سے ہونا نہایت دشوار ہے، چنانچہ اس کے لئے آزادانہ تادیل کے ذریعہ سے موجودہ قوانین میں ایک بڑی حد تک توسیع و اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اس قسم کی تادیلات کو محض "اجادت" کا لقب دینا اس لفظ کو خود ساختہ اور غلط معنی پہناتا ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ جب مقدمہ عدالت کے سامنے جاتا ہے تو عادل پہلے یہ دیکھ لیتا ہے کہ آیا معاملہ زیر بحث پر موجودہ قوانین کا انطباق ممکن ہے یا نہیں۔ اگر یہ ممکن ہو تا ہے تو وہ فوراً اس کے مطابق اپنی تجویز دے دیتا ہے، اور (جیسا کہ بیشتر معاملات میں جزا اور بعض میں کلام پیش آتا ہے) موجودہ قوانین میں سے کسی کا کلیتہً انطباق ممکن نہیں، تو وہ فی الفور اس معاملے کو طے کرنے کی غرض سے اپنے فہم و ادراک اور اپنی قوتِ تحلیل کو کام میں لاکر اور جدید قواعد وضع کر کے اس کے مطابق تصدیق کر دیتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ جدید قواعد یہ عادل بنائے گا وہ اصولاً موجودہ قوانین کے منافی نہیں ہوں گے، لیکن اس کی دائمی کیفیات بحسبہ اسی قسم کی ہوں گی جیسی کسی نام نہاد "قانون ساز" شخص یا جماعت کی جب وہ چند خاص ضروریات کو پیش نظر رکھ کر قواعد بنائے۔ دونوں صورتوں میں جملہ عناصر کم و بیش یکساں ہی ہیں، دونوں کے سامنے ایک یا چند مسائل ہوتے ہیں جن پر موجودہ قانون کا انطباق نہیں ہوتا، دونوں ان کا حل چاہتے ہیں، دونوں ضروریات ملک اور معائنہ زیر بحث کو پیش نظر رکھتے ہیں، اور دونوں ایسے قواعد وضع کرتے ہیں جنہیں وہ اس کے حل کے لئے مناسب سمجھتے ہیں؛ فرق صرف یہ ہوتا ہے (اور یہ

فرق نہایت اہم ہے، کہ عادل کو اپنی تجویز بیرونی اثرات سے آزاد ہو کر دینی چاہیے۔
 اور آئینہ قانون ساز شخصیت پر بیرونی اثرات پڑتے ہیں اور وہ عام رائے،
 اخبارات وغیرہ کی تنقیدوں کو پیش نظر رکھتی ہے۔

اس اصول کی مراد یہ نہیں کہ لے ایک مثال دینا ضروری ہے۔ فرض
 کیجئے، زمین نے اپنی اراضی میں ایک ٹھکانا لایا بنا کر اس میں پانی بھر اوجھی الامکان
 اس کی مضبوطی و حفاظت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ لیکن ملکیت اپری
 میں کسی کو چارہ نہیں، چنانچہ آفت ارضی و سماوی کی وجہ سے اس ٹھکانا کا پلٹہ
 پھٹ گیا اور پانی کے زور سے عمر و کی اراضی کو جو اس کے دامن میں واقع تھی،
 سخت نقصان پہنچا۔ اب ایسے معاملے کے تصفیہ کے لئے عادل کیا کیسے گا؟
 زمین نے حتی الامکان اپنے پلٹے کی حفاظت کی اور کسی قسم کی غفلت نہیں برتی،
 ساتھ ہی یہ بھی مسئلہ ہے کہ زمین کا پلٹہ ٹوٹنے سے عمر و کا بہت کچھ نقصان ہوا۔
 ظاہر ہے کہ اس قسم کے معاملہ کے تصفیہ کے واسطے کسی قانون ساز کا بنایا ہوا
 قانون ڈھونڈنا بالکل بے سود ہو گا، اور اس کے لئے عادل کو اپنا اختیار
 تمیزی کام میں لانا پڑے گا، گویا کہ ایک جدید قانون وضع کرنا پڑے گا جو معاملہ
 زیر بحث پر مطبق ہو سکے، اور خود ہی اس کے مطابق تصفیہ کرنا پڑے گا۔ بحسنہ
 اس قسم کا مقدمہ مالک متحدہ امریکہ کی دو ریاستوں کی عدالتوں میں پیش ہوا، اور
 جو امر لٹا ہر تحریر نقل ہے وہ یہ ہے کہ دونوں میں ایک دوسرے کے مخالف
 تصفیہ ہوا، یعنی ایک ریاست کی عدالت عالیہ نے یہ فیصلہ کیا کہ عمر و زبردست
 ہر جہ وصول کر سکتا ہے، لیکن دوسری ریاست میں اس کے برعکس یہ طے ہوا کہ

چونکہ زید کسی قسم کی غفلت کا مرکب نہیں ہوا اس لئے اس سے ہر جہ وصول نہیں کیا جاسکتا ہے۔

یہ تو ایسے معاملات تھے جن کا تصفیہ کسی مردِ جہ قانون کی بنا پر نہیں کیا جاسکتا۔ اب ایسے معاملات کو لیجے جن کے متعلق قوانین موجودہ میں اصول تو مدون کئے گئے ہیں لیکن چونکہ قانون سازی کے وقت ہر امر مستقبل کی بابت پیش بینی کرنا ناممکن ہے اس وجہ سے قطعی فیصلے کے لئے حاکم عدالت کو اپنا اختیار تمیزی کام میں لانا پڑتا ہے۔ جہاں تک جرائم کا تعلق ہے عام طور پر قانون ساز محض زائد از زائد سزا کا تعین کرتا ہے، اور عدم سزا یا واقعی سزا کے تعین کو بالکل اختیار عدالت پر چھوڑ دیتا ہے۔ فرض کیجئے کسی شخص نے چوری کے ارادے سے زید کے گھر کا قفل توڑا، اور پھر اسو اپنٹول ہاتھ میں لے کر زید کے یلگ کمرے تک گیا اور اس کو مارنے کی دھمکی دی یہاں تک کہ زید نے انہیں صندوق کی کتبیاں اس کے حوالہ کر دیں، اور وہ مالِ مسروقہ لے کر جا رہا تھا کہ راستے میں گرفتار ہو گیا۔ اسے عدالت شاید اس شخص سے زیادہ سزا کا مستحق سمجھے گی جس

۳۰ مقدمہ جات رائل لیڈز بنام فلچر *Rylands v. Fletcher* دارالامدھنہ
۳۱ ساچو بنام ویل ووڈ *Marshall v. Wellwood*

۳۲ نیوجررسی صفحہ ۳۲۹

ان تمام مقدمات کا بیان کرے "قانون کی ماہیت اور اس کے اخذ" *Gravy: The Nature and Sources of the Law* میں دیا ہوا ہے۔

کے گھر سے مال مسروقہ تو برآمد ہوا ہے لیکن جس کے خلاف چوری کرنے کا تو کوئی ثبوت نہیں لیکن اس کا ثبوت ہے کہ اسے اس مال کے چوری کا علم تھا یا خود اس نے چوری کرائی تھی۔ دونوں صورتوں میں مال مسروقہ بھی موجود ہے، چور بھی موجود ہے، لیکن واقعات کے اختلاف کی وجہ سے شاید عادل سزا میں فرق کرے گا۔

حقیقی اثباتی قوانین پس پردہ ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں عدالت کے اختیارات تمیزی کی نوعیت کیا ہوگی؟ یہ بالکل درست ہے کہ کچھ علی مثال میں قانونی اصول پہلے سے موجود تھا، لیکن یہ امر ناقابل انکار ہے کہ اس سے کم از کم ان لوگوں کو مطلق کوئی مدد نہیں ملتی جن کے واسطے وہ وضع کیا گیا تھا۔ اس میں ذرا بھی کلام کی گنجائش نہیں کہ جس وقت چور چوری کرتا ہے یا کوئی فریق معاہدہ معاہدے کو فرخ کرتا ہے اس وقت اسے یہ ہرگز معلوم نہیں ہوتا کہ جب اس کے خلاف مقدمہ دائر کیا جائے گا تو حکم عدالت کیا حکم دے گا۔ کسی خاص معاملے کے متعلق یہ پیش بندی کسی حالت میں نہیں کی جاسکتی کہ دراصل کون سی قانونی تجویز اس کی بابت صادر کی جائے گی۔ گویا کہ اس معاملے کی نسبت حقیقی قانون پردہ خفا میں ہوتا ہے۔ یہ امر باعث تعجب ہے کہ باوجودیکہ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے نہایت بدیہی ہے، تاہم کوئی عدالت یا کوئی نام نہاد جماعت مقننہ اسے ماننے کے لئے بظاہر تیار نہیں ہے کہ واقعی قانون سازی دراصل محکمہ عالیہ کرتا ہے نہ کہ جماعت مقننہ اور موخر الذکر جماعت محض اصول طے کرنے پر اکتفا کرتی ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک قدیم قانونی اصول کے بموجب، "ناواقفیت قانون کوئی معقول عند نہیں" چنانچہ جب قانون داں

(۷ ص ۱۱۱)

دیکھتے ہیں کہ فی الواقع جماعت عالیہ ہی حقیقی قانون کا انکشاف کرتی ہے اور ہم تجویز عدالت کے اعلان کے کسی خاص مسئلے کے متعلق درستی قانون سے باطل ثابت رہتے ہیں، تو وہ عدالت کے اس زبردست منصب کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایک فاضل معنف اسی اصول کے متعلق کہتا ہے کہ قانون اُن قواعد کا نام ہے جنہیں عدالتیں تسلیم کر کے اُن پر عمل درآمد کریں۔ اسی اصول پر اس قاعدے سے کا دار مدار ہے کہ جب عدالتِ عالیہ کسی خاص مسئلے پر کوئی تجویز صادر کر دے تو پھر تجویز کو قانون کا رتبہ حاصل ہو جائے گا۔ اور آئندہ عدالت اُسے ماتحت اس پر عمل کریں گی۔ یہ اصول اس درجہ مسلمہ ہے کہ سلطنتِ برطانیہ اور ممالک متحدہ امریکہ میں تو ان تجویز کو آئندہ کے لئے نظیر کا رتبہ دیا جاتا ہے اور کسی عدالت ماتحت کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اس کے خلاف عمل کرے لیکن اکثر دیگر ممالک متحدہ میں ان تجویز کے الفاظ کی اتنی پابندی نہیں کی جاتی بلکہ اُن کے اساسی اصول کی پابندی کافی سمجھی جاتی ہے۔ ۱۷۱۷ء میں نائسی جرمنی میں ایک قانون منظور ہوا جس سے عدالتیں

(نہایت حاشیہ صلا) ۱۷۱۷

Ignorantia legis neminem excusat.

۱۷۱۷ء سائنڈ: "امول قانون" *Salmond: Jurisprudence.*

۱۷۱۷ء "امول قانون" *Hobland: Jurisprudence* باب اس کے

معلق اولگ اپنی کتاب "حکومت ہائے یورپ" *Ogg: Government of Europe*

میں لکھتا ہے کہ کم از کم سترھویں صدی میں انگریزوں کے نزدیک "قانون" کے معنی ایسے قواعد کے ہو گئے تھے جنہیں عدالتیں تسلیم کریں اور نافذ کریں۔ حال ہی میں جرمنی میں وال کے آخر میں

کی اہمیت اس سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ عادل کو اختیار ہے کہ کسی ایسے شخص کو سزا دے جسے مردہ تعزیری قانون کے مطابق سزا نہیں دی جا سکتی بشرطیکہ اس کے نزدیک وہ عام تعزیری اصول کے تحت یا ”مندرجہ ذیل احکام عامہ“ کے بموجب سزا کا مستحق ہو!

قانون کے ماخذ۔ اب یہ امر واضح ہو گیا ہو گا کہ تا وقتیکہ کسی قاعدے پر عدالت کی گویا مہر نہ لگ جائے اس وقت تک اسے پورے طور پر جہاں تک امر متنازعہ فیہ کا تعلق ہے، قانون کا رتبہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ اب غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ وہ کس قسم کے قواعد ہوتے ہیں جو قانون کا اعلان کرنے کے وقت عدالت مجاز کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو ان کی تعداد محدود ہے۔ ان تجاویز کے سب سے پہلے تو وہ ماخذ ہیں جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، یعنی عدالت ملے عالیہ مجاز کی تجاویز ماضیہ۔ دوسرے وہ قواعد ہیں جن کے قانون ہونے کا اعلان ملکی دستور سیاسی کے مطابق جماعت مقننہ یا دوسری قانون ساز شخصیت نے کر دیا ہے لیکن چونکہ قانون ساز کی نظر دوسری نہیں ہوتی کہ وہ تمام واقعات آئندہ پر حاوی

(نہیہ ڈٹ ملا کا) ایک نیا قانون نافذ کیا ہے جس کے بموجب اگر کسی مقدمے میں قانونی تجربہ رکھنے والے کے اعتراض کے متافی ہو تو عدالت کو اختیار ہے کہ قانون کے صریح معنی کے خلاف احکام صادر کرے۔

۹۹ سالنامہ برٹین، ۱۹۵۹ء صفحہ ۹۵۵۔ نیز دیکھو باب ۲۱ حاشیہ ۴

مطلہ اس بحث کے لئے دیکھو ”کوتی“: ”قانون عامہ“ *Willoughby: Public Law*

ہو سکے اس لئے) اسے مجبوراً بہت بڑا اختیار تیزی بحکمہ عدلیہ کو دینا پڑتا ہے اور جیسا بیان کیا جا چکا ہے حقیقی قانون متعلقہ کا اس وقت تک انکشاف نہیں ہوتا جب تک عدالت اپنی تجویز نہ دے دے۔ یہ دواخذ لوگوں کو یاد ہے جنہیں زیر نظر رکھنا دستور مملکت کے مطابق ہر عادل کا فرض عین ہوتا ہے، ان کے علاوہ بعض ایسے توابع بھی ہیں جن کا عام طور پر دستور مملکت میں کہیں ذکر نہیں ہوتا، لیکن عادل بعض مرتبہ انہیں بھی ملحوظ رکھنا اتنا ہی ضروری سمجھتا ہے جتنا موضوعی قوانین یا نفاذ کو اور یہ مذہبی احکام، رسم و رواج، مستند ائمہ قانون کی کتابیں اور نصیحت ہیں۔

تقریباً ہر ملک پر ایک دور ایسا گذرتا ہے جب وہاں کے قانون کا دار و مدار کلیۃً خدائی قانون پر ہوتا ہے۔ خود یورپ میں بھی جو آج کل دنیوی معاملات میں مذہبی قواعد کی دست اندازی سے اس قدر دیگر دواں نظر آتا ہے، اس قسم کا عہد گزر چکا ہے۔ رومن عہد میں سیاسیات میں مذہب کا بہت بڑا دخل تھا، اور تارچ رومان کے ہر مطالعہ کرنے والے کو اس عظیم الشان اثر کا علم ہے جو وہاں کے ”آگر دس“ یعنی پجاریوں کو سیاسیات پر چلا تھا۔ جب کبھی کسی ”آگر“ کو آسمان پر یا زمین پر یا کسی جانور کے جسم میں یا کسی اہل جگہ کوئی بدشگونی معلوم ہوتی تو وہ اپنے حکم سے تمام موجودہ سیاسی کارروائیوں کو یکدم موقوف یا ملتوی کر سکتا تھا اور اس کا حکم ناطق سمجھا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس اہم منصب نے بالکل سیاسی پہلو اختیار کر لیا، اور یہ روزمرہ کی بات ہو گئی

ﷺ کے حسبِ بالا باب ۴

ﷺ کے حسبِ بالا باب ۵

کہ جب کوئی اگر کسی خاص سیاسی فریق کا ہونا ہوتا اور فریق مخالف کسی جمعیت یا مجلس پر حاوی ہوتا تو وہ کسی فرضی بدھنگونی کا اکتشاف کر کے کارروائی کو اپنی طرف روک دینے میں دریغ نہ کرتا۔ قانون پر مذہب عیسوی کا اثر بھی کچھ کم نہیں تھا۔ چنانچہ پہلی چارم شاہ انگلستان کے زمانے کی ایک نظم میں مصریچا یہ حکم لگا دیا ہے کہ انجیل مقدس ایک ایسا قانون عامہ ہے جس پر جلد امتیازی قوانین کا دارو مدار ہے۔ یہی کیفیت مندرجہ ذیل جیسی کتب منود اور بعض صحائف سماوی کی ہے۔ قرآن مجید میں بھی بعض اصولی اور بعض تفصیلی قوانین مندرج ہیں اور انہی پر تمام فقہ اسلامی مبنی و مختصر سمجھا جاتا ہے۔

لیکن یہاں بھی یہ امر ملحوظ رکھنا چاہئے کہ کسی ملک میں صرف انھیں خدائی احکام کو قانون کا رتبہ حاصل ہوتا ہے جنھیں عدالت اعلیٰ مجاز تسلیم کر لیں۔ سب سے بدیہی مثال شریع اسلامی کی ہے۔ شریع اسلامی کے عروج کے زمانے میں یہ شریع جملہ معاملات مملکت پر حاوی تھی، لیکن امتداد زمانہ سے (خصوصاً جب غیر اسلامی قوانین کا عروج ہوا اور ان کا دنیا پر رواج ہو گیا تو) رفتہ رفتہ اس کے بعض حصوں کو نظر انداز کر دیا گیا اور آج شاید ہی کوئی ایسا ملک ہوگا جہاں اس کا تمام و کمال رواج ہو۔ ہندوستان میں

۱۱۴ "میکو" روم کی دستوری اور سیاسی تاریخ T. M. Taylor: *Constitutional and Political History of Rome.*

۱۱۵ سالنامہ ۲۲، پہلی ۲۲ صفحہ جس کا اقتباس الیڈ باب ۵ میں کیا گیا ہے۔

قانون کے ایک قانون کے مطابق شرع شریف اور دہرم شاستر کا نفاذ صرف معاملات وراثت اور مناکحت و ازدواج تک محدود رہ گیا ہے اور تعزیرات و ضربے جیسے معاملات پر اس کا مطلق کوئی اثر باقی نہیں رہا۔ بعض اسلامی مالک اس سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں اور انھوں نے ضروریات زمانہ کو ملحوظ رکھ کر اپنے خانگی قوانین بالکل نئے سانچے میں ڈھال دئے ہیں۔ یہ انفرادی دہرم قوانین سے اس عظیم الشان گریز کا ہے جو اس وقت یورپ و امریکہ میں جاری و ساری ہے۔ ہر بیچ خواہ ہندوستان کی طرح مذہبی قوانین کی جڑوں کی پابندی کی جائے یا ترقی و معاصر کی طرح اکثر معاملات میں مطلق پابندی نہ کی جائے، اس میں شبہ نہیں کہ مذہبی قوانین کی ترویج کا دار و مدار محض اس امر پر ہے کہ آیا عدالتیں اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں یا نہیں؛ اگر قانون ساز نے اس کی کوئی جرم کو صراحتاً رد کر دیا ہے تو لامحالہ عدالتیں اسے مسترد سمجھیں گی، اگر روئیں کیا ہے تو پھر اس کا تسلیم کرنا نظر اور خود اس کے اختیار تفسیری پر

ثالث قانون پابلیشٹ ۱۱ جارج نم ۷، باب ۱۰ دفعہ ۱۱ اس قانون کے مطابق ہندوؤں کے خانگی معاملات پر دہرم شاستر اور سکالوں کے خانگی معاملات پر شرع اسلامی کو حادی تسلیم کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے خانگی قوانین اور ملکی قوانین کے درمیان بعض تہ عجیب و غریب اختلاف نظر آتا ہے۔ اس کی مثال ۱۱۱۱ کے مشہور "ساروا ایکٹ" سے یہی چاہتی ہے جس کے بموجب اگر ۱۱ سال سے کم کی لڑکی ۱۱ سال سے کم کا لڑکا شادی کریں تو وہ ملکی قانون کے بموجب ایک قابل تعزیرات کا مجرم ہوگا گو شاید شاستر یا شرعاً اس کے وارث جائز تصور کئے جائیں۔

مختصر ہو گا۔

فرہی قوانین سے گزر کر رسم و رواج تک پہنچ جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رسم و رواج کو اتنا ہی، بلکہ بعضوں کی نگاہ میں تو اس سے زیادہ، تقدس حاصل ہے جتنا مذہبی قوانین کو۔ قدیم یونانیوں کا خیال تھا کہ جب کوئی حاکم کسی معاملے کا تصفیہ کرنے کی جھٹکتا ہے تو قہر میں نہایت مضبوط (جسے انصاف کا دیوتا سمجھا جاتا تھا) اس پر اپنی رائے لگا کر کہتا ہے 'اور وہی اس حاکم کی تجویز ہوتی ہے' چنانچہ ان تجاویز کو

مذہب شرع محمدی، محکمہ عدلیہ اور جماعت مفسرین کے حدود و مکمل دفعہ اسلامی کے حوالہ سے ظاہر ہو جائیگا۔ جملہ امثال سنت و اشعار میں اس اصول پر متفق ہیں کہ کوئی شخص اپنی جائداد وقف علی الاولاد کر سکتا ہے یعنی اس طرح پر وقف کر سکتا ہے کہ جائداد کا منافع اس کی اولاد اور اولاد کی اولاد کو ملے گا، تاکہ اس کی نسل میں سے کوئی باقی نہ رہے؛ اگر کوئی زمانہ آئے کہ اس کی نسل بالکل منقطع ہو جائے تو وہ پیر کی کار خیر میں لگا دیا جائے۔ یاد رکھیں اتفاق رائے ائمہ کے پریو کی نسل نے سترہ سو سے پہلے بار بار یہ طے کیا کہ اگر وقف کا مقصد فوراً کسی خیرات میں منافع کا صرف نہ ہو گا تو وقف کا لغو سمجھا جائے گا (محمد احسان اللہ چودھری بنام امر چند، ۱۷ کلکتہ صفحہ ۴۹) پریو کی نسل؛ البتہ محمد احسان بنام مپا دھر چودھری ۲۲ کلکتہ صفحہ ۱۷ پریو کی نسل؛ اور قانون کی یہ شکل ہو براس وقت تک جاری رہی جب تک کہ قانون سترہ سو سے زیادہ قانون جاری دفعہ اسلامی (ہندوستان کی مجلس مشن نے غلط فہمی کے لیے اس کی شرعی اصول اور اصول فرہی دیکھو عبدالحکیم۔

Abdul Rahim: Mohommadan Law

Jurisprudence. باب ۷ حصہ ۲ ص ۱۱۶

تھے جس میں کالقب دیا جاتا تھا اور لوگوں کا یہ خیال تھا کہ بادشاہوں کے پاس ان تجاویز کا گویا انبار لگا ہوتا ہے جس میں سے وہ چن چن کر ان کے مطابق مختلف معاملات کا تصفیہ کرتے ہیں۔ اگر ہم غور کریں اور ان کے معانی کے میں اسطورہ میں تو ہم پائیں گے کہ دراصل تھے مس نہیں کا ماخذ وہی رسم و رواج کا ذخیرہ تھا جس کے مطابق بادشاہ یا حکمران تجویزیں صادر کرتا تھا اور خود ہر مریٰ اشعار میں بھی تھے اس رسم و رواج کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ہندوستان میں رسم و رواج ایک مسئلہ ماخذ قانون ہے اور پنجاب تو اس قسم کے رواجی قوانین سے بھر پڑا ہے ساتھ ہی مختلف دیہات کے واجب العرضوں کو تسلیم کر کے مملکت نے اس اصول پر اپنی مہر ثبت کر دی ہے بعض مرتبہ بعض رواج کو ایسے قوانین جیسے قوانین دستور پر امتداد ملنے سے ترقی حاصل ہو جاتا ہے مثلاً انگلستان میں بادشاہ کو پارلیمنٹ کے منظور کردہ سودا پر یقیناً حق امتناع حاصل ہے، لیکن اسے دوسروں سے کام میں نہیں لایا گیا اور اب یہ اختیار گویا مملوب تصور کرنا چاہئے۔

مسند القانون اور فقہاء کی کتابیں بھی تجاویز عدالت کا ماخذ ہوتی ہیں۔ بلاشبہ اس قسم کی زبردست اور اہم کتابوں سے جیسے یوس فی نیان اور گایوس قانون کے عالمگیری اور ہدایہ، مشکشاہ اور دایہاگ، بیکسٹن اور کک ہیں، عادل اپنی تجاویز کے اصول افذ کر سکتا ہے اور ان کی سند پر اپنے خیالات کو مبنی کر سکتا ہے، لیکن تاوقتیکہ کوئی اعلیٰ عدالت مجاز ان کتابوں کے کسی اصول کے مطابق

کسی معاملے کا تصفیہ نہ کرے انہیں یا ان کے کسی جزد کو اثباتی قوانین کا رتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

قانون کا آخری ماخذ نصفت ہے۔ پروفیسر الینڈ اس کی تعریف یوں کرتے ہیں ”نصفت ان قواعد کا نام ہے جو موجودہ اثباتی قوانین کے دوش بہ دوش کسی اعلیٰ حاکم عدالت کے حکم سے جاری کئے جائیں۔ اثباتی قوانین اور قواعد نصفت میں باہمی اختلاف نظر آئے تو مؤخر الذکر کا ہی بول بالا سمجھا جائے گا۔ اگر دوسرے اعضائے حکومت پر حکام عدالت کی فوقیت اس وقت تک مشتبہ تھی تو اصول نصفت اور اس کی ترمیم و توسیع کے بعد تو اس میں کسی کا شبہ باقی نہیں رہتا۔ اثباتی قوانین موجود ہیں، ان قوانین پر حکم عمل ہو رہا ہے، لیکن عدالت ان پر لفظاً یا معنایاً عمل کرنے کی بجائے خود جدید قواعد وضع کرتی ہے اور ان کے مطابق معاملہ کا تصفیہ کرتی ہے۔ اس اصول کی ابتدا اور ترمیم بچائے خود ایک نہایت ہی اہم شاخ مطالعہ قانونی کی ہے، اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن ملک میں ان قواعد کی ابتدا ہوئی ان میں حکام بالا دست نے کس طرح سے دوفیوہ اثباتی قوانین کو نظر انداز کر کے جدید قواعد کی بنیاد ڈالی اور ان قواعد کے مطابق مقدمات کا تصفیہ کیا۔ قواعد نصفت کی بہری مثال قاعدہ حکم امتناعی ہے جس کی رو سے قبل تصفیہ مقدمہ محض ایک فریق کی درخواست پر عدالت فریق ثانی کو نہ آزمائے اور اسے دست کشی کا حکم دیتی ہے اور عدول حکمی کی صورت میں اسے سزا کا

رکب گردانتی ہے۔

اثباتی قانون کے اقسام قبل اس کے کہ ہم حقوق کی اہم بحث کی طرف متوجہ ہوں، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر آثباتی قانون کے اقسام بیان کر دے جائیں۔ یوں تو قانون کی تقسیم بہت سے اصول پر کی جاتی ہے، لیکن سیاست کے اعتبار سے اسے دو اصول کی بنیاد پر تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک تو اس کے مقصد کی بنا پر اور دوسرے طرز تحقیقات و تصفیہ کی نوعیت کی بنا پر۔ اگر غور کیا جائے تو قانون کے دو بدیہی مقاصد نکلیں گے؛ ایک تو افراد ملکیت کے حقوق و فرائض کو تعین اور دوسرے اگر شخصوں میں تنازعہ ہو تو اسے رفع کرنے یا اس کے طے

لئے یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عام قوانین کے مافذوں کو شمار کرنے کے ساتھ ہی فقہ اسلامی کے مافذ بھی شمار کر دے جائیں۔ فقہ اسلامی کی تدوین (جسے شرع محمدی کا لقب بھی دیا جاتا ہے) تقریباً تیسری صدی ہجری میں ہوئی۔ اس کے مافذ مفصلہ ذیل ہیں۔ قرآن مجید، حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، یعنی علماء و ائمہ قانون کا اتفاق رائے۔ قیاس یعنی اصول، قبل کو پیش نظر رکھ کر کسی ایک عالم فقہ کی ذاتی رائے، استحسان یعنی بغیر اصول، قبل کے پیش نظر رکھے ہوئے بعض عالم فقہ کی رائے کا واقعات متنازعہ پر انطباق۔ اس کے علاوہ عرف یعنی رسم و رواج کو بھی مافذ شرع اسلامی قرار دیا گیا ہے، بشرطیکہ اس کے خلاف کوئی نص صریح یا حدیث نہ ہو۔ اس پر سر عبد الرحیم نے اپنی کتاب "اصول قانون اسلامی" باب میں مفصل بحث کی ہے؛ علاوہ ازیں انحضرت کی تاریخ "فقہ اسلامی" (مترجمہ عبدالسلام ندوی) میں اصول اجتہاد کی تاریخ جسٹہ جسٹہ اس کی تفصیل کے مدارج واضح کئے گئے ہیں۔ (ذقیقہ ضابطہ پر)

کرنے کے طریقہ کا تعین پہلی قسم کے قوانین کو "قوانین موجہ" اور دوسری قسم کے قوانین کو "قوانین اضافی" کہتے ہیں۔ قوانین موجہ میں اس قسم کے قوانین جیسے قانون معاہدہ، قانون ازالہ حیثیت عربی، قانون ملکات، قانون مالگزاری اور ایسے ہی دوسرے قوانین ہیں جن میں ہر ایک شخص متعلق کے حقوق و ذرائع کی نوعیت دکھائی گئی ہو؛ اس کے برعکس قوانین اضافی میں ایسے قوانین جن کا تعلق اقسام عدالت، مدارج مقدمہ، نفاذ تجویز عدالت، ہذا اختیار اور وہ قواعد ہوتے ہیں جن کی پابندی ضروری اور لازمی ہے۔ دوسرا اصول جس کی بنا پر قانون کو تقسیم کیا جاتا ہے افراد متعلقہ کی شخصیت پر مبنی ہے۔ اگر دونوں فرق کی نوعیت محض خانگی ہو تو اس کا تعلق "خانگی قانون" سے ہو گا۔ اگر ان میں

(بقیہ نوٹ ص ۱۱۷) آج کل کے سلسلہ ماخذ قوانین کو پیش نظر رکھ کر زمانہ حال کے اصول قانون کے ماخذ اور شرع محمدی کے ماخذ کا مقابلہ مفصلہ ذیل طرز پر کیا جاسکتا ہے

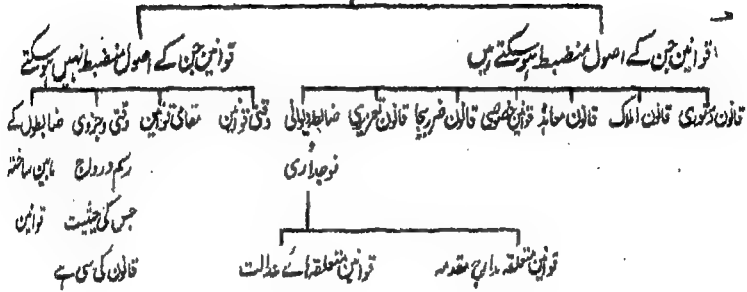
ماخذ قانون اسلامی	ماخذ قانون عالیہ
(۱) قرآن مجید و حدیث رسول اکرم صلیم	(۱) خدائی قوانین و قوانین منظور کردہ قانون ساز
(۲) اجماع مجتہدین	(۲) بڑے بڑے مفسرین قانون کی کتابیں
(۳) قیاس	(۳) نظائر
(۴) استحسان	(۴) تصفیٰ
(۵) عرف	(۵) رسم و رواج

سے ایک خود مملکت اور دوسرا محض ایک فرد ہے تو اس کی نوعیت "قانون عامہ" کی ہوگی اور اگر دونوں فرقی دو یا دو سے زائد مملکتیں یا ان کے شہری ہوں تو ان کا تعلق "بین الاقوامی قانون" سے ہوگا۔ خاگی قانون ایسے قانون کہتے ہیں جیسے قانون معاہدہ، قانون املاک، جب ان میں دونوں فریق محض خاگی افراد ہوں؛ قانون عامہ میں قانون جرائم دینی وہ قانون جس کے ذریعے سے مملکت ملک میں رہائی کا اہل نادر کرتی ہے (دستوری قانون دینی وہ قانون جس سے گویا مملکت کا سیاسی مرکز نقل معلوم ہوتا ہے اور یہ انکشاف ہوتا ہے کہ مملکت کی "ہیئت حاکمہ" میں کون کون سے عناصر شامل ہیں) اور انتظامی قانون دینی وہ قانون جس کے ذریعے سے مملکت اور افراد کے باہمی تبادلات طے ہوں) شامل ہیں۔ بین الاقوامی قانون ان قواعد کا مجموعہ ہے جن پر ان اور جنگ کے وقت مختلف ممالک کو حتی الامکان کاربند رہنا چاہئے؛ لیکن معاہدہ پر بیان کیا جا چکا ہے، قانون کے لئے مقتدر اعلیٰ کا ہونا لازمی ہے، اور چونکہ کوئی ایسی قوت یا ادارہ موجود نہیں ہے جسے "بین الاقوامی مقتدر اعلیٰ" کہا جاسکے اس وجہ سے اکثر بعض علما ان قواعد کو قانون کا لقب دینا پسند نہیں کرتے تھے

پروفیسر اموس اپنی کتاب "علم قانون" *Amos: The Science of Law* میں بائیں ان قوانین کا جو ان کی دانست میں کسی تمدن مملکت کے لئے ضروری ہیں، شمار کرتے ہیں۔ پہلے اس فہرست میں تھوڑی بہت ضروری ترمیم حسب حال کر دی ہے۔ (بقیہ ملاحظہ)

(بقیہ زٹ ملا کا)

قوانین



باب ۸

حقوق و آزادی

قانون اور حق۔ قانونی حقوق کی تعظیم۔ اہم حقوق کا شمار زندگی اور شخصی آزادی۔ ملکیت۔
مناکحت و ازدواج۔ مذہبی آزادی اور رواداری۔ سیاسی حقوق۔ بیانی آزادی۔ و معنوی آزادی
Rights and Duties کی آزادی

قانون اور حق۔ سب سے پہلے تو ہمیں حقوق کا مطلب اچھی طرح دہن
لینا کر لینا چاہئے۔ اس سے قبل یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ملکیت میں جو قوانین
واجب ہوتے ہیں وہ یا تو مقتدر اعلیٰ کے ایسے احکام ہوتے ہیں ورنہ ایسے قواعد ہوتے
ہیں جنہیں مقتدر اعلیٰ تسلیم کرتا ہے جن کے ذریعے سے اس کی شیرازہ بندی ہوتی
ہے اور جن کا انما ہر فرد ملکیت کا فرض ملے۔ ملکیت کے اس اختصار کے
باعث وہ اپنے ذی اختیار اور ادارہ کے ذریعے سے موجودہ قوانین کی ترمیم کر سکتی
ہے اور انہیں ایسے راستے پر لاسکتی ہے جس سے باشندگان ملک کے مجموعی
منافع میں ترقی ہو حقیقت یہ ہے کہ قوانین ہی کے ذریعے سے ملکیت میں آزادی کا

۱۲۳

وجود ممکن ہے، ورنہ انسانوں کی کسی جماعت میں اتنی مرکز گریز قوتیں ہوتی ہیں کہ وہ اسے شاید ایک دن بھی چہن نہ لینے دیں۔ اگر مملکت کا دباؤ بالکل ہٹا دیا جائے تو انسانوں کا مجموعہ گونا گونا گونے کے مختلف قسم اور مدارج کی قوتوں کا مجموعہ ہو جائے گا جو ایک دوسرے سے سیادت اور تقویٰ کی غرض سے برسرِ پیکار ہوں گی جس کی وجہ سے ایسے مجموعہ افراد میں حقوق و فرائض کا نشان بھی نہیں ہو گا۔ مملکت کے غیاب میں ہر انسان کے ”حق“ کا واحد معیار اس کی ذاتی قوت ہی تک محدود ہو گا، یعنی صرف اُس کے قیام ہی کی صورت میں مختلف اشخاص اس دامن کے ساتھ اپنے اپنے حقوق کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

جب یہ طے ہو گیا کہ قوانین کی ساخت اور ان کی ترمیم و تفسیح کا واحد آرگن مقتدر اعلیٰ ہے، اور قوانین ہی حقوق و فرائض کا تعین کرتے ہیں، تو اس سے یہ نتائج بالکل قدرتی ہے کہ حقوق کا تعین بھی اسی ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ روزمرہ اس قسم کے الفاظ سنتے ہیں جیسے ”ہمارا بنیادی حق“ ”انسان کے فطری حقوق“ ”اخلاقی حقوق“ وغیرہ، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ہمارا کوئی بنیادی حق ”ایسا ہے جسے مقتدر اعلیٰ نے تسلیم نہیں کیا ہے تو اس کی نوعیت کیا ہو گی؟ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میرا بنیادی حق یہ ہے کہ میرے مقدمات جیوری کے ذریعہ سے تصفیہ پائیں، اور اس ملک میں جس میں یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے، جیوری کا قانون نہ ہو، یعنی اس اصول کو مقتدر اعلیٰ نے تسلیم نہ کر لیا ہو تو اسی حالت میں اس کا یہ دعویٰ بالکل باطل اور لغو ہو گا۔ دوسرے آخر ”فطری حقوق“ کے تعین کا معیار کیا ہے؟ جب تک کوئی ایسی ذی اقتدار قوت موجود نہ ہو جو ان حقوق کا



تین کر سکے اس وقت تک ہم ”فطری حقوق“ کو کیسے پہچانیں؟ ظاہر ہے کہ یہ قوت الٰہی ہو سکتی ہے یا دنیوی، لیکن علی انتظام کا مقصد یہی ہے کہ ہر بیچ جب تک نظام مملکت اسے تسلیم نہ کر لے اس وقت تک ان حقوق کی بنا پر تنازعات کا جبری تصفیہ نہیں ہو سکتا۔ ہم جن حقوق کو عام طور پر ”فطری“ یا ”پیدائشی“ کہتے ہیں وہ ایسے حقوق ہیں جو فی الواقع قانون کا رتبہ نہیں رکھتے، بلکہ ملک کے بعض مصلح چاہتے ہیں کہ انھیں قانون کا رتبہ حاصل ہو جائے مثلاً جب کوئی ہندوستانی سیاسی مصلح کہتا ہے کہ ”سیاسی آزادی ہمارا“ فطری“ یا ”پیدائشی“ حق ہے جس کی وجہ سے مملکت کو یہ حق فوراً تسلیم کر لینا چاہئے تو اس کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ اس وقت میں سیاسی آزادی حاصل نہیں، چنانچہ اس سیاسی مصلح کا مصلح فطری ہو گا کہ کسی نہ کسی طرح اس کے ملک والوں کو سیاسی آزادی حاصل ہو جائے بعض حقوق ایسے ہیں جو ہمیں بدی نظر آتے ہیں، لیکن دوسرے مالک میں انھیں زیادہ سے زیادہ ”فطری حقوق“ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، چنانچہ بہت سے علمائے سیاست کو حق املاک جیسے بدیہی حق میں شبہ ہے کہ آیا یہ انسان کا فطری حق ہے یا نہیں، مثلاً روس میں افراد کو مکمل حقوق ملکیت حاصل نہیں۔ یہی کیفیت اخلاقی حقوق کی بھی ہے۔ اخلاقی حقوق ان حقوق کا نام ہے جنھیں رائے عامہ نے تسلیم کر لیا ہو، لیکن جنھیں اس وقت تک مقتدر علی کی سرپرستی حاصل نہ ہوئی ہو۔ چونکہ رائے عامہ اور مملکت میں جو فرق ہے وہ تنظیم کا ہے، یعنی رائے عامہ باغیوں کی غیر منظم کیفیت کا نام ہے اور مملکت ان کی منظم اجتماعی حیثیت کا اس لئے ان دونوں میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ ان ”اخلاقی حقوق“ کو

بالجبر نہیں منوایا جاسکتا، یعنی جو فریق ان سے روگردانی کرے اس پر قانونی سختی نہیں کی جاسکتی، اور اُسے جو خوف ہوگا وہ محض لوگوں کے مضحکے یا ان کے غصے یا ان کی ناراضی کا ہوگا؛ چنانچہ اگر وہ چاہے تو ان کی پرواہ نہ کرے اور اپنی ہسٹ پوسٹ پر قائم رہے۔ مثال کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ زوجہ کا اخلاقی حق ہے کہ شوہر اس کے ساتھ نیک سلوک کرے؛ اگر کوئی شوہر ایسا بے درد ہو کہ اپنی بیوی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا لیکن ساتھ ہی تعزیری قانون کے حدود کے اندر رہتا ہو اس کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ رائے عامہ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھے، اور اگر اس کی وہ پرواہ نہ کرے تو رائے عامہ اس کا کچھ نہیں کر سکتی۔

ان سب اقسام کے حقوق سے متنازعہ حقوق ہیں جن میں ہم "اثباتی" یا "قانونی" کا لقب دیتے ہیں اور جن میں مختار ادارات مملکت نے تسلیم کر لیا ہو، یعنی جن کا نفاذ مملکت کے محکمہ عدلیہ کے ذریعے سے ہوتا ہو کوئی "پدایشی" یا "فطری" حق اس وقت تک "اثباتی" حق نہیں بن سکتا جب تک مملکت ادارہ مجاز اسے پورے طور پر تسلیم نہ کر لے۔ جب ادارات مملکت (بالخصوص محکمہ عدلیہ) اسے تسلیم کر لے کے نئے تیار ہو گئے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ حقدار شخص کو ایک دوسرے شخص کے ساتھ ایک خاص قسم کا برتاؤ کرنے کا اختیار ہو گیا، اور اس شخص کا یہ فرض ہو گیا کہ وہ اس طرز کار پر تسلیم خم کرے، ورنہ بشرط ضرورت مملکت اسے جبراً قہراً مجبور کرے گی۔ مثلاً اگر ذیل سے حاکم سے روپیہ قرض لیا ہے تو میعاد مقررہ

کے بعد خالد کو یہ حق ہے کہ وہ زید سے روپیہ واپس وصول کر لے، اگر زید نے روپیہ دینے سے انکار کیا تو خالد عدالت مجاز میں مقدمہ دائر کر کے ڈگری کر لے گا اور سرکاری قرض اور نیلام کے ذریعے سے روپیہ وصول کر لے گا۔ انسانی معاشرہ کا مدعا ہی یہ ہے کہ مختلف افراد جن امور کو بطور خود انجام نہ لے سکیں یا ان کا انجام دینا خلاف مصلحت ہو، وہ اس کی تائید و پشت و پناہی سے ان کے انجام دینے کے اہل ہو جائیں، اور اس مقصد کی انجام دہی کے لئے سیاسی معاشرہ اور مدونو اہی کے ذریعے سے لوگوں کو مختلف کام کرنے یا نہ کرنے پر مجبور کرتا ہے، انہیں اور مدونو اہی سے افراد کے فرائض کا تعین ہوتا ہے اور ہر ایسے فرائض کے جواب میں جو حق محسوس ہو اُسے قانونی حق سمجھنا چاہئے۔

قانونی حقوق کی تقسیم: قانونی حقوق دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو حقوق عامہ اور دوسرے خاص حقوق۔ تقسیم کچھ نئی تقسیم نہیں ہے بلکہ اس میں جہنم دی فرق مد نظر ہے جو فقہائے اسلام نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کے مابین رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ ”حق اللہ“ سے (علاقہ عبادات کے) ایسے حقوق مراد نہیں ہو سکتے جن سے انسان مستفید نہ ہوتا ہو (اس لئے کہ خداوند کسی دنیوی حق یا کسی دنیوی امر کے استفادہ سے بالاتر ہے) اور ان سے یہ بھی مراد نہیں ہو سکتی کہ یہ حقوق خاص طور پر پیدا کئے ہوئے ہیں (اس لئے کہ خدا نے تو ہر ایک حق پیدا کیا ہے) بلکہ ان دونوں باتوں کے برعکس انھیں حقوق اللہ غالباً ان کی انتہائی اہمیت کی وجہ سے کہتے ہیں اور ان میں سے اکثر کے ذریعے سے مملکت کی شیرازہ بندی عمل میں آتی ہے۔ سب سے پہلے تو خاص حقوق و فرائض کو لیجئے۔

(مسئلہ مشرق)

خانگی حقوق و فرائض وہ ہیں جو مختلف افراد کے باہمی تعلقات کو معین و منضبط کرتے ہیں۔ ہمارے روزمرہ کاروبار کے ضمنی حقوق اسی کے تحت آتے ہیں مثلاً میاں بیوی، بالغ و مشتری، مکان دار و کرایہ دار، زمیندار و کاشتکار، آقا و مازم کے حقوق و فرائض کا تعلق اکثر و بیشتر اسی حق میں آتا ہے، اور ملکیت کا کام یہ ہے کہ ایک طرف انھیں جبراً متوائے، دوسری جانب حد سے تجاوز نہ ہونے دے۔ ان کے برعکس حقوق عامہ میں جن کے ذریعے سے حکومت اور افراد کے باہمی تعلق کا تعین ہوتا ہے یہ بالکل ممکن ہے کہ بعض معاملاتی حکومت مثل کسی فرد کے ایک فریق پر (مثلاً حکومت کسی سرکاری عمارت بنانے کا کسی کو ٹھیکہ دے یا جب دیوانی یا انتظامی عدالت میں اسے بطور ایک فریق کے گردانا جائے) لیکن ایسی حالت میں اس کی حیثیت محض خانگی ہوگی۔ حقوق عامہ وہ حقوق ہیں جن کے ذریعے سے حکومت افراد اور حکومت کے باہمی تعلقات کا تعین اور ان کی تجدید کرتی ہے۔ یہ اور بتایا جا چکا ہے کہ ملکیت اور حکومت میں ایک تین فرق ہے۔ ملکیت افراد کی مجموعی سیاسی کیفیت کا نام ہے، اور یہی فی الواقع مقتدر اعلیٰ ہے؛ حکومت وہ آلہ کار ہے جس کے ذریعے سے ملکیت کا انتظام و انصرام ہوتا ہے۔ لیکن ملکیت ایک مجرد فلسفیانہ تخیل ہے؛ اس کے برعکس حکومت چند انسانوں کے مجموعے

(رفیقہ علیہ السلام)
 ۱۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے لئے دیکھو عبد الرحیم، "اصول قانون اسلامی" Abdul
 Rahim : Mohammdan Jurisprudence. باب ۸

کا نام ہے جو مرکز گریز قوتوں کو دبا تا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب حکومت کا مقصد ہی افراد کے نقصان پر سوا احساسات کو زیر کرنا تھا، تو اس کے اور افراد کے مابین ایک کشمکش اور پہنچ تان کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ مملکت اپنی ہیئتِ حاکمیت کے ذریعے سے دساتیر تیار کرتی ہے، اور ان کے مطابق بنے ہوئے قوانین کے ذریعے سے افراد اور حکومت دونوں کی حدود متعین کرتی ہے۔ حال کے زمانے تک یعنی اس وقت تک جب تک مملکت اور حکومت کا فرق پورے طور پر واضح نہیں ہوا تھا، مملکت اور حکومت کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھ لیا گیا تھا، چنانچہ سیاست دانوں اور مفادینوں کے ایک مخصوص گروہ، یعنی انفرادیوں کا مقصد ہی یہ ہو گیا تھا کہ فرد کو ”مملکت“ کی دست برد سے بچا یا جائے۔ گو انسان کی انفرادی حیثیت مملکت کے احساس کے خلاف پرستگتی ہے، لیکن اس تضاد میں مانعہ آمیزی کی بھی گنجائش ہے۔ اس لئے کہ آخر مملکت افراد ہی کی اجتماعی جس کی ایک اخلاقی شکل کا نام ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ حکومت (یعنی دستوری مملکت) کے ذریعے سے جو آئہ کار مقرر ہوتا ہے، وہ مرکز گریز اثرات کا استیصال کرنے میں بعض مرتبہ افراد کے انفرادی احساسات و جذبات کی پروا نہیں کرتی، جس سے اس میں اور ملک کی اجتماعی کیفیت میں تنقیص پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ مباحثہ ہر رٹ پڑنے کی مشہور ”فرد و مملکت“ *Herbert Spencer*:
Man Versus the State کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مملکت ایک طرف حکومت کے اختیارات کی حد بندی کرتی ہو اور دوسری جانب افراد کے جسطہ عمل کا یقین کر دیتی ہے۔ حکومت کے اختیارات کی حد بندی کی مثالیں تقریباً ہر ملک کے دستور و آئین میں نظر آئیں گی، اور دراصل انگلستان کے دستاویز حقوق ۱۶۸۹ء فرانس کے اعلان حقوق ۱۷۹۱ء جرمنی کے اعلان حقوق ۱۹۱۹ء اور نہرو رپورٹ کے اعلان حقوق ۱۹۴۷ء میں فرد کے مقابلے میں حکومت کے اختیارات کی تحدید ہی کی گئی ہے۔ ان کے برعکس وہ قوانین میں جن کے ذریعے سے افراد کے اختیارات کی حدود مقرر کی جاتی ہیں، مثلاً قوانین غداری و قوانین تعزیری، اور جن کے ذریعے سے

۱۵ "نہرو رپورٹ" کے اعلان کا شخص خالی از لطفی نہ ہوگا۔

- (۱) حکومت کے جملہ اختیارات کا منہج قوم ہے۔
- (۲) بلا قانونی چارہ جوئی کے کسی شخص کی آزادی سلب نہ کی جائیگی، نہ اس کی ملکات پر قبضہ کیا جائیگا۔
- (۳) افراد کو غیر منہج کی آزادی حاصل ہوگی اور کسی مذہب کو ترجیح نہ دی جائے گی نہ کسی پر قانونی مجبوریوں کا اندک کی جائیگی۔
- (۴) ہر فرد کو، خواہ اس کی ذات اور مذہب کچھ بھی ہوں، "دولت عامہ" کے مدارج میں داخل رہیگا۔ اجازت ہوگی۔

(۵) مکمل قانونی مساوات۔

- (۶) ہر شخص کو کوئی پیشہ اختیار کرنے کی آزادی حاصل ہوگی اور مختلف عہدے کسی خاص مذہب والوں کے لئے مخصوص نہیں کئے جائیں گے۔ (بقیہ صفحہ ۱۳۱ پر)

حکومت کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ اگر کوئی فرد ان حدود سے تجاوز کرے تو حکومت فی الفور مداخلت کر کے اسے ایسی جسمانی سزا دے کہ خود اس فرد کے لئے باعث نصیحت اور دوسروں کے لئے باعث عبرت ہو بلکہ اکثر ممالک میں حکومت کے عہدہ داران مجاز کو اس کی جان تک لینے کا اختیار ہوتا ہے۔

اہم حقوق کا شمار یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر افراد کے بعض حقوق کا شمار کر دیا جائے، تاکہ ایک طرف تو امور متفقہ بالا اچھی طرح سے واضح ہو جائیں اور دوسرے افراد کی مجموعی آزادی کا مفہوم بخوبی سمجھیں آئیں گے۔ ظاہر ہے کہ ہر ملک میں افراد کے حقوق یکساں نہیں ہوتے، مثلاً ایک طرف تو ہمارے سامنے ایسی ملکیتیں جیسے جرمنی، میں جہاں حکومت اور بہت حاکمیت میں کوئی فرق نہیں اور جہاں حکومت نے ایک حد تک واقفانہ عقیدہ علی کی حکم لے لی ہے۔ ایسی ملکیتوں میں افراد کو بحیثیت افراد بہت ہی کم حقوق حاصل ہوتے ہیں، یعنی ملکیت سمز لہ محافظ افراد ان کے اکثر امور پر حاوی ہوتی ہے۔ دوسری وہ ملکیتیں ہیں جہاں حقوق کی ترار کو کا پیڑا دوسری طرف جھکتا ہے یعنی جہاں حکومت اکثر و بیشتر محض آزادی کی حفاظت، ملکیت کی شیرازہ بندی اور افراد کے لئے آسانیاں بہم پہنچانے کے لئے مداخلت کرتی ہے، جیسے دنیا کے ان ممالک کا حال ہے جہاں پارلیمنٹی طرز حکومت رائج ہے۔ بہر حال اگر یہ بشر ممالک کے قوانین پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ افراد کو عام طور پر مفصلہ ذیل

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۳۱) (۱) معافی ترقی کے لئے اتحاد کرنا اور انجمن بنانا جائز ہے۔

حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

۹ زندگی اور شخصی آزادی۔ سب سے اہم حقوق تو زندگی اور شخصی آزادی کے حقوق ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر زندگی و آزادی نہ ہوگی یا اس کا اطمینان نہ ہوگا تو پھر مملکت کا نظام بالکل بے کار ہے۔ حقوق کے اعتبار سے مردہ اور غیر آزاد یعنی غلام کی نوعیت ایک ہی ہوتی ہے، چنانچہ آج کل متمدن ممالک میں مملکت نہ صرف زندگی کی ضامن ہوتی ہے بلکہ ذاتی آزادی کی بھی حفاظت کرتی ہے، اور نہ صرف قاتل کو سخت سے سخت سزا دی جاتی ہے بلکہ بعض ممالک میں سزائے موت اور بعض میں جس دوام سے ہے، بلکہ اس شخص کو بھی قابل اقامت گردانتی ہے جو اپنے ہاتھوں اپنی جان لینے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس میں بعض تشنیت بھی ہیں، مثلاً اگر زید خاں پر اس کی جان لینے کی غرض سے حملہ آور ہو تو خاں کو حق حاصل ہے کہ اپنے بچاؤ کی خاطر زید کو مار ڈالے مثلاً

۱۰ انفرادیت اور اشتراکیت کے لئے دیکھیے آئینہ باب ۱۔ تاسی جرمینی اور فاشی اٹلی میں انفرادی حقوق ملتی ہیں بالکل پورے ہو گئے ہیں، جرمنی میں فرد کی حیثیت مملکت کے ایک پندہ سے زیادہ نہیں۔ ایسی حکومت مملکت کے مقابلے میں فرد کے کیا حقوق ہو سکتے ہیں؟
۱۱ ۱۹۳۵ء میں جرمنی میں جو قانون عدالتوں کی تسلیم کے لئے نافذ ہوا اس میں ایک پرہیزی فقرہ یہ ہے کہ حق صرف وہ ہے جو قوم کے لئے مفید ہو۔ دیکھو سالنامہ برلن ۱۹۳۵ء ص ۱۹۷
۱۲ مثلاً مجموعہ تہذیب و تمدن، قسط ۳۰۲۔

(بقیہ نوٹ منظر پر)

۱۳ ایضاً دفعہ ۹ ص ۳۰۹

ای طرح کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے کو جبراً کہیں جانے سے روکے رہے، اسے قانونی اصطلاح میں جس بیجا کہتے ہیں اور اکثر قانونی نظاموں میں اس کے لئے بھی سزا مقرر ہے۔ آج کل کے متقدم ممالک میں غلامی قانوناً ناجائز ہے، اور ہم اس صورت حال سے اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ ہمارے ذہن میں شکل سے ایسی متدن مملکت آ سکتی ہے جس میں غلامی کا ادارہ حیات عامہ کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہو۔ بڑے بڑے نظام ہائے قانونی (جیسے رومن قانون) میں ہی دہانے میں غلامی ایک ادارہ حیات تھی اور قدیم یورپ میں اسے اتنا ہی ”غلام پیدائش“ سمجھا جاتا تھا جتنا آج کل کے معاشین محنت، سرمایہ اور زمین کو سمجھتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ سیاسی تنظیم کی بنیاد صرف غلامی تھی، اس لئے کہ رومانوں کے مفکر ایسی سیاسی صورت حال کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے تھے جس میں کسی شخص کو فکر معاش بھی ہو اور ساتھ ہی وہ مملکت کے انصرام میں حصہ بھی لے سکے۔ یہی وجہ تھی کہ پیدائش دولت کا کام غلاموں سے لیا جاتا تھا، اور مملکت کے ”شہری“ اطمینان سے سیاسی کاروبار میں حصہ لیتے تھے۔ رومانوں میں غلاموں کی حالت ناقصہ بہ تھی، لہذا اس کے عہد میں پیچھے غلاموں کو کسی قسم کے حقوق حاصل نہیں تھے، چنانچہ ان کے مالک انھیں بھوکا مار سکتے اور ہر طرح کی ازیتیں پہنچا سکتے تھے۔ مشرق میں عام طور پر غلاموں کی حالت بہتر تھی، چنانچہ گوہندوں میں

سلاہ دیکھئے توہذرات ہند، صفحات ۹۶، ۹۷ (بقیہ حاشیہ ص ۱۳۴)

سلاہ توہذرات، دفعہ ۳۴۰

سلاہ مملکت رومانوں میں غلاموں کی حالت کے لئے دیکھئے ”تفسیر قوانین گایوس“ مؤلفہ

۱۳۴۲ء

غلاموں پر طرح طرح کی مذہبی عائد تھیں، اور انھیں حقوق مالکانہ حاصل نہیں تھے، تاہم ان کی ذات اور زندگی محفوظ تھی۔ اسلام نے غلاموں کی حالت پہلے سے بدرجہا بہتر کر دی۔ اول تو اس نے آزاد مسلمان کو غلامی کے خطرے سے بالکل آزاد کر دیا، پھر غلام کی جسم و جان بالکل محفوظ و مامون ہو گئے اور اسے ایذا دینے والے یا اس کی جان لینے والے کو دہی سترادی جالے گی جو آزاد شخص کی اذیت یا قتل کے لئے مقرر تھی۔ ساتھ ہی غلام آزاد کرنے کو ایک ثواب عظیم قرار دیا گیا، چنانچہ مالک اسلامی میں عام میلان غلاموں کی آزادی کی طرف ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام میں ہم اکثر مالک میں آزاد شدہ غلاموں کو بڑے بڑے عہدوں پر مہتمن دیکھتے ہیں، اور بعض ملکوں میں تو ایسے لوگ سرِ سلطنت پر نظر آتے ہیں جنہوں نے کسی زمانے میں اپنی زندگی غلامی کی حالت میں بسر کی تھی۔ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد شدہ غلام اور یدائشی آزاد غلاموں کی مساوات کو عملی جامہ اس طرح پہنایا کہ حضرت زید بن حارثہ کو (جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک آزاد شدہ غلام تھے) مہاجرین، انصار اور دوسرے شرفاء عرب کے لشکر پر کماندار بنا کر موتہ کی جنگ کے موقع پر روانہ کیا، اور اس لطافت میں

انڈین نوٹس کا۔ پوسٹ Post: Commentary on Gai

Institutions. باب اول، زیر نمبر ۵۳۔

P.N. Sen: Hindu Juris- اصول دہم شانہ

(تقریباً ۱۲۵)

prudence. درس ۱۰۔

و غدار سپہ سالار نے اپنی جان بازی کا ثبوت شہید ہو کر دیا۔ اسی طرح جگہ جگہ سابق غلاموں کے کارناموں کی مثالوں سے تاریخ اسلام بھری پڑی ہے، چنانچہ سلطان محمود غزنوی ایک غلام زادہ تھا، مصر میں ”ملوکوں“ نے چار سو برس تک اور ہندوستان میں نام نہاد ”غلامان“ نے کم و بیش ایک صدی تک نہایت شان و شوکت سے حکومت کی۔ مغربی ممالک میں غلاموں کی آزادی کا خیال زائد حال ہی کے زمینی ارتقا کا نتیجہ ہے، اور بعض ممالک، مثلاً ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تو غلاموں کو اس وقت تک آزادی میسر نہیں ہوئی جب تک کہ موافقین و مخالفین آزادی کے مابین ایک عظیم الشان خو خوار جنگ لڑنے سے ۱۸۶۵ء تک برابر جاری نہ رہی۔ امریکہ میں اب بھی پچاس سے زنگیوں کی جان خطر سے خالی نہیں رہتی اور اب بھی اخبارات میں پڑھنے میں آتا ہے کہ کسی معمولی بات پر وہاں کے سفید باشندوں نے کسی بے یار و مددگار زنگی کو زندہ جلادیا یا مار ڈالا۔

حق حیات اور حق آزادی کے اصول پر ذرا تفصیلی بحث کرنے کی اس لئے ضرورت ہوئی کہ اول تو یہ حق جملہ دوسرے حقوق سے زیادہ اہم ہے، اور دوسرے باوجود اس قدر بدیہی ہونے کے اس میں مختلف زمانوں اور مختلف ممالک میں ہمیشہ تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں صرف ایک بات باقی رہ گئی ہے۔ وہ یہ

ذیلہ صاحبہ کے مطابق
 ”اسلام نے جس قسم کی شرائط غلامی پر لگائیں ان کے لئے دیکھو عبدالرحیم“ اصول فقہ اسلامی“
 Bodul Rahim: Mohammadan Jurisprudence. باب

کہ حق آزادی اور حق حیات دونوں دوران جنگ میں معطل ہو جاتے ہیں اور ساتھ اگر کسی سے کوئی جرم سرزد ہو تو اس کی سزا میں حکومت کو عام طور پر مجرم کی آزادی محدود کرنے اور مواقع پر اس کی جان تک لینے کا اختیار ہوتا ہے۔

ملکیت۔ دوسرا حق جو عام طور پر اکثر ممالک میں پایا جاتا ہے وہ حق مالکانہ ہے حق مالکانہ کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی چیز کسی کی ملکیت میں ہو تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ اس چیز کو اپنے قبضے میں رکھے، اس سے مستفید ہو اور دوسروں کی دست برد سے بچائے یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ یہ حق ”فطری حقوق“ میں سے ایک ہے، بلکہ اس حق کا انطباق جملہ افراد آبادی پر صرف زمانہ حال میں ہوا ہے۔ جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے، وصرم شاستری انھیں حق مالکانہ تقریباً بالکل حاصل نہیں، اور اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہندو متقنون اور ہندوؤں کی کتب و روایہ میں صنف لطیف کو مردوزع القلم قرار دیا گیا ہے۔ اسلام نے عورتوں کی معاشرتی سطح بلند کر کے انھیں حقوق ملکیت اور بعض دوسرے حقوق بخشم اسی طرح نئے جیسے مردوں کو، اور جہاں تک انہی ملوکہ اشیاء پر قبضے اور ان سے استفادے کا تعلق ہے، ان میں اور مردوں میں تعلق کوئی فرق باقی نہیں رکھا۔ مغرب میں یہ اصول کہ عورت مردوں کو ملوکات پر مساویانہ حقوق حاصل ہیں، حال ہی میں تسلیم کیا گیا ہے، چنانچہ ”قانون سٹیت جاندار زمانہ منکوچہ“ سے پیشتر درج ۱۸۸۶ء میں منظور ہوا، انگلستان میں عورتوں کو حق مالکانہ حاصل نہ تھا۔ ایک اور بات کی

۱۵ وصرم شاستری عورتوں کے بعض حقوق کے لئے دیکھو پریاتنہ میں، ”اصول دہرم شاستر“ رکن ۵۰۹۔

طرف توجہ مبذول کرنی ضروری ہے۔ آج کل اشتراکیوں کا ایک خاص گروہ یہ کہتا ہے کہ افراد کے حق ملکاتہ اور ان کے معاشی مقابلے کی وجہ سے پیداوار پیدائش دولت میں بہت کچھ وقت، محنت اور سرمایہ رائیگاں جاتے ہیں لہذا عالمین پیدائش پر حکومت کا پورا اختیار ہونا چاہئے، اور سرمایہ و زمین دونوں ملکیت ہی کی حکومت ہوئی چاہئیں۔ یہاں اس بحث کا موقع نہیں کہ آیا اس اصول کے دعوے دار حق بجانب ہیں یا نہیں^۱ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان میں سے اکثر ضروریات زندگی کو ذاتی انفرادی ملکیت ہونے میں چنداں حرج نہیں سمجھتے۔ نیز ہر ملکیت میں جنگ یا کسی اور شدید ضرورت کے وقت حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ افراد کی ملکات میں سے ایک حصے پر جبراً قبضہ کر لے، اور اسی طرح اپنی روزمرہ ضروریات کے لئے حکومت کو محاصل عائد کرنے کا اختیار بھی ایک طرح سے انفرادی ملک پر جبراً قبضہ کرنے ہی کی ایک شکل ہے۔

مناسحت و ازدواج۔ تیسرا حق جو تقریباً ہر جگہ عام ہے، حق خاندانی و حق ازدواج ہے۔ خاندان کی بنیاد نکاح ہے اور یہ وہ ادارہ ہے جس کے ذریعے سے نئی آدم کی نسل جاری رہتی ہے، وارث کا پتہ لگتا ہے اور معاشرہ انسانی کی

^۱ Married Women's Property Act, 1882, 45-46
Vict. c. 75.

اس کے اثرات کے لئے دیکھو انگریزی "قوانین انگلستان" Halsbury's Laws of

England جلد ۱۶ صفحہ ۳۷۲ و صفحہ ۴۲۸ و صفحہ ۴۵۲ و صفحات ۴۰۵ و غیرہ

^۲ اس بحث کے لئے دیکھو باب ۹

بنیاد مضبوط ملوثی ہے۔ نکاح کے قواعد و قوانین اور عورت مرد کے حقوق و فرائض مختلف ممالک میں مختلف ہیں بعض ممالک میں صرف ایک ہی زن و مرد کی باہمی نہایت کی اجازت ہے، بعض میں ایک مرد متعدد عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے (جیسے ہندوستان میں ہندو اور مسلمان) اور بعض میں ایک عورت متعدد مردوں سے نکاح کر سکتی ہے (جیسے بریت اور یلیباریں) چونکہ موخر الذکر ممالک کی معاشرتی و قانونی صورت و حال ہمارے معاشرہ سے مختلف ہے اس لئے اسے تو یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے، رہے وہ قانونی نظام جو ایک مرد کو متعدد بیویوں سے نکاح کرنے کو جائز رکھتے ہیں، ان کی بابت یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان میں جس اصول پر عمل لازمی ہے وہ یہی ہے کہ مرد مختلف بیویوں کے باہن مکمل مساوات قائم رکھے گا اور عام طور پر بلا ضرورت نکاح نہیں کرے گا، اور ان مجید میں تو جہاں ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے وہ مکمل مساوات کو تقریباً ناممکن اصل قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح جن اقوام میں طلاق کا طریقہ ناجائز ہے وہاں کم از کم آج کل عورت مرد دونوں کو ایک دوسرے کو اس وقت چھوڑ دینے کا اختیار دیا گیا ہے جب دونوں کی زندگی ایک دوسرے کے باہمی شدید اختلافات یا بدسلوکی کی وجہ سے تلخ ہو جائے۔

ضمیمہ کی آزادی اور رواداری۔ اس سلسلے میں آخری حق خاکی جس کا ذکر یہاں مناسب ہو گا، حق آزادی ضمیر یا عقائد کا حق ہے۔ بطور توجہ یہ معلوم ہوتا ہے

کہ نہ ہی عقائد کا تعلق انسان کی کیفیات قلبی سے ہے اور اسے کسی قسم کے مذہبی عقیدے کا جبراً پابند نہیں ہونا چاہیئے، لیکن تاریخ دنیا کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عقائد مذہب مختلف افراد یا مختلف جموعوں کے مابین ایسا رابطہ پیدا کر سکتا ہے جس سے زیادہ مضبوط اور پائیدار رابطہ شکل سے ممکن ہے، چنانچہ حکومت نے ہمیشہ ایسے مذاہب اور فرقوں کو معاندانہ نظر سے دیکھا ہے جن کے علی اور شدید مقاصد سے وہ خلاف ہوں، اور بعض ممالک میں تو مذہب کے نام سے خون کی ندیاں بہہ گئی ہیں۔ اس ضمن میں مشرقی اور مغربی تاریخ میں بین فرق نظر آتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی بڑے مشرقی مذہب میں تشدد روا نہیں رکھا گیا۔ ہندوؤں اور بودھوں میں تو ”اہسا“ یا عدم تشدد کا ایسا اصول مسلم ہے کہ جس سے گریز ممکن نہیں؛ اسلام نے ابتدا ہی سے ”کلمہ دیکھ دینی دین“ کا سبق دنیا کو سکھایا ہے۔ حضرت عیسیٰ نے یہ تلقین کی کہ تمہارے ایک بھائی پر کوئی تھپڑ مارے تو دوسرا رخسار بھی اس کی طرف کر دو۔ ایسے بڑے عظیم جو ان عظیم انسان مذہب کی جنم بھوم بھی کسی قسم کی عدم رواداری کا کم امکان ہو گا۔ ساتھ ہی چونکہ مشرق میں مذہب کو انسان کے تقریباً ہر ایک شعبہ زندگی میں دخل حاصل ہے اور حکومت اس امر سے اچھی طرح واقف ہوتی ہے کہ اس کی سختی سے لوگ اپنا عزیز مذہب نہ چھوڑیں گے، شاید اس وجہ سے بھی یہاں اکثر و بیشتر زمانوں اور ممالک میں رواداری برتی گئی ہے اور محض مذہب کی خاطر بہت ہی کم تشدد روا رکھا گیا ہے۔ اس کے عکس یورپ میں بالکل حلال کے زائے تک مختلف حکومتوں کا شیورہ ہی یہ رہا ہے کہ وہ اپنے مخالف مذہب کی جڑ بنیاد اکھاڑ کر پھینک دیں۔ دو تین واقعات کو لیجئے اور ان کا

مقابلہ کیجئے۔ ۱۹۱۲ء میں فرناندو اور انزابیلا نے غرناطہ سے وہاں کے بادشاہ
 ابو عبد اللہ کو نکال دیا اور یہ وہ تاریخ ہے جب سے لے کر ۱۹۱۲ء تک ہسپانوی
 مسلمانوں پر انتہائی سختیاں کی گئی، ان کی عورتوں کی بے حرشی کی گئی۔ مردوں کو
 بدوشیزہ بنیسمہ دیا گیا یا ملک بدر کر دیا گیا۔ چنانچہ سرزمین اندلس میں ایک بھی اسلام کا
 نام لیوا باقی نہیں رہا۔ اس کے برعکس ۱۹۱۲ء سے صرف چالیس لاکھ مسلمان
 محمد خاں ثانی نے قسطنطنیہ فتح کر کے وہاں کی غیر مسلم ملتوں کو منظم کر کے ان میں
 سے ہر ایک کو مذہبی معاملات میں بلکہ بعض دنیوی امور میں بھی آزادی دہی، اور یہ
 آزادی ۱۹۲۲ء کے صلنامہ لودان تک مسلسل جاری رہی۔ اسی طرح جب ۱۹۲۲ء
 میں شاہ چارلس نہم شنت برٹولومیو کے دن فرانس کے احتجاجیوں کا مشہور قتل عام
 کرادیا تھا، یہاں ہندوستان میں اکبر اعظم تخت نشین تھا، جو فتح پور سیکری کے
 مشہور عبادت خانے میں بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے ہر مذہب کے پیشواؤں کے مناظرے

۱۹۱۵ء زوال غرناطہ کے بعد ہسپانوی مسلمانوں پر سختیاں کی گئیں ان کا ٹھوڑا بہت حال س۔ پ۔
 سکاٹ کی کتاب میں درج ہے جس کا ترجمہ مولوی قسطل الرحمن صاحب نے ”اخبار الاندلس“ کے
 نام سے شائع کیا ہے۔ اس کی جلد ۳، باب ۲۶ کا مطالعہ کیا جائے۔

۱۹۱۵ء محدود دولت عثمانیہ میں مختلف مذاہب اور ان کی آزادی تنظیم کے لئے دیکھو میرز ”ترکیہ عالیہ“
 Mears: Modern Turkey. باب ۴، ”لوائن بی وکرک ڈو“ ”ترکیہ“

Taymube + Kirkwood: Turkey باب ۹، ”ایلیس فلیس“ ”جنگ
 آزادی یونان“ - Alison Phillips: War of Greek Independence.

سنا اور اپنی راجپوت رعایا ہمارے درجہ اعلیٰ کرنا کہہ کر ان میں سے ایک یعنی راجہ مان گجھ کو کابل کا صوبہ دار مقرر کر کے میں مضائقہ نہ سمجھتا۔ یہ کیفیت شہنشاہ محی الدین اورنگزیب عالمگیر تک بار بار جاری رہتی ہے، جس نے اپنے بد مقابل شیواجی کے خلاف ایک غیر مسلم مرزا راجہ جے سنگھ کو سپہ سالار بنانا کر بھیجا، اور آج بھی ہندوستان میں بہت سے ہندو معاہدے ہیں گے جن کی جاگیریں اسی محل پادشاہ (یعنی اورنگزیب) کے زمانے سے وقف ہیں۔ یہی اسباب ہیں جن کی بدولت آج ہندی مسلمانوں کے مرکزوں، یعنی دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد دکن میں غیر مسلم آبادی گھٹانے سے کہیں زیادہ ہے اور سابق آستانہ خلافت، یعنی استنبول میں یونانی، آرمینی اور دیگر عیسائی فرقے تعداد میں مسلمانوں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ مغرب مشرق سے زیادہ روادار ہے، لیکن آج کے دن بھی اگر شاہ انگلستان کلیسائے انگلستان سے خوف ہو جائیں تو انھیں "قانون ہندوستان" کے نام کی رو سے تخت سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ مشرق میں محض مذہب کی خاطر

ان عالمگیر کی عطا کردہ جاگیروں کا غنہاریاں نہ ضروری ہے اور نہ ممکن۔ خود راقم الحروف نے بیدر دکن کے قریب خانہ پور نامی بے چارے قبیلے میں ایک بہت بڑا مندر دیکھا جس کے حصار آج تک دولت آصفیہ کے زیر سایہ شہنشاہ عالمگیر کے اوقاف کی آمدنی سے اپنا بیٹ پالتے ہیں۔ اسی طرح دیرہ دکن میں سکھوں کے گورام راسے کے گرد و بارہ کے لئے بھی اورنگزیب نے جاگیریں وقف کی تھیں۔ اس گرد و بارہ پر ہندوؤں کا قبضہ ہے۔

بہت کم لڑائیاں لڑی گئی ہیں اور بہت کم ممالک میں لوگوں کا مذہب بڑا اثر رکھتا ہے۔ لیکن مغرب میں چارلس اعظم کے زمانے میں جرمنی کا جبرائیلیائی مذہب اختیار کرنا اصلیتی جنگیں، بیس سالہ جنگ، اور سپانیولی "عدالت احتساب" کی یاد آج تک تازہ ہے۔ غیر مذہب والوں کے ساتھ یورپ کے بعض ممالک میں جبریلوگ ردوار کھا جاتا ہے اس کا نمونہ دیکھنے کی خواہش ہو تو جرمنی جاسیے جہاں یہودی مذہب والوں کو خطرناک جانوروں کی طرح ملک سے نکالا جا رہا ہے اور جہاں کے لوگ کٹھیک بھی کچھ زیادہ مطمئن نہیں ہیں، یاروس جاسیے جہاں پندرہ بیس سال تک مذہب اور اہل مذہب دونوں کا مضحکہ ہی نہیں اڑایا جاتا تھا بلکہ جہاں تک ممکن ہو تالان کی نفی کنی کی جاتی تھی، اور اب بھی گو مختلف مذاہب کے پیروؤں کو اپنی طرف پرہیزگار کے کی اجازت ہے لیکن مذہب کے مخالفین دل کھول کر ان کا مذاق اڑا سکتے ہیں اور گلی گلی مذہب کے خلاف تبلیغ کر سکتے ہیں جو مذہب والوں کے لئے بظاہر جائز ہیں بہر حال دنیا کا عام رجحان یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر مذہب والے کو کجہاں تک اس کا مذہب ملک کی سیاسی زندگی میں خلل نہ ہو، اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی حاصل ہو۔

سیاسی حقوق۔ آخر میں ان نہایت اہم حقوق کا ذکر کرنا باقی ہے جنہیں بعض مرتبہ مجموعی طور پر "سیاسی حقوق" کہتے ہیں، یعنی حقوق، جلسہ عام کی آزادی، پریس کی آزادی، مطالبہ اور سنگت آزادی، عام طور پر یہ اصول رتھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر ان کے کوئی فعل کسی تعزیری قانون کے تحت نہ آئے تو وہ اس کے لئے مبارک ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص اپنی زبان سے کوئی نقطہ نکالے یا اسے

تحریریں لائے یا چھینوائے اور اس کا یہ فعل کسی تعزیری قانون کے خلاف نہ ہو تو اس کی پکڑ نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے ان افعال کا دائرہ محدود ہے۔ اول تو اس کا کوئی فعل ایسا نہیں ہونا چاہئے جس سے مملکت کا شیرازہ بکھر جائے یا احتمال ہو یا حکومت کو اپنے وجود کی طرف سے خطرہ پیدا ہو جائے۔ آج کل کی حکومت ہند مالک میں کسی شخص کو حکومت کی نکتہ چینی سے مشکل سے روکا جاسکتا ہے، لیکن جب حکومت یہ دیکھے گی کہ مصنف یا مقرر نے لوگوں کو علانیہ بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے تو وہ اسے جبراً روک دیگی۔ حکومت کے خلاف اس معاندانہ روش کو ”غدار“ کا لقب دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر حکومت یہ دیکھے گی کہ کسی کے قول یا فعل سے نقصان کا اندیشہ ہے تو بھی اسے روک دے گی، اس لئے کہ امن و امان کا قیام بھی مملکت کے فوری مفاد میں سے ایک ہے۔ تحریر و تقریر کی آزادی کے معنی نہیں کہ کوئی شخص دوسرے کے عیوب کو بے جا ظاہر کرے یا اس کی ناموس کو گزند پہنچائے، اور چونکہ اس ”ازالہ حیثیت عرفی“ سے نہ صرف ایک خانگی حق یعنی ناموس کو ٹھیس لگتی ہے بلکہ اس سے نقصان کا بھی اندیشہ ہوتا ہے اس وجہ سے ایسی حرکات کے انکسار

مثلاً تحریر و تقریر کا حق دفعہ ۲۴ (الف) آج کل کے دماغ میں اس نوع کی سیاسی آزادی بعض آزاد ممالک میں سبب کی جا رہی ہے، مثلاً اٹلی اور جرمنی میں کسی شخص کی مجال نہیں کہ حکومتی طرز عمل کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکالے یا قلم سے لکھے۔

کا اختیار افراد اور حکومت دونوں کو ہو سکتا ہے، یعنی جس فرد کے ناموں کو نقصان پہنچا ہے وہ ہر جہ و صول کر سکتا ہے اور حکومت اس کو سزا بھی دے سکتی ہے۔
 بعض مرتبہ اگر حکومت کو ملک میں کسی خاص خطرے سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو ان ”سیاسی“ حقوق میں قطع و برید کر لے گئی ہے، مثلاً غنیم کے حملے کے دوران میں یا ملک میں اگر غلطشار پیدا ہو جائے اور اس میں خود شیرازہ مملکت متضرر خطر میں آجائے تو بعض مواقع پر حکومت اکثر حقوق و قوانین کو معطل کر کے ملک میں صرف ”جنگی قانون“ کا نفاذ کر دیتی ہے، جس کا لب لباب یہ ہے کہ احکام حکومت کی خلاف ورزی کی شکل میں چند افسر بیٹھ کر سرسری طور پر سزا تجویز کر لے دیں جس کا مراحضہ نہیں ہو سکتا، اور وہ سزائی الفور دے دی جاتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ بغیر ”فوجی قانون“ کے نفاذ کے حکومت بعض مخصوص حقوق کو معطل کر دے، یعنی مدارج مقدمات کو قائم رکھے لیکن افراد کے سیاسی حقوق کم کر دے، جیسے حکومت ہند بعض مرتبہ دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کا نفاذ کر کے اپنے آپ کو مامون و مصلون سمجھ لیتی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ حکومت کو

۱۔ تعزیری اذالہ حیثیت یعنی کی تعزیرات ہند“ دفعہ ۵۰۰ میں دی ہوئی ہے۔

۲۔ ناظرین کی دلچسپی و مصلوات کے لئے دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کا شخص دینا مناسب ہوگا۔

اُن مقدمات میں جن میں مجسٹریٹ..... کی دانست میں فوری انداز یا جلد تدبیر

کرنی مناسب ہو تو یہ مجسٹریٹ بذریعہ حکم تحریری جس میں مقدمات کے حالات قلمبند ہوں گے.....

مجاز ہو گا کہ کسی شخص کو کسی فعل سے باز رکھنے کی ہدایت کرے..... جائز ہے کہ حکم

(بقیہ صفحہ ۱۴۵ پر)

اس قسم کے اختیارات نہایت سوچ سمجھ کر استعمال کرنے چاہئیں، ورنہ ممکن ہے کہ ایسی کارروائیاں سے بجائے خلفشار کم ہونے کے برعکس اور زیادہ بڑھ جائے۔

سیاسی آزادی۔ جب حکومت لوگوں کے سیاسی حقوق میں کم سے کم مداخلت کرتی ہے تو اس صورت حال کو سیاسی آزادی کہتے ہیں۔ آزادی کے لغوی معنی تو فقدانِ مداخلت بیرونی کے ہیں، لیکن جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، یہ مکمل آزادی خواہ کسی قسم کی بھی ہو، ناممکن ہے، ورنہ مملکت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اگر حکومت عادی سیاسی حقوق کا دائرہ تنگ کر لے گی تو اس کے خلاف اس کے حقوق کو کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ کر گھٹاتی ہے تو ایسے ملک میں سیاسی آزادی کی کیا بنیادیں قائم ہو سکتی ہیں؟ ایسے ممالک اکثر وہ ہوتے ہیں جہاں یا تو کوئی پرہیزی حکومت وی اقتدار ہو، یا جہاں کی رعایا پر حکومت کتنا اعتبار و اعتماد نہ ہو، یعنی جہاں بھی تو قانون مطالع رائج ہوتا ہو، کہیں فوجی قانون، کہیں دفعہ ۱۲۴ یا بعض دیگر قوانین جاری، سیاسی آزادی کا بہت کم جزو حاصل ہے۔ اس کے بغیر عموماً یہ ممالک مثلاً ممالک متحدہ امریکہ اور انگلستان میں، جہاں کے باشندے دل

دلیقہ لگاتار متعلق دفعہ ہذا شدت ضرورت کی حالت میں ایک طرفہ صادر کیا جائے نیز جائز ہے کہ حکم مطابق دفعہ ہذا کسی شخص خاص کے نام یا عموماً خلق اللہ کے نام منضبط کیا جائے کوئی حکم حسب دفعہ ہذا اس کے صدور کی تاریخ سے زائد از دو ماہ تاخیر سے ہوا اس کے کوئی گورنمنٹ بذریعہ اشتہار مندرجہ گزٹ ہدایت کر دے۔

۴۴ حسب بالا، باب ۶

کھول کر حکومت کی تنقید کر سکتے ہیں، اور خود بھی ملٹی ترین عہدوں پر فائز ہو سکتے ہیں سیاسی آزادی کم بیش مکمل سمجھنی چاہئے۔ اس کے ساتھ ہی زمانہ حال میں چند ممالک میں ایسی حکومتیں قائم ہو گئی ہیں جو خود ملک کے باشندوں پرستل میں لیکن جنہوں نے اپنا فرض سمجھ لیا ہے کہ اپنے اپنے ملکوں کو ایک خاص قالب میں ڈھال لیں۔ ایسی ممالک کی مثالیں روس، ترکی، آسٹری اور جرمنی ہیں۔ اگر ان ملکوں پر بغیر اقوام کی حکومت ہوتی، اور حکومت کی طرف سے روزمرہ زندگی کی کیفیات میں جبر کیا جاتا تو یہ صراحتہ کہا جاسکتا تھا کہ ان میں سیاسی آزادی معقود ہے؛ لیکن اول تو ان ممالک کے باشندوں کا اپنی حکومتوں پر بطور کلیہ اعتماد ہے، دوسرے حکومتیں جو کچھ کر رہی ہیں وہ اپنی دانت میں ملک والوں کی بہتری کے لئے ہی کر رہی ہیں، چنانچہ زیادہ سے زیادہ یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ ان ملکوں میں بالفعل انفرادی آزادی کو محدود کر دیا گیا ہے تاکہ ملک کی حالت پہلے سے بہتر ہو جائے، اور جب یہ ایک خاص

۲۵۳۵ء بمطابق ۱۲۶۱ھ کے موسم حج میں کہ مکہ مکرمہ جانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ وہاں علی المرتضیٰ شاہ حجاز و نجد برسر حکومت تھے اور احکام شریعی کے علاوہ باقی ہر امر شخصی مطلق انسانی کا دور دورہ تھا۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ حجاز میں جہاں صرف دو سال پیشتر آل سعود کی حکومت قائم ہوئی تھی لوگوں کو مکمل آزادی تقریر چل تھی، اور نہ صرف وہ اپنے اپنے گھروں میں اور جرم و مہر میں یں حکومت پر بدل کھول کر مکنتہ چینی کرتے تھے، بلکہ جلالتہ الملک نے آزادی دے رکھی تھی کہ جو چاہے ان کے سامنے آئے اور راہ راست کی تعیین کرے، اس سے معاہدہ اسلام کا وہ عہد مذہب سامنے آیا جب ایک معمولی ٹپھیا حضرت عمرؓ کے ذاتی افعال پر علانیہ و بد مکنتہ چینی کرنے کی جاب بھی جاتی تھی۔

سچ پہنچ جائے گی تو پھر ممکن ہے کہ حکومت اپنے مخصوص طریق عمل پر نظر ثانی کرے
 دستوری آزادی - اب دستوری آزادی کے معنی سمجھیں آجائیں گے۔
 عمومیت والے ملکوں میں بہترین حکومت وہی سمجھی جاتی ہے جو ملک کے باشندوں
 کی حقیقی نائب اور قائم مقام ہو۔ جو لوگ اس اصول کے حامی ہیں ان کا طبع نظریہ ہے
 کہ ملک والے خود اپنے اوپر اپنے ہی مفاد کے لئے حکومت کریں۔ اور اسی سے
 قوم کی دیرینہ قاطعیتیں کھینچ کر ان کا ممکن ہو گا۔ چونکہ آج کل کی عظیم نشان ملکوں میں
 ملک کے باشندوں کے براہ راست حکومت نہیں کر سکتے اس لئے منتخب شدہ نیابت کا
 طریقہ ایجاد کیا گیا ہے جس کے ذریعے سے ان کے نمایندے حکومت کو ترتیب دیتے
 ہیں۔ یہ خیال بعض ممالک میں اس قدر جاگزیں ہو گیا ہے کہ اگر یہ عمومی حکومت
 غلطیاں بھی کرے اور ملک کو نقصان بھی پہنچائے تاہم اسے اتنا مضر نہیں سمجھا جاتا
 جتنا ایک ایسی صورت کو جو نیابتی نہ ہو لیکن ملک کی بہتری کے لئے کوٹاں ہو۔ اس
 میں کوئی شبہ نہیں کہ مسوینی کی مطلق العنان وزارت کی دوران میں اعلیٰ کو دن دینی داتا
 چوگنی ترقی ہو رہی ہے اور مثلاً کے مختصر دور حکومت میں جرمنی کا بین الاقوامی اثر و سبب
 بڑھ گیا ہے لیکن عمومیت پسندوں کے نزدیک دستوری آزادی کے فقدان کی وجہ سے

۱۸۶۲ء میں ابراہیم لنکن Abraham Lincoln صدر ریاستہائے
 متحدہ امریکہ نے گیش برگ Gettysburg والی تقریر میں اپنا طبع نظریہ فرما دیا۔ اس کے مشہور
 الفاظ Government of the People by the People for the
 the People اب گویا انگریزی زبان کی ایک شہر بن گئے ہیں۔

اٹلی اور جرمنی کی حالت نہایت درجہ ناقابل برداشت ہے۔ اس اصول کو مطابق دستوری آزادی صرف ان ہی ملک کے باشندوں کو حاصل ہے جن کا حکومت کی ترتیب و تنظیم میں حصہ ہے اور جہاں خود براہ راست اپنے غامبوں کے ذریعے سے ان کی نگرانی رکھتے اور ان کے افعال کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالتے رہتے ہیں۔

ملکی آزادی۔ آزادی کا مفہوم ایک اور بھی ہے، وہ یہ کہ دی ملک آزاد تصور کیا جائے گا جو کسی دوسرے کے زیر اقتدار نہ ہو۔ آج کل کے زمانے میں مختلف ملک ایک دوسرے سے اس قدر وابستہ ہیں کہ نام نہاد آزاد ملک بھی مکمل طور پر آزاد نہیں کہے جاسکتے۔ مختلف ملک کے مابین معاشرتی تعلقات، ملحد ناموں اور حکیمات کے کشمکش کے باعث فاصلے اور وقت کے معیار میں عظیم الشان تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ اور مسائل آمد و رفت اور دید و شنید کے انقلابات کی وجہ سے مختلف ملک کے مابین معاشرتی روابط بڑھ گئے ہیں، چنانچہ ان سب امور کے باعث کوئی خواہ کتنا ہی باقی ماندہ دنیا سے الگ تھلگ ہو، محض من مانی حکمت عملی پر کار بند نہیں ہو سکتا۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ مکمل ذہنی اور مادی ارتقاء کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک اپنے اندرونی معاملات میں آزاد ہو اور بیرونی معاملات میں کلینہ کسی دوسرے کا محکوم نہ ہو، ورنہ ممکن ہے کہ اس بیرونی سلطنت یا حاکم کی خاطر اسے روزمرہ ایسی قربانیاں کرنی پڑیں جن سے نہ صرف اس کی خودداری مٹ جائے بلکہ اسے بہت سے داخلی نقصانات بھی پہنچیں، اور اگر حاکم ملک نے اپنی مطلب براری کے لئے اپنے اقتدار کا کچھ زیادہ کس دیا تو ممکن ہے کہ اسے اپنی دستکاری، تجارت، جہاز رانی اور صنعت و حرفت

سے بالکلید ہاتھ دھونا پڑ جائے۔^{۵۲۸}

۵۲۸ مشہور عالم 'فنی امور' *Phenomena* آزادی کے لئے حسب ذیل لازم شمار کرتا ہے:-

- (۱) ملک میں کسی دوسرے کا غلبہ نہ ہو۔
- (۲) اپنی حفاظت خود کرنے کا اختیار۔
- (۳) اپنی حکومت کے تعین فاکٹیڈ اختیار۔
- (۴) قومی وسائل کو کام میں لانے کا اختیار۔
- (۵) بیرون ملک کے مفوضات و حقوق عائد کرنے کا اختیار۔
- (۶) ملک کے جملہ افراد و اشیاء پر قدرت۔

فنی امور کا انیسواں پرکرن ہے، "قانون بین الاقوام" *Birkenhead: Order*

national law منقو ۶ میں دیا ہوا ہے۔

باب ۹

حکومت کا دائرہ عمل

ملکت اور حکومت کی مداخلت - انفرادیت اور اشتراکیت - انفرادیت - انفرادیت جدیدہ
 نزاع - پیشہ مندی - اشتراکیت - جماعتیت - انسانیت - اصول اشتراکیت کی تنقید - اعتدال پسندی
 پچھلے باب میں بتایا گیا تھا کہ آج کل اشتراکیوں کا ایک خاص گروہ یہ کہتا ہے
 کہ افراد کے حق مالکانہ اور ان کے معاشی مقابلے کی وجہ سے پیدائش دولت میں بہت
 کچھ وقت، محنت اور سرمایہ رائیگاں جاتے ہیں، لہذا عالمین پیدائش پر حکومت کا پورا
 قابو ہونا چاہئے، اور سرمایہ و زمین دونوں ملکیت ہی کی ملک کہ ہونی چاہئیں۔ یہ اصول بعض

۱۵۰ اس باب میں بہت سی معاشی اصطلاحات کو استعمال کرنا پڑے۔ سیاسیات اور معاشیات
 دونوں علوم عمرانی ہیں، اور ان میں جو باہمی رشتہ ہے اسے باب میں واضح کر دیا گیا ہے۔ زمانہ حال
 میں ان دونوں علوم کا تعلق پہلے سے بھی قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ موجودہ باب میں اس کی خوش
 کی گئی ہے کہ جہاں تک ہر ایک کے معاشی اصطلاحات سے گزر کر کیا جائے، لیکن بعض مرتبہ اس سے
 مفر نہیں ہو سکا۔ ”دولت“، ”مال“، ”زمین“، ”عالمین پیدائش“، ”اجارہ“، اور دوسری معاشی اصطلاحات
 کے مفہوم کے لئے دیکھو الیکس برنی کی کتاب ”اصول معاشیات“ (مطبع جامعہ عثمانیہ)

ضمنی طور پر بیان کیا گیا تھا اور اس وقت بحث و محیص کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ موجودہ باب میں اس اہم بحث پر غور کیا جائے گا اور کشش کی جانے لگی کہ آج کل دنیا کی نفاذ جن طبقہ داری نزاعات کی وجہ سے مکدر ہو رہی ہے ان پر ٹھنڈے دل سے تبصرہ کیا جائے۔

مملکت اور حکومت کی مداخلت۔ اشتراکیت اور اس کے جوابی اصول انفرادیت کا مسدود اصل مملکت کے باہمی تعلقات، اور افراد کے کاموں میں مداخلت کا مسئلہ ہے۔ اس میں تو شبہ نہیں کہ مملکت کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہے، اور چونکہ ملک کی تمام منظم قوت اس کی پشت پناہی کے لئے حاضر ہو سکتی ہے اس لئے بظاہر وہ ایسی مطلق العنان فرمانروا ہے جس کا حکم گویا قانون ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ افراد کی کن کن مصروفیات اور امور میں عمال حکومت کو معمولی طور پر مداخلت کرنے کا اختیار ہونا چاہئے۔ ایک مثال پر غور کیجئے۔ ممالک متحدہ امریکہ کی ریاست یوٹاہ میں ہر شخص جنسی عورتوں سے چاہے نکاح کر سکتا ہے لیکن شرع اسلامی کی رو سے کسی مرد کو چار سے زیادہ نکاح کرنے کا اختیار نہیں ہے اور وہ بھی جب وہ اپنی ہر ایک بیوی کے ساتھ مکمل مساوات کا سواپ کر سکے، پھر اکثر ممالک یورپ میں کسی فرد کو اتنی آزادی بھی حاصل نہیں، بلکہ اگر کوئی شخص ایک زوجہ کے ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کر لے تو وہ گرفتاری تصور کیا جاتا ہے۔ ادھر اٹلی میں مجر دو لوگوں پر حصول عائد کیا جاتا ہے اور ترکی میں بچوں کا گذرہ معزز کیا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں عمال حکومت اکثر ممالک یورپ میں افراد کے جن جنات میں نسبت زیادہ مداخلت کر سکتے ہیں، اسلامی شرع کی رو سے اس سے ذرا کم

اور پوتا جیسی ریاست میں انہیں اس نوع کی مداخلت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ایک دوسری مثال لیجئے۔ انگلستان میں جہاں جبری تعلیم کا قانون مانجھ ہے اگر کوئی شخص اپنے بچے کو جس کی عمر ایک خاص حد سے تجاوز کر چکی ہو، مدرسہ نہ بھیجے تو اس پر مقدمہ چلایا جاسکتا ہے، لیکن ہندوستان میں حکومت کسی شخص کو جبراً اپنے بچے کو مدرسہ بھیجنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

انفرادیت اور اشتراکیت۔ اگر انفرادیت اور اشتراکیت کو اچلی طور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انفرادی مسلک کے پیرو حکومت کو فرد کے حق میں برا تصور کرتے ہیں اور ان کا یہ خیال ہے کہ اس غیر ضروری دست اندازی کو انسان کی آزادی میں رخنہ پڑتا ہے، تاہم ان کے نزدیک چونکہ انسانی معاشرہ ہنوز اس پایہ کمال کو نہیں پہنچا کہ بغیر بیرونی رباؤ کے انسان کی زندگی، حقوق اور املاک، مال و مغلوظ رکھیں اس لئے حکومت کے بغیر چارہ کار بھی نہیں۔ یہی سبب اس کی ضرورت ہے کہ جس وقت ان عناصر حیات میں سے کوئی بھی خطرے میں آئے تو حکومت مداخلت کر کے نقصان رساں کو کیفر کردار کو پہنچائے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ حکومت ایسے معاملات میں بھی دست اندازی کرے جو صرف خود فرد کے حیلہ افتداریں ہوں، جیسے تعلیم، حفظانِ صحت وغیرہ، اس لئے کہ انفرادیوں کی دانست میں ہر شخص کو ان کو طے کرنے کا کلیتہً حق حاصل ہے، چنانچہ ایسی حالت میں بیرونی مداخلت بے کار ملکہ ثنائی نقصان رساں ثابت ہوگی۔

اس کے برعکس اشتراکی یہ کہتے ہیں کہ انسان ہرگز اپنے مفاد کو کما حقہً واقف نہیں ہوتا اور اس کے اور ملکیت کے اغراض میں بعض مرتبہ جو تضاد پایا جاتا،

اُس کے برے نتائج کے انداز کے لئے مملکت کی مداخلت لازمی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ انفرادی معاشرے میں اصول مقابلہ کی ترویج کے باعث انسان کی محنت اور سرمایہ کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو جاتا ہے، اور چونکہ ایک ہی قسم کے کام کو بہت سے لوگ یک وقت انجام دیتے ہیں اس لئے کوئی بات بھی خاطر خواہ انجام کو نہیں پہنچتی۔ اُن کی دانست میں بہترین مملکت وہی ہے جس میں اپنے برائے کا سوال باقی نہ رہے بلکہ سرمایہ و زمین دونوں مملکت ہی کی ہتھی جائیں اور "محنت" پر اسی کی کلیتہ دسترس ہو۔ کل اشتراکی مملکت میں نہ خانگی زمینداریاں ہوں گی نہ خانگی گرنیاں اور اسی نہ خانگی مدارس و کارخانہ جات، بلکہ جس قدر بھی عوامین پیدائش ہیں سب کے سب حکومت ہی کے دست نگہ ہوں گے، ہر فرد کو مملکت ہی کی طرف سے کام کئے گا اور حکومت ہی کے مقرر کردہ معاوضہ پر اس کی قوت بسر ہوگی۔

انفرادیت - اب ان اصول پر ذرا غور نظر ڈالئے۔ انفرادیت کی ابتدا اس وقت ہوئی جب قدیم تجارت کے ساتھ ساتھ حکومت کی مداخلت و نگرانی کے خیالات داخل ہو رہے تھے، آدم سمٹھ، فون سمبولٹ اور ہربٹ اسپنسر

شہ اشتراکیت کی مختصر تاریخ اور بیان کے لئے دیکھو ایس احمد، "اشتراکی تخیل اور تحریک کے رجحانات" *Styas Ahmad: Trends in Socialistic*

Thought & Movement خصوصاً ابواب ۸ و ۹۔

شہ آدم سمٹھ، "دولت اقوام" *Adam Smith: Wealth of the Nations*

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۴ پر

نے اس اصول کو پیش کر کے اس سے مختلف النوع استدلال کئے۔ انفرادیت کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ ہر فرد کو اپنی حرکات و سکنات کی اس وقت تک پوری آزادی ہونی چاہئے جب تک یہ عیاں نہ ہو جائے کہ اس کی آزادی سے کسی دوسرے کو گزند پہنچتا ہے۔ انسانی معاشرے کی بنیاد خود غرضی پر ہے، اور ہر ایک شخص اپنی غرض کو دوسروں کی یہ نسبت بہتر پہچان سکتا ہے، چنانچہ جس قدر بیرونی اور مصنوعی رکاوٹیں کم ہوں گی اتنا ہی وہ اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوگا۔ یہی نہیں، بلکہ ہر فرد کے حصول مقاصد ہی سے افراد کی اجتماعی بہبود مد نظر ہوتی ہے اس لئے کہ آخر افراد ہی سے تو معاشرہ ترکیب پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہر فرد اپنی بہبود کے لئے کوشش کرے گا تو مختلف افراد کے مابین مقابلے کی کیفیت پیدا ہو جائے گی جس سے انسان کی اعلیٰ ترین قابلیتیں نمایاں ہو جائیں گی اور اس میں اپنی مدد آپ کرنے کی اہلیت پیدا ہو جائے گی۔ نیز اس مقابلے کا نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ جواز و فطرتاً ناقابل میں یا ماحول کے باعث ان کی فطری اہلیت رائل ہو چکی ہے وہ یا تو پس پشت چلے جائیں گے ورنہ فنا ہو جائیں گے، جس کی وجہ سے معاشرہ کو بقائے اصلح سے فائدہ پہنچے گا۔ انزل

لڈو فون ہمبولٹ "خیالات متعلق تحدید دائرہ حکومت" Humboldt :

Grenzen der Wirksamkeit des Staats

سٹو ہربٹ سپنسر "فریبقاہہ مملکت" Herbert Spencer: *Man Versus State.*

انفرادیوں کے نزدیک بہتر یہی ہے کہ افراد کے کاموں میں حکومت بے ضرورت مداخلت کرنے سے باز رہے اور صرف انھیں کاموں کی نگرانی نہ کئے جو افراد کی جان، مال اور آزادی کے لئے ضروری ہیں۔

اگر نظریہ انفرادیت پر تنقیدی نظر ڈرائی جائے تو ہمیں بہت جلد اس کے بے بنیاد ہونے کا ثبوت مل جائے گا۔ سب سے پہلا اصول جو اس نظریہ کی گویا جان ہے یہ ہے کہ نہ صرف ہر ایک فرد کو اپنی بہبود پر نظر ہوتی ہے اور وہ اس کے لئے کما حقہ کوشش کرتا ہے بلکہ وہی اس کوشش کا اہل بھی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ہم جانتے ہیں کہ عقل انسانی مکمل نہیں ہے اور روزمرہ اس قسم کے سینکڑوں واقعات پیش آتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لئے اپنے پاؤں میں جان بوجھ کر کلہاڑی مار لینا بالکل معمولی بات ہے۔ اگر وہ اپنے جائز مقاصد حاصل کرنے کے درپے ہوتا اور اس کے حصول کے ذرائع سے بھی واقف ہوتا تو پھر ہم کسی کو ناکامی یا غربت کی زندگی بسر کرتے ہوئے نہ دیکھتے۔

پھر یہ بات غلط ہے کہ افراد اور مملکت کے اغراض ایک ہی ہیں ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ بعض مرتبہ جس چیز میں نصابہ افراد کا مفاد نظر آتا ہے اس میں ان کی اجتماعی کیفیت یا مملکت کا مفاد ضم نہیں ہوتا۔ اگر یہ اجتماعی کیفیت قائم رکھنی ہے (اور اس ضروری نہیں)

لے عسیٰ ان نکرھو افسیادھو خیر کمر عسیٰ ان یجھو اشیادھو شر کمر (قرآن مجید)

سورہ بقرہ رکوع ۱۰۔

۷ باب ۱۱ بالا

۸ باب ۱۲ بالا

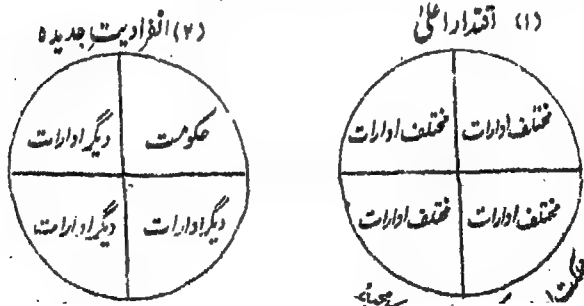
تبعہ و دوزخ خیالات کو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ اور ممتاز رکھنا پڑے گا، اور ممکن سکے ارتقا اور اس کے اغراض کے حصول کے لئے اسی طرح سے آسانیاں اور سہولتیں ہم پہنچانی پڑیں گی جیسے خود افراد کے۔ نظریہ انفرادیت پر تیسری تنقید یہ کی جاسکتی ہے کہ انفرادی جس ”آزادی“ کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اس کا تعین ممکن کی انتہائی مداخلت کے بدون نامکن ہے اور فطری آزادی حقوق کیسے ہی دل خوش کن خیالات کیوں نہ ہوں، بغیر اس انتہائی مداخلت کے ان کی بنیاد محض ہوا ہے۔ آخری دلیل جو انفرادیت کے موافق پیش کی جاتی ہے وہ فلسفے اصل کی ہے، اور اس کا سب سے بڑا مؤید ہر برٹ سینٹر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی معاشرے کی حقیقی فلاح و بہبود اسی میں مشتمل ہے کہ بہترین افراد باہمی مقابلے کے ذریعے سے آگے بڑھیں اور بدترین فنا ہو جائیں۔ بظاہر یہ خیال بہت ہی اچھا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بے کار فرد باقی نہ رہے جو اٹھ پاؤں ہلاکے بغیر دوسروں کا گریہ پیٹ کاٹ کر رکھتا ہو، لیکن ذرا غور کرنے سے یہ نظریہ بالکل بے اصل معلوم ہونے لگتا ہے۔ اول تو سینٹر کا یہ خیال ایسے جانوروں سے اخذ کیا گیا ہے جن میں اپنی اہم صلاح کی اہمیت نہیں، درنحالیکہ انسان ان جانوروں سے ممتاز ہے، اور وہ ہر ان اپنی حالت کو بہتر بنانے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ بعض ترقی یافتہ ممالک میں اب وہی ہرے، اندھے، گونگے لوگ اور اچانچ، جنھیں شاید سینٹر دیکر ادیتا، معاشرے کے

مفید عناصر بن گئے ہیں، اور جنہیں فطرت کی طرف سے جملہ قواسم جسمانی عطا ہوئے ہیں ہر لحاظ اپنی اور اپنے ماحول کی حالت کو سدھارنے میں مشغول ہیں۔ جب وہی صورت حال یہ ہے تو پھر جانوروں کی عادات و خصائص سے استدلال کرنا اور نئی نوع انسان کو گردن زدنی قرار دینا کہاں تک مناسب ہے۔ دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ مقابلے کی زد و جد سے بدخفا ہو جاتے ہیں اور نیک باقی رہتے ہیں، درحالیکہ حقیقتہً اس سے بہت سے لوگ ایک ہی قسم کا کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے معاشرہ کو صریح معاشی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے، اور پھر جو شخص مقابلے کی وجہ سے امتیاز حاصل کر لیتا ہے وہ اگرچہ اضافی اعتبار سے قابل ترین ہو، لازماً بہترین نہیں ہوتا؛ اس کے وسائل اور اس کا دائرہ نظر نسبتاً تنگ ہوتے ہیں؛ اس کے برعکس اجتماعی انتظامات کی شکل میں یہ دائرہ وسائل کی فراوانی، مقاصد کی توسیع اور سرمایہ کی زیادتی کے باعث وسیع تر ہو جائے گا۔

انفرادیت جدیدہ۔ حال کے زمانے میں دوسرے سیاسی نظریوں کی طرح انفرادی نظریہ نے بھی چولا بدلا ہے اور بالخصوص پچھلی جنگ عظیم کے بعد اس کی ہیئت میں بہت کچھ تبدیلی ظہور میں آئی ہے۔ دوران جنگ میں اور اس کے بعد تقریباً ہر ملک میں دو قسم کی کیفیات ظاہر ہوئیں، ایک تو حکومت کی مداخلت اور دوسرے حکومت کے علاوہ دیگر اداروں کے اثر میں توسیع۔ جنگ کے زمانے میں اس کی ضرورت

۱۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ لندن کا مشہور مزاحیہ رسالہ ”پنچ“ بریل تحریر میں اندھوں کے فائدہ کے لئے شائع ہوا کرے گا۔

پیش آئی کہ مرکز گیر قوتوں کا یا تو خاتمہ کر دیا جائے ورنہ حکومت کسی نہ کسی طرح سر
ان پر حاوی ہو جائے، چنانچہ نئے نئے محاسن جاری ہوئے، "قوانین تحفظ قومی"
نافذ کئے گئے، اکثر جنگجو ممالک میں ہر ایسے شخص کو جو جنگ میں حصہ لینے کے قابل تھا،
بھرتی ہونے پر مجبور کیا گیا، خانگی کارخانوں اور گریوئوں میں جن میں پہلے روزانہ ہتھیار
کی اشیاء بنائی جاتی تھیں، سامان جنگ اور گولہ بارود بننے لگا، انٹرنیشنل حکومت
کی نگرانی ہونے لگی اور حکومت کے عمال ہر موقع پر نظر آنے لگے۔ اس صورت حال
کے خلاف رد عمل ہو نا لازمی تھا، چنانچہ جنگ کے بعد لوگوں کو حکومت کی دست برد
اور بد اہلیت سے ایک قسم کی نفرت سی پیدا ہو گئی اور بڑی بڑی قومی انجمنوں اور ادارت
نے خود اپنے ضابطوں اور قاعدوں کا نفاذ کر کے یہ دکھا دیا کہ ترتیب و تنظیم محض
حکومت کے جبری سے برقرار نہیں رہتی بلکہ اس کے بغیر بھی ممکن ہے۔ انہیں کھاشی
کیفیات سے انفرادیت جدیدہ جنم لیتی تھی۔ اول تو اکثر ملکوں کے باشندوں میں
نئے جدید نظریوں کے متعلق جوڑکی کتاب "زمانہ حالیہ کے سیاسی نظریات" *Modern Political Theory*
نہایت سلیط اور پر معلومات ہے۔ نظریہ اقتدار اعلیٰ اور نئی انفرادیت
کے درمیان جو تعلق ہے وہ حسب ذیل شکلوں سے معلوم ہو گا۔



عام طور پر یہ خیال پیدا ہو گیا کہ عقیدہ پرستی اور ملکی سیاسیات دو مختلف چیزیں ہیں، اور یہ یقین ہو گیا کہ انفرادی اور اشتراکی عقیدہ پرست کچھ ہی کہتے ہوں، ہر ملک کا سیاسی ارتقا اس ملک کی سیاسی کیفیات کے مطابق ہوتا رہے گا۔ ایک مسلک یہ بھی قائم ہو گیا کہ مملکت کو محض افراد کی بجائے ان کے مجموعوں کا مقابلہ کرنا ہے، اور جس طرح ہیں یہ سمجھا یا جاتا ہے کہ وقت آنے پر ہم اپنے ملک (یعنی اپنے مخصوص جغرافیائی پٹے) پر اپنی جان بگ قربان کر دیں، اسی طرح دوسرے ایسے ادارات بھی ہیں جن کے واسطے ممکن ہے کہ ہمیں قربانی کرنی پڑے، وہ ادارات ہمارا مذہب، ہمارا مدرسہ، ہمارا کلیسہ، ہمارا اتحاد تجارتی وغیرہ ہیں۔ نئے افراد یوں کا قول ہے کہ اگر مملکت اور اُن قومی یا مذہبی عالمگیر ادارات کے مابین تصادم ہو جائے تو استقرائی اعتبار سے کوئی وجہ نہیں کہ مملکت ہی کو فوقیت حاصل ہو، اور موجودہ صورت حال میں ان ادارات کو نظر انداز کر دینا کسی طرح سے مناسب نہیں۔ ان کے نزدیک مملکت کی بابت زیادہ سے زیادہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ جملہ مجموعہ بات انسانی کی ایک عہدیت یا وفاقت ہے، جس کے ذریعہ سے ان ادارات کے مابین ایک قسم کی ترتیب و تنظیم پیدا ہو جاتی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مملکت کو فی نفسہ کسی قسم کا ایسا تفوق حاصل ہے

مثلاً اس خیال اور نظریہ اقتدار اعلیٰ سے جو عقین چرس کسٹے دیکھو لا کی کی تعانیف خصوصاً "مسئلہ اقتدار اعلیٰ" *Laski: The Problem of Sovereignty* "صرف و نحو سیاسیات" *The Grammar of Politics* نیز دیکھو باب ۱۱ عنوان "سیکٹیری نظریہ"۔

جس کے باعث اسے ان ادارات کو فنا کرنے کا بھی اختیار حاصل ہو۔

”نراج۔ اب انفرادیت کی انتہائی شکل یعنی نراج کے اصول پر نظر ڈالئے۔ عام طور پر ”نراج“ کے معنی ”نابودیت“ یا جملہ معاشری ادارات کے بربادی کے لئے جاتے ہیں، اور ان دونوں لفظوں سے شہنشاہیت پسندوں نے اپنا جو کام نکالا ہے اس کے باعث ہم انھیں بالالتزام انقلابی سمجھنے لگے ہیں جہاں کسی بدخبت نے کوئی بم پھینکا، جہاں کسی سیاسی جرم کا ارتکاب کیا گیا، بس ”نراج“ کی صدائیں ہوا میں چکر لگائے لگیں، اور چونکہ عام طور پر اس قسم کے حالات سے کام نہ لانا مقصود ہوتا ہے اس لئے کسی کو یہ سوچنے کی ہمت نہیں ملتی کہ آخر نراج کے معنی کیا ہیں اور یہ کم واتی کسی نراجی نے پھینکا ہے یا اس کا مقصد کچھ اور ہے ”نراج“ کے معنی عدم حکومت کے ہیں، اور اس کے موید چاہتے ہیں کہ انسانی تولدے ذہنیہ جسمانیہ میں کچھ اس قسم کا ارتقا ہو جائے کہ جبر و اکراہ بالکل غیر ضروری ہو جائے اور افراد اور ان کے مجموعے ہر کسی بیرونی دباؤ کے جملہ کار و بار زندگی انجام دے سکیں ان کے نزدیک حکومت ایک بڑے بھاری مضبوط پریشی ہے، وہ یہ کہ سیاسیات میں نیابت کے اصول کا انطباق ممکن ہے، یا کوئی شخص کسی مصنوعی رقبے کی آبادی کا نائب بن سکتا ہے، بلکہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی دانا و دنیا کیوں نہ ہو، ہر اکابر میں رائے دینے کا اہل نہیں ہو سکتا، نہ یہ ممکن ہے کہ ”مختار“ اپنے ”اصل“ سے ہر ایک معاملہ میں استفسار کیا کرے۔ اس کے ساتھ ہی موجودہ حکومت بے کار بھی ہے، اس لئے کہ تعلیم اور حفظان صحت ہی نہیں بلکہ ملک کی حفاظت بھی اختیاری انجمنوں اور جموں کے ذریعے سے کی جاتی ہے، مثلاً ان کا یہ قول ہے کہ تاریخ دنیا پر

نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی حملہ آور بہت مرتبہ کسی ملک کی منظم فوجوں کے مقابلے میں تو سبقت لے جاتے ہیں لیکن انھیں آخر کار شہریوں کے ایسے اختیاری مسلح گروہوں کے سامنے نچا دیکھنا پڑتا ہے جو جگہ جگہ سے چھپ چھپ کر ان پر گولے برساتے ہیں۔ بہر حال زراچیوں کے نزدیک اگر مملکت اور حکومت کا اٹھ اٹھا لیا جائے تو کاروبار اور مختلف امور کی کارفرمائی بالکل موجودہ زمانے کی طرح سے ہوتی رہے گی، صرف فرق یہ ہوگا کہ ملک میں بجائے مقابلہ، عناد اور دشمنی کے محبت اور اتحاد و اتفاق کا راج ہو جائے گا۔ ان کے خیال میں حکومت کے فقدان کے باوجود ترتیب و تنظیم باقی رہے گی لیکن جبر کا عنصر بالکل اٹھ جائیگا ان کا سب سے بڑا کردار تو یہی کہتا ہے کہ تم اگر جبریل سے منسوب ہو جاؤ تو تمہیں بیسوں ملکوں اور شہرکوں کی ریلوں میں سفر کرنا پڑے گا جنھیں لاکھوں کروڑوں مزدوروں نے بنایا ہوگا، لیکن جن کی ہم آہنگی کے لئے کسی برسرِ انداز مرکزی قوت یا ادارہ کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ ان کے نزدیک فرد صرف اسی وقت آزادی کا دعویٰ کر سکتا ہے جب سیاسی بساط سے مملکت اور حکومت دونوں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں۔ اسی حالت میں فرد کو مملکت اور سرمایہ وارد دلوں کے جوئے سے آزادی حاصل ہو جائے گی اور کئی امر دان کی بجائے اختیاری انجمنوں کے ذریعہ سے انجام پایا کریں گے۔

ملا کر دیکھیں، "زراچ کا فلسفہ اور اس کا ملحد نظریہ" *Kropotkin: Anarchism* its Philosophy & Ideal. اس کا ذکر جو کئی کتاب (سب بالا میں دیا ہوا ہے)۔

پیشہ سہری - اشتراکیت کی طرف رجوع ہونے سے پیشتر ہمیں ایک اور تحریک کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے اور وہ پیشہ سہری ہے۔ پیشہ سہری کی ابتدا فرانس میں ہوئی تھی اس کا بانی مہانی پروو وھول تھا جس نے یہ خیال غامبر کیا کہ دنیا کی جملہ حکومتوں میں دراصل طبقہ اوسط یا طبقہ اعلیٰ برسرِ اقتدار ہے، اور یہی دو طبقے ملک کی افزائش دولت میں کم سے کم حصہ لیتے ہیں۔ اس کے نزدیک واقعہ یہ ہے کہ وہی طبقہ جو پیدائش دولت کے لئے اپنا عزیز وقت اور اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے (یعنی مزدور) سیاسی حقوق سے ایک بڑی حد تک محروم ہے۔ اتحادی کہتے ہیں کہ حکومت کے خیل کو بالکل غائب کر دیا جائے اور اس کی جگہ تمام سیاسی قوت مزدور سبھاؤں کے ساتھ وابستہ ہو تاکہ مزدور ہی سیاسی معاشرہ کے رہبر اور روح رواں ہو جائیں۔ معاشی اعتبار سے پیشہ شاہی اشتراکیت کا عکس ہے، اس لئے کہ جہاں اشتراکیت میں "مصارف" کی اہمیت پر زور دیا جاتا ہے وہاں پیشہ سہری مزدور کو معاشرہ کا اہم ترین عنصر قرار دیتی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق مرکزی روایت کے باعث ضرورت سے زیادہ یکسانی، روزمرہ کا بے جان چکر، جدت کا فقدان اور بے اعتباری کے احساسات نمایاں ہو جاتے ہیں جس سے معاشرہ کو صریح نقصان پہنچتا ہے۔ جہاں پارلیمنٹیں قائم ہیں وہاں مزدور فریق کے ارکان دراصل اپنے ہم خیالوں کے قائم مقام نہیں بلکہ اپنے حلقہ جات انتخابات کے تابع مقام ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ بالکل دست و پا بستہ ہوتے ہیں اور مزدوروں

شاہد دیکھو لیون: "فرانس میں اتحادیت" *Devine: Syndicalism in France.*

اور آجروں کی بہبود کے لئے چاہیں بھی تو کچھ نہیں کر سکتے۔ اس کے موذیہ جلتے ہیں کہ کسی ملک میں نسبتاً کم ایسے لوگ ہوں گے جو ان کے ہم خیال ہوں، لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عہد ارتقا میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کو راہ راست پر لایا جائے جس کے لئے کسی کثرت رائے کی ضرورت نہیں، بلکہ حکومت اور اہل داروں کو بالآخر ”کھلے عمل“ یعنی ”ٹر ٹال“، ”مقاطعہ“، ”خفیہ شرارت“ انگیزی وغیرہ کو ذریعے سے دباؤ ڈال کر اپنا کہا منوایا جائے۔

تتبیہ۔ مزاج کے نظریہ کو کسی نے تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا، اور اس سے بڑا سقم یہ معلوم ہوتا ہے کہ (جسا اور بیان کیا جا چکا ہے) بلاشبہ انسان خود غرض ہے، افراد اور جموعوں کے باہمی اغراض میں یقیناً تضاد مہوتا رہتا ہے، اور اس تضاد کو روکنے کے لئے محض اختیاری انجمنیں اور اختیاری ادارات ہرگز موثر نہیں ہو سکتے۔ اگر چوری کے انسداد کے لئے ایک انجمن، قاتل کو سزا دینے کے لئے دوسری انجمن، اور قرضہ کی ادائیگی پر مجبور کرنے کے لئے تیسری انجمن قائم کی گئی تو پھر جس انجمن کی قوت دوسری انجمنوں سے بڑھی ہوئی ہوگی وہی موجودہ حکومت کی جگہ لے لے گی اور دوسری ”اختیاری انجمنوں“ اور ادارات کو اپنا مطیع کر لے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں حاکمیت و محکومیت کے اصول بھرے ہوئے ہیں اور کسی نظریہ ساز کی تحریر یا محض عقیدہ پرستی کی وجہ سے اس کی فطرت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی کیفیت اتحادیت کی بھی ہے۔

پیشہ و اسلئے جاسکتے ہیں کہ تمام مزدور سبھائی باہم متفق ہو جائیں اور یہ جدید ”دفاقت“ حکومت کی جگہ حاصل کر لے۔ ظاہر ہے کہ جب اس دفاقت کو حکومت

کے اختیارات حاصل ہو جائیں گے اور وہ شہریوں سے اپنے احکام جبراً منوانے لگے گی تو پھر موجودہ حکومت کو تہ و بالا کرنے کی کوشش ضروری سمجھی گئی ہے۔

اشتراکیت - انفرادیت کا مفہوم سمجھنے کے بعد اشتراکیت کی طرف آئیے اور سب سے پہلے اشتراکیت کے ابتدائی نظریہ کو لیجئے۔ اشتراکیوں کا سب سے بڑا گرو اور اشتراکی نظریہ کا ایک موجودہ کارل مارکس ہے جس نے اپنی کتاب ”موسمہ“ اصل داری“ کو ۱۸۸۷ء میں جرمنی میں شائع کرایا۔ صنعتی دیکھائی انقلاب کی وجہ سے ایک طرف تو دولت روز بروز نسبتاً کم تعداد لوگوں کے قبضے میں چلی جا رہی تھی اور بڑی بڑی شرکتوں اور عظیم الشان کارخانوں کا دور دورہ شروع ہو گیا تھا، اور دوسری جانب اسی دولت کی وجہ سے اصل داروں کی ٹیٹھ بھاری اور بچارے مزدوروں کی کم مانگی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کارل مارکس نے انھیں اثرات کے تحت اپنی کتاب لکھی جس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دنیا کے جملہ آلام و نقائص کا انداز صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ موجودہ معاشرے کی بنیاد یعنی خانگی ملکیت کا خاتمہ کر دیا جائے اور اس کی بجائے مشترکہ ملکیت کے اصول پر عمل کیا جائے۔ بلاشبہ ہر قسم کے کاروبار کے لئے اصل کی ضرورت ہے لیکن اصل کی ملکیت افراد کی بجائے ملکیت کے ساتھ وابستہ ہونی چاہئے، جو افراد کی اجتماعی کیفیت ہی کا دوسرا نام ہے۔ ملکیت کا مقصد اعظم یہ ہونا چاہئے

Karl Marx: Capital.

کارل مارکس ”اصل داری“

(انگریزی ترجمہ)

کر اصل کو محض چھوٹی سی جماعت کیلئے فائدے کیلئے نہیں بلکہ تمام معاشرے کی فلاح کی غرض سے استعمال کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب سرمایہ ملکیت کے قبضے میں آجائے گا تو ملکیت ہی اُسے کام میں لائے گی، جس کی وجہ سے مقابلہ جیسے نقصان رسا عنصر کا سدباب ہو جائے گا، اور بجائے چند چٹنے ہوئے لوگوں کے تمام معاشرہ ملکی کو طرح طرح کے فوائد حاصل ہوں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ اشتراکیت کے رواج سے خود افراد کی عام اخلاقی حالت بھی بہتر ہو جائے گی اس لئے کہ وہ محض اپنے اغراض کو ملحوظ رکھنے کی بجائے ملک کے معاشرتی مفاد کے حصول میں کوشاں ہوں گے۔ ان تمام انتظامات کے واسطے ملکیت کی درست اندازنی لازمی ہے، اس لئے کہ وہ افراد کی فلاح و بہبود سے خود ان سے کہیں زیادہ واقف ہوتی ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے حکومت کو جملہ عاملین پیدائش پر خاص نگرانی رکھنی پڑے گی، کارخانوں کا انتظام کرنا پڑے گا اور ہر شخص کے واسطے اس کے کام کے مطابق آرام و آسائش کا انتظام کرنا پڑے گا۔

اجتماعیت - یہ تو ابتدائی اشتراکیت کی نظریہ ہوا، لیکن پچھلے اسی برس میں (بالخصوص جنگ عظیم کے بعد) اس میں بہت کچھ تبدیلیاں اور اضافے ہوئے ہیں گو اب بھی ان سب کا وارد مدار کارل مارکس کے خیالات ہی پر ہے جس خیال کا سب سے زیادہ تعلق ابتدائی اصول کے ساتھ ہے وہ اجتماعیت ہے، اور اس کے موید صرف یہ چاہتے ہیں کہ اشتراکی اصول کا اثر ہر ملک میں بندرج پیدا کیا جائے تاکہ حکومت کی کل اشتراکیوں کے قبضے میں آجائے۔ اس کے لئے مغربی یورپ کے ہر ملک میں باضابطہ اجتماعی سیاسی گروہوں کو منظم کیا گیا جن میں

سے شاید سب سے پہلا گروہ جرمنی کی "انجمن مزدوران" کی شکل میں نمودار ہوا جسے فروری ۱۸۴۸ء کے وسط میں قائم کیا تھا، اور ۱۸۴۸ء میں آخر کار جرمانی "دستوری اشتراکی" گروہ کی بنیاد پڑی جس نے سولہ سال بعد یعنی ۱۸۶۴ء میں اپنے پیش نامہ کا اعلان کیا۔ اس پیش نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریق انقلاب پسند نہیں بلکہ حکومت میں اس وقت تک ارتقاء کا خواہاں ہے، جب تک ملک میں اشتراکی خیالات پورے طور سے سرایت نہ کر جائیں۔ اسی طرح انگلستان میں اشتراکی خیالات کی رہبری جارج برنارڈشا اور شے مین سوسائٹی نے کی جس کے روح رواں مسٹر سڈنی ویب ہیں۔ ان کا سطح نظریہ یہ ہے کہ ایک طرف تو حتی الامکان لامرکزیت کے اصول ترویج کریں اور دوسری جانب جبری ہمہ "وظائف مہربان کارخانہ داروں اور مزدوروں کی جبری پنچائیت اور نگرانی کارخانہ جات کے اصول کے ذریعے سے مداخلت حکومت کے دائرے کو وسیع کریں۔ یہی وہ طریقے ہیں جن کے ذریعے سے اجتماعیل کو مختلف ممالک میں لائانی کامیابی حاصل ہوئی ہے اور ایک طرف تو ۱۹۱۹ء میں جمہوری جرمنی کا سب سے پہلا صدر وہاں کے اشتراکی گروہ کا جبر فڈرشل ایبرٹ مقرر ہوتا ہے، دوسری جانب ۱۹۲۹ء میں انگلستان کے مزدور فریق کا

۱۹۲۹ء دیکھو کہ "تاریخ اشتراکیت" *Encyc: A History of Socialism*

۱۹۲۹ء کے وسط میں مزدور جماعت کی جو وزارت ترتیب دی گئی اس میں سڈنی ویب کو وزیر نوآبادیات بنایا گیا اور ملک معلم نے انھیں برنی کارتبہ اور لارڈ پاس فیلڈ کا خطاب مرحمت کیا

صدر ریجنل میکڈائٹلڈ خود شاہ جارج پنجم کے ہاتھ سے قلمدان وزارت حاصل کرتا ہے۔

اشتمالیت - اشتمالیت کا آخری اور سب سے اہم پیرایہ وہ ہے جسے اشتمالیت کا لقب دیا جاتا ہے، اور جس نے روس میں بولشویت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ بولشویت پر اس وقت بحث نہیں کی جائے گی بلکہ اس مخصوص طرز حکومت پر سیاسی فرقہ بندی کے سلسلے میں آئندہ غور کیا جائے گا؛ اس وقت صرف اس کے بنیادی اصول یعنی اشتمالیت کو بہ نظر غائر دیکھنا ہے اجتماعیت کی طرح اشتمالیت کے پردہ بھی ایک مخصوص طرز کار کے ذریعہ سے اپنے مقصد کے حصول کے خواہاں ہیں۔ جس طرح اجتماعیت پسند محض ارتقاء کے ذریعے سے اشتراک کی کیفیت کو پیدا کرنا چاہتے ہیں اسی طرح اشتمالیوں کے

قلمدان انگلستان کی مزدور جماعت نے ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۱ء تک حیرت انگیز ترقی کی۔ ۱۹۲۹ء میں ایوانِ علم میں اس کے قائم مقاموں کی تعداد صرف دو تھی، یہ تعداد بڑھتے بڑھتے ۱۹۳۱ء میں ۱۹۱ ہوئی اور اس گردہ کے رہنما ریجنل میکڈائٹلڈ انگلستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ مزدوروں کی وزارت بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۳۱ء کے عام انتخاب میں یہ تعداد ۲۸۸ ہو گئی اور میکڈائٹلڈ کی دوسری "مزدوروں کی کاغذیہ" کا تقرر ہوا۔ اس کے بعد اس فرقے میں تفرقے پڑ گئے، اور خود میکڈائٹلڈ اپنے پرانے رفقاء کے کار کو چھوڑ کر قدامت پسندوں اور برہمنوں کے ایک جڑ سے جاملے اور نام "تومی" کا بیہ ترتیب دیدی۔ اس وقت سے اب تک مزدور جماعت کو برابر زوال ہو رہا ہے اور اب اس کے صرف ۱۵۴ نمائندے ایران عام ہیں۔

نزدیک آئرش کی مقاصد کا حصول انقلاب اور طبقہ واری جنگ کے بغیر ممکن نہیں اس لئے کہ کراچی و دنیا کے اہل داروں اور سرمایہ داروں نے اپنی بنیاد کو اس درجہ مضبوط کر لیا ہے کہ وہ کسی حالت میں ملامت سے راہ راست پر نہیں آسکتے۔ ابتدائی اشتعالیں جو جرمانی سیاسی فلسفی اینگلس کا نام نہایت متنازعہ ہے، لیکن جسے بھی اشتعالی گزرے ہیں ان سب میں متنازع ترین شخص جس نے اصول اشتعالیت کی علمی ترویج کر کے اس کی تاریخ میں گویا چار چاند لگا دئے ہیں، لیکن تھا، جو سالہ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۴۹ء تک مسلسل ردوں کا آہر رہا اور جو زمانہ حال کے عظیم ترین انسانی رہبروں میں شمار کرنے کے قابل ہے۔ لیکن کہتا ہے کہ یہ خیال محض قلم ہے کہ جس طبقہ کے قبضے میں صدیوں سے قوت و اقتدار رہا ہو وہ بغیر فیصلہ کن جنگ کے اپنے اقتدار سے دست بردار ہو جائے گا، چنانچہ اس کی ضرورت ہے کہ جس طرح سے ہو سکے مزدور اور ملک کا محنتی طبقہ، جو اس وقت تک نہایت کس مہر سی کے عالم میں رہا ہے، جبراً و قہراً موجودہ سیاسی اختیارات اپنے قبضہ میں کر لے اور انہیں خود اپنے مقاصد کے حصول کی غرض سے کام میں لائے:

Marx & Engels: "اعلان اشتعالین"

The Communist Manifesto (Eng.)

Trans., Ch. Kew, N. Y.)

Lenin: "الانقلاب طبقہ اسفل Proletarian Revolution."

اشرار کی کہتے ہیں کہ یہ حکومت بلاشبہ محض ایک طبقہ داری جماعت پر مشتمل ہوگی اور
 مجمع معنی میں ملک کی قائم مقام نہیں ہوگی، لیکن یہ طریقہ صرف اس لئے استعمال کیا
 جانا ضروری ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے اہل داروں کا سیاسی و معاشی اجارہ منسوخ
 کر دیا جائے۔ زمانہ موجودہ میں جتنی بھی بے اعتباری انقضائے امن نظر آتا ہے وہ
 سب عدم مساوات کی وجہ سے ہے؛ جب مکمل مساوات ہو جائے گی اور حق
 بحق دار رسید کے اصول کے تحت مختلفوں اور مزدوروں کو جو اپنے پسینے کی
 کمائی سے اپنا پیٹ پالنے ہیں، جملہ گم شدہ حقوق مل جائیں گے، تو پھر ایسی سیاسی
 فضا پیدا ہو جائے گی جس میں جبر و اکراہ کی حاجت نہ ہوگی اور اس طرح گو یا جی
 نوع انسان کو سیاسی نجات حاصل ہو جائے گی۔ جبر و اکراہ کے فقدان کے ساتھ
 ہی محاشرہ سیاسی یعنی مملکت کی بھی ضرورت باقی نہیں رہے گی، اس لئے کہ اس
 کا اہل اصول اقتدار اعلیٰ ہے اور اس کی ضرورت صرف اس لئے داعی ہوتی ہے
 کہ مختلف طبقات آبادی کے مابین توازن پیدا کیا جاسکے جب طبقہ جماعت آبادی
 ہی کا خاتمہ ہو گیا تو پھر مملکت یا محاشرہ سیاسی کی کیا ضرورت باقی رہی، انقضائے
 گواشتر اکیس اور انفرادیت کے مابین بعد اشرقتین معلوم ہوتا ہے، لیکن ان
 دونوں کا انتہائی نسبت العین یہی ہے کہ ایسا زمانہ آجائے جس میں فرد کو کامل آزادی
 حاصل ہو اور کسی قسم کی بیرونی قوت یا اقتدار کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

اصول اشتہائیت کا العین اور ضروریات زمانہ کے اعتبار سے اس میں
 تغیر و تبدل ایک بین الاقوامی اشتہائی کانگریس کے ذریعے ہوتا رہا ہے جسے اصطلاح
 میں "اشتہائیت" کہتے ہیں۔ اس "اشتہائیت" نے اس وقت تک تین چہلے بدلے ہیں۔

اس کا سب سے پہلا جلسہ سوئسٹان کے شہر بازل میں ۱۸۶۶ء میں ہوا جس میں اشتہلیوں نے بائکون اور اس کے لاجی پیروں کو انہی جماعت سے نکال دیا اور اس طرح گویا یہ اعلان کر دیا کہ مداخلت حکومت کے متعلق ان دونوں جماعتوں کے مابین ایک اصولی فرق ہے، وہ یہ کہ جہاں نراجی گروہ حکومت کے وجود کی مخالفت ہے، وہاں دوسرا یعنی اشتہلیوں کا فریق حکومت کی کل کو اپنے قبضے میں لا کر اس کے ذریعے سے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دوسری بین الاقوامیہ کا انعقاد کیمبرج کے شہر اینٹ ورپ میں ۱۸۸۹ء میں ہوا اور اس میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب بھی کارل مارکس کے اصول کی لغوی و معنوی پابندی پیٹے ہی کی طرح ضروری ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہونی چاہئے۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس اشتہلیہ کا مسلک تقریباً بائکونیا ارتقائی تھا، اور اس میں انقلاب کو بہت ہی کم دخل تھا، لیکن اس کے انعقاد کی وجہ سے اشتہلی گروہ میں ایک قسم کا ہرجان پیدا ہو گیا اور مزدوروں کی انجمنوں میں تنظیم کی جو کیفیت پیدا ہوئی وہ برابر جنگ عظیم تک جاری رہی۔ اس تنظیم کی وجہ سے آئل واروں اور ہیرا ہاروں کی طرح کی مداخلت حاصل کی گئیں اور جنگ عظیم کی انداز پر محسوس ہونے لگا کہ شاید کارل مارکس کی پیش گوئی درست ثابت ہوگی اور اشتہلیوں کے مقاصد محض ارتقائی اور آئینی طریقوں سے حاصل ہو جائیں گے، لیکن جنگ نے اشتہلیوں میں ایک خاص نتیجہ پیدا کر دیا اور اس کے بعد ہی ارتقائی اور انقلابی اشتہلیوں کے مابین گویا دیوار آہنی حائل ہو گئی، ارتقائی گروہ تو قومی حکومتوں کے ساتھ مل گیا اور انقلابی گروہ کے افراد مختلف ممالک کے مزدوروں اور مختلفوں کو اپنا بھائی بند سمجھ کر فی نفسہ

جنگ اور اصول جنگ سے منفرد ہو گئے۔ ان کے اس میدان کے باعث ایک طرف تو ہر ملک میں ان پر تشدد ہونے لگا اور دوسری جانب انھوں نے قومی ملکوں کے ساتھ دینے سے منہ موڑ لیا۔ ان اخراجات کے ماتحت ۱۹۱۷ء میں (یعنی روس کے بولشوی انقلاب کے بعد) روس کے مرکز کو سکوپس تیسرے اشتعالیہ کا انعقاد ہوا، اور اس نے وہ اعلان شائع کیا جو تمام اشتالیوں کا نصب العین ہو گیا ہے، یعنی مارکس اور اینگلس کے اصول کے ساتھ ہی ساتھ اس نے آخر کار قطعی طور پر اپنے انقلاب پسند ہونے کی ذرا دوا منظور کر لی جس کا لب لباب یہ تھا کہ اشتالیوں کا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ اصل واری کا خاتمہ کیا جائے اور ”ارڈلیہ“ کی آمریت قائم کی جائے۔

اصول اشتالیہ کی تنقید۔ اگر اشتراکیت پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ تمام دوسری غالی تحریکات کی طرح یہ بھی منافطوں سے بھری ہوئی ہے۔ سب سے پہلی تو یہ ہے کہ اس میں تین عاملین پیدائش (یعنی ”زمین“ ”محنت“ اور ”اصل“) میں سے ایک یعنی ”محنت“ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ انفرادی حالات میں تو قیمت، نوعیت و مقدار پیداوار، تقسیم دولت اور دوسرے معاشی امور کا تعین خود بخود طلب و رسد کے قانون کی بنا پر ہوتا ہے، لیکن جب مقابلہ ہی غائب ہو جائے گا تو پھر ان کا تعین بہت

۱۷۱ اشتالی روس میں ارڈل طبع اپنے رول ہونے پر اتنا فخر کرتے ہیں جتنا سرمایہ دار ملک میں شریف اپنی شرافت پر۔

دشوار ہو جائے گا۔ تیسرے جہاں مقابلہ نہ ہونے سے رشوت ستانی اور سازشوں کا بازار گرم رہے گا وہاں جب ذاتی بہبود اور ذاتی منفعت کا خیال نہ رہے گا تو افراد بے پرواہ ہو جائیں گے۔ ارسطاطالیس اپنے استاد حکیم افلاطون کی نظریہ اشتراکیت پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب انسان کسی کام کو خود اپنا تصور کرتا ہے تو اس میں وہ شرکت اور ساجھے کے کام سے کہیں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔^۱ ان تمام باتوں کے ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ زمانہ حال کے اشتراکی اصول کے پیرو طبقہ داری حکومت کو محض ایک منزل ارتقا تصور کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اچھی طرح یا بری طرح کسی طرز پر بھی ناسیوری اور عدم مساوات کو مٹا کر ایسا مکمل آزاد معاشرہ قائم کیا جائے جس میں مملکت یا حکومت کی ضرورت ہی نہ ہو؛ اس میں اور نراج میں ملن کوئی فرق نہیں، سوائے اس کے کہ نراجی آج ہی سے مملکت اور حکومت کے خاتمے کے درپے ہیں اور اشتہالی بالآخر اسی نتیجہ پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں آخری بات یہ کہنی ہے کہ تیسرے بین الاقوامیہ کے اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا مقصد اعلیٰ مساوات نہیں بلکہ آزت ہے۔ اگر ہم پچھلے بیس سال کی تاریخ روس پر نظر ڈالیں تو ہم محسوس کریں گے کہ جب تک خالص اشتہالیت کی ترویج رہی اس وقت تک فرد برابر حکومت کے شکنجے میں جکڑا رہا، اور یہ شکنجہ اسی وقت ذرا ڈھیلہ ہوا جب حکومت قطعی

^۱ ارسطاطالیس، "سیاسیات"، ص ۲۰۳، ترجمہ انگریزی جونٹ

طریقہ اس عمومی اصول کی طرف آنے لگی جسے وہ کسی زمانے میں اس قدر نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔

اعتدال پسندی - یہ قاعدہ ہے کہ جب تک کوئی اصول محض مجرد شکل اختیار کئے رہتا ہے اس وقت تک اس میں غالییت کا عنصر نمایاں رہتا ہے، لیکن جب وہ عمل میں لایا جاتا ہے تو ایک قسم کے اعتدال کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے بعض عقیدہ پرستی سے عملی سیاسیات میں کام نہیں چل سکتا اس لئے کہ مختلف ملکوں میں افراد ہی کے تو مجموعے ہیں اور ہر ملک کی معاشی، جغرافی اور سیاسی کیفیات جدا گانہ ہونے کی وجہ سے اس کا طرز عمل جدا گانہ ہی ہونا مناسب ہے۔

کاغذی دلیل و استدلال اور بحث و تحقیق کے لئے ایک طرف ہر برٹس پسندوار کہ وہ لوگ اور دوسری جانب کارل مارکس اور اینگلس کے نظریے نہایت دل خوش کن ہیں لیکن واقعات و حالات پر انطباق کرتے ہی ان کے پیروؤں کی غالییت کا کانسٹراکٹل کریمینک دینا پڑتا ہے۔ جن ممالک میں انفرادی حکومت رائج ہے وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمسو و عامہ و ضروریات زمانہ کی خاطر مختلف شعبہ جات حکومت میں اشتراکی اصول کو اختیار کر لیا گیا ہے اور درپردہ حکومت کا دائرہ عمل وسیع تر ہوتا جاتا ہے، دوسری جانب روس میں جہاں **سوشلسٹ** سے اشتراکییت کا دور دورہ ہے، یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مکمل اشتراکییت کے ذریعے سے ارتقاء کی ”موجودہ منزل“ بھی اس وقت تک طے نہیں کی جاسکتی جب تک افراد کو تھوڑی بہت آزادی نہ دے دی جائے اور انفرادیت کے اصول پر ایک حد تک عمل نہ کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ انفرادی ہو یا اشتراکی، دونوں کے

ماہن جو فزن ہے وہ محض طرز کار کا ہے ، اور اگر وہ اپنے وطن کی بہبود چاہتے ہیں تو موقع محل کے اعتبار سے اس عظیم الشان مقصد کے حصول کی غرض سے انہیں اپنے اصول میں کمی بیشی کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آزاد متمدن ممالک کی حکومتوں نے اپنے سر پر یہ فرض لے لیا ہے کہ نہ صرف اس قسم کے کاموں کو اپنے ذمہ رکھیں جیسے ڈاک اور تار اور ایک بڑی حد تک تعلیم اور حفظان صحت کے مسائل ، بلکہ ان میں سے اکثر میں ریلوں کو یا تو حکومت براہ راست چلاتی ہے ، ورنہ اگر وہ خانگی کمپنیوں کے ماتحت ہیں تو ان پر نگرانی رکھتی ہے۔ پھر ملک کی معاشی بہبود بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی جس کے لئے بیرونی مال پر طرح طرح سے محصول لگا کر ملکی صنعت و تجارت کو محفوظ کیا جاتا ہے ، حکومت ملکی طرف سے کارخانوں کی سرپرستی کی جاتی ہے اور وقتاً فوقتاً صنعتی نمائشوں کے ذریعے سے دنیا کی توجہ ملکی پیداوار اور مصنوعات کی طرف مبذول کی جاتی ہے۔ زمانہ حال کی ”انفرادی“ حکومت کی لچپی بیپی نہیں رکھتی ، بلکہ خانگی امور اور خاندان تک کے معاملات میں وہ مداخلت کرتی ہے ، مثلاً بعض ممالک میں لوگوں کو جبراً اپنی زندگی کا بیمہ کرانے پر مجبور کرتی ہے ، غوغا کو ایک خاص عمر سے تجاوز کرنے پر فلاس سے بچانے کی غرض سے وظیفہ دیتی ہے ، اور مختلف کارخانوں میں ایک خاص مقدار سے زیادہ کسی کام کو نہیں کرنے دیتی۔ محنت اور مزدوری کے معاملات میں حکومت کی مداخلت کا اصول اس قدر مسلمہ ہے کہ جب ۱۹۱۷ء میں انجمن اقوام کی ابتدا ہوئی تو اس کے عہد نامے میں ایک دفعہ یہ بھی رکھی گئی کہ ”جہاں کہیں روزانہ آٹھ

گھنٹے یا مہینہ وار ہم گھنٹے کی محنت کا قاعدہ مقرر نہیں ہے۔ وہاں کی حکومت کو اس قسم کے طریقہ کار کو رواج دینا چاہئے، اور اسی طرح بعض جدید وسائیر مثلاً جرمانہ کے دستور ۱۹۱۹ء اور آپن کے دستور ۱۹۱۹ء میں مزدوروں کی بہبود کا خیال بہت کچھ پیش پیش نظر آتا ہے۔

آدھروں کے بولشویوں کو بھی محض سطحی اشتہائیت کی سطح سے اترنا پڑا ہے، اور "نئی معاشی پالیسی" کی ترویج کے بہت سے انفرادی اصول کو روکس میں رائج کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خوردبین کی حیات ہی میں یہ ثابت ہو گیا تھا کہ جو آشتیرانیت میں جو نفاصلے ہیں ان کے باعث روز بروز ابتری پیدا ہونا لازمی اور لا بدی ہے، چنانچہ اوائل ۱۹۱۹ء ہی میں کاشتکاروں سے غلہ کی بجائے لگان کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ اور ۱۹۱۹ء میں لینن نے یہ اعلان کر دیا کہ ہم اصل داری کو روک نہیں سکتے، اسے ملتی اصل داری کے راستے پر لگا سکتے ہیں دروازہ بعد کار خانے اور گرنیاں کرایہ پر دی جانے لگیں اور رفتہ رفتہ دکانیں بھی کھلنے لگیں۔ انفرادی اصول نے بالآخر اس قدر ترقی کی کچھ ہی عرصہ کے بعد انہی باضابطہ

لئے مہنامہ نوجمن اقوام میں محنت کے متعلق دفعہ ۲۳ ملاحظہ کی جائے۔

۱۹۱۹ء دستور جرمنی ۱۹۱۹ء باب ۱۵۷۔

۱۹۲۱ء سالانہ رجسٹر ۱۹۲۱ء: *Annual Register*

۱۹۲۰ & ۱۹۲۱ ان دونوں وسائیر کا اب خاتمہ ہو چکا ہے، جرمانی دستور کا پتہ کے برسر اقتدار ہولے سے اور سپانوی دستور کا وہاں کی خانہ جنگی سے۔

بارہ سال کے لئے پتے پر دی جانے لگی اور بعض سونے کی کانیں بھی قدیم کمپنیوں کو پتے پر دی گئیں۔ اس اتفاق کا آخری اور سب سے بڑا مظاہرہ ۱۸۶۷ء میں ہوا جب روس کے آمر اور وہاں کے اشتہالی فریق کے متحدہ اور موجودہ روس کے راج روٹا شائین نے نئے دستور کو ملک کے سامنے پیش کیا۔ اس دستور کی رو سے نہ صرف ملکیت ہی الماک کی ملک قرار دی گئی بلکہ امداد باہمی کی انجمنوں کو بھی "اجتماعی کمپنیوں" کا نامک گردانا گیا ہے۔ سیاسی اعتبار سے روس عمومی اصول کے بہت قریب آگیا اور اگر اب بھی اس کی بنیاد اشتمالیت پر ہے، لیکن اس میں فرد کو وہ اہمیت دی گئی ہے جو اسے پچھلے بیس سال میں کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ چنانچہ اعلان حقوق انسانی کے ساتھ یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ ہر شہری معاشری، معاشی، تمدنی اعتبار سے بالکل مساوی ہے، اور جہاں پہلے صرف "انہی قوت بازو سے کمانے والوں" کو حقوق شہریت حاصل تھے، اب یہ حقوق ہر اٹھارہ سال کے شہری کو حاصل ہیں۔ نیز کم سے کم کاغذ پر آزادی ضمیر، آزادی مذہب، آزادی ارتباط وغیرہ جیسے عمومی تغذیلات کو اشتہالی روس میں رائج کیا گیا ہے۔

الغرض اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ کسی ملک میں صرف وہی حکومت کامیاب ہو سکتی ہے جو اس کے حسب حال ہو، اور بعض عقیدہ پرستی اور سیاسیات میں بہت بڑا فرق ہے۔ آئندہ باب میں انفرادی حکومتوں کے عمومی فرائض و اختیارات پر تبصرہ کیا جائے گا۔

(بقیہ نوٹ ملے اسکا) مارچ ۱۹۳۹ء جب پوپ پیئرس کا انتقال ہوا تو موسکو کے
 ردین کینٹرک گرجا میں بھی اس کے جنازے کی غائبانہ نماز ہوئی تھی۔

منصور دہلوی راجہ بہنم سے پیار نہ رکنے پیا دہلی میں دہلی

Duty of Govt.

باب ۱۰ حکومت کے فرائض

فرد کا مفاد ملکیت کی شیرازہ بندی۔ فوج۔ مالک غیر۔ مجال۔ تنظیم۔ لازمی فرائض
نیم اشتراکی فرائض۔ اشتراکیت فرائض۔ اشتراکی دوس پر انفرادی اثرات
اب سے پچھلے باب میں یہ دکھایا جا چکا ہے کہ علیٰ انتظام ملکیت میں مذکور
انفرادی نظریہ سے ہی کام نکل سکتا ہے نہ مکمل اشتراکی نظریہ سے، بلکہ جب کسی
ملک میں کوئی ذلتی برسرِ اقتدار ہو تا ہے تو سب سے پہلے اسے غایت اور انتہا
پسندی کو خیر باد کہہ دینا پڑتا ہے اور ملکیت کے حسبِ حال حکومت کرنی پڑتی ہے۔
اسی باب میں یہ بھی سرسری طور پر دکھایا گیا تھا کہ آج کل ان ملکوں میں جہاں انفرادی
اصول پر حکومت ہوتی ہے، ایسے اشتراکی انتظامات جیسے ریل، تار، ڈاک اور
سریستی مصنوعات ملکی نظر آتے ہیں، اور اس کے برعکس دوس جیسے ملک میں جہاں
اشتراکیت کا دور دورہ ہے، اب حکومت اپنے اصل اصول سے ہٹ کر فانی
تجارت اور بیع و شریکی اجازت دے رہی ہے۔ موجودہ باب میں اس موضوع
پر ذرا غائر نظر ڈالی جائے گی اور بالخصوص انفرادی ملک میں حکومت کو معمولی فرائض
و اختیارات مقرر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

فرد کا مفاد۔ اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو انفرادی حکومت میں اس کا سبب سے اہم، بلکہ بعض کے نزدیک تو شاید واحد کام یہی ہے کہ وہ جہاں تک اس کے افراد ملک کے سود و بہبود کی کوشش کرے۔ بلاشبہ یہ مقصد یعنی بہبود کی کوشش نہایت ہی اہم ہے، اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ملکیت والوں کے فائدہ کا تین کون کرے گا۔ اس سئلہ پر تو آئینہ بحث کی جائے گی، یہاں صرف یہ بیان کرنا کافی ہے کہ حکومت خواہ کسی اصول پر کار بند کیوں نہ ہو اس کا ظاہری مقصد ملک والوں کی بہتری کی تلاش ہے اور یہ فرق جو افرادیت، فترائیت، اشتراکیت، راج اور اتحادیت کے مابین نظر آتا ہے، مقصد آخری کا ایسا فرق نہیں جتنا طرز کار کا فرق ہے۔ ایک فریق کہتا ہے کہ ملک کا مفاد ای میں مضمر ہے کہ افراد کے خاگی معاملات میں حکومت کی دسترس ہو تو دوسرا یہ کہتا ہے کہ ملک والوں کے لئے بہترین طرز کار یہی ہے کہ حکومت کی مداخلت کو کم سے کم کر دیا جائے، بلکہ شاید بنا سب یہی ہو کہ سرے سے حکومت ہی کا خاتمہ کر دیا جائے۔

ملکیت کی تعمیر از نو بندی۔ حکومت کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ جتنی الامکان ملک کا شیرازہ منتشر نہ ہو۔ دیکھو اس کے لئے دو مختلف النوع فرائض انجام دینے پڑتے ہیں، ایک تو اندرونی امن و امان اور تہذیب و دوسرے بیرونی دشمنوں سے ملک کو محفوظ رکھنا۔ گران دونوں مقامات کے لئے تقریباً ایک ہی قسم کا طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ دونوں مسائل مختلف قسم کے ہیں اور غور کیا جائے تو اندرونی حفاظت کا کام بیرونی حفاظت سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ بیرونی حملوں سے بچاؤ کا انتظام ایک شخص میں کافی کام ہو

یعنی اگر حکومت کو فوج کی ایک تعداد کیجا کر لے پر دسترس ہو اور اس کے پاس کافی سامان جنگ بھی موجود ہو تو وہ ایک بڑی حد تک بیرونی خطرات سے محفوظ رہے گی؛ لیکن مملکت کو اندرونی بغاوتوں کا شکار نہ ہونے دینا اور خود اپنی بقا کی تدابیر کرنا یہ اس لئے مشکل ہے کہ حکومت مملکت کی خادم ملے، اور مملکت جملہ باشندگان ملک کی اجتماعی کیفیت کا نام ہے جس میں بے چین اور کشمکش پسند عناصر بھی شامل ہوئے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ فی نفسہ امن و امان اور ترتیب تنظیم کوئی آخری مقصد نہیں بلکہ دراصل کسی آخری مقصد کے حصول کی تدابیر ہیں، اور وہ مقصد مملکت کے وقتی سطح نظر کا حصول ہے۔ جس طرح کسی چڑیا خانے میں ایک قسم کی تنظیم، جیل خانے میں دوسری قسم کی تنظیم، در سے ہیں تیسری طرح کی تنظیم، اور گھر کے میں چوتھی طرح کی تنظیم ہوتی ہے، اسی طرح اگر ملک کسی غیر قوم کا دست نگہ ہو تو ایک طرح کی تدابیر امن، اور اگر آزاد ہو تو دوسری طرح کی تدابیر امن کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ تنظیم کے معنی مختلف ممالک میں مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ دست نگہ ملک میں تنظیم اور امن و امان سے مراد وہ کیفیت ہوتی ہے جس کے تحت ملک پر آسانی سے حکومت کی جاسکے، دراصل حالیکہ کسی آزاد ملک میں اس سے مراد وہ صورت حال ہے جس میں باہرین وجوہ مفاد عامہ کے حصول کی کوشش ممکن ہو

سطح باب ۲، حسب بالا

۵۷ میک آئیور، "ملکت حالیہ" Mao Tse-tung: The Modern State.

حصہ ۲، باب ۵، جلد ۲۳۔

الغرض حکومت انہی حفاظت کی جو تدابیر عمل میں لاتی ہے اور اس کے لئے افراد کو اپنے احکام ماننے پر مجبور کرتی ہے، وہ اسی وقت حق بجانب سمجھی جاسکتی ہیں جب ان سے ان کے مخصوص سطح نظر کے حصول میں سہولت پیدا ہو۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ حکومت خواہی نہ خواہی افراد کے ہر نوع کے خیالات و اقوال کو منظم کرنے کی کوشش کرتی ہے، بلکہ اس کے برعکس افراد کی بہت سی چیزیں ہیں جنہیں انفرادی حکومت علی العموم چھوٹی بھی نہیں، مثلاً رسم و رواج، اخلاق و عادات گوارے ان میں بھی مداخلت کرنے کا حق حاصل ہو سکتا ہے۔ عام طور پر اس کا کام یہ ہے کہ ہر فرد کو دوسرے افراد اور جموعوں کی بے جا دست برد سے محفوظ رکھے، اس کے ذاتی امور میں بے جا دست اندازی سے باز رہے اور مملکت کو دوسرے سے آزاد رکھے۔ یہ وہ فرائض ہیں کہ اگر حکومت ان کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو اسے قائم رہنے کا کوئی حق نہیں رہے گا۔ مملکت کی کم از کم مداخلت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مختلف افراد کے باہمی تعلقات کا تعین معمولی دہرائی و فوجداری قوانین کے ذریعے سے، حکومت اور افراد کے باہمی تعلقات کا تعین دستوری و فوجداری قوانین کی مدد سے اور مختلف ممالک کے باہمی تعلقات کا تعین قانون بین الاقوام کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ لیکن حکومت ان ہی امور میں مداخلت کرنے پر قائل نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ اپنا دائرہ عمل وسیع کرتی رہتی ہے حکومت کو ایک طرف مملکت سے گہرا تعلق ہے، اور دوسری جانب وہ مہینت حاکم کی ساختہ پروا ختم ہے

اور اپنے جملہ فرائض کی انجام دہی میں اس سے مدد ملتی رہتی ہے، چنانچہ ملک کے تمام وسائل و پیداوار عملاً اسی کی دسترس میں ہوتے ہیں۔ اگر حکومت چاہے تو بہت سے ایسے کام کر سکتی ہے جن سے ملک والوں کی حالت بہتر ہو جائے اور انھیں اپنے ذاتی کاروبار میں مدد مل سکے۔ افراد کی بہ نسبت اس کے پاس روپیہ بڑھ جائے یا وہ ہوتا ہے، اس لئے وہ صنعت و حرفت، زراعت، تحقیقات و فحوص میں طرح طرح کے تجربے کر کے ان کی مدد سے پیداوار دولت میں خاطر خواہ اضافہ کر سکتی ہے، نیز چونکہ وہی سکھ سازی کا انتظام کرتی ہے اور محاصل درآمد و برآمد و ہنگامی کا محصول وصول کرتی ہے اس لئے اگر چاہے تو ملک کی صنعت و حرفت اور تجارت میں ترقی کر سکتی ہے۔

فوج۔ بہر حال ملک کی حفاظت و انتظام کے لئے دو چیزیں نہایت ضروری اور لازمی ہیں، ایک فوج، دوسرے روپیہ۔ علاوہ بعض مستثنیات کے آج کل کے زمانے میں تمام ممالک کی فوجیں خود اس ملک کے باشندوں پر مشتمل ہوتی ہیں، اور وہ ممالک خواہ سیاسی معنی میں کتنے ہی آپس کی دوستی و

بعض ممالک (مثلاً فرانس) میں ایک پرہیزی رسالہ ہوتا ہے جس میں وہ پرہیزی بھرتی کئے جاتے ہیں جنہیں اس ملک کے جارجانہ طرز عمل سے ہمدردی ہو۔ فرانس کا ایسا رسالہ جنگ ریف میں فرانس کے ووٹرز لڑا۔ سپانوی غاجگی میں جبرل فرانس کی فوج کے ساتھ بہت سے اطالوی اور جرمن لڑے ہیں۔ گو اس میں جو نکتہ پر لطف ہے وہ یہ ہے کہ خود اعلیٰ اور جرمن مجلس عدم مداخلت کے رکن رہتے ہیں۔

ہوا خواہی کا دم کیوں نہ بھرتے ہوں کبھی یہ پسند نہیں کرتے کہ علاوہ پر دسی رسالوں کے ایک دوسرے کے شہریوں کو اپنی اپنی فوجوں میں شریک ہونے دیں۔ پہلے یہ معمولی بات تھی کہ کسی ملک کے شہری دوسرے ملک میں جائیں اور وہیں بفر کر کے فوج میں بھرتی ہو جائیں، لیکن آج کل کی عام بین الاقوامی موٹائی سیاسی کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب کوئی آزاد ملک کسی دوسرے ملک کے لئے اپنے معمولی رسالوں میں بھرتی نہیں ہونے دیتا۔ بعض ممالک میں تو فوجی خدمت پر بعض شہریوں کے علاوہ دوسری شرائط بھی لگائی جاتی ہیں، مثلاً ۱۹۳۷ء سے پہلے روس میں کوئی شخص جب تک اپنے ذاتی کسب سے براہ راست دولت میں اضافہ نہ کرتا ہو اس وقت تک اسے ملک کی حفاظت میں تلوار اٹھانے کی اجازت نہ تھی، جس کے معنی یہ ہوئے کہ اکثر ممالک حاضرہ میں صرف ملک والوں پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۷ء سے پہلے روس میں صرف وہی باشندے قابل اعتماد سمجھے جاتے تھے جو مملکت کے بنیادی اصول پر عمل کرتے ہوں، یعنی جو خود اپنے اہل چلا کر اپنا پیٹ پالتے اور ملک کی دولت میں اضافہ نہ کرتے ہوں۔ یہی کیفیت عروج دولت اسلام کے زمانے میں شریعہ و مروجہ کی تھی جس کے مطابق فوجی خدمت کے لئے صرف مسلمانوں ہی کو مجبور کیا جاتا تھا اور ”اہل ذمہ“ (یعنی غیر مسلموں) کی حفاظت اور فوجی خدمت سے معافی کے معاوضے میں ان سے جو یہ لینے پر کفایت کی جاتی تھی۔ اکثر قدیم متمدن ممالک میں یہ قاعدہ رائج تھا کہ

۱۸۳۷ء کے متعلق بہت کچھ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی مقدار کا تعین یا تو (بقیہ نوٹ منسلک)

خطرے کے وقت حکومت جس کسی شہری کو چاہتی ملک کی حفاظت کے لئے طلب کر لیتی، اور چونکہ فوجی قواعد تنظیم و تربیت کا آج کل کی طرح رواج نہ تھا اس لئے حکومت کو اس میں بہت آسانی ہوتی تھی۔ آج کل کی مرتب و منظم افواج کے دور میں بہت سے مالک ایسے ملیں گے جن میں جبری فوجی خدمت کا طریقہ جاری ہے، مثلاً فرانس میں ہر ۲۱ سالہ شہری کو ایک یا سوا سال کے لئے فوجی تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے، اور حکومت جب چاہے ۵۲ سال تک کے شہریوں کو باضابطہ فوجی خدمت کے لئے طلب کر سکتی ہے! اسی طرح جاپان میں ہر شہری کو جس کی عمر ۱۷ سال سے تو متجاوز ہو لیکن ۴۰ سال سے بڑھ نہ گئی ہو، حکومت ملک کی حفاظت کرنے کے لئے قانوناً طلب کر سکتی ہے سلطنت برطانیہ اور مالک متحدہ امریکہ دو ایسی ملتیں ہیں کہ ان میں فوجی خدمت لازمی نہیں بلکہ اختیاری ہے، گو پچھلی جنگ عظیم میں برطانیہ کلاں میں بھی فوجی خدمت لازمی کر دی گئی تھی۔

دقیقہ نوٹ ص ۱۸۱ کا) عدہ شیعہ کے ذریعے سے ہونا تھا ورنہ خلیفہ وقت اس کا تعین کرتا تھا۔ بہر حال یہ محمول دراصل "اہل الذمہ" یعنی غیر مسلموں کے حقوق، جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری کے معاوضے میں عاید کیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمانوں پر فوجی خدمت لازمی تھی اور غیر مسلموں پر معاف تھی، چنانچہ اول الذکر پر ملک کی حفاظت کا پورا بار پڑتا تھا۔ جزیرہ سے عورتیں، بچے، اندھے، مریض اور تارکان دنیا بری تھے۔ دیکھو عبدالرحیم:

"اصول قانون اسلامی" *Abdul Rahim : Mohammadan*

ممالک غیر بیحدت ہیں براہ راست غیر ممالک سے تعلقات کی طرف لے جاتا ہے۔ یوں تو تاریخ عالم کا کوئی عہد ایسا نہیں گذرا جب کہ ملک ہر دوسرے ملک سے غیر متعلق رہا ہو، لیکن آج کل کے زمانے میں جب حکمیاتی اکتشافات کی وجہ سے دنیا اس درجہ سکڑ گئی ہے کہ سالوں کا سفر دنوں اور دنوں کا منٹوں میں لے جاتا ہے، یہ تعلقات بالکل ناگزیر ہو گئے ہیں۔ مختلف ممالک ایک دوسرے کے ساتھ ایک تو کچے اور کچے عہد ناموں وغیرہ کے ذریعے سے براہ راست قائم کرتے ہیں، درمیان الاقوامی سیاسی ادارات، مثلاً انجمن اقوام، اتحاد واک، ہلال و صلیب احمر، وغیرہ کے ذریعے سے۔ نیز اب یہ اصول مسئلہ تصور کرنا چاہئے کہ ہر ملک میں ان ممالک کے سفر اور قنصل وغیرہ رہتے ہیں جن سے اس ملک کے تعلقات ہیں یا جن کے شہری اس ملک میں آباد ہیں، تاکہ اپنے ملک اور ہم ملکوں کے رفاہ کی نگہداشت کریں اور تجارتی رسل و رسائل میں مدد کریں۔ ساتھ ہی بڑی بڑی ملکوں کے فوجی، بحری اور فضائی قائم مقام بھی بعض مرتبہ دوسرے ملکوں میں منتقل طور پر رکھے جاتے ہیں تاکہ ان ممالک کی فوجی تیاریوں اور تنظیم پر نظر رکھیں اور اپنے ملک کی حکومت کو اس سے باخبر رکھتے رہیں۔

محاصل۔ ملک کا انتظام چلانے کے لئے ضروری چیز روپیہ ہوتا ہے، چنانچہ حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ کاروبار کی انجام دہی کے لئے بافندگان ملک پر محاصل عائد کرے۔ ان محاصل کی نوعیت مختلف ممالک میں مختلف ہوتی ہے۔ ہندوستان قدیم میں ہندوؤں کے عروج کے زمانے میں سرکاری آمدنی کے ذرائع محاصل در آمد و برآمد کے علاوہ زرد چوہا، جنگلات، پیداوار باغات، پیداوار خورد و نوش

اور سرکاری اراضیات پر مشتمل تھے۔ فیروز اسلام کے بعد عہد خلافت میں سلازوں سے عشر، زکوٰۃ و خمس، اور سبکوں سے جزیہ لیا جانے لگا۔ ازمنہ و سطلی کے یورپ میں دوسرے امور کی طرح محاصل میں اس قدر ترتیب و تنظیم تھی جتنی آج کل پائی جاتی ہے، اور اکثر شاہان مغرب اجاروں اور عہدوں کی خرید و فروخت پیش کش اور جبری قرضوں کے ذریعے سے (جنہیں واپس دینے کا خیال بھی نہ ہوتا تھا) روپیہ کی کمی کو پورا کرتے تھے۔ زمانہ حال کے تمدن ممالک کی آمدنی کا دار و مدار عام طور پر علاوہ محاصل درآمد و برآمد و محصول جنگی کے کوئی محصول اور محاصل آمدنی، زمینداری و مکانات پر نہ ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اکثر مملکتوں میں بعض ایسے کاروبار انجام دئے جاتے ہیں جن سے حکومت کو خاصہ منافع ہو جاتا ہے، مثلاً ڈاک، ہار، ٹیلیفون، کاغذ مہر وغیرہ اور آج کل پیسٹ کے جو قوانین رائج ہیں

۱۰ دیکھو ارتھ شناسٹر، ترجمہ انگریزی ڈاکٹر شام شناسٹری، حصہ ۲، باب ۶۔
 ۱۱ اسلامی محاصل کے لئے دیکھو عبدالرحیم، حسب بالا، باب ۱۱ عشر اس ارضی کی آمدنی کا رسواں حصہ ہوتا تھا جو مسلمانوں کی ملک ہو، اور خمس اس ارضی کی آمدنی کا پانچواں حصہ جو غیر مسلموں سے مسلمانوں کے قبضے میں آگئی ہو۔ جزیہ کے لئے دیکھو عاشیہ نمبر ۶ بالا۔ خراج ان ممالک سے وصول کیا جاتا تھا جو غیر مسلموں کے قبضے میں چھوڑ دئے گئے ہوں۔
 ۱۲ پیش کش "اور جبری قرضوں" کے لئے دیکھو گرین "تاریخ اہل انگلستان" ترجمہ فارسی محمد حسین (مطبوعات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن) یا کوئی دوسری تاریخ دستور انگلستان۔
 ۱۳ کاغذ مہر سے دراصل منافع نہیں ہوتا بلکہ وہ عدلی انتظام کے قیام کی غرض سے لیا جاتا ہے۔

انہیں دراصل قدیم اجارہ فروشی کے باقیات تصور کرنا چاہئے۔ بعض ممالک میں حکومت ہی کو چند مخصوص اشیاء کے تیار اور فروخت کرنے کا واحد اجارہ ہوتا ہے جیسے زرخش میں سگریٹ اور دیاسلائی، اور ہندوستان میں افیون۔ اسی طرح ان ممالک میں جہاں وفاقی حکومت رائج ہے، عام طور پر بعض محال مرکزی ادارات کے سپرد کر کے جاتے ہیں اور بعض ریاستی ادارات کو تفویض کر دئے جاتے ہیں، مثلاً ممالک متحدہ امریکہ میں محال درآمد و برآمد، محصول آمدنی و دیگر جنس محال کے عائد کر کے گا اختیار مرکزی ادارات کو محال ہے اور محال املاک اور بعض دیگر براہ راست محال کو ریاستوں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ برطانوی ہند میں مرکزی اور صوبہ داری، مالیات کا درمیان دونوں ادارات کے باہمی تقسیم کے اوپر ہے، چنانچہ مرکزی ادارات درآمد و برآمد آمدنی، ریل، مار، ڈاک، چمک، ہنڈی، نمک وغیرہ پر محال عائد کرنے کے مجاز ہیں، اور صوبہ جات مالگداری، مکانات، زراعت، جنگلات، کاغذ مہرہ اور جبرٹری کی مدت سے روپیہ وصول کر سکتے ہیں، محصول چکی مرکزی اور صوبہ داری ادارات کے مابین اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ علاوہ شراب، الکھلی اور افیون جیسی استخبار کے باقی تمام استخبار محصول چکی وصول کرنے کا اختیار مرکز کے متعلق رکھا گیا ہے، اور ان مشینوں انصاف کو صوبوں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔

تنظیم۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ملک ایک ایسا فطری ارادہ ہے جو ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہے، اور اس کی ضرورت سب سے زیادہ اس لئے پیش

آتی ہے کہ مختلف افراد کے مابین اور نیز ان کی اجتماعی اور انفرادی خواہشات کے درمیان تصادم ہوتا رہتا ہے۔ اور اس سے معاشرہ انسانی کو ضرر پہنچے گا اندیشہ ہوتا ہے۔ مملکت کا فرض ہے کہ وہ افراد اور جمہوروں کو مرتب و نظم کرتے ایسے قوانین بنائے جن سے اس تصادم کا کم سے کم اندیشہ باقی رہ جائے، نیز اگر کوئی ان کی خلاف ورزی کرے تو اسے سزا دے۔ اس ترتیب و تنظیم کے لئے سب سے پہلے تو ملک کے حدود و اربعہ کا تعین اور ملک کو مختلف انتظامی اکائیوں میں تقسیم کرنے کا کام ہوتا ہے۔ جس کے بغیر کسی حکومتی ادارے کے لئے اپنے دائرہ اقتدار کا تعین ممکن ہی نہیں۔ اس کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ ہر انسان کے جان و مال کو دوسروں کی دست برد سے بچانے کے لئے قواعد بنائے جائیں اور ایسی سزائیں تجویز کی جائیں جو دوسروں کے لئے باعث عبرت اور ساتھ ہی (بشرط امکان) خود مجرم کے لئے باعث تنبیہ ہوں۔ ایسے محکمہ جات کا قیام بھی لازمی ہے جو ان قواعد یا قوانین کی خلاف ورزی یا افراد کے باہمی تصادم کی صورت میں حکم یا سزا کا کام کرے اور ان قواعد کے مطابق تجویز کرے اس کا نفاذ کرے۔

لازمی فرائض اور مفصلہ بالا سے معلوم ہوا کہ حکومت کے فرائض سہ گانہ

ہیں یعنی ملک کو بیرونی حملوں اور اندرونی بے چینی سے محفوظ رکھنا، دوسرے افراد کی بیش از بیش آزادی کے حصول و قیام کی غرض سے خاندانی تعلقات، جان و مال، تجارت و حرفت کے لئے قوانین بنا کر انھیں نافذ کرنا اور تیسرے ایسی عدالتیں

قائم کرنا جو قوانین کے مطابق ان افراد سے باز پرس کر کے ان لوگوں کو پاداش کو پہنچائے جنہوں نے قوانین مرد جبکی خلاف ورزی کی ہو۔
یہ تو وہ فرائض ہوئے جن کے بغیر حکومت ملک کا انتظام چلا ہی نہیں سکتی۔
لیکن جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ آج کل کے زمانے کا رجحان یہ ہے کہ حکومت کی مداخلت کا دائرہ اقتدار روز بروز وسیع ہوتا رہے، چنانچہ ان ممالک میں بھی جہاں انفرادی طرز پر انتظام کیا جاتا ہے، بہت سے ایسے امور حکومت کے دائرے میں آگئے ہیں جو نصف صدی قبل اس سے باہر سمجھے جاتے تھے۔ انہیں آسانی و سہولت کی خاطر اختیاری فرائض کہنا مناسب ہو گا تاکہ ان کا امتیاز لازمی فرائض حکومت سے کیا جاسکے۔ (اختیاری فرائض دو قسم کے سمجھنے چاہئیں، ایک میں تو وہ امور شامل ہیں جو حکومت کی مداخلت کے بغیر بروئے کار آتے ہی نہیں اور دوسرے وہ جو حکومت کی مداخلت کے بغیر بھی انجام پا سکتے تھے لیکن جن کا تعلق ایسی حالت میں افراد سے ہوتا۔ ثانی الذکر امور میں مداخلت گویا اشتراکیت نہا ہوگی، اور اول الذکر امور کی نگہ رانی نیم اشتراکی۔

نیم اشتراکی فرائض۔ سب سے پہلے نیم اشتراکی فرائض کو لیتے، جو حکومت کی مداخلت کے بغیر غالباً پورے نہ ہو سکتے یا کم از کم زیادہ وسیع پیمانے پر انتخاب نام کو نہ پہنچتے۔ آج کل کے زمانے میں حکومت نے اپنا فرض اس کو سمجھ لیا ہے کہ جہاں تک ہو سکے باشندگان ملک کو بہتر بنانے اور ان کی معاشی حالت کو درست کرنے کی

کوشش کرے، چنانچہ اب شاید شکل سے کوئی ایسا عقیدہ پرست انفرادی شکل
 گا جو ہر برٹ منسٹر کی طرح کلینہ رقائے اصلح کے مسئلہ پر اعتقاد رکھتا ہو۔ آج کل کی
 انفرادی حکومتیں بھی اس کی کوشاں رہتی ہیں کہ لوگوں کی تعلیم و تربیت کے بہترین
 وسائل ہم پہنچائیں، کاشتکاروں کی مدد کریں ان کی تندرستی کی نگہداشت رکھیں
 گاؤں گاؤں حفظان کا انتظام کریں، جگہ جگہ شفا خانے کھولیں، تحقیقات و کیمیا
 بحسب کی خاطر مناسب مقامات پر عجائب اور نوادہ خانے کھولیں، علوم و فنون
 کے ارتقا میں مدد دیں اور کوشش کریں کہ ملک کی صنعتی حرفتی و زرعی وسائل میں
 اضافہ ہو۔ نیز متمدن اور ترقی یافتہ حکومتیں اعداد و شمار کا محکمہ بھی قائم کرتی ہیں تاکہ
 مختلف شعبوں اور محکموں کو ملک کی موجودہ حالت کا اندازہ ہو سکے اور اعداد و شمار
 کو پیش نظر رکھ کر وہ اس حالت کی اصلاح کی کوشش کر سکیں۔

یہ تو وہ فرائض ہوئے جو مادہ حال کی متمدن انفرادی حکومتوں نے
 اپنے سر لئے ہیں، اور اگر ان کی انجام دی ہیں وہ کوشاں نہ ہوں تو یہ امور شاید
 سرے سے انجام ہی نہ پائیں، اس لئے کہ افراد کے وسائل اس قدر بڑھے
 ہوئے نہیں ہیں اور نہ ان کا حلقہ اثر اس قدر وسیع ہے کہ وہ ان سب باتوں کو
 فرداً فرداً یا ہم شفق ہو کہ بھی بڑے پیمانہ پر پورا کر سکیں۔ بلاشبہ امریکہ اور مغربی
 یورپ میں پچھلے چند سالوں میں بعض نہایت عظیم الشان کمپنیاں اور کاروباری
 جتنے قائم ہوئے ہیں جن کا سرمایہ کروڑوں اور اربوں روپیہ کا ہے، تاہم ان میں
 سے ہر ایک مخصوص تجارت سے متعلق ہے، اور اس کا نصب العین ملکیت کا
 مفاد نہیں بلکہ حصہ داروں کا فائدہ اور سرمایہ میں اضافہ کرنا ہے، چنانچہ یہ بھی

اس کمی کو پورا نہیں کر سکتے جو حکومت کے ان نیم اشتراکی فرائض سے دست بردار ہونے پر پیدا ہوگی۔

اشتراکیت نہ فرائض - اس کے علاوہ حکومت نے اپنے سیر و ایسے کام بھی کر رکھے ہیں جو بالکل اشتراکی ہیں یعنی جو مجرد انفرادی اصول کے مطابق حکومت کی دسترس میں نہیں رہتے جاتے ہیں۔ اس زمے میں سب پہلے ذرائع حاصل و نقل آتے ہیں جیسے ریلوں کی تعمیر سڑکوں کی درستی، ڈاک اور تار کا انتظام، ٹیلیفون کی نگرانی وغیرہ۔ آج کل کے زمانے میں یہ تقریباً ناممکن ہے کہ ان کا درآمد ضروری وسائل ترستی کو حکومت اپنے حال پر چھوڑ دے، چنانچہ اکثر ممالک میں تو یہ سب حکومت کے اقتدار میں آگئے ہیں، اور بعض میں حکومت نے ان پر اپنی نگرانی ہی رکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ مثلاً ریلوں کو ایسے پورے اور ہندوستان میں عام رجحان یہ ہے کہ ریلیں مملکت ہی کی املاک ہوں، چنانچہ پہلے پانچ سال میں ہندوستان کی مین لائنیں بڑی ریلیں، یعنی ایسٹ انڈین، گرینٹ انڈین مین سولہ، اور ادوہ دروہ بھگت، اپنی اپنی کمپنیوں سے مل کر حکومت کے قبضے میں آگئی ہیں اور حیدرآباد و میسور کی اکثر ریلیں انھیں ریاستوں کی ملک ہو گئی ہیں انگلستان میں اس کے برعکس ریل کی مختلف شرکتوں کو مدغم کر کے بڑی بڑی شرکتیں

ٹرانزپورٹ میں یورپ اور امریکہ کے تجارتی ارتقاء کی تاریخ و دراصل کاروباری جمہور کی تاریخ ہے اس کے لئے دیکھو "جو جنکس" کاروباری جمہور کا مسئلہ "The J. W. Gentis: Trust Problem" باب ۱۲ ضمیمہ۔

بنائی جا رہی ہیں اور حکومت ان پر براہ راست نگرانی رکھتی ہے، جتنی میں رہیں حکومت ہی کے قبضے میں ہیں۔ ریلوں کے علاوہ ملک کے قدرتی وسائل میں ترقی کے سامان بہم پہنچانا بھی حکومت کا فرض ہے، چنانچہ اگر ملک میں کوئی خاص صنعت یا کسی حصہ ملک میں زراعت میں کمی یا سقم ہو تو حکومت خزانہ سرکاری سے روپیہ خرچ کرتی ہے، کاشتکاروں کو تقاضی دیتی ہے، آبپاشی کے سامان فراہم کرتی ہے اور جگہ جگہ نمونے کے کھیت اور کارخانے قائم کر کے لوگوں کو بہترین ذرائع استعمال کر لے کی ترغیب دیتی ہے۔

سب سے آخر میں وہ فرائض ہیں جو بالخصوص مزدوروں اور غریبوں کے مفاد کی غرض سے حکومت پر عائد کئے جاتے ہیں اور یہ وہ ہیں جن پر اشتراکیت کا پرتو خاص طور پر نمایاں ہے۔ بچے، افراد ہی بھی اس واقعہ کا انکار نہیں کر سکتے کہ مزدوروں اور محنتیوں کی حالت عام طور پر نہایت زبوں ہے، اور وہ جو ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ملک کی عام ہرزہ اٹھاتی ہیں اضافہ کرتے ہیں، انھیں اس کا صحیح معاوضہ آرام و آسائش کی شکل میں نہیں ملتا۔ اسی وجہ سے فلاحیت زدہ طبقے کی حالت سدھارنا اور مزدوروں کی آسائش کا انتظام، دونوں باتیں ترقی یافتہ حکومتوں نے اپنے ذمہ کر لی ہیں، اور جبری بیمہ، وظائف، معمرین، ارزاں آرام دہ مکانات کی تعمیر، قوانین کارخانہ جات اور ایسے ہی دوسرے طریقوں سے غریب اور

سلاہ اس قسم کے مکانات منجملہ دوسرے ہندوستانی شہروں کے بھی اور فرخندہ بنیاد حیدر آباد میں بنوائے گئے ہیں۔

نیچے درجہ کے طبقے کا معیار زندگی بڑھایا جاتا ہے۔ جبری بیمہ کا قاعدہ ۱۹۳۸ء میں جرمنی میں شروع اور اس کا اتباع ۱۹۴۰ء میں انگلستان میں کیا گیا۔ وظیفہ معمرین کا قاعدہ آسٹریلیا میں مدت سے جاری ہے اور اس کے مطابق ہر درجہ کا گذار شہری کو جس کی عمر کم سے کم ۶۵ برس کی ہو اور جو کم از کم ۲۰ سال سے آسٹریلیا میں رہتا ہو، اس شرط پر وظیفہ دیا جاتا ہے کہ درخواست گزار کی کل آمدنی کی مقدار تقریباً گیارہ سو روپیہ سالانہ سے متجاوز نہ ہو جائے۔ آج کل کی انفرادی حکمتوں کو مزدوروں کے آرام و تندرستی اور معیار زندگی کا اس قدر خیال ہے کہ بعض انفرادی مالک مثلاً (انگلستان و جرمنی) میں اس کے لئے ایک وزیر مختص کر دیا گیا ہے، اور ایک بین الاقوامی اجتماع ہر سال منعقد ہوتا ہے جس میں مختلف ملکوں کے مزدوروں کے آرام و سائش کی تدابیر کی سفارش کی جاتی ہے۔ اور حکومتیں حتیٰ الامکان ان پر کار بند ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ نیز آج کل کے اکثر متہدن مالک میں کارخانوں اور گہنیوں کے مزدوروں کے لئے روزانہ اور ہفتہ وار گھنٹوں کی تعداد مقرر کر دی جاتی ہے تاکہ اپنے کام سے زیادہ بار نہ پڑے اور ان کی زندگی و تندرستی برقرار رہے۔

۱۹۳۸ء Stateman's Year Book
جہاں پچھلے سال کے اجتماعوں کی قراردادیں دی ہوئی ہیں۔ اس اجتماع کے لئے دیکھو کتابچہ
حصہ دوم، آخری باب۔

۱۹۲۷ء کارخانوں کے متعلق ہندوستان میں جو قواعد رائج ہیں وہ قانون (ابقہ نوٹ ۱۹۲۷ء)

اشتمالی روس پر انفرادی اثرات۔ اوپر کے پاروں میں ان اشتمالیت
نما امور کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو زمانہ حال کی انفرادی حکومتیں انجمن
دینی پیشہ پسندیت کرنے سے پہلے یہ مناسب ہے کہ محض مفاد کے خاطر ان
اثرات کو بھی ذرا وضاحت سے دوبارہ بیان کر دیا جائے جو دنیا کی دھڑلتی ملک
یعنی روس پر انفرادیت کے پڑے ہیں، گو اس سے پہلے مختصر طور پر اس کا ذکر آچکا ہے۔
ہیں اس موقع پر وہ سیاسی واقعات دہرانے کی ضرورت نہیں ہے جو ۱۹۱۷ء کے
روسی انقلاب سے پہلے اور اس کے بعد پیش آئے، چنانچہ اس وقت یہ بیان کر دینا
بالکل کافی ہو گا کہ مارچ ۱۹۱۷ء سے آٹھ ماہ بعد تک روس میں سخت سیاسی فتنے

دقیقہ نوٹ ملے گا، کارخانہ جات نمبر ۱۲ اسلامیہ پرنٹی میں۔ انگلستان کے قانون کارخانہ جات کے

دیکھو لازمی قوانین انگلستان "Halsbury: Laws of England"

جلد ۱۴، حصہ ۵، کارخانہ جات Factories دفعات ۳۳ و ۳۴۔

شلے ل، س، لاین S. Lyon م کی کتاب موسومہ "پیشے کا انتخاب" Making

a living کے صفحات ۴۲۵ و ۵۲۴ پر دو نہایت نفیس جدول دئے گئے ہیں جن میں

سے اول الذکر میں مالک متحدہ آرمیک کی مرکزی حکومت کے کاروبار کو اور دوسرے میں دہل کی

ایک ریاست یعنی سنے سوٹا کی حکومت کی مساعی کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان جدولوں

کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ حال کی انفرادی حکومتیں کس حد تک آزادی کی بہبود کے

واسطے کوشاں ہیں۔

شلے باب ۹، حسب بالا۔

کیے بعد دیگرے برسرِ اقتدار رہے، اور اس ملک کی سیاسیات کو اس وقت تک استقلال نصیب نہیں ہوا جب تک، فروری ۱۹۱۱ء کو لینن کے قبضے میں تمام حکومتی پرزے نہیں آگئے۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء تک کا زمانہ انتہائی اشتعالی اصول کی ترویج کا زمانہ ہے؛ اشتعالی گردہ کو ایک عظیم انسان ملک اپنے تجربات کے لئے لے گیا تھا چنانچہ ابتدا میں انھوں نے خوب دل کھول کر اپنے اصول کی ترویج کی۔ تمام اراضی ضبط کر لی گئی اور اسے کاشتکاروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ کاشتکاروں کو صرف اسی قدر پیداوار رکھنے کا حق دیا گیا جتنے کی انھیں ضرورت تھی، باقی تمام پیداوار حکومتی کھیتوں میں جمع ہونے لگی۔ مگر نیاں، تماشا گاہیں، کارخانے، مختلف دھابوں کی کانیں، ریلیں، قبوہ خانے، غرض جس قدر سامان ضرورت و سامانِ تفریح تھا سب پر حکومت قابض ہو گئی اور اپنی طرف سے اس کا انتظام کرنے لگی۔ ۱۹۲۰ء تک کارخانہ اس انتظام کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے، لیکن یہی وہ دور ہے جب ملک کی پیداواریں کمی، ضروریات زندگی کی گرانی اور ملک میں عام افلاس کی کیفیت صریحاً نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس خالی اثتر لکی طرز عمل کی وجہ سے بحران کی جو کیفیت رونما ہوئی اس کا فوری سبب ایک تریہ تھا کہ زراعت کو ایک بڑا دھوکا لگا تھا، اور زراعتی

۱۹ برسہائی اصول کے ارتقا کے لئے دیکھو فارب مین، "لینن کے بعد" : Farberman
After Lenin حصہ دوم، نیز "جرنل سالانہ" *Annual Register* بابت
 سالہائے ۱۹۱۶ء، ۱۹۱۷ء، ۱۹۱۸ء، ۱۹۱۹ء، ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۱ء، ۱۹۲۲ء، ۱۹۲۳ء، ۱۹۲۴ء، ۱۹۲۵ء کے مختصر حالات کے لئے
 "برائعات سال" *These Eventful Years* جلد ۲، باب ۴۸ کا مطالعہ کافی ہوگا۔

پیدا میں قلت اور اس کی گرانی کی وجہ سے اس کے اور مصنوعات دستکاری دیکھائی
کی قیمتوں کے مابین ایک عظیم نشان تفاوت پیدا ہو گیا تھا، ساتھ ہی لینی کا فدی
روبل کی قیمت تقریباً صفر رہ جانے سے بھی ملک کے مصائب میں گونا گونا گونا
پہر حال ان سب باتوں کا یہ اثر ہوا کہ وہ طبقہ جو جدید حکومت کا گواہ بنتا بنا
ہوا تھا (یعنی مزدور و کاشتکار) حکومت کے مخالفین میں شامل ہو گیا اور حکومت کو
جبراً و قہراً اپنا طرز عمل بدل دینا پڑا۔ آخر کار ۱۹۲۲ء کے ابتدائی مہینوں کے میں
ایسا سے "جدید معاشی طرز عمل" کی بنیاد پڑ گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ طرز عمل کی اس تبدیلی کے آثار پہلے ہی نظر آ رہے تھے،
اور خود لینن ملک کو اس کے لئے تیار کر رہا تھا۔ دسویں اشتراکی کانگریس میں لینن نے
ایک زوردار تقریر میں یہ تحریک کی کہ بھائے غلہ کے حکومتی کھیتوں میں جمع ہونے کے
کا تشکاروں کو اس کی قیمت (یعنی دوسرے الفاظ میں ایک مقررہ دکان) ادا کرنا سب
ہوگا، اور انہی مقبوضہ پیداوار کے مبادلہ و انتقال ملکیت کا اختیار خود کاشتکار کو ہونا
چاہئے، چنانچہ ۱۲ مارچ ۱۹۲۲ء کو یہ تحریک قازن کی شکل میں منظور ہو گئی اور کاشتکار
کو غلہ منتقل کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ یہی وہ قانون تھا جسے "جدید معاشی طرز عمل"
کی بنیاد کہنا چاہئے۔ بہار سے نزدیک لینن کا شاید سب سے اہم کارنامہ یہی تھا
کہ اس نے بھانپ لیا کہ خالی اشتراکی طرز عمل کا رواج بالکل ناممکن ہے، چنانچہ
اس نے جان بوجھ کر سرمایہ داری کی طرف قدم بڑھایا اور کہہ دیا کہ "ہم اصل داری کو روک
نہیں سکتے لیکن اسے مہلکی داری کے راستے پر لگا سکتے ہیں۔"

۵ جولائی ۱۹۲۱ء کو ایک قدم اور بڑھایا گیا، یعنی کارخانے اور گرنسیاں مختلف شرکتوں اور افراد کو بیچے پردے دی گئیں۔ اس کے بعد پہلے تو انجن مانے اعداد بھی کروپیہ کام میں لانے کی اجازت دی گئی اور رفتہ رفتہ روپیہ کی ترویج کے راستے سے جملہ رکاوٹیں اٹھا دی گئیں روپیہ کی ترویج کی وجہ سے تجارتی کاروبار کا از سر نو احیا ہو گیا، دکانیں کھل گئیں اور از سر نو خرید و فروخت کی کیفیت تین سال بعد نظر آنے لگی۔ ۹ جولائی کو ریلوں پر سفر کرنے کا کرایہ لیا جائے لگا۔ یکم اگست کو ڈاک اور تار کا محصول عائد ہو گیا، ۵ اکتوبر کو پانی، بجلی اور گیس خرچ کرنے کا معاوضہ لگایا جائے لگا اور ساتھ ہی کئی سال بعد ٹرانسپورٹ کے کاروبار کے کپڑوں کی دھلائی لی جانے لگی۔ ستمبر اور اکتوبر میں آٹھ گوداموں اور دو کانوں کے کرایہ کا طریقہ دوبارہ رائج کیا گیا اور رفتہ رفتہ ہر ایک چیز کی قیمت یا اجرت روس میں پہلے کی طرح ایک معمولی بات ہو گئی سرمایہ داری کی طرف یہ میلان برابر جاری رہتا ہے تا ۱۹۲۵ء میں دوازدہ سالہ پچے کے ذریعے سے اراضی منتقل کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور مردوروں کو چھوٹے چھوٹے کارخانوں کا انتظام کرنے دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی غیر ملک کے سرمایہ کاروں کی طرف منتقل کرنے کی طرز عمل کی ابتدا ہوتی ہے جس کا اولین مظاہرہ یہ ہے کہ اسی سال ”شرکت معدنیات زردریائے لیتا“ کو از سر نو سونے کی کان کاٹھیکہ دے دیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۵ء میں اس اصول کے خلاف شاہین نے نزاعت کو بھی اشتراک کرنے کی کوشش کی اور صریحاً اعلان کر دیا کہ حکومت کسی طرح سے سرمایہ داری کو دیہات اور کھیتوں میں جڑ نہیں بکڑنے دیگی۔ ساتھ ہی اس نے ”پانچ سالہ تنظیم“ کی بنیاد ڈالی جس سے مراد یہ تھی کہ پانچ سال میں روس

پیمانہ کبیر پر پیداوار کا انتظام کرے لیکن "اجتماعی" کھیت قطعاً ناکام ثابت ہوئے۔
 اجتماعی کسانوں نے ان کی پیداوار راتوں رات لوٹنا شروع کر دی، اور بے دلی
 سے کام کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کم از کم زرعی پیداوار میں معتد بہ کمی پیدا ہو گئی۔ الغرض
 بہت جلد سٹالین کے مخالف زور پکڑنے لگے، اور گو اس نے بہت سخت انتقام
 لیا لیکن انتہائی اشتمالیت کے خلاف جو آگ لگ گئی تھی وہ بجھ نہ سکی، اور پہلے
 تو ۱۹۳۲ء میں مساوی مزدوری کے اصول سے انحراف کیا گیا اور سرمایہ دار ملک
 کے ساتھ عہد نامے کئے گئے، پھر پوشویت کے بین الاقوامی تخیل کو جرمنی کے
 خلاف جوش کی وجہ سے ٹھیس لگی اور اب حال میں ۱۹۳۶ء میں ایک عمومی پابندی
 کے قیام سے روس اور مغربی یورپ کے عمومی ملک کے تخیل میں نسبتاً کم رفت
 رہ گیا ہے۔

الغرض جہاں زمانہ حال کی انفرادی حکومتیں انتہائی انفرادی اصول سے
 ہٹ کر بہت سے ایسے کام کرنے لگی ہیں جنہیں افراد ہی آسانی سے انجام دے
 سکتے ہیں، وہاں روس جیسے اشتمالیت پسند مملکت کو جس میں جلد ذمہ اتارنا
 کو بالکل ناہود کر کے اشتمالیوں نے گویا ایک جدید باب کی ابتدا کر دی تھی اپنے
 مرغوب اور جیتے اصول سے بہت کچھ ہٹ جانا پڑا ہے۔ اگر غور کریں تو ہم اس
 نتیجے پر پہنچیں گے کہ انفرادیت، اشتراکیت اور اشتمالیت یہ سب مملکت کے
 حقیقی مقاصد کے حصول کے مختلف طریقے ہیں۔ ان طریقوں کا تعین مختلف ملک

کی تاریخ ان کی جزائی کیفیات اور وہاں کے باشندوں کی عادات و اطوار پر منحصر ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت تک کوئی ایسا سیاسی طرز عمل دریافت نہیں ہوا جو کیمیاں جملہ ممالک پر جاری ہو۔ وہی حکومت بہترین ثابت ہوگی جو مملکت کے مقاصد کی ترویج میں حتی الامکان کوشاں ہو، اور مملکت کے حقیقی مقاصد کیا ہیں اور کیا ہونے چاہئیں، اس پر آمیزہ باب میں بحث کی جائے گی۔

باب ۱۱

مملکت کا مطمح نظر

بین الاقوامیت، نفع، مملکت، افادیت، ترقی، تنظیم، عدل، مذہب، ارتقاء، انسانی
 اس سے پہلے ہم یہ دکھا چکے ہیں کہ مملکت انسانی زندگی کا جزو لا ینفک ہے
 اور شخص کو خواہ وہ کتنا ہی اس سے گریز کرے، کسی نہ کسی قسم کی سیاسی زندگی ضرور
 بسر کرنی پڑے گی۔ ساتھ ہی حکومت کے مخصوص حیطہ اقتدار اور اس کے معمولی
 فرائض و اختیارات پر بھی بحث کی جا چکی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس
 تمام کرد و فرما، جو مملکت کے کار کا یعنی حکومت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے، کیا طمح نظر
 ہونا چاہیے، اور اس کے ادارے کا جس کے لئے انسان اپنے جان و مال،
 اپنا گھر بار، اپنا آرام و راحت سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے،
 آخر حقیقی مصرف کیا ہے، یعنی نبی نوع انسان کے لئے عموماً اور اس کے مخصوص
 شہریوں کے لئے خصوصاً آخر اس سے کیا فائدہ مقصود ہے۔

۱۱ باب ۳۔ حسب بالا۔

۱۱ باب ۹ اور ۱۰۔ حسب بالا۔

بین الاقوامیت۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ علم سیاسیات گویا تاریخ ہی سے پیدا ہوتا ہے، اور چونکہ تاریخ سران بدلتی رہتی ہے اس لئے اصول سیاسیات میں بھی ہمیشہ تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ سیاسیات کا موضوع مملکت ہے اور یہ لازمی ہے کہ جیسے جیسے واقعات تاریخی سے لوگوں کے سیاسی خیالات میں تبدیلی ہوتی رہے ویسے ہی مملکت کے معنی اور اس کے مقاصد میں بھی تغیر ہوتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں قدیم یونانیوں کے نزدیک اعلیٰ ترین سیاسی مطح یہ تھا کہ ہر قصبہ اور شہر بجائے خود ایک مملکت ہو اور ہر طرح سے بیرونی دباؤ سے آزاد ہو، وہاں آج کے سیاسی خیالات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ گویا ہر خیال روزانہ بدھم پڑتا جاتا ہے کہ مملکت ایک نہایت ہی محدود ادارہ ہے جو انسان کی سیاسی تشفی و ضروریات کے لئے ناکافی ہے، اور انسان کا مطح نظر یہ ہونا چاہیے کہ "اولاد آدم کی پارلیمنٹ اور دنیا کی وفاقت" قائم ہو۔

بہاؤ شاہ گاندھی، جو ہمارے زمانے کے انسانوں میں ایک بلند و ممتاز پارکیت ہیں

شہ مکرٹ اصول سیاسیات "Gilchrist: Principles of Politics"

Cal Science. باب ۲۔

تھیسن: "لوکس ہال" Tennyson: Locksley Hall

"Till the war drums throbbed no longer and
the battle flags were furled,
In the Parliament of man, the
Federation of the world."

اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ”میری قوم پرستی انتہا درجے کی بین الاقوامیت کے مترادف ہے۔“ اس عظیم اٹلانٹک تہاکن کی جو قدیم یونانی سیاسی فلسفیوں اور زمانہ حال کے بعض انڈینوں کے خیال کے درمیان نظر آتا ہے، ایک وجہ یہ ہے کہ سامانِ حل و فصل کی آسانیوں اور فاصلہ وقت کے تقریباً فقدان سے بعید تر چیز حصص دنیا کے امن اب شاید اس سے زیادہ تعلقات میں جو کسی زمانے میں (مثلاً، اسپارٹا، ایتھنز اور بھنجر کے باہر تھے، اور مختلف اقوام عالم ایک دوسرے کے خصائص و حالات سے اس سے زیادہ واقف ہیں جتنے قدیم ایرانی یونانیوں سے یا قدیم یونانی اشوریوں سے واقف تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جہاں صرف ایک یونان یا ایک آٹلی کے باہمی اتحاد میں بے شمار رکاوٹیں نظر آتی تھیں، وہاں بین الاقوامیت کا تخیل محض نظریئے سے گزیر گیا ہے، گو حال کی تاریخ اور آٹلی و جرمنی میں آمریت اور غالی ملکیت کے فروغ نے اس تخیل کو ایک عظیم انسان دھکا لگایا ہے اور اس بین الاقوامی اصول کو اب ایک پیش پا افتادہ تخیل سمجھا جانے لگا ہے۔

نفسِ مملکت۔ ساتھ ہی اس میں بھی شکوک پیدا ہو گئے ہیں کہ آخر مملکت کا حقیقی مقصد کیا ہونا چاہئے۔ کوئی سیاست تو مملکت کی غایت افزاد کے مفاد کو سمجھتا ہے، کوئی ان کی خوشنودی کو، کوئی ان کی ترقی کو، کوئی ان کی تنظیم کو، کوئی ان کے حسن اخلاق کو، اور بعض ایسے بھی ہیں جو فی نفسہ مملکت، بلکہ

اُس کے آئینہ کا یعنی حکومت ہی کو تمام انسانی کوششوں کا لمبا وادبی قرار دیتے ہیں۔
 یونان قدیم میں ”اوسٹراکزم“ یعنی دس نکالے کا جو طریقہ رائج تھا اس میں سب
 سے بڑا نمونہ ہی تھا کہ جیسے بھی ممکن ہو، مملکت کو قائم رکھنا چاہئے خواہ اس کی
 درجہ سے افراد کو جلاوطن ہی کیوں نہ کر دیا جائے، بلکہ اتھنز میں تو اگر کوئی شخص
 اساسی آئین مملکت کے خلاف کوئی تحریک کرتا تو اس تحریک کو بعض صورتوں
 میں زہر کا سالہ مینا پڑتا۔ جب رفتہ رفتہ مملکت ایک فرد یا عدلیہ بادشاہ کی
 شخصیت میں مرکوز ہوئی تو مختلف ممالک میں غداری کے قوانین مرتب کئے گئے
 جن کے بموجب بادشاہ کی شخصیت کے خلاف ہتھیار اٹھانے والا یا سازش
 کرنے والا موت کے گھاٹ اتارا جاتا تھا۔ یہی وہ پھل ہے جو انگریز عاقل س ہرگز
 کے قبضے میں آکر ایک نہایت زبردست ہتھیار بن گیا اور اُسے افراد کو منظم کرنے
 اور ان کے احساسات و جذبات کو زیر کرنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ آج کل مملکت
 اور حکومت کی اس قد چہل پہل ہے اور ان دونوں ادارات کو مختلف پیرایوں میں اس قدر
 اہمیت دی جاتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی لفظ لکھنا بڑا چنچا معلوم ہوتا ہے،

یہ اس کی مثال کے طور پر انگلستان ”کانٹون“ ۱۷۹۲ء میں کیا جاسکتا ہے جس کے لئے
 دیکھو میٹ لیڈ، ”تاریخ دستور انگلستان“ *Mainland English Constitutional History* جلد ۵۔ جہاں بادشاہ نہیں وہاں ”ملک“ کے
 خلاف غداری مستوجب سزا سمجھی جاتی ہے، حال ہی (۱۹۱۷ء) میں ایرستان میں ایک قانون
 منظور ہوا ہے جہاں اسی اصول پر عمل درآمد کیا گیا ہے۔

لیکن ہم مجبور ہیں کہ اس خیال کے خلاف صدرائے احتجاج بلند کریں جس طرح انسان کی اجتماعی حس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا بالکل اسی طرح ان کی انفرادی حس کو بھی بالائے طاق نہیں رکھا جاسکتا۔ ضرورت آئے تو مملکت کی خاطر افراد کو ہر قسم کی قربانیاں کرنی پڑتی ہیں، لیکن یہ نہیں ہے کہ ہر نقطہ وہ مملکت ہی کے مفاد کو ڈھونڈے اور اپنی خوشنودی، مسرت اور مفاد کی پرواہ ہی نہ کرے، بلکہ ایسا کرنا خلاف فطرت اور خلاف انسانیت ہوگا۔ یہ کہنا کہ انسان کی کوشش کا واحد مظاہرہ اور اس کی تنہائے پرواز بس مملکت ہی ہے، انسانوں کے ایک نہایت ہی اہم پر اسے یعنی انفرادی حس کو بالکل نظر انداز کر دینے کے مترادف ہے، افادیت۔ اس کے بالکل عکس وہ خیال ہے جس کے بموجب مملکت کا اعلیٰ ترین، بلکہ واحد مقصد افراد کا مفاد ہے اس خیال کو نظریہ افادیت کہتے ہیں اور اسے سب سے زیادہ زور کے ساتھ ایک انگریز جرجی، بنٹم نے پھیلی صدر کے اوائل میں پیش کیا تھا۔ اس کی رو سے افراد کی بہبود اور ان کی بہتری سے زیادہ مملکت کا کوئی دوسرا مقصد مہرہ نہیں سکتا۔ اس خیال میں جو مغالطہ ہے وہ صاف عیاں ہے۔ اول تو مملکت محض افراد کی خادم ہوئی اور اس کی حیثیت افراد کے مجمرے سے زیادہ نہ ہوئی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حقیقتہً مملکت افراد کے مجموعے

۱۰ بنٹم کا نظریہ پولک کی کتاب "تاریخ علم سیاسیات" مترجمہ رحم علیہ اسٹیجی (باب ۴) میں دیا ہوا ہے جو جامعہ عثمانیہ کی طرف سے طبع ہو چکی ہے،

سے زیادہ نہ ہوئی ہم دیکھ چکے ہیں کہ حقیقتاً ملک افراد کے مجموعے سے کہیں زیادہ وسیع ہے، بلکہ بعض مرتبہ تو اس کے مفاد کی شکل افراد کے مفاد کی شکل سے بالکل مغایر ہوتی ہے، چنانچہ اس مخصوص پرانے کو نظر انداز کر دینا حالات و واقعات سے روگردانی کرنا ہے۔ ایسے سیاست دان (مثلاً لاسکی وغیرہ) جو اس ملک کو دوسرے انسانی ادارات کا محض ہم پلہ سمجھتے ہیں، اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ ملک کی ضروریات و احساسات بعض مرتبہ نہیں بلکہ اکثر مرتبہ افراد کے ضروریات و احساسات سے جدا گانہ ہوتے ہیں، اور ان کا پاس و لحاظ رکھنا بھی کم از کم اتنا ہی ضروری ہے جتنا خود انفرادی احساسات کا۔ آج کل کے زمانے میں فرد کی ترقی اور اس کی مدد کے ضمن میں حکومت کو جو کوششیں کرنی پڑتی ہیں۔ وہ اسی کا ایک ادنیٰ مظاہرہ ہیں۔

ترقی، تنظیم، عدل۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ ملک کے بغیر ترقی، تنظیم اور عدل ممکن نہ ہوگا، اس لئے ملک کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ملک والے شاہراہ ترقی پر گامزن ہونے کے لئے منظم ہوں اور عدل و انصاف کا راج قائم ہو جائے۔ بلاشبہ عدل و انصاف کے بغیر ملک کا استحکام ناممکن ہو جائے گا اور حکومت کا فرض ہے کہ ملک میں اسی اصول کی تعمیل کرے، چنانچہ مشرقی ممالک

۱۱ دیکھو باب ۲، حسب بالا۔

۱۲ مثلاً دیکھو لاسکی: "مسئلہ اقتدار اعلیٰ" *Lascki: Theory of Sovereignty*

۱۳ دیکھو باب ۱۰، حسب بالا۔

میں مدتِ دراز سے غیر جانبدارانہ انصاف حکومت کا بڑا بھاری فرض تصور کیا جاتا ہے، اور مغربی ممالک میں بھی اس کو بیرونی اثرات سے تقریباً تین سو برس سے آزاد کر دیا گیا ہے۔ لیکن اسے ہم مملکت کا مطمح نظر نہیں کہہ سکتے بلکہ زیادہ سے زیادہ تعدیل و حکیم حکومت کا فرض سمجھا جاسکتا ہے۔ یہی کیفیت تنظیم کی ہے ظاہر ہے کہ اگر انسان منظم نہ ہوں گے تو مملکت عدم سے وجود میں نہیں آسکتی بلکہ فی لفظہ تنظیم ایسا اصول نہیں جو مقصدِ مملکت ہو، بلکہ وہ دراصل مملکت کی ترکیب کا طریقہ ہے۔ تنظیم بجائے انتہائی مقصد ہونے کے ابتدائی شرطِ قیامِ مملکت کی ہے۔ محض ترقی ہی مطمح نظر نہیں ہو سکتی اس لئے کہ ترقی کے لفظ سے انتہا کا نہیں بلکہ ارتقا کا خیال پیدا ہوتا ہے؛ بلاشبہ یہی ایک عظیم الشان فرضِ حکومت کا ہے کہ وہ باشندگانِ مملکت کو ہر طرح پر شاہراہِ ترقی پر لگائیں، لیکن حقیقی مطمح نظر نہیں سمجھا جاسکتا۔

مذہب۔ تاریخ انسانی میں ایک زمانہ ایسا گزرا ہے جب مملکت کے

لے مشرقی ممالک میں عدل کو ہمیشہ سے بہت کچھ اہمیت دی جاتی ہے۔ آج بھی دہلی کے لال قلعہ جاؤ تو ان تھوڑے بہت ایوانوں میں سے ایک میں جو نلے کی دست برد سے خون کے آنسو بہانے کے لئے باقی رہ گئے ہیں،

عدل کی ترازو نہایت ممتاز انداز سے نظر آئے گی۔ نیز یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ابتدائے اسلام میں ناضی کو دالی سے بالکل آزاد سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس یورپ میں عدالتِ عدل کے زمانے تک برابر دیگر اعضاءِ حکومت کی دست نگر رہی۔ دیکھو میٹ لیٹڈ، حسبِ بالا، عہدِ ہم، حصہ ۲۔

تیم کا مقصد ہی ایک خاص مذہب کی ترویج کو سمجھا جاتا تھا، چنانچہ مشرق میں عام طور پر تبلیغ و ترغیب کے ذریعہ سے اور مغرب میں تشدد و احتساب کے ذریعے سے حکومت کے مذہب کی نشر و اشاعت کی جاتی تھی۔ آج بھی بہت سے ممالک ایسے ہیں جن کے حکمرانوں کا کوئی خاص مذہب ہے، مثلاً شاہ انگلستان اگر کلیسے انگلستان سے مخوف ہو جائیں تو ملکہ کے "قانون بندوبست" کی رد سے سخت احتجاج سے دست بردار سمجھے جائیں گے۔ نیز ایسے ملک موجود ہیں جہاں آج بھی کسی خاص مذہب کی تبلیغ کے لئے حکومت بے دریغ روپیہ خرچ کرتی ہے اور بعض ممالک میں "ملکوتی مذہب" کے خیال کا از سر نو احیا کیا جا رہا ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ نفس مذہب کا اثر ملکی معاملات میں روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور

ملکہ باب ۲، حسب بالا۔

ملکہ خود سلطنت برطانیہ اپنے سخت ممالک میں تبلیغی انجمنوں کی براہ راست مدد کرتی ہے، مثلاً برطانوی جنوب مغربی افریقہ اور برطانوی گنی میں تعلیم کا کاروبار کلیئہ انجمنوں کے قبضے میں ہے دیکھو سالانہ مدبرین، ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۹۱ و صفحہ ۲۴۲ وغیرہ۔ نیز قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء دفعات ۳۴ و ۳۵ کی رو سے کلیسائی اخراجات میں کلیئہ گورنر جنرل مختار ہیں اور جماعت متغنیہ ہند کو اس پر اس کے دینے کا حق حاصل نہیں۔

ملکہ جیسے جو کئی ہیں۔ اس کے برعکس ترکی نے مذہب کو ملکیت سے بظاہر بے تعلقی کر دیا ہے۔ ملکہ خود پیر سلام علیہ الخلیفہ الاسلام نے آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پیشتر فرمایا تھا کہ "انتم علم منی باموردینا کہ" یعنی تم امور دنیوی میں مجھ سے زیادہ ماہر ہو۔

آج کم ہی ایسی ملکیتیں نظر آئیں گی جو اپنے مذہب کی نشر و اشاعت علی الاعلان بڑھوتری کر رہی ہوں۔ تقریباً ہی کیفیت اخلاق کی بھی ہے۔ بعض سیاسی فلسفیوں مثلاً ہسٹننگز کا خیال ہے کہ مملکت کا مقصد عظیم صحیح اخلاق کی ترویج ہے۔ اس کی بابت پہلی بات تو یہ کہنی ہے کہ ہر ملک میں اخلاق کا تعین عام طور پر کسی ایک فرد یا مجموعہ افراد کی آزادانہ دسترس سے باہر ہوتا ہے، دوسرے گو آج کل کی مملکتوں میں بہت سے ایسے قوانین نافذ کئے جاتے ہیں جن کا ملک کے اخلاق پر خاص اثر پڑتا ہے، لیکن یہ مشکل معلوم ہوتا ہے کہ ادارات حکومت جملہ اخلاقی اراہ و زواری کا تعین کرے، اس لئے کہ اس قسم کی کوشش کے لئے بہت کچھ جبر و اکراہ کی ضرورت ہوگی جس سے سوائے بے چینی اور اختلال کے کوئی نتیجہ مشکل سے نکلے گا۔

ارتقاء کے انسانی۔ انرض یہ خیال مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے کہ مملکت کا واحد مطلع نظر ان سب مقاصد میں سے کوئی ایک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا مقصد عظیم یہ ہونا چاہئے کہ ہر طریقہ اور ہر آئین کے اعتبار سے قومی خصائص میں

علامہ بٹنلی، "نظرِ سلطنت"، مترجمہ فارسی تلمذ حین کتاب ۵، باب ۲۔ یہ کتاب جامعہ عثمانیہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

علامہ اس قسم کے قوانین کا ایک سلسلہ مجموعہ تقریرات منہیں لے گا۔
علامہ فاتحی جزیہ میں اس کی کوشش کی جا رہی ہے کہ عورتوں کو خالی آزادانہ روش سے روک کر ان کے اخلاق پر اثر ڈالا جائے۔

حتی الوسع زیادہ سے زیادہ ارتقا پیدا کیا جائے اور اس طرح ہی نوع انسان کی بہبود کی طرف قدم بڑھایا جائے۔ جیسے ہر ملک کو افراد پر مشتمل ہوتی ہے اور ہر ایک فرد اپنی بساط کے مطابق اپنی انفرادی اور سب کی اجتماعی ترقی میں کوشاں ہو تو ملک بھی خاہر ترقی پر محاذ بن ہوگی، بالکل اسی طرح اعلیٰ ترین مقصد ملک کا یہ شمار ہونا چاہئے کہ ہر ملک اپنی بہبود کی کوشش کے ساتھ ہی نوع انسان کی فلاح کو بھی مد نظر رکھے۔ جس طرح انسان کا ہر دوسرے انسان سے فطری تعلق ہے اور کسی قسم کی اجتماعی کیفیت کے بغیر انفرادی زندگی ناممکنات سے ہے، اسی طرح خداوند کریم نے مختلف حصص عالم کا ایک دوسرے سے تعلق پیدا کیا ہے، چنانچہ جو قوم محض اپنے ہی مفاد کو مد نظر رکھتی ہے اور ہی نوع انسانی کے مفاد کو نظر انداز کر دیتی ہے وہ اسی فرد کے مانند ہے جو محض اپنی خود غرضانہ خواہشات کے پیچھے بڑ جائے اور اپنی ملک کے مفاد کو پس پشت ڈال دے۔ اب جب کہ نیا صیلا و وقت کا سوال پہلے کی طرح اہم نہیں رہا تو ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر شخص کے دل اور ہر ملک میں حقیقی معنی میں بین الاقوامی فضا پیدا کی جائے، اور کالے گورے، مشرقی، مغربی ایشیائی یورپی کا فرق صرف اس حد تک رہنے دیا جائے جہاں تک وہ مخصوص رد قبول کی ترقی میں ہمدردانہ ہو۔ یعنی ”نبی آدم اعضاءے یک دیگر اندکاسین دنیا کے سامنے“

لفظ ”نبی آدم“ صمدی شہزادی، ”مکھتان“، باب ۱۱، صفحہ ۱۲۷ کے مطلع کا عنوان اشارے سے ظاہر ہوتا ہے:

نبی آدم اعضاءے یک دیگر اندکاسین دنیا کے سامنے
چرخ عضوے برد آور و روزگار وگر عضوے را نماند قرار

از سر نو پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ انسان کی قومی زندگی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی زندگی کی تکمیل بھی ہوتی رہے اور دنیا سے تعصب، تنفر اور تہنک کا استیصال ہو جائے۔

یہی وہ خیال ہے جو ہر مملکت کا اعلیٰ ترین مطمع نظر ہونا چاہئے۔ اس کا حصول دشوار ضرور ہے اس لئے جن مضرا حساسات و جذبات کا وہ انداز کرنا چاہتا ہے وہ صدیوں سے اقطاع عالم کے جیسے والوں میں بھرے ہوئے ہیں اور ان سے چھٹکارے کے لئے بہت سا وقت اور بے حد کوشش درکار ہے۔ سب سے پہلی چیز جسے ہر مملکت کو اپنا مقصد گردانا چاہئے وہ تنظیم اور عدل و مساوات کی تعلیم ہے۔ اگر عدل و مساوات کے جذبے کو ترقی دی جائے گی تو یقین ہے کہ لوگوں کی اخلاقی حالت بھی درست ہو جائے گی اور لوگ بین الاقوامیت کا اصول سمجھنے کے اہل ہو جائیں گے۔ یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب سنی معاشرے، 'ناسانی' کوئی اور براہِ عقلی تنگی سے نکل کر دنیا کی مختلف مملکتیں اس سے اعلیٰ دارِ مطمع نظر اپنے سامنے رکھیں گی اور حقیقی معنی میں نوح انسان کو پھر ایک مرتبہ عالمگیر بھائی چارے، 'امن و امان اور مکمل انسانیت کے خیال کی طرف گامزن ہونے کا سبق دیا جائے گا۔'

۱۱۔ یہ فقرے منسلکہ میں کلمے گئے تھے اور آج بھی انہیں قلمزد کرنے کی وجہ نظر نہیں آتی۔
جاپان کے قبضہ، منچوریا و مشرقی چین، اٹلی کے قبضہ، حبشہ، (دارِ حج منسلکہ) جو مینی کے قبضہ آسٹریا، (اکتوبر ۱۹۱۸ء)، سوڈان و (دارِ حج منسلکہ)، (اقیہ لوط منسلکہ) پر

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۱۰ کا)

برہمیا و مورادیا، انجمن اقوام کی کس مہر سی، ہسپانوی خاندان جنگی اور خرد ہالے ملک
کے ہر گوشے میں عدم ردا داری، فرقہ داری بدامنی اور بے اطمینانی، ان سب کے باوجود
اگر کوئی تحلیل ایسا ہے جو حقیقی مقصد انسانی ہونا چاہئے، تو یہی اقوامیت ہے۔

organs of state
&
separation of powers
باب ۱۲

اعضاء حکومت اور تفریق اختیارات

حکومت کے ذرائع - ہیئت حاکمہ اور حکومت - ذرائع کی تقسیم - اعضاء حکومت
نظریہ تفریق اختیارات - اس نظریہ کی تنقید - اس میں حقیقت کا پہلو - آمریت -
ہم نے کتاب کے پہلے حصے میں مملکت 'اس کے ارتقا اور دائرہ عمل بحث
کی ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ عام طور پر مملکت ایک مجرد فلسفیانہ تحلیل
سمجھا جاتا ہے، لیکن اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی
طبقہ یقین انسانوں کا ایسا ہوتا ہے جو اس کے کاروبار میں براہِ حصہ لیتا رہتا ہے،
اور اسی طبقہ کوئی اجماع ہیئت حاکمہ کا لقب دیا گیا ہے۔ ہم مختصر طور پر یہ کہہ سکتے
ہیں کہ مملکت کا کاروبار وہ تمام باشندگان ملک سمجھاتے ہیں جن کے سپرد یہ
کام دستور سیاسی کے ذریعہ سے تفویض کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص ہر کام
بیک وقت انجام نہیں دے سکتا، چنانچہ اس دستور کے ذریعہ سے پہلے
کرویا جاتا ہے کہ تقسیم کار کن امور میں ہوگا اور مختلف ادارات سیاسی پس لائح

کے افراد کا تقرر کیا جائے گا۔ حکومت کے فرائض، اس سے پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ حکومت کے فرائض و اختیارات کیا کیا ہیں۔ پہلے تو جس چیز کی ضرورت ہے وہ آزادی ہے، اس لئے کہ غیر ملک کا قبضہ ہو جانے پر سیاسی اعتبار سے مملکت ہی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ساتھ ہی اس کی بھی ضرورت ہے کہ ایسے نوامین بنائے جائیں جن سے ہر فرد کو اپنی جان، مال، تلاش معاش اور افزائش دولت کے مواقع کی طرف سے اطمینان ہو جائے، اور ان قواعد کی خلاف ورزی کر لے پر کسی قسم کی جسمانی یا مالی نقصان کا خطرہ ہو۔ نیز اس کی بھی ضرورت ہے کہ ایسے عادل مقرر کئے جائیں جو بالکل غیر جانبدارہ انداز سے جملہ معاملات قانون شکنی پر غور کر کے اور رائج الوقت قوانین کا بلا تعصب الطباق کر کے سزا تجویز کرتے رہیں۔ مملکت کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ اگر اس کے انتظامات کی طرف سے کسی قسم کی روگردانی یا لغات کا احتمال ہو تو وہ اپنے جملہ وسائل کو کام میں لا کر ملک میں امن و امان قائم کرے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام باتوں کے لئے روپیہ کی فراہمی کی بہترین صورت کون سی ہے۔ یہ تو وہ فرائض و اختیارات ہیں جن کے بغیر حکومت کا چلنا ہی ناممکن ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ بھی انفرادی مملکت ایسے امور اپنے قبضہ یا نگرانی میں لے لیتی ہے

۱۰ باب ۱۰۔

۱۱۔ اور اطمینان صرف انفرادی حکومت کے تحت ہو سکتا ہے۔ اشتراکی حکومت میں انفرادی ال بدولت ہی نہیں رہتی۔ دیکھو باب ۹۔

جن سے عام مرزہ الحالی میں اضافہ ہو، مثلاً کارخانہ جات کی نگرانی، ریلیں اور سڑکیں، ذرائع حمل و نقل میں اضافہ، وظائف معمرین، جبری بیمہ وغیرہ اور یہ بھی مملکت حالیہ کے کم و بیش لازمی فرائض تصور کئے جاتے ہیں۔ ان فرائض کو جن افراد مملکت کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے اسی کو ہم نے ہیئت حاکمہ کا لقب دیا ہے۔

ہیئت حاکمہ اور حکومت۔ ہیئت حاکمہ تو ان باشندگان ملک پر مشتمل ہوئی جو کسی نہ کسی نوع سے کاروبار حکومت میں حصہ لیتے ہیں۔ حکومت اس ہیئت حاکمہ کی گویا فادہ ہے جسے اس کی مرضی پہ چلنا ہوتا ہے اور جسے کسی قسم کے قصور یا تجاوز اختیارات پر بدلا جاسکتا ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ تا وقتیکہ ہیئت حاکمہ حکومت کے افعال سے خوش نہ ہو، حکومت کو استقلال نصیب نہیں ہوتا اور اسے ایک خاص حد تک ملک میں بے چینی، اختلال اور بغاوت سے دوچار ہونا پڑتا ہے، یہاں تک کہ یہ بھی امکان سے بعید نہیں کہ ہیئت حاکمہ کی (جو مملکت کا گویا کارکن حصہ ہے) اکثریت تنگ آکر بالکل موجودہ حکومت کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جائے اور حکومت کو پلٹ دے۔ اگر اختلال اور بے چینی سے ملک کو نجات دینی ہے تو ہیئت حاکمہ اور حکومت کے مابین اول درجہ کا تعلق و تعاون لازمی ہے، ورنہ ملک کو بڑی مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا، اور اس تعلق کی واحد شکل یہ ہے کہ حکومتی ادارات کے سپرد جو فرائض کئے گئے ہیں انہیں جہاں تک

ہو سکے بہترین طریقہ سے پورا کیا جائے۔ اور ان سے تجاوز نہ کیا جائے۔
 فرائض کی تقسیم۔ اگر ہم غور کریں تو جن فرائض کا اد پر شمار کیا گیا ہے وہ
 پانچ شعبوں میں منقسم ہوں گے، سب سے پہلے تو قانون سازی یعنی ان قواعد
 کی ساخت ہے جن کے تحت ملک میں امن و امان اور افراد کی زیادہ از زیادہ آزادی
 ممکن ہے اور جن کے بغیر انسانی ادارات میں نظم کی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔
 دوسرے اس بات کی نگرانی بھی بغایت ضروری اور لازمی ہے کہ ان قواعد کی
 پابندی ہوئی ہے یا نہیں۔ تیسرے اگر کوئی شخص ان قواعد سے انحراف
 کرے تو اسے پاداش کو پہنچایا جائے۔ مملکت کے قیام کے لئے یہ بھی ضروری
 ہے کہ اسے بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اس کی قوت کو منظم کیا جائے
 اور دوسرے ملک سے دوستانہ تعلقات رکھے جائیں۔ حکومت کا آخری فرض
 یہ ہوگا کہ ان تمام انتظامات کے برقرار رکھنے کے لئے روپیہ فراہم کیا جائے۔ یہ
 تقسیم ان فرائض کی ہوئی جو افراد کے کاموں میں کم از کم مداخلت کے بغیر ضروری ہوں
 لیکن اگر غور کیا جائے تو جتنے بھی مقدم اصول اشتراکیت کی طرف بڑھائے جائیں
 گے اور حکومت کے سپرد جتنے بھی مزید فرائض کئے جائیں گے وہ سب کے سب
 قانون سازی، اور ان قوانین کی پابندی کی نگرانی ہی کے تحت آئیں گے، اس
 لئے کہ روگردانی کی شکل میں حکیم، حفاظت اور محاصل ہر حالت میں لازمی ہیں،
 خواہ مملکت کا رجحان انفرادیت کی طرف ہو یا اشتراکیت کی طرف، چنانچہ
 جتنے بھی زیادہ فرائض حکومت کے سپرد کئے جائیں گے اتنی ہی زیادہ مصروفیت
 قانون ساز اور پابندی قانون کے نگران کی بڑھ جائے گی۔

اگر غور کیا جائے تو یہ جو پانچ شقیں فرائض حکومت کی بیان کی گئی ہیں ان میں سے بعض فرائض ایسے ہیں جو ایک دوسرے سے اس قدر مطابقت ہیں کہ ان کا ایک ہی ادارہ کے سپرد رہنا مناسب ہے۔ ظاہر ہے کہ پابندی قانون کی نگہانی بغیر کسی قسم کے آئہ جبر کے بے سود ہے، ورنہ اگر قانونی نہدیر نہ ہوگی تو محض بدایت و ترغیب سے کام چلنا نہایت دشوار ہے۔ بحسب یہی کیفیت ہر دنی مدافعت کے فرض کی ہے، اور گوعام طرہ پر حکومت محض انہی قوت کو تنظیم کر کے اور دوسرے ممالک سے رشتہ قائم کر کے دشمنوں کو مرعوب کر لیتی ہے، لیکن اسے ہمیشہ دشمن سے مقابلہ کے لئے تیار رہنا چاہئے، اور اس فرض کی ادائیگی میں اسے تقریباً اسی طرح کے طریقے استعمال کرنے پڑیں گے جو اندرونی بے صنی کے روک کے لئے استعمال کرنے پڑتے ہیں، اسی لئے آج کل یہ دونوں فرائض علی العموم ایک ہی ادارہ حکومت کے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا امر بھی غور طلب ہے۔ اگر دیکھا جائے تو قانون سازی اور محصول عائد کرنا یہ دونوں ایک ہی اصول کے تحت آتے ہیں، اس لئے کہ دونوں میں انسان پر پابندی یاں لگائی جاتی ہیں۔ قانون سازی میں انسان کی جسمانی رد و حالی آزادی کی قطع و برید کی جاتی ہے تاکہ دوسروں سے تصادم کا اندیشہ باقی نہ رہے اور زائد از زائد ممکن آزادی باقی رہے، محصول عائد کرنے کا مقصد بھی اس کے مماثل ہوتا ہے وہ یہ کہ انتظامات ملک چلانے کی غرض سے انسان کے گٹھ سے پسینے کی گمائی سے جو آمدنی ہوتی ہے اس میں سے ایک حصہ وصول کیا جائے اور اس طرح افراد کی مالی آزادی کو محدود کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً ہر ملک اور ہر زمانہ میں

قانون سازی اور محصول عائد کرنے کا اختیار ایک ہی ادارے کے سپرد ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ ان ممالک میں بھی جہاں قانونی اصول کی نوعیت خدائی بھی جاتی ہے، وہاں محال بھی ایسے احکام کے تحت ہی عائد کئے جاتے ہیں جو خدا کی طرف سے بندوں کے مفاد کے لئے نازل ہوئے ہوں۔

اعضاء حکومت۔ الغرض اگر غور سے دیکھا جائے تو حکومت کا کام تین بڑے شعبہ جات یا اعضاء کے سپرد ہوتا ہے، پہلے تو وہ عضو حکومت ہے جس کے سپرد تنظیم کی خاطر افراد کی حدود معین کرنے کا فرض ہوتا ہے خواہ یہ حدود جسمانی یا بنیادی پر مشتمل ہوں یا مالی یا بندوبست پر، دوسرا وہ عضو جس کے سپرد ان قوانین کا نفاذ ہوتا ہے اور جس کے متعلق ملک کو اندرونی اختلاف اور بیرونی ممالک کے حرم و آؤسے بچاؤ کا اہم کام سپرد ہوتا ہے، اور تیسرا عضو وہ ہے جو قانون شکنی کے شبہ کی صورت میں یہ طے کرتا ہے کہ فی الواقعہ قانون توڑا گیا ہے یا نہیں، اور اگر توڑا گیا ہے تو پھر مجرم کو پاداش کو پہنچانے کی تجویز یا سفارش کرتا ہے۔ پہلے ادارہ کو عضو مقنن، یا ”مقننہ“ دوسرے کو عضو عامل یا ”عاملہ“ اور تیسرے کو عضو عدالت یا ”عدلیہ“ کا لقب دیا جاتا ہے۔ حکومت کے حدود اختیار کا بیان اصل ان ہی تین عظیم الشان اعضاء حکومت کے تذکرے پر مشتمل ہو گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تینوں ”اعضاء حکومت“ کا ایک

اس کی بدیہی مثال یہ ہے کہ شرع اسلامی میں قوانین کے اصول بھی قرآن مجید اور حدیث نبوی سے اخذ کئے گئے ہیں اور محال بھی انہی کی سند سے عائد سمجھے جاتے ہیں۔

دوسرے سے کس قسم کا تعلق ہونا چاہیے۔ جیسا کہ پر بیان کیا گیا ہے، بعض ممالک میں ملکی انتظام ایک خاص اصول پر مبنی رہا ہے، وہ یہ کہ چونکہ قوانین انسانی سقیم ہوتے ہیں اس لئے خدا کو یا قانونی اصول و ولایت کرتا ہے اور علماء و ائمہ کا ان کی تائید کرتے ہیں؛ دوسرے جہاں تک عالمائے اقتدار کا تعلق ہے، سردار قوم کی کیفیت اس کے خادم کی جیسی ہوتی ہے۔ محکمہ عدلیہ کو ہر ملک میں گویا بال کمانی سمجھا جاتا ہے، اور اس کی ذمہ داری کے ساتھ جملہ ادارات حکومت میں خامی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان اصول کا ائمہ سیاست نے بار بار ادا کیا ہے اور ملکی حکام نے ان پر عمل کیا ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جو قاضی مقرر کئے جاتے تھے ان کا تعلق مقامی صوبہ داروں سے نہیں بلکہ خود خلیفہ وقت کے ساتھ ہوتا تھا اور ایسی مثالیں موجود ہیں کہ خود خلیفہ کو قاضی نے طلب نامہ بھیج کر بلایا ہوا اور اسے حاضر ہونا پڑا ہو۔ مغربی ممالک میں اس اصول پر نسبتہ حال ہی میں عمل ہونا شروع ہوا ہے، گو اس سطح طائیں ہی کے زمانہ سے یہ محسوس کر لیا گیا تھا کہ ہر مملکت میں یہ سبب

۱۵ باب ۱۲

۱۶ "سید القوم خادیم"

۱۷ مثلاً اٹھارہویں صدی عیسوی سے بیشتر مملکتان کا بادشاہ عدالت پر کلیتہً عادی تھا اس کے لئے دیکھو چیمبرز "تاریخ دستور انگلستان" ترجمہ اردو۔ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن باب ۴، جہاں بیان کیا ہے فقرہ نقل کیا گیا ہے کہ "مناسب ہے کہ عادل بنے شیر دل کے ہوں، اگر ایسے شیر جو تخت شاہی کے تابع ہوں تاکہ وہ ملکی اقتدار کے کسی جزو کی طاعت و ریزی، یا مخالفت نہ کریں۔"

ایک دوسرے سے جداگانہ ہوتے ہیں۔ سولہویں صدی عیسوی کا سیاست دان
ژاں بودیں یورپ میں شاید پہلا شخص تھا جس نے یہ اصول پیش کیا کہ فرمانروا کو عاوانہ
فرائض کو خود اپنے آپ پورے نہیں کرنے چاہئیں بلکہ عدالت کا کام دوسروں کے
سپر دکر دینا چاہئے۔ وہ کہتا ہے کہ "اگر قانون سازی اور عدالت دونوں ایک
ہی شخص کی سپردگی میں ہوں تو پھر اس کے معنی یہ ہوں گے کہ عدل و اختیار جانی
قانون کا انطباق اور اس سے خود مختارانہ گریز" ان سب میں خلط بحث ہو چکا۔
اس کے بعد جس لوگوں نے اس تقسیم کاری کے اصول پر فراز یا زور دیا ہے وہ
انگریز منصف کوک ہے جس نے اپنے "رسالہ جات شعلی حکومت" میں
حکومت کے شعلی شعبوں کو ایک دوسرے سے میز کیا۔ لیکن اس کے نظریہ
کی بنیاد وہ اعضا نہیں ہیں جو اد پر بیان کئے گئے ہیں، بلکہ وہ ایک طرف تو
حکومت کو "قانون ساز" "عادلانہ" اور "وفاقی" شعبوں کے سپرد کرتا ہے۔
اور دوسری جانب حکومت کا مرکز ایک "راہ عامہ" کو بتاتا ہے جو اس کو خیال
میں امور ملک کی ہمیشہ نگہ رانی کرتا رہتا ہے۔ لیکن جس شخص نے تقسیم کار کے اصول
پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ فرانسیسی ہیرن ٹھیسیو ہے جس نے انہی

۴۴ ارسطو کا کہنا ہے: "سیاسیات" *Aristotle's Politics* اشاعت آگسٹ ۱۹۸۸ء باب ۴، پارہ ۴

۱۔ دیکھو شیخ، "نظریہ مملکت" ترجمہ اردو، جامعہ عثمانیہ، حصہ ۲ باب ۶۔

ملک "ربالہ مات متعلق حکومت ملی" *Laches: Treatises on Civil*

Government. رسالہ ۲۔ جواب ۱۲، ۱۳۔

کتاب ”روح قوانین“ کو اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں لکھ کر اور اس میں ”تفریق اختیارات“ کے اصول پر زور ڈال کر دنیا کے بعض دستوروں پر براہ راست اثر ڈالا۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نوٹیکٹیو کی کتاب کے ایک بارہ کا ترجمہ بخیرہ کر دیا جائے وہ کہتا ہے کہ :-

نظریہ تفریق اختیارات۔ ”ہر حکومت میں تین قسم کا اقتدار مرکوز ہوتا ہے، اول اقتدار قانون سازی، دوسرے اقتدار عالم، جس کے سپرد دو کام ہوتے ہیں قانون اقوام کا نفاذ اور ملکی قوانین کی ترویج، پہلے اقتدار کے تحت فرماں روا یا عامل موتی یا متعلّق قوانین بناتا ہے۔ اور موجودہ قوانین میں ترمیم و تہتج کرتا ہے اور دوسرے کے تحت وہ جنگ چھیڑتا ہے، اطرائی ختم کرتا ہے، سفیروں کو بھیجتا اور بلاتا ہے، امن عامہ قائم کرتا ہے، اور ملک کو خارجی دول کے حلوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ ایک تیسرا اقتدار بھی ہے جس کی رو سے مجرموں کو سزا دی جاتی ہے، اور افراد کے درمیان جو جھگڑے پیدا ہوتے ہیں انھیں طے کیا جاتا ہے، اس اقتدار عدلی اقتدار کہتے ہیں اور یہ اقتدار عالم سے جدا تھا نہ ہوتا ہے۔ جہاں ایک ہی شخصیت میں اقتدار مقننہ و عالمہ دونوں مرکوز ہوں وہاں آزادی کا بول بالا نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ایسی صورت میں لوگوں کو ہمیشہ یہ خوف لگا رہے گا کہ ایک ہی حکمران یا جماعت ظالمانہ قوانین بھی بنائے گی، اور ان کا نفاذ بھی ظالمانہ انداز سے کرے گی۔ اسی طرح اگر عدلی اقتدار جماعت مقننہ میں مرکوز ہو تو گویا عادل ہی قانون ساز بھی ہو گا اور اسی طرح رعایا کی زندگی اور آزادی دونوں پر مطلق العنانی کے ساتھ قابو یافتہ ہو جائے گا۔ اگر عدالت اور عالمانہ

انتظار دولوں ایک شخصیت کے سپرد ہوں، خواہ وہ عیان پر مشتمل ہو یا عموم پر، تو بس ہر چیز کا خاتمہ ہی ہو جائے گا۔

یہ ہے وہ مشہور نظریہ جس نے دنیا کے بعض نہایت اہم و تاثیر پذیر دست اثر ڈالا۔ نوٹس کی کتاب ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی اور اس کے بعد سب سے پہلا دستور مرتب ہوا اس میں اسی تفریقِ اختیارات کے اصول پر تقریباً پورے طور سے عمل ہوا۔ ممالک متحدہ امریکہ کے دستور سازوں نے اپنے ساختہ پر دو اختصار حکومت کی بنیاد ہی اس اصول پر رکھی کہ عالم، متفقہ، اور عدلیہ تینوں اعضاء حکومت حتیٰ الامکان ایک دوسرے کے اثر اور دست برد سے آزاد رہیں، چنانچہ ممالک متحدہ امریکہ میں

۱۸۷۷ء میں نوٹس کی اس نظریہ "تفریقِ اختیارات" سے خاص طور پر پسپی ہے۔ مدت دراز سے ہندوستانی لوگ برطانوی حکومت سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ عمال حکومت کو اس وقت جو عادلانہ و عادلانہ اختیارات حاصل ہیں ان کی تفریق کی جائے مثلاً کلکٹروں، ڈپٹی کمشنروں، ڈپٹی کلکٹروں (اکسپریسٹنٹ کمشنروں) اور تحصیلداروں سے فوجداری کے اختیارات لے لئے جائیں، لیکن اس وقت تک برطانوی ہندی حکومت اس اصلاح پر رضامند نہیں ہوتی اور حالیکہ قلمرو علحضرت حسدوکن خلد اللہ ملکہ اور بعض دوسری ریاستوں میں مدت سے اس اصول پر عمل کیا جا رہا ہے۔ آج کل ہندوستانی سیاسی بلے بھٹی کے زمانہ میں نوٹس کی یہ خیالی، بالکل صادق معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ آج کل ہندوستان میں گورنر جنرل مجلس عالمہ ہی قواعد نافذ کرتے ہیں، انھیں کی پولیس گزار کر رہی ہے اور انھیں کے ناظم مقام عادل لمزیوں سے جیل خانے بھرتے ہیں۔ نوٹس کی یہ نظریہ اس کی کتاب "روح قوانین" *Essence of Laws* ۱۸۷۷ء میں لکھا۔

آج تک وزرا و اہل کی جماعت مقننہ یعنی کانگریس کے نہ رکن بن سکتے ہیں نہ ان کے سامنے ذمہ دار ہیں، اور بہت سی ریاستوں کے عادل اور ان کے عمل کا بیشتر حصہ منتخب ہوتا ہے گو ان سے اگر کوئی حرکت ناشایستہ سرزد ہو جائے تو اکثر ریاستوں میں انھیں جماعت مقننہ یا وہ اور جماعت عاملہ مل کر انھیں خدمت سے علیحدہ کر سکتی تھے۔ نیوٹن کیو کے خیالات کا خود اس کے ملک فرانس پر بھی بہت کافی اثر پڑا۔ چنانچہ ۱۷۹۱ء کے انقلاب کے بعد فرانس کے پہلے تحریری دستور میں جو ۱۷۹۱ء کے انقلاب کے بعد بنایا گیا تھا، یہ فقرہ موجود ہے کہ ”ہر وہ معاشرہ جس میں تفریق اختیارات کے اصول کا تعین نہیں ہوتا اس میں دستور ہی کا فقدان سمجھنا چاہئے۔“ فرانس میں اس نظریہ کا اس وقت بھی اتنا اثر ہے کہ ممبری عدالتیں سرکاری عہدہ داروں کی ان خلاف ورزیوں کو مقدمات کی سماعت نہیں کر سکتیں جو ان سے سرکاری فرائض کی انجام دہی میں سرزد ہوتی ہوں بلکہ ان کی سماعت خاص عدالتوں کے انتظامی میں کی جاتی ہے۔ انھیں نیوٹن کیو کے نظریہ تفریق اختیارات کی وجہ سے ایک جدید طرز کی حکومت کی ابتداء

۱۷۹۱ء کی ریاستوں میں عادلوں کے تقرر اور علی گیلوں کے طریقوں کا نہایت عمدہ تذکرہ برائیس کی سند تصنیف ”دولت عامہ امریکہ“ Bryce: American Commonwealth جلد ۲، باب ۴۲، میں ہے۔

۱۷۹۱ء دستور فرانس ۱۷۹۱ء حصہ ۱ ”اعلان حقوق انسانی“ دفعہ ۱۶، ”تاریخ مرفین عالم“ جلد ۱۲
Historians History of the world.

ہوتی ہے جس میں عالمہ مقننہ اور عدلیہ ایک دوسرے سے جداگانہ عناصر حکومت

سمجھے جاتے ہیں۔ غور کیا جائے تو حکومت کے ان تینوں اعضاء

یعنی مقننہ، عالمہ، اور عدلیہ کے درمیان ایسی تقسیم کار جس کی وجہ سے ان تینوں میں

کسی قسم کا تعلق باقی نہ رہے، نہ صرف ناممکن ہے بلکہ نقصان رساں بھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مؤسسیوں نے جن حالات و واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا

ان کی رفتار کو وہ سمجھا ہی نہیں۔ اس نے اپنی دانست میں دستور انگلستان کا

فائدہ مطالعہ کر کے اپنے نتائج اخذ کئے تھے۔ یہ زمانہ تاریخ انگلستان میں نہایت

ممتاز زمانہ تھا، اس لئے کہ دستاویز حقوق ^{۱۸۵۹ء} اور "قانون بندوبست"

۱۸۵۹ء کے ذریعہ سے شاہ انگلستان کے اکثر ایسے اختیارات جو پچھلے پچاس

ساٹھ سال میں اس کے اور پارلیمنٹ کے درمیان ابہ التنازع رہے تھے، اس

کی گرفت سے نکال لئے گئے تھے، اور مؤخر الذکر قانون کی رو سے ایک طرف

تو محکمہ عدلیہ بیرونی اثرات سے تقریباً آزاد ہو گیا تھا اور دوسری جانب یہ قاعدہ

ہو گیا تھا کہ بادشاہ کا کوئی وزیر یا وظیفہ خوار دارالعوام میں نشست نہ کرے تاکہ

پارلیمنٹ شاہی اقتدار سے بالکل آزاد رہ سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ آخری وقت عدہ

باقی رہتا تو کابینہ کی حکومت، جو آج کل کے انگریزی دستور کی جان ہے قطعاً ناممکن

۱۸۵۹ء مکتبہ "من شیخہ ترجمہ" Select Charters: ۵۵۰

"قانون بندوبست" دفعہ ۴۔

ہو جاتی اور یہ طریقہ کہ وزیراعظم پارلیمنٹ کی اکثریت کا رہبر ہوتا ہے، اسی وقت ممکن ہوا، جب عہد ملکہ آئن کے اوائل میں اس میں ترمیم کر دی گئی اور بڑے بڑے عہدہ داران حکومت کا رکن دارالعوام بننا ممکن ہو گیا۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ مونٹگیو کے پیش نظر جو پتناز ملکیتیں تھیں، یعنی انگلستان و فرانس، ان میں سے فرانس میں تو جملہ اختیارات ایک شخص واحد یعنی بادشاہ کی ذات میں مرکوز تھے اور وہ چاہتا تھا کرتا تھا، راء انگلستان، تو اس میں شہزاد اور اس کے بیٹے کی کوشش کی گئی تھی کہ تینوں اعضاء حکومت کو ایک دوسرے سے آزاد کر دیا جائے۔ جب صورت حال یہ تھی تو کسی قسم کے تعجب کی بات نہیں کہ مونٹگیو نے انگلستان کے مروجہ دستور کو فرانس کے طرز حکومت پر ترجیح دی۔

بہر نوع جیسا ابھی بیان کیا گیا ہے، یہ ناممکن ہے کہ مختلف اعضاء حکومت ایک دوسرے سے بالکل آزاد ہوں۔ سب سے پہلی بات تو یہ یاد رکھنی ہے کہ حکومت چند خود مختار اور ایک دوسرے سے غیر متعلق ادارات کے مجموعہ کا نام نہیں بلکہ اس میں ایک اندرونی وحدت پائی جاتی ہے، اور یہ ادارات اس جائداد کے

تسلط کے لئے اس قاعدے کی ترمیم کر دی گئی۔ اگر قانون بندوبست کی یہ شرط ہوتی تو دستور کا ارتقا بالکل مختلف ہوتا، اور اراکین کا بیڑہ انگلستان جیسے اراکین پارلیمنٹ ہونے کے اس میں نشست دے سکتے، جس کی وجہ سے بجائے ”کابینہ حکومت“ کے امریکہ کی ”سی“ صدارتی حکومت ”قائم ہو جاتی، جہاں جس وزرا جماعت نیابتی کے سامنے نہیں بلکہ محض صدر جمہوریہ کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے۔

اسی طرح اعضاء میں جیسے جسم انسانی میں لقمہ، پاؤں، کان، ناک، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان اعضاء سیاسیہ کے مابین اعضاء جسمانی سے کہیں زیادہ تعلق پایا جاتا ہے۔ اگر بالمشی سیاسی اعضاء ایک دوسرے سے ایک جہتک آزاد بھی ہوں تاہم ان میں باہمی تعلق ضرور رہتا ہے اور وہ اس وجہ سے کہ ان سب میں جو قوت محرکہ ہے وہ ایک واحد سیاسی جسم یعنی مملکت سے پیدا ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی غلط ہے کہ یہ اعضاء رہتے ہیں برابر میں۔ کوئی ادارہ اس وقت تک کام نہیں کر سکتا تاؤنگیہ اس میں تنظیم نہ ہو اگر کسی قسم کی تنظیم بدون قواعد قوانین کے ممکن نہیں، لہذا کسی مملکت میں اسی ادارے کو فوقیت حاصل ہوگی جس کے سپہ وقانون سازی کا اہم کام ہو اور کوئی ایسی حکومت شخصی یا مطلق العنان نہیں کہلائی جاسکتی جس میں ضرور اکر مجلس عاملہ اختیارات حاصل ہوں، لیکن وہ قانون سازی پر حاوی نہ ہو، ضرورت تنظیم کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور وجہ بھی ادارہ مقننہ کے تفریق کی ہے۔ یہ تھا چاہیہا ہے کہ چونکہ قواعد و محال دونوں ان بابتدول کا نام ہے جو مملکت تنظیم و انتظام کی خاطر ازاد پر عاید کرتی ہے اس لئے یہ دونوں علی العموم ایک ہی ادارے کے سپرد ہوتے ہیں، اور یہ خیال ہے کہ وہی ادارہ سب پر حاوی ہوگا جسے خزانہ مملکت پر قابو ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ آزادی کی اساس محض غلامی تفریق اختیارات پر نہیں ہوتی (جیسا مونٹسکیو اور فرانس کے انقلابی سمجھے تھے) بلکہ اس کا دار و مدار ان حکومت کی عام روش و طرز کار پر ہوتا ہے۔ اگر کسی طرح سے اعضاء حکومت کے مابین کل تفریق بھی ہو جائے تو وہ مملکت کے لئے نہایت مضر ہوگی، اس لئے کہ اسی حالت میں مختلف اعضاء سیاسیہ کے مابین افزائری اور حسد کا مادہ پیدا ہوگا

جس سے مملکت کے کمزور ہو جانے کا اندیشہ ہے۔^{۱۱۴}

اس میں حقیقت کا پہلو۔ اس نظریہ میں جو حقیقت مضمر ہے وہ یہ ہے کہ اگر مختلف اعضاء حکومت کے مابین ایک حد تک تقسیم کار کر دیا جائے تو قانون قدرت کے مطابق ہر عضو کے لئے اپنے متعلقہ امور کو بحسن خوبی انجام دینے کا موقع حاصل ہو جائے گا۔ لیکن یہ خیال کہ تقسیم کار ایسی مکمل ہو سکتی ہے کہ ہر عضو حکومت کو دوسرے سے واسطہ ہی نہ رہے، سراسر غلط ہے، اس لئے کہ ان کے مابین کہیں نہ کہیں تناسل ہونا لازمی ہے۔ مثلاً ہر شخص اس پرتشوق ہو گا کہ محکمہ عدلیہ کو اپنے مخصوص کام کی نوعیت کی وجہ سے جماعت عالمہ و ادارہ مقننہ دونوں سے آزاد ہونا چاہئے تاکہ جماعت عالمہ کے ارکان سے خلاف قانون افعال پر غیر جاندارانہ بازپرسی کی جاسکے، خود ادارہ مقننہ کو اپنے حدود و اختیارات سے بڑھنے روکا جاسکے، اور قانون کا انطباق بلادرور رعایت بڑے چھوٹے پر ہو سکے۔ لیکن ظاہر ہے کہ عادلانہ کے تصور کا اختیار کسی نہ کسی کو ضرور ہو گا۔ اور قوانین کی شکل کے تعین میں دو یقیناً جماعت مقننہ کے نا بجا رہیں گے یہ ٹھوسکیوں کے نظریہ تفریق اختیارات ہی کی برکت ہے کہ ممالک متحدہ امریکہ کی اکثر ریاستوں میں عادلانہ کا تصور انتخاب عامہ کے ذریعہ سے ہوتا ہے، اور اس کی ترویج کے باعث جو طرح طرح کی رشوت ستانی دہاں عدالت جیسے اہم عضو حکومت میں چلتی ہے وہ اس عظیم نشان مملکت کے ماتھے پر

۱۱۴ اس نظریہ کی مزید تنقیہ کے لئے دیکھو گلکرسٹ "اصول سیاسیات" Gilchrist, Principles of Political Science. باب ۱۲۔

گویا کونک کا ٹیکہ ہے۔ اب اگر عام انتخاب نہ ہو گا تو یا تو جماعت عالمہ عادلوں کا تقرر کرے گی، ورنہ مقننہ، اور جماعت مقننہ کے تقرر میں بھی اسی قسم کی خرابیاں ممکن ہیں جیسے عام انتخاب کی صورت میں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مملکت میں عادلوں کے تقرر کا اختیار جماعت عالمہ کو ہی دیا جاتا ہے گو ایک مرتبہ تقرر کے بعد عادل کے اثر سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اور (سوائے سخت بدعلی کی صورت کے) انہیں کوئی علیحدہ نہیں کر سکتا، نہ ان پر جرمانہ کر سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ محکمہ عدلیہ کو جو آزادی مختلف خود مختار ممالک میں حاصل ہے اس کا باعث یہی ہے کہ اسے کسی دوسرے محکمہ کے تابع نہیں سمجھا جاسکتا۔ بعض ممالک مثلاً فرانس میں تو نہ صرف عادل محکمہ عالمہ سے آزاد ہیں بلکہ عدلیہ حکومت ان خلاف قانون افعال کے لئے جو سرکاری کارگزاری کے دوران میں سرزد ہوں معمولی عدالتوں میں نہیں بلکہ ان مخصوص ”انتظامی عدالتوں“ کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں

۱۱۔ برٹس، حسب سابق

۱۲۔ انجمن ان میں عادلوں کا تقرر لارڈ چانسلر کی سفارش پر ہوتا ہے اور تاؤنٹیکلک وہ اپنا کام خوش اسلوبی سے بٹے جائیں انہیں علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ فرانس میں وزیر عدلیہ کی سفارش پر صدر جمہوریہ بڑے بڑے عادلوں کا تقرر کرتا ہے۔ جرمنی کے ۱۹۱۷ء والے دستور کی رو سے عدالت عالیہ کے عادل جب تک ان کا جی چاہے اپنے عہدے پر برقرار رہتے تھے اور انہیں اس وقت برخواست نہیں کیا جاسکتا تھا جب تک ان کے خلاف کسی دوسری عدالت کا حکم نہ ہو۔ ممالک متحدہ امریکہ کے مرکزی عدالت عالیہ کے ارکان کی تنخواہ میں کمی نہ کی جاسکتی۔

جو اس تفریق اختیارات کے اصول کے تحت خاص طور پر اعمال حکومت کے مقدمات کے لئے قائم کی گئی ہیں۔

اس اصول کی ترویج کی وجہ سے دنیا کی دستوری حکومتوں کی دو قسمیں ہو گئی ہیں ایک وہ ممالک جہاں ”کابینہ“ یا ”ذمہ دار“ حکومت رائج ہے، جیسے انگلستان، فرانس، کینیڈا، جنوبی افریقہ، آسٹریلیا، یعنی جہاں مجلس کابینہ، جو جماعت عامہ کے سرگروہوں پر مشتمل ہوتی ہے، جماعت مقننہ کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے، اور اس کے اکثر افراد اسی جماعت مقننہ کے افراد میں سے منتخب کئے جاتے ہیں، اور دوسرے وہ ممالک جہاں صدارتی یا غیر ذمہ دار حکومت رائج ہے جیسے ممالک متحدہ امریکہ اور اکثر دوسری امریکی ملکیتیں، یعنی جہاں جماعت مقننہ کا جماعت عامہ کے تقریر یا برطانوی مطلق کسی قسم کا قابو نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ہر حکومت اپنے ملک اور اپنے ماحول کے تاریخی ارتقا کا نتیجہ ہوتی ہے، اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان دونوں میں سے کوئی دوسرے طریق پر فوقیت لئے ہوئے ہے۔ ان دونوں قسم کی حکومتوں کا مفصل ذکر متعاقب کیا جائے گا؛ یہاں صرف یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں ایک طرف تو انگلستان جیسے ”پارلیمینٹری“ ملک میں جماعت مقننہ جماعت عامہ کے ہر فعل کی باز پرس نہیں کرتی اور اکثر ایسے معاملات جیسے جنگ، صلح نامہ، اور فوج کی تفصیلی کھلا

نٹہ فرانس کی انتظامی عدالتوں کی بابت دیکھیں نے اپنی کتاب ”فانون دستوری“

Dacey: Law of the Constitution.

باب ۱۲ میں مفصل بحث کی ہے۔

عام انتظامات ملکی، خارجی معاملات وغیرہ کو ایک حد تک جماعت عالمہ کی صوابدید پر چھوڑ دیتی ہے (گو خود جماعت عالمہ جماعت مقننہ ہی کی ساختہ پرداختہ ہوتی ہے) وہاں ایسے ملکوں میں بھی جہاں "غیر ذمہ دار حکومت" رائج ہے، جماعت مقننہ (یا اس کا کوئی جزو) بہت سے عالمانہ امور میں درخیز رہتی ہے، مثلاً مالک متحدہ امریکہ میں مجلس سینات کے سپر وائی عہدہ داران جمہوریہ کا مواخذہ کیا گیا ہے جس میں جماعت مقننہ کا دوسرا جزو یعنی دارالائین بمذکرہ مستغیث کے ہوتا ہے، اور جہاں تک حاصل کا تعلق ہے جماعت عالمہ کو کانگریس کے سامنے تسلیم خم کرنا پڑتا ہے پھر تقریباً ہر ملک میں جماعت عالمہ کے رکن اعلیٰ کو قوانین پر حق امتناع حاصل ہوتا ہے خواہ وہ کیا ہی کمزور یا محدود کیوں نہ ہو، اور ہر ملک کے ہر محکمہ کو اندرونی تنظیم کے لئے قواعد بنانے امدان کی تعمیل کرنے کا پورا اختیار حاصل ہوتا ہے۔

آخر یہاں اس سے یہ معلوم ہوا کہ ان ممالک میں جہاں دستوری حکومت

میں حق امتناع ہے، انگلستان میں بادشاہ کو قانوناً حق امتناع حاصل ہے لیکن عین عمل سے اسے کام میں نہیں لایا گیا۔ صدر جمہوریہ فرانس کو براہ راست حق امتناع حاصل نہیں ہے لیکن وہ کسی قانون کے بابت کہہ سکتا ہے کہ تا دقتیکہ دلوں، ایران اس پر نظر ثانی نہ کریں اس وقت تک اس کا نفاذ نہیں کیا جائے گا؛ اگر دوبارہ وہی قانون اذول ایوانوں میں اڑسری منظور ہو جائے تو پھر اس کا نفاذ کرنے پر مجبور ہو گا۔ جرمنی میں ۱۹۱۹ء کے دستور کے بموجب اقتدار ایک، ایک کے اندر کسی ایسے قانون کے نفاذ پر مجبور تھا جسے جماعت مقننہ نے منظور کر لیا ہو لیکن اگر وہ چاہتا تو اس کا فیصلہ طلبی بھی کر سکتا تھا۔

مانج ہے، یعنی جہاں کے سیاستی تنظیم کا دار و مدار کسی نسبتاً مستقل دستور کے تحت ہوتا ہے، وہاں کسی نہ کسی قسم کی تفریق اختیارات لازمی ہے۔ اس کے عکس حال میں ایسی حکومتیں قائم ہو رہی ہیں جہاں کا دستور مطلق العنان حکومتوں کی طرح کم و بیش ایک فرد واحد کی مرضی کا تابع ہوتا ہے، چنانچہ آج کل جرمنی میں ہٹلر ملک کے بادشاہ و پید کا مالک ہے، اور ملک کی تمام سیاسی کل اس کی ذات کی تابع ہے۔ یہاں یہ امر عجیبی سے خالی نہ ہو گا کہ جرمنی کے تمام بڑے بڑے عہدہ داروں سے ہٹلر کی ذات کی وفاداری کا حلف لے لیا گیا ہے، اور اس امر کا جرمنی پر اس درجہ اثر ہے کہ ایک جرمن دوسرے جرمن کو "ہٹلر کی جے" کہہ کر سلام کرنا چھو جرمنی میں وہاں کی پارلیمنٹ نے اپنے تمام اختیارات مجلس کا مینہ کے سپرد کر دیے ہیں جس کا صدر اور رہنما ہٹلر ہے۔ ایسے مالک میں اگر تفریق اختیارات ہو تو بھی اس کا دار و مدار ایک شخص کی ذات اور اس کی مرضی پر ہو گا، اور جو مقصد اس تفریق سے ہے وہ حاصل نہ ہو سکے گا۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ وہ چیز جسے ہم آزادی تصور کرتے ہیں آمرتوں میں محفوظ ہوتی ہے اور آمر کے سیاسی اسلحہ میں ایک شہنشاہ یہ بھی ہوتا ہے کہ خفیہ سراخ رسائی کے ذریعے سے قہر کم کی تنقید کو ممکن قرار دیتے۔

۱۲ جرمنی کی سیاسی مرکزیت کے ارتقاء کے لئے وکھیر شرماء "میدان دستور سازی میں حالی کے تجربات"۔ *Sharma: Recent Experiments in Conoti-tution making* صفحہ ۱۹، باب ۳۔ مارچ ۱۹۶۱ء میں جب ہٹلر نے "امن و امان کے ساتھ" لیتھوانیہ سے سیکل کا علاقہ لیتے تو سب سے پہلے جرمن عہدہ داروں میں سے جو جرمن قبضہ مل کر ملے کے لئے پہنچے ہیں، جرمن خفیہ پولیس کا افسر اعلیٰ بھی تھا۔

Forms of Govt.

باب ۱۳ حکومت کی قسمیں

سیاسی تنوع۔ ارسطو کا سیاسی تقسیم۔ قانون سازی کی اہمیت۔ بادشاہی اور جمہوریت۔ خودیہ و دینا قیہ۔

ذمہ دار و غیر ذمہ دار۔ تحریری اور دواچی وساتیر

سیاسی تنوع۔ مختلف شعبہ جات ضروریات حکومت کو سمجھنے کے بعد
اب حکومت کی مختلف قسموں کو سمجھنا دشوار نہ ہوگا۔ سیاسی اداروں کا انحصار ملک اور
آبادی کی ضروریات اور تاریخی و جغرافیائی کیفیات پر ہوتا ہے، اس لئے عیسایان
کیا جا چکا ہے، یہ لاجب ہے کہ ہر ملک کے سیاسی ادارے دوسرے ملک سے
ممتاز و ممتاز ہوں گے۔

اگر ہر ملک کی سیاسی ضرورتیں اور انہیں پورا کرنے کے طریقے ایک ہی طرح
ہوتے تو پھر کسی قسم کا سیاسی تنوع ممکن ہی نہ ہوتا، اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ
ہر ملک اپنی سیاسی انجمن کے مختلف راستے ڈھونڈتا ہے، اور گو اس میں شبہ نہیں
کہ وہ دوسرے ملکوں کے تجربات سے مستفید ہوتا رہتا ہے تاہم سیاسی ارتقاء کی جو کل

وہ قبول کرتا ہے وہ جزواً یا کلاً دوسرے ملک سے مختلف ہوتی ہے۔ ہر ملک اس نوع کے ایک سی ہے کہ وہ آبادی ملک کی منظم سیاسی کیفیت کا نام ہے لیکن اگر ہم ذرا غائر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ رقبہ، حکومت کے مرکز، ہیئت حاکمہ کے تعین، افراد کے حکومت کے ساتھ تعلقات، مختلف حصہ جات ملک کے مرکز کے ساتھ تعلقات اور بہت سے دوسرے ضمنوں میں ایک ملک دوسری ملک سے مختلف ہوتی ہے۔ اس انباز کا دار و مدار فی نفسہ ملک کی ہیئت پر نہیں ہوتا بلکہ طرز حکومت یا دستور پر ہوتا ہے، اور چونکہ دستور میں بہت سی تفصیلی کیفیات، مثلاً عالمہ، مقننہ، عدلیہ اور ان کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات کا یقین ہوتا ہے اس لئے حکومت کے اعتبار سے ملک کی قسمیں متعدد عنوانات کے تحت کی جاسکتی ہے۔

ارسطاطالیسی تقسیم۔ بنیادی سب سے سادہ اور شاید سب سے قدیم تقسیم حکومت وہ ہے جو آج سے دو ہزار برس پہلے ارسطاطالیس کر گیا ہے۔ اس نے اپنی کتاب ”سیاسات“ میں حکومت کے اعتبار سے ملک کی دو گونہ تقسیم کی ہے، ایک باعتبار مقاصد کے اور دوسری باعتبار شرکت حکومت میں کے نزدیک حکومت دو طرح کی ہو سکتی ہے، ایک وہ جو تمام آبادی کے مفاد کو ملحوظ رکھے اور دوسری وہ جو صرف حاکموں کے مفاد کی خاطر عمل کرے، اور چونکہ خود غرضانہ عمل افراطی اعتبار سے گرا ہوتا ہے اور ملک کے حقیقی مقاصد میں جملہ آبادی کے مفاد کا

حصول ہے، اس لئے وہ تمام آبادی کے مفاد کو ملحوظ رکھنے والی حکومت کو افضل و ادنیٰ سمجھتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ حکومت یا تو ایک ایسی شخص پر مرکوز ہوگی ورنہ چند اشخاص پر یا تمام باشندوں سے مرکب ہوگی۔ یونانی و ساتیر سے مثالیں دے کر وہ کہتا ہے کہ حکومت کی خوبی یا خرابی کا دارو مدار جس طرح مقاصد حکومت پر ہے اسی طرح ترکیب حکومت پر بھی ہے۔ اگر حکومت کا مقصد تمام باشندوں کے مفاد کا حصول ہے تو پھر بہترین حاکم ایک بادشاہ ہوگا۔ اس لئے کہ وہ سیاسی سازشوں اور حرص و آز سے بالا تر ہوگا۔ اسی اصول کے تحت اگر بادشاہ کی بجائے اعلیٰ ترین اختیارات کسی جموعے کے قبضے میں ہوں اور مقصد سب کا مفاد ہو تو بہترین حکومت وہ ہوگی جو چند امیر مرکب ہو، اور یہ نہ ہو تو خیر وہ حکومت ہی اچھی ہے جو تمام باشندوں سے مرکب ہو اور جس کا مقصد کسی ایک حصہ سے آبادی کا مفاد نہ ہو بلکہ تمام طبقوں کے کیاں مفاد کا حصول ہو۔ پہلی قسم کو وہ بادشاہی، دوسری کو امیر ساری اور تیسری کو عوام ساری کا لقب دیتا ہے۔ اب ان حکومتوں کو پیچھے جن میں مقصد تمام ملک کے مفاد کا حصول نہیں بلکہ صرف حکام کی بہتری ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں حکومت اعلیٰ اخلاقی معیار سے گرجانی ہے تاہم زیادہ تر آبادی کا مفاد کمتر آبادی کے مفاد سے بالا نہیں ہے، چنانچہ اس ضمن میں بہترین حکومت وہ ہے جو تمام طبقوں پر مشتمل ہو جسے وہ عوامیت کہتا ہے، اس سے خراب تر وہ جو صرف ایک طبقہ پر مشتمل ہو جسے وہ چندی کا لقب دیتا ہے اور خراب ترین وہ ہے جس میں صرف ایک حکمران ہو اور اس کا مقصد اعلیٰ صرف یہی ہو کہ وہ تخت پر بیٹھا رہے

اور اپنے آرام و آسائش کی فکر میں نگاہ رہے؛ اس آخری طرز کو وہ خود سری کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔

بظاہر تقسیم نہایت منطقی اور دل خوش کن معلوم ہوتی ہے، لیکن جس لمحہ ہم ان اقسام میں سے کسی ایک قسم کا انطباق دنیا کی کسی مملکت کی واقعی سیاسی حالت سے کرتے ہیں تو ہمیں قدم قدم پر مشکلات نظر آنے لگتی ہیں۔ کوئی بڑی یا چھٹی مملکت ایسی نہیں ملے گی جس میں کوئی واحد حکمران بغیر دوسروں کی مدد کے حکومت کرتا ہو یا کر سکتا ہو، نہ کوئی ایسی مملکت ملے گی جس میں عموم براہ راست بغیر اعیان یا عمال کی مدد کے قانون سازی کرتے ہوں، عالمانہ اقتدار رکھتے ہوں اور عدالت کا کام انجام دیتے ہوں۔ اسی طرح کسی انسان کے مقاصد میں صرف کچھ نہ کچھ خود غرضی کا

۱۔ تقسیم مفصلہ ذیل نقشے سے واضح ہو جائے گی۔

مرکز حکومت	صحیح	ناسد
شخص واحد	(۱) بادشاہی	(۶) خود سری
ایک طبقہ آبادی	(۲) امیر سری	(۵) چند سری
تمام طبقہ	(۳) عوام سری	(۴) عمومیت

اس میں جو بند سے دے گئے ہیں وہ ارسطو جیسی ترجیح کے اعتبار سے دے گئے ہیں۔
 سہ آج کل کے ان ممالک میں جہاں آمریت کا دور دورہ ہے، جیسے روس، انگریز برٹنی یا جہاں شخصی راج رہا ہے جیسے سلطنت مغلیہ یا انگلستان کا عہد یوڈیافرائس بعد یوڈیافرائس (۱۷۰۱ء تا ۱۷۰۳ء)

یہ ضرور ہوتا ہے خواہ وہ کتنا ہی خود فراموش کیوں نہ ہو، اور ایسی حکومت کا وجود نہایت دشوار ہے جس کا حکمران کلینہ اپنے آپ کو فراموش کر دینا ہو اور اپنی رعایا ہی کے مفاد کے لئے حکومت کرتا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ ارسطو طالیس کے کچھ ہی دن بعد جب روما کا دور دورہ ہوا اور اتفاقاً ارسطو طالیس کے ایک ہم ملک پرلے پوس کو قید ہو کر روما میں رہنا پڑا تو اس لئے روما کے دستور کو بچائے ارسطو طالیس نے

(بقیہ نوٹ ص ۲۳۵ کا) وہاں بھی بادشاہ کو اپنے امرا اور اپنے دروفا دو صوبہ داروں پر اتنا دار و مدار کرنا پڑتا ہے کہ یہ امرا اور صوبہ دار بعض مرتبہ ترک و احتشام میں اپنے آقا کی بربادی کر لے گئے ہیں۔ دوسری طرف آج کل کے ”آزاد سے آزاد“ مالک میں جہاں انتہائی عوامیت کا دور دورہ ہے، جیسے سوئٹزرلینڈ، فرانس و جدید ملک ہیرک، ہالک، انھیں بھی قدیم بادشاہی کی جھلک ”صدر جمہوریہ“ رئیس مکت ”کی شکل میں نمایاں ہے۔

۵۰۰ کسی خالص دیوی حکمران میں اس اعلیٰ اعلان کی مثال ملتی تقریباً ناممکن ہے کہ وہ کوئی اور مخلوک الحالی میں زندگی بسر کرے، لیکن اس کی ہمسرہ رعایا ”دن و دلی رات چوٹی ترقی کرتی رہے۔ تاریخ یورپ میں ہم ”رعایا پرورد حکمرانوں“ کا ذکر پڑھتے ہیں لیکن سب سے زیادہ رعایا پرورد بادشاہ بھی اس معیار پر نہیں پہنچتے۔ شاہ ایک ہی ملک اور ایک ہی زمانہ ایسا ہے جب حکمران واقعی اپنے ذاتی آرام کے خیال کو بھول جاتا تھا، موٹا کھاتا اور موٹا پہنتا تھا اور ہرگز اپنے ملک اور اپنی قوم ہی نہیں بلکہ نبی نوع انسان کے مفاد کی فکر میں رہتا تھا، اور وہ زلزلہ آن پڑھ، پیوند پوشش، جو خور سادہ شش پیہر برقی مسلم اور ان کے خلفائے راشدین کا زمانہ ہے۔

کسی ایک طبقہ کے تحت لانے کے ایک مرکب دستور قرار دیا جس میں ملکیت، اعیانیت اور دولت عامہ قیضوں کے عناصر موجود تھے۔ پولی بوس کا یہ حکم ہر انسانی حکومت پر لگ سکتا ہے، اس لئے کہ کوئی ایسی حکومت نہیں جس میں یہ عناصر مزوج نہ ہوں، اور حیرت تو یہ ہے کہ کس طرح تقریباً دو ہزار برس تک ارسطاطالیسی خیال برابر میدان سیاست پر جاری رہا اور بالکل حال کے لانے تک کیسے اسے ایک سیاسی عقیدہ کے طور پر تسلیم کیا گیا۔

اس مفالطہ کی اصل وجہ یہ ہے کہ حکومت میں ایک شخص یا ایک طبقہ اس قدر غالب ہو سکے کہ اس کی وجہ سے دوسرے طبقات باند پر حاکم بن جائیں اور دستور پر نظر ڈالنے والا سمجھتا ہے کہ حکومت بس اسی ایک شخص یا طبقے پر مرکوز ہے، دراصل ایک یہ ممکن ہے کہ یہ نظام غالب شخص یا طبقہ شخص نمائشی ہو اور حقیقی عمل کا دار و مدار ایک بالکل دوسرے جزو حکومت پر ہو۔ مثال کے طور پر انگلستان کے

ڈننگ: *Political* "سیاسی نظریات" قدیم و جدید

Theories, Ancient and Modern.

ڈننگ: *Political* "سیاسی نظریات" قدیم و جدید میں مشہور جرمانی سیاسی فلسفہ کی اپنی کتاب "نظم حکومت عالم"

Bluntschli: Lehre vom modernen Staat.

ترجمہ اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی فصل ۶ باب ۱ کے ابتدائی کتبائے کہ "دو ہزار برس سے زیادہ ہوئے کہ ارسطاطالیس نے اشکال مملکت کا تعین کیا تھا اور آج ہم اس کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔"

بادشاہ اور وہاں کے وزیر اعظم کو پیش جاسکتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ حکومت کا دار و مدار ایک بڑی حد تک وزیر اعظم پر ہوتا ہے اور بادشاہ کو سوائے "صلااح نیک دینے یا تنبیہ کرنے کے" علا کوئی سیاسی اختیارات نہیں ہیں؛ لیکن شاہ انگلستان کے ساتھ جو بزرگ واقعات وابستہ ہوتا ہے وہ وزیر اعظم کو حاصل نہیں ہوتا اور نہ شاید وہ اس کا خواہاں ہوتا ہے۔ گو یا شاہ انگلستان حکومت کا ایک ناگشتی عنصر ہے اور وزیر اعظم کا رآمد عنصر۔ تاہم ارسطاطالیس کے نظریہ میں حقیقت ضرور اس شدہ ہے کہ مملکت حاکمیت میں "جوازِ حست و جو" ایک رقبِ جماعت کا نام ہے، ایک شخص یا ایک طبقہ یا بہت سے طبقات ضرور دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں، اور مخالفہ ہے تو صرف یہی کہ وہ غیر ممتاز طبقہ است کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے۔

قانون سازی کی اہمیت۔ ارسطاطالیس زیادہ تر یونانی شہری

شہ و شہ کے ناگشتی اور کارآمد عناصر میں ہم کا سہرا بحث کے سہ ہے۔ دیکھو اس کی کتاب "سنو انگلستان" Bagehot: English Constitution باب ۱۔

یہ ناگشتی اور کارآمد عناصر کے ظاہری تزک و حشام کے درمیان جو تباہ ہے وہ انگلستان میں شاہ خارج حشام کی تاجپوشی اور مٹرنیول چیمبرلین کے وزارتِ عظمیٰ پر تقرر سے معلوم ہوتا ہے۔ بالکل نہایت سادگی سے لگے اور بادشاہ کے سامنے اپنا استعفا پیش کیا اور اس سے بھی زیادہ سادگی سے چیمبرلین "بلائے گئے" اور بادشاہ نے تختی ملان وزارت سپرد کر دیا۔ کوئی جلیوس نکلا، نہ کوئی دعوت ہوئی نہ کوئی پڑٹیل ہا۔

ملکیتوں کے دساتیر سے اپنے نظریات کا امتحان کرتا ہے اور غیر یونانی ملکیتوں کو
 (جنہیں وہ "بربری" کا لقب دیتا ہے) میں ایران جیسی متمدن اور مذہب
 سلطنت شامل سمجھی جاتی تھی، بالکل نظر انداز کر دیتا ہے۔ مگر یونان میں بھی قانون
 کا ایک نہایت ہی مقدس چیز سمجھا جاتا تھا، اور گواہتیں دوسرے ملکوں کی طرح
 اسے خود ایک مبدوء کا حکم سمجھا جاتا تھا، امتداد زمانے سے اس کا تقدس تو قائم رہا
 لیکن قانون سازی کی کوئی خاطر خواہ کل نہیں بنائی گئی، بلکہ یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ
 قوانین کو تبدیل کرنے کا اہم کام کسی بڑے ممتاز و ذریعہ مقصد کے سپرد کر دیا جائے۔
 ایتھنز میں تو قانون سازی کو اتنا اہم سمجھا جاتا تھا کہ اگر کوئی شخص کسی لیے اس کا
 قانون کی تحریک کرتا جو کسی موجودہ قانون کے خلاف ہوتا اور ایک سال کے اندر
 اس سے کوئی برے نتائج پیدا ہوتے تو ہر شہری کو اختیار ہوتا کہ وہ اس کے
 خلاف استغاثہ دائر کرے، اور جرم ثابت ہو جانے پر اسے زیر کاہلہ پٹا پڑتا۔
 تو زمین کی اس اہمیت کے مد نظر بعض معاشرہوں میں قانونی اصول کے تعین کا کام
 خدا پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس طرح ایک جدید قسم کے حکومت کی بنیاد پڑی جسے
 وسیع معنی میں خلافت اللہ یا دین راج کہنا چاہئے اور جس کے تحت حکومت محض خدا کی

۱۔ دیکھو "آئین قانون قدیم" *Moine: Ancient Law* باب ۱

۲۔ اس کے بارے میں "تاریخ خلافت آئین" کے لئے دیکھو "گراٹ" "تاریخ یونان قدیم"
 تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔ *Grote: History of Greece* condensed

۳۔ لندن ۱۸۷۴ء میں *ced & edited by Mitchell & Cropani* باب ۱۹

تایم نظام اور خدائی احکام کی عملیں بن گئی۔ ایسی حکومتوں میں جہاں خلافت کے اصول پر عمل ہوتا تھا، حکومت کے اختیارات ہمیشہ ان احکام کے اثرات سے محدود رہتے تھے جنہیں خدائی احکام سمجھا جاتا تھا اور ظاہر ہے کہ ان کا رنگ ایک بڑی حد تک مذہبی ہوتا تھا۔ گو حکمران جماعت کبھی کبھی اپنی خواہش کے مطابق علماء قانون سے خدائی احکام کی تائید کرائی تھی لیکن خود یہ احکام بالکل مثل سمجھے جاتے تھے اور کوئی عضو حکومت ان کے اصول سے ذرا بھی منحرف نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ طریقہ رفتہ رفتہ کم و بیش عالمگیر ہو گیا، یعنی مشرق میں یہودی مملکت، ہندو مملکت جس میں برہمن کو ”بہاراج“ کہا جاتا تھا اور اس کا رتبہ حکمران سے بھی بڑا سمجھا جاتا تھا، اور خلافت اسلامیہ اس قسم کی حکومتیں تھیں، اور مغرب میں ایک طرف پوپ اور دوسری جانب شہنشاہ دونوں اپنے آپ کو خدا کا نائب تصور کرتے تھے۔

اس کے دوش بدوش کلیئہ دنیوی طرز کے حکومتیں تھیں، جو ابتدا میں تو ان دینی حکومتوں کے ماتحت باجگذاڑ تھیں لیکن آخر کار جنہوں نے ان سے انہی خود مختاری اور آزادی کو ملنا لکھ چھوڑا۔ اس طرز کی حکومتیں مشرق میں غزنوی، غوری اور تغلق اور مغرب میں انگلستان اور فرانس اور ولندیزی مملکتیں تھیں جنہوں نے آخر خلافتی حکومتوں کو منہ دہن سے اٹھا کر پھینک دیا اور خود آزاد ہو گئیں۔ ان جدید دنیوی حکومتوں اور پرانی دینی مملکتوں کے اہل جو امتیاز ہے وہ یہی ہے کہ ان میں نہایت بڑا دی سے قانون کشی ہوتی ہے اور اگر کوئی احکام خدائی سمجھے بھی جاتے ہیں تو بھی روزمرہ بود و ماند کے معاملات

میں ان پر زیادہ لحاظ نہیں کیا جاتا اور انہیں اسی زمانے کے لئے بہترین سمجھا جاتا ہے۔ جب وہ "ماخذ" ہوئے تھے۔ زمانہ حال میں نیم دینی طرز سے دنیوی طرز کی طرف ارتقا کی ایک نہایت دلچسپ مثال جمہوریہ ترکی سے ملتی ہے جہاں یہ ارتقا ۱۹۲۰ء میں مکمل ہو گیا ہے۔

بادشاہی اور جمہوریت بعض مرتبہ حکومت کے اعتبار سے ملکوں کی تقسیم کو کیت اور جمہوریتوں کے درمیان کی جاتی ہے۔ اول تو یہ تقسیم اسی پرانی اصطلاحات کی ایک بڑی بھٹی شکل ہے اور دوسرے اگر غور کیا جائے تو ہر ایک بادشاہی میں بھڑا بہت جمہور کا عنصر پایا جاتا ہے اور ہر ایک جمہوریہ میں بادشاہی عنصر بیکانہ پر معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت اور بادشاہی میں تباہی ہے اس لئے کہ جمہوریت وہ طرز حکومت ہے جس میں کسی بادشاہ کے لئے جگہ نہ ہو۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ دنیا بادشاہیت کے اصول سے سجدے مانوس ہے بلکہ بغیر کسی شخصی مرکز کے حکومت کا چلنا محال ہے، اسی لئے عمومی سے عمومی جمہوریتوں میں بھی کسی شخص کو ایک سال کے لئے (جیسے فرانس میں)

۱۳ ارتقا کے دلچسپ وارج حسب ذیل ہیں :-

(۱) ابتدائے "خلافت" آل عثمان بعد سلطان سلیم خاں ثانی ۱۵۱۷ء؛

(۲) عزل سلطان و خلیفہ عبدالوحید محمد خاں سانس ۱۹۲۲ء؛

(۳) عزل خلیفہ عبدالحمید خاں ۱۹۲۲ء؛

(۴) ترکی جمہوریہ کے دستور سے یہ فقرہ نکال دیا جاتا ہے کہ جمہوریہ ترکیہ کا سرکاری مذہب اسلام ہے ۱۹۲۴ء

گو بادستوری بادشاہ بنا دیا جاتا ہے جمہوریوں میں اس ملوکہ عنصر کی کیفیت نہیں اس وقت پوری طور پر واضح ہو جائے گی جب ہم جماعت عامہ پر تفصیلی بحث کریں گے یہاں یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ ایک طرف تو انگلستان کے بادشاہ اور فرانس کے صدر کے اختیارات میں کوئی فرق نہیں اور دوسری جانب مالک متحدہ امریکہ کے صدر کے اختیارات بہت سے بادشاہوں کے لئے قابل رشک ہیں۔ اسی طرح کوئی ملوکیت ایسی نہیں جس میں بادشاہ براہ راست ہر امر کے متعلق قانون بنائے اس کا نفاذ کرے اور اسے حالات و واقعات پر منطبق کر لے۔ قدیم چھوٹی چھوٹی پدرسری ملوکیتوں میں بھی اس قسم کا براہ راست انتظام ناقابل عمل تھا اور یہ اس وقت بھی لا بد تھا جب چند اعیان و اہل خواہ وہ فائدہ انشا ہی کے کرن ہوں یا نہ ہوں بادشاہ کے صلاح کار یا اس کے علیل ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ آج کل کی پچھلے ملوکیتوں میں تو یہ بات کلیتہً ناقابل عمل ہے کہ اس کی کسی نہ کسی قسم کی صلاح مجلس نہ ہوا ورنہ بلا شریکت غیر سے اپنی رہایا حکومت کرے۔

فردیہ و وفاقیہ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کو ارسطاطالیس کی طرح اس

نئے نام نہا مطلق العنان بادشاہوں میں بھی کوئی نہ کوئی صلاح کار مجلس ضرور ہوتی ہے جیسے شان فیروز کے انگلستان میں پروڈیوسر، قدیم ہند میں مہتمی اور مہاراجا اور سلطنت عثمانیہ میں ”درہاں“۔ پدرسری آج بھی ملوکیتوں کی سب سے نمایاں مثال قدیم ملوکہ روم ہے جہاں کا بادشاہ ایک نہایت ہی ختم رقبہ پر حکومت کرتا تھا، یہاں بادشاہ کے صلاح کار سیناٹ یا ”مجلس معین“ شاہی مطلق العنانی کے زمانے میں بھی برقرار تھا۔

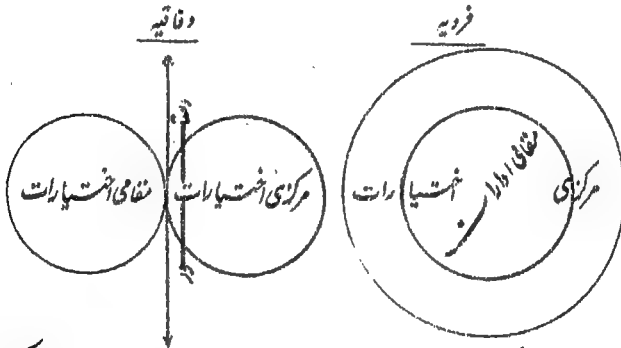
کی ترکیب یا اس کے متنازعہ حصص کے نام پر معنون کرنا اس لئے مغالطہ آمیز ہے کہ اس میں بہت سے عناصر ترکیبی کا لحاظ نہیں رکھا جاتا، لیکن جیسا اور بیان کیا گیا ہے اس نوع کی تقسیم پر اربعہ صدی کے اواخر تک مسئلہ رہی اور پہلا شخص جس نے اس کی تنقید کی پروفیسر سر جان نیلی تھے۔ جنھوں نے کیمبرج میں ایک سلسلہ دروس میں اس کا بطلان کیا۔ اور ایک بالکل جدید تقسیم دنیا کے سامنے پیش کی۔ ان کا بیان ہے کہ اول تو ارسطاطالیس کی تقسیم مغالطہ آمیز ہے اور دوسرے آج کل کی کسی ملکیت پر بھی اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا، جس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ارسطاطالیس کے خیالات کا ماخذ محض شہری ملکیتیں تھیں اور اس نے اپنے زمانے کی وسیع ”بربری“ (یا غیر زانی) ملکیتوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ سچی کے نزدیک علاوہ ”شہری ملکیتوں“ کے کچھ دوسرے کی ملکیتیں پائی جاتی ہیں، ایک وہ جن کا ہر حصہ ایک ہی مرکز کے ماتحت ہوتا ہے جیسے انگلستان، اور دوسرے وہ جس کے مختلف حصے ایک حد تک مرکز سے خود مختار ہوتے ہیں جیسے ممالک متحدہ امریکہ، ان میں سے پہلی قسم کی ملکیت کو وہ فرد یہ اور دوسری کو وفاقیہ کا لقب دیتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ بعض زدے ایسے ہوتے ہیں کہ گو اس کے مختلف اجزاء مرکز سے خود مختار نہیں ہوتے لیکن

۱۵ سچی ”اقترب علم ریاست“ Seeby: Introduction to Political Science ترجمہ شائع کردہ جامعہ عثمانیہ ۱۹۲۹ء خطبہ ۲۔

۱۶ شہری ملکیت کے لئے دیکھو مبدل اول، باب ۴، عنوان ”یونان“
 ۱۷ دیکھو مبدل اول، باب ۲، عنوان ”ریاست“ (بقیہ زبٹ صفحہ ۲۴۳ پر ملاحظہ فرمائیے)

خود مرکز کی طرف سے ان اجزاء کو وسیع اختیارات دیدئے جاتے ہیں، ایسے فردوں کی شمار سب سے ممتاز مثال انگلستان کی ہے جہاں مرکزی حکومت مقامی معاملات میں کم سے کم مداخلت کرتی ہے، بلکہ یوں کہئے کہ ان کے مخصوص حلقہ اختیار پر مطلق مداخلت نہیں کرتی، لیکن ساتھ ہی، جو کچھ بھی اختیارات ان مقامی ادارات کو حاصل ہیں وہ سب کے سب مرکزی حکومت ہی کے تفویض کئے ہوئے ہیں، اور ان میں وہ جب چاہے اور جیسے چاہے ترمیم کر سکتی ہے۔ دوسری جانب ایسے محرمے بھی ممکن ہیں جہاں ہر مملکت اپنے سیاسی معاملات میں کلیتہً آزاد ہو کر ساتھ ہی خواہ کسی خطرے سے

(بلیو پٹ مملکت کا)۔ اسے فریدی اور وفاقیہ کا فرق حسب ذیل شکل سے سمجھ لی آجائے گا:-



شک ہے، اس بات کی طرف توجہ دلانا مناسب ہے کہ باوجودیکہ مملکت متحدہ امریکہ کی ریاستیں اپنی ملک فرمے ہیں لیکن ان کے مقامی رقبات خصوصاً بلدیات کے مشوروں کا دار و مدار ریاستی حکومتوں پر نہیں بلکہ ان رقبوں کے باشندوں کی عام رائے پر ہے۔

خوف زدہ ہو کر وہ نہ خاص مسئلے کو حل کرنے کی غرض سے ایک مرکزی شکل بنائے
ایسے مجموعوں کی مثال سوئیزستان کے ابتدائی مجوسے سے دی جاسکتی ہے
جس میں کوئی مستقل مرکزی ادارہ نہیں تھا اور نہ کوئی "صدر مملکت" تھا۔ حال
کے زمانے میں اس کی بنی مثال وہ سیاسی شکل ہے جو سلطنت میں امریکہ میں
قائم ہوئی جس میں نہ کوئی صدر تھا، نہ عدالت نہ مستقل محفل، اور جس کا واحد
مقصد یہ تھا کہ اگر یزیدوں کے خلاف جنگ جاری رکھی جائے، ایسے مجموعوں کو
یکلی "عہدیت" کا لقب دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خواہ سبکی کی اس تقسیم میں کتنے ہی استقامت کیوں نہ ہوں
لیکن ارسطو کا اس کے تقسیم کی بہ نسبت یہ سیاسی واقعات و حالات کے کہیں زیادہ
مطابق ہے۔ اس میں جو سب سے بڑا سقم ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف شہری
مملکت کا عنوان جدا گانہ قائم کیا گیا ہے اور دوسرے "عہدیت" کو مملکت قرار
دیا گیا ہے۔ "شہری مملکت" ہر جہاں ایک "مرکزی فرد" تھی اس لئے کہ
اس میں رتبے کے مختصر ہونے کی وجہ سے ہر ایک حصہ مرکز کے کلیتہً تابع
تھا، چنانچہ اس کا ایک جدا گانہ عنوان قائم کرنا بے سود تھا، دوسرے جب
عہدیت میں مختلف مملکتیں اپنا انفرادی وجود قائم رکھتی ہیں تو پھر جو نیا ادارہ قائم ہوا

۱۳ الفاظ "وفاقہ" اور "عہدیت" بعض مرتبہ ایک میں مملکت کے لئے قیادال طور پر بھی
استعمال چلے ہیں جیسے سوئیزستان کو (غلطی سے) "عہدیت سوئیزستان" بھی کہتے ہیں اور
"وفاقہ" بھی حالانکہ دراصل وہ وفاقہ ہی ہے۔

وہ نئی مملکت نہ ہوگی بلکہ اس سے بہت زیادہ وسیلہ وصالاً مجموعہ ہوگا جس کی بقا کا سوال خود مختلف مملکتوں کی خوشی پر منحصر ہوگا نہ کہ مرکزی ادارات پر۔ درآئنا لیکہ مملکت کی وجہ وجود ہی یہ ہے کہ ایک مستقل ادارہ قائم ہو جائے۔ گویا سرہانہ سکی کے اصول کو پیش نظر رکھ کر مملکت کی طرف دو ہی قسمیں ہوں گی ایک فرد یعنی وہ مملکت جس میں سیاسی و مقامی جملہ ادارات کا دار و مدار مرکزی ادارات پر ہے اور دوسرے وفاقیہ یعنی وہ مملکت جس میں مختلف اجزاء بعض معاملات میں مرکز کے تابع ہیں اور بعض میں خود مختار ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور قسم کی "مملکت" ہے جس کی طرف سنی اور ملتی دونوں نے اشارہ کیا ہے۔ خود انیسویں صدی عیسوی میں کم سے کم دو مملکتیں ایسی تھیں جن کے اجزاء کے نقطہ اے لمس وہاں کے بادشاہوں کی ذات تھی؛ یہ دو مملکتیں سوئیڈن۔ ناروے اور آسٹریا ہنگری تھیں۔ ان میں سے ناروے سوئیڈن سے بغیر کسی قسم کی اطاعتی جھگڑے کے ۱۹۰۵ء میں علیحدہ ہو گیا اور اسپے نے ایک جداگانہ بادشاہ مقرر کر لیا اور آسٹریا ہنگری کی سلطنت کا جنگ عظیم سے فائدہ کر دیا۔ اب جنگ عظیم کے بعد تقریباً ہی کیفیت برطانوی قلمرو کی ہو چکی ہے جنہوں نے پہلے ۱۹۲۲ء کی کانفرنس میں اعلان کیا (اور اس اعلان کی مشاعرے کے "قانون ویسٹ منسٹر" کے ذریعے سے برطانوی پارلیمنٹ نے توہین کر دی) کہ برطانوی قلمرو میں ایک دوسرے سے اور جنگ سے بالکل آزاد ہیں اور ان کا آپس میں صرف ایک ہی رشتہ ہے اور وہ بادشاہ کی ذات ہے۔ اس اصول کا امتحان اس وقت ہوا جب ۱۹۳۲ء اور

سلسلہ ۱۹۷۱ء میں اکرستان میں ڈی ویلیو کے ”فیٹائل“ فزق کو دجواب دیا ہی سے جمہوری اصول کا حامی اور انگلستان کا مخالف تھا، وہاں کے پارلیمنٹ نے ”ڈائل“ میں اکثریت حاصل ہوئی اور چشم زدن میں نئے صدر اکرستان نے ایک طرف تو اس بات کی تحریک کی کہ ڈائل کے اراکین کو بادشاہ کے وفاداری کا حلف لینے پر مجبور کیا جائے اور دوسرے اپنے من مانے شخص کو فرمان شاہی کے ذریعے سے اکرستان کا گورنر جنرل بنوا دیا اور سلسلہ ۱۹۷۱ء کے نئے دستور اکرستان میں یہ عہدہ بھی توڑ دیا گیا اور آزاد مملکت کی طرح اکرستانی حکومت کا صدر آزادانہ طور پر پانچ سال کے لئے منتخب ہونے لگا۔ سب جوں جوں ہے اور انگلستان کے وزیر بھگوانے قانون ویسٹ منسٹر سوائے ”اخلاقی دباؤ“ ڈالنے اور تقریریں کرنے کے کچھ نہیں کر سکتے۔ الفرض ہیں مملکتوں کے ذمے میں ایسے جمہور کو بھی رکھنا پڑے گا جیسے ”برطانوی دولت عامہ اقوام“ جس کے بعض حصے ہر جیت سے ایک دوسرے سے آزاد ہیں لیکن جو غیر مملکت کے مقابلے میں ایک حد تک تن واحد کے حیثیت رکھتے ہیں۔ اس ”دولت عامہ اقوام“ کی نوعیت عہدیت سے پیدا کا نہ ہے اس لئے کہ عہدیت کسی خاص مقصد کے لئے قائم ہوتی ہے، درآئیکہ اس ”دولت عامہ“ کا قیام مستقل ہے اور اس کے اجراء کی ”جلی مشین“ آزادانہ اتفاق و اتحاد ہے۔

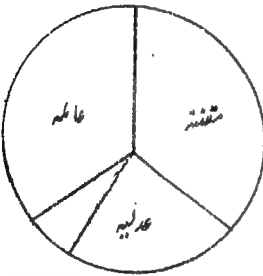
سلسلہ ۱۹۷۱ء کے دستور کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اس میں برطانیہ یا ”برطانوی دولت عامہ“ اقوام“ کا کہیں ذکر نہیں۔

ذمہ دار وغیر ذمہ دار۔ یوں تو حکومت ایک مرکب ادارہ ہے اور اُس کے جتنے اجزاء ہیں اتنی ہی قسمیں ہو سکتی ہیں مگر ممتاز حدود و فاصلہ میں سے جماعتِ عالمہ کی ذمہ داری کا مسئلہ بھی ہو سکتا ہے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ جماعتِ عالمہ لفاظِ قوانین کی ذمہ دار ہے اور اس طرح اس کی حیثیت ایک بہت بڑے عضوِ حکومت کی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ جماعتِ آیا ذمہ دار ہوگی یا غیر ذمہ دار۔ یہ ظاہر ہے کہ جماعتِ عالمہ کے اراکین کسی نہ کسی کے سامنے اپنے کردار کے ضرور ذمہ دار ہوں گے، خواہ حکراں کے سامنے ورنہ خود اپنے صدر یا وزیرِ اعظم کے سامنے، لیکن چونکہ حکراں اور صدر جماعتِ عالمہ دونوں اسی جماعت کے رکن ہو سکتے ہیں اس لئے اگر یہ جماعت سوائے ان اعمال کے دوسرے کسی کے سامنے ذمہ دار نہ ہو تو اسے گویا غیر ذمہ دار کہیں گے۔ اس کے برعکس اگر یہ جماعت کسی دوسری جماعت، مثلاً کسی نیابتی مجلسِ مقننہ کے سامنے اپنے افعال و کردار کے جواب دہ ہو اور یہ نیابتی مجلس اس سے باہر نہیں کر سکتے تو پھر یہ ایک ”ذمہ دار“ جماعتِ عالمہ یا کابینہ کہلائے گی۔ اس کے برعکس صورت حال انگلستان اور فرانس جیسے ممالک میں پائی جاتی ہے جہاں تقریباً ہر ایک فعل کے بابت نیابتی جماعتِ مقننہ یعنی پارلیمنٹ میں کابینہ سے صرف جواب ہی طلب نہیں کیا جاتا بلکہ اگر مسئلہ اہم خیال کیا جاتا ہے تو اس مجلس کے مخالفانہ اکثریت کے رابر وزارت کو مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ فرانس میں تو یہ صورت حال انگلستان سے بھی زیادہ غیر متشکل ہے اس لئے کہ وہاں اگر کوئی رکن دارالمناس کسی وزیر سے کوئی سوال

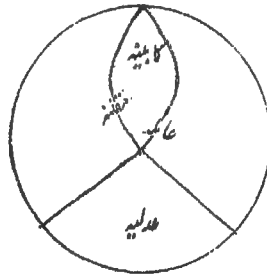
کرے تو وزیر کے جواب پر بغیر کسی اطلاع کے فوراً مباحثہ ہو سکتا ہے، ”قرار داد عدم اعتقاد“ بغیر کسی قسم کے پیشگی اطلاع کے پیش کی جاسکتی ہے اور اگر یہ قرار داد منظور ہو جائے تو اس وزارت کو مستعفی ہو جانا پڑتا ہے۔ فرانس کے اس کارروائی کو ”وضاحت طلبی“ کہتے ہیں اور ارکان کے اس اختیار کی وجہ سے مشکل سے کوئی وزارت ایسی ہوتی ہوگی جسے سال بھر سے زیادہ برسرِ اقتدار رہنا نصیب ہوتا ہو۔ ان تمام شکلوں سے ممتاز وہ شکل ہے جس کا اس وقت

تلاش ذمہ دار حکومت میں کابینہ عالم اور مقننہ کے درمیان واسطے کام دیتی ہے اور اس کے اراکین جماعت مقننہ کے منتخب شدہ اراکین ہی میں سے چنے جاتے ہیں۔ ان دونوں شکلوں کا فرق حسب ذیل شکل سے واضح ہو جائے گا۔

غیر ذمہ دار حکومت



ذمہ دار حکومت



بعض سیاست دان ذمہ دار حکومت کو ”کابینی“ اور غیر ذمہ دار کو ”صدارتی“ کا لقب دیتے ہیں اور یہ غالباً اس لئے کہ ذمہ دار حکومت کا اصول انگلستان سے نکلا ہے اور ”غیر ذمہ دار حکومت“ کا (بقیہ صفحہ ۲۴۹ پر)

اٹلی جرمنی بعض دوسری ملکوں میں پورے زور سے مظاہرہ ہو رہا ہے، جہاں ملک میں جلد شہر جات و عہدہ داران حکومت بلا استقنا را ایک آمر مطلق کے سامنے جواب دہ ہیں، جو خود محض اپنے زور اور قابلیت سے سرچشمہ سیاسیات بن گیا ہے، اور جو کسی کے سامنے مطلق ذمہ دار نہیں۔ یہ صورت حال مظاہر کسی ہی نامکن کیوں نہ معلوم ہو، واقعہ یہ ہے کہ اس وقت بہت سے ملک میں اس نے عمومی یا لینٹی طرز حکومت کی جگہ لے لی ہے اور ان ملک میں بھی، جہاں یہ رائج نہیں، وہاں بھی بعض اہم فزق اس کے کوشاں ہیں کہ اس قسم کی آمریت قائم ہو جائے۔ اس میں اور ملک متحدہ امریکہ کی حکومت میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ امریکہ میں صدر جمہوریہ باوجود اپنے وسیع آمرانہ اختیارات کے دستوری پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے، لیکن آمر ایک بڑی حد تک خود اپنا دستور ساز ہے اور سولے بنادت کے حفرے کے کسی دوسری پابندی کو اپنے اوپر عائد تصور نہیں کرتا۔

Modern Constitution

تحریری اور رواجی و سائیر۔ اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ایک اور طرز تقسیم پر نظر ڈالنا مناسب ہو گا۔ حکومت کا دار و مدار سیاسی دستور پر ہوتا ہے اور پس منظر نہایت اہم ہے کہ آیا کسی ملک کا دستور تحریری ہے یا غیر تحریری۔ تحریری

(تقدیرت ۱۹۷۷ء)۔ اصل ملک متحدہ امریکہ سے، جہاں کا سب سے بڑا عہدہ دار صدر جمہوریہ کہلاتا ہے، لیکن یہ اصطلاحیں درست نہیں اس لئے کہ امریکی اپنی جماعت عالمہ کو انگریزوں کی طرح "کابینہ" کہتے ہیں اور انگریزی کا جینہ کابینہ تو آخر ایک صدر یعنی وزیراعظم ہوتا ہے۔

✓ دستور سے یہ مراد ہے کہ حکومت کے متعلق جتنی باتیں اہم ہیں وہ سب کی سب ایک دستاویز میں مندرج ہوتی ہیں اور اس دستاویز کو بدلنا عام طور سے معمولی قوانین سے زیادہ وقت طلب ہوتا ہے۔ تحریری دستور کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہر شخص نہایت آسانی سے یہ معلوم کر سکتا ہے کہ آیا فلاں معاملہ ہر دستور کے مطابق عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ ایسے دستور کی تین مثالیں جاپان اور مملکت متحدہ امریکہ کے دستاویز ہیں جو علی الترتیب ۱۸۹۰ء اور ۱۷۸۹ء میں مرتب ہوئے، اور بعض ضروری ترمیموں کے ساتھ آج بھی ان کی تقریباً وہی کیفیت ہے جو اس وقت تھی۔ اس کے برخلاف ایسے ممالک بھی ہیں جہاں کا دستور تحریری نہیں ہے بلکہ جو طرز حکومت رائج ہے، اس کے اجزاء بعض تو معمولی قوانین پر مبنی ہیں اور بعض محض رسم و رواج پر۔ اگرچہ دستور کی سب سے ممتاز مثال سلطنت متحدہ برطانیہ کا دستور ہے۔ جہاں کے قوانین میں کوئی ایسی دستاویز نہیں ملے گی جیسے حقیقی معنی میں "دستور" کا لقب دیا جائے اور جو مختلف اعضاء حکومت کے باہمی تعلقات کا تعین کرے۔ نیز انگلستان جیسے ملک میں دستور اور قانون دونوں کی حیثیت اس درجہ مساوی ہے کہ بڑے سے بڑا دستوری و سیاسی اصول بھی بالکل اسی طرح سے تبدیل ہو سکتا ہے جیسے کوئی معمولی سے معمولی موٹی قالین۔

۱۷۸۹ء سلطنت متحدہ برطانیہ کے قانون سازوں میں ایک خاص ضابطہ کے تحت منظور ہوا ہے، اس کے بعد بھی دستخطوں کے لئے بادشاہ کے پاس بھی جانتا ہے، اور جس وقت اس کے پاس جانتا ہے فوراً وہ اس پر دستخط کر دیتا ہے۔ سوادہ سو برس سے (ایک صدی ۲۵۱ پر)

لیکن دوسری اور کبھی ہوئی تقسیموں کی طرح یہ تقسیم بھی ناقص ہے اس لئے کہ ایک طرف تو ایسے ممالک میں جہاں کا دستور تحریری ہے امتداد زمانہ سے رسم و رواج کا اثر ذایل ہوتا جا رہا ہے اور دستور غیر شعوری طور پر بغیر ارادی تبدیلی کے بدل رہا ہے اور دوسری جانب انگلستان جیسے رواجی دستور والے ملک میں ایسی دستانہ و نزات موجود ہیں جن پر مبنی دستور کا دار و مدار ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ بغیر ارادی تبدیلی کے جاپان کی ”غیر ذمہ دار کا مینہ“ ”ذمہ دار ہوئی گئی اور اب روز بروز ہم گری کی طرح کار اختیار کرتی جاتی ہے اور امریکہ میں سنہ ۱۸۵۷ء والی پندھوں و دستور کی زمیم کی دوسرے دن کے سیاہ نام شہر یوں کو حقوق شہریت حاصل ہیں لیکن اس قسم کے طریقے رائج کئے گئے ہیں جس کی وجہ ایک بڑے حصہ ملک میں وہ ان

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۵۲) کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی مسودہ دونوں ایوانوں سے منظور ہو کر بادشاہ کے پاس گیا ہو اور اس نے اس پر دستخط نہ کئے ہوں، چنانچہ اب یہ ایسا رواج ہے جس کے خلاف کرنا خلاف دستور سمجھا جائے گا۔ ممبروں کی دستور اور قانون میں اس درجہ مماثلت ہے کہ بڑے سے بڑا سیاسی اصول بھی اس طرح سے تبدیل ہو گا، چنانچہ اسی مسئلہ کو پیش نظر رکھ کر جو بحث کہتا ہے کہ ”اگر ملکہ (و کٹر یا) کے پھانسی کے حکم کو دونوں ایوان با اتفاق منسوخ کر لیں اور اس سے دستخطوں کے لئے خود اس ملکہ کے پاس یہجا جائے تو بھی (و جو قائم شدہ رواج کے) انھیں اس پر دستخط کرنے پڑیں گے۔ دیکھیٹ دستور مصلحت انگلیشیہ مطبعہ عد جاؤنڈ غنائیم“ باب ۳۔

نکال اس جہان کے لئے دیکھو رائل ”معاملات خارجہ“ Foreign Affairs for England جو ۱۹۱۷ء

حقوق سے محروم ہو گئے ہیں۔ گو انگلستان کا دستور محض رواجی ہے لیکن ایسے
 دستاویزات کے اصول جیسے دستاویز حقوق ۱۶۸۹ء اور "قانون بندوبست"
 ۱۷۰۱ء آرمانی سے تبدیلی نہیں ہو سکتے۔
 انفرض دستاویز دنیا کی جو بھی تقسیم کی جائے گی وہ ایک حد تک ناقص رہے
 گی اس لئے کہ انسانی ذہنیت محض حسابی مساواتوں کے مثال نہیں بلکہ ذہنی جدت
 تزییم، تنقیح، یہ اس کے ایسے خواص ہیں جس سے گریز نامکن ہے۔

۱۷۵۵ء اس قسم کے مکتوبوں کے لئے دیکھو پرائس "دوست عامہ امریکہ"
American Commonwealth جلد ۲، صفحہ ۱۵، باب ۴۵۔
 ۱۷۷۶ء دستور انگلستان کے خصوصیات کے لئے دیکھو چمبر "تاریخ دستور انگلستان" ترجمہ اردو مطبوعہ
 جامعہ عثمانیہ باب ۲۔

باب ۱۴ مفرد اور مرکب ملکیتیں

فردیہ - عہدیت - وفاقیہ - مرکزی و اجزائی اختیارات - ہندوستانی صورت حال -
فردیہ - ظاہر ہے کہ سب سے فطری اور سب سے سادہ شکل ملکیت کی
وہ ہوگی جب اس کے جملہ ادارات اور جملہ شعبہ جات ایک ہی مرکز کے تحت ہوں گے
اور وہ مرکز جب چاہے جس شعبہ سے چاہے اس کے اختیارات سلب کر سکے گا
یا ان کے درمیان تنظیم ناطق کر سکے گا۔ یہ صورت حال اس وقت ممکن ہوتی ہے
جب ملک واسطے کم و بیش ہم خیال ہوتے ہیں اور ان میں سیاسی اعتبار سے
زیادہ تنوع نہیں پایا جاتا، یا جب مرکز دوسرے قطعات کو باہم پر کر لیتا ہے
کلیتہً کم و بیش سمجھنا چاہئے کہ جب ملک مختصر ہوگی اور جب مختلف اجزاء اور مرکز
حکومت کے ماتحت ہوں گے اس وقت یہ شکل پیدا ہوگی۔ ایسی ملکیت کو "فردیہ"
کہتے ہیں۔ فردیہ وہ ملکیت ہے جس میں مختلف اجزاء کے اختیارات کا انحصار کلیتہً
مرکز ہی کا ہوتی ہو۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ایسی ملکیت میں ہر جزو کل کی دیکھ
بہال اور نگرانی مرکزی حکومت ہی کرتی ہوگی؛ آج کل کی پیچ در پیچ زندگی میں یہ
ناممکن ہے کہ کوئی حکومت خواہ اس کا رقبہ کتنا ہی مختصر ہو، ہر حصے کے ہر معاملہ کا

خود ہی تصفیہ کیا کرے، اور جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے حکومت کا کاروبار روز افزوں ترقی پر ہے، جس کی وجہ سے بہت سے امور کی بابت مرکز کو کنارہ کشی اختیار کرنا پڑتی ہے اور انہیں چند مقامی ادارات کے سپرد کرنا پڑتا ہے۔ اگر مرکزی حکومت شہر شہر، گاؤں گاؤں کے کنوئیں اور روشنی کا انتظام کرتی پھرے یا اپنے زیر اثر لاکھوں میل میل کا جو رقبہ ہے اس کے بہرہ چے کی ابتدائی تعلیم کی براہ راست نگرانی کرتی پھرے تو ایسی حالت میں اسے اہم تر امور کی کارفرمانی ناممکن ہو جائے گی اور اس کا پورا وقت اسی قسم کے جزوی امور میں صرف ہو جائے گا؛ یہی وجہ ہے کہ مقامی تعلیم کی نگرانی، بعض مرتبہ ضلع داری مجالس، روشنی کا انتظام، بلدیوں اور پٹرکوں کی نگہداشت مقامی مجالس کے سپرد اسی طرح کر دی جاتی ہے جیسے ریلوں میں سفریوں کے آرام و سائش کی ذمہ داری ریلوں کے ادارات کے سپرد کی جاتی ہے، یا پڑے پڑے کپنیوں کے اندرونی انتظامات کی نگرانی جلسوں کے صدر شین یا مندر کے سر پڑتی ہے۔ یہ سب اختیارات گویا مفوضہ ہوتے ہیں جو خواہ صراحتاً یا ضمنیاً تحت ادارات کے سپرد کر دئے جاتے ہیں اور مرکز جب جاسے انہیں منتقل کر سکتا یا سلب کر سکتا ہے۔ فردی مملکت کا یہی انیاز ہے اور اس میں وہ مرکب مملکتوں سے ممتاز نظر آتی ہے۔

فردی مملکت کی بہترین مثالیں انگلستان، فرانس، جاپان، ایران، افغانستان اور ادب ہٹلر کی اصلاحات کے بعد جرمنی ہیں جہاں کے مقامی ادارات کلینک مرکزی حکومت کے تابع ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ انگلستان کے مقامی ادارات، یعنی بلدیوں اور صوبوں کی مجالس، کو بہت وسیع اختیارات حاصل ہیں، لیکن یہ سب اختیارات راست۔

مرکزی حکومت کے رہن منت ہیں اور ان میں ترمیم یا ان کی تفسیح مرکزی حکومت ہی کے قوانین کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ گو یا فردی مملکتوں میں مقامی ادارات کے کمپوشن ذمی اختیار ہونے سے مملکت کی فردیت میں فرق پیدا نہیں ہوتا اور کوئی مملکت اس وقت تک فردی نہیں ہے جب تک یہ مقامی ادارات مرکز کے تابع رہیں۔

لیکن جیسا بیان کیا جا چکا ہے، مملکت کی سب سے سادہ شکل یعنی فردیہ کا قیام صرف اسی وقت ممکن ہے جب ہر حصہ ملک مرکز کا کلیتہً تابع ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گو مختلف اقطاع ملک ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد علی کے خواہاں ہوں لیکن اپنے آپ کو ایک دوسرے میں کلیتہً جذب کرنا نہ چاہتے ہوں۔ اتحاد علی کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں جن میں سے سب سے نمایاں وہ اتحاد ہے جو دو مملکتوں کے درمیان محض موقوف ہوتا ہے۔ اس قسم کے اتحاد کی بہترین مثال وہ علاقے ہیں جو جنگ کے زمانے میں دو یا دو سے زیادہ مملکتیں ایک دوسرے کے ساتھ کسی دشمن کے ڈر سے کر لیا کرتی ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ اتحاد یا محالفہ محض جنگ کے زمانے میں ہی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ایک انسان دوسرے کے ساتھ تعلقات پیدا کئے بغیر اس دنیا میں نہیں رہ سکتا بالکل اسی طرح یہ لازمی اور لاٹھ ہے کہ بغیر دوسری مملکتوں کے ساتھ تعلقات قائم کئے ہوئے کوئی مملکت رہ سکے۔ ظاہر ہے کہ مملکت کی سرحد ضرور ہوگی، اور اگر وہ محض کسی جبر پورے پر مشتمل نہیں ہے تو اس سرحد کے دوسری طرف ضرور دوسری ریاستیں ہوں گی جن کے ساتھ اس مملکت کا چلی دہن کا ساتھ ہوگا، اور اگر یہ دوسری مملکت مفرد و

ایک جزیرہ پر ہی مشتمل ہے تاہم اس کے باشندوں کو کم از کم بعض ضروریات زندگی کے لئے سمندر پار جانا اور وہاں کے باشندوں سے کسی نہ کسی قسم کے تعلقات قائم کرنا پڑیں گے۔ یہاں اس باب میں ہم ان تعلقات پر بحث نہیں کریں گے جو کوئی ملکیت مساویانہ حیثیت سے دوسری کسی ملکیت کے ساتھ قائم کرے؛ یہاں محض ان کیفیات کا ذکر کیا جائے گا جن کے تحت سیاسی ضروریات کے مد نظر کوئی ملکیت اپنے ہمایہ ملکیت کے ساتھ ساتھ اپنے چند اختیارات سے خواہ مجبوراً اور نہ اپنی رضامندی سے دست بردار ہوتی ہے، اور یہ ملکیتیں کسی نہ کسی قسم کے مستقلانہ متحرک عمل پر رضامند ہو جاتی ہیں۔

لکھنؤ ہدایت - پچھلے باب میں اس صورت حال کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اگر باہمی اتفاقی اتحاد محض موقتی نہیں ہے (جیسے کسی دوسری بڑی ملکیت کے ٹڈ سے یا کسی مشترک دشمن سے جنگ کی بنا پر) تو اس اتحاد کے کئی مارج ہو سکتے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ مختلف سیاسی جماعتیں بالکل آزاد ہیں اور اگر کوئی مشترکہ مرکزی ادارہ ہو بھی تاہم اس کا اثر ان جماعتوں پر بہت ہی کم ہو یعنی گویا خارجی معاملات میں ایک بڑی حد تک یہ مرکز ان کے قائم مقام کے خدایات انجام دے لیکن تقریباً ہر اندرونی معاملے میں اس کا کوئی اختیار نہ ہو، یا اگر ہو تو اس میں اتنی قوت نہ ہو کہ اس اختیار کو کام میں لاسکے۔ حال کے زمانے میں اس قسم کے مجبوروں کی جیسے اصطلاح میں عہدیت کہتے ہیں؛ بلین مثال اس عہدیت کی ہے جو شانہ میں جرتی میں قائم ہوئی یا جو سوستان میں شانہ سے شانہ تک رہی۔ شانہ میں سب سے بڑا مسئلہ جو جرتی مدبروں کے سامنے یہ تھا کہ مختلف جرتی ملکوں میں

ہم آہستگی کیسے پیدا کی جائے۔ ان جرمن ملکیتوں میں آسٹریا اور پروشیا بھی تھے جو کسی طرح ایک دوسرے کی سیاست تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے، چنانچہ جو مرکزی ادارات قائم کئے گئے انھیں شکل سے کوئی اختیار مختلف ملکیتوں پر مال تھا، اور چونکہ بڑی بڑی جرمن ریاستوں میں ایک دوسرے کے ساتھ کسی قسم کے رواداری کا پتہ نہ تھا اس لئے یہ ایسا مجموعہ بنایا گیا جس میں صد ہی سرے سے منقود تھا۔ یہ اندرونی نزاعات ہی تھے جن کا مظاہرہ آخر کار دو سب سے بڑی جرمنی سلطنتوں، یعنی پروشیا اور آسٹریا والی جنگ میں میدان سادو واپس ہوا جس کے بعد آسٹریا جرمنی سے نکال دیا گیا اور اس کے چار سال بعد پروشیا کی سرکردگی میں جرمن وفاقہ بننے میں قائم ہو گیا۔ سوئٹزرلینڈ کی کیفیت بھی کچھ اسی قسم کی تھی سوائے اس کے کہ وہاں کسی طرح کی واحد وفاقہ ملکیت کے قیام کے راستے میں یہ رکاوٹ حال تھی کہ جتنے بھی اجزاء تھے وہ سب کے سب بالکل آزاد اور مساوی حیثیت تھے، اور مرکزی ادارات صرف شدید ضرورت کے وقت طلب کئے جاتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عہدیت ملکیتوں کے اس مجموعے کو کہتے ہیں جسے خواہ

۱۔ عہدیت جرمنی کے دستور کے لئے دیکھو لہین لیس، "یورپ عالیہ" ۱۸۹۹ء، ترجمہ اردو
۲۔ جامعہ عثمانیہ، باب ۳۔

۳۔ سوئٹزرلینڈ کی عہدیت کے دستور کے لئے دیکھو وینسٹ، "حکومت سوئٹزرلینڈ"؛ Vincent:
Government in Switzerland. لندن ۱۹۱۶ء، باب ۱۔

مرتبی طور پر خواہ مستقل طور پر یہ ملکیتیں آپس میں اتحاد کر کے چند مرکزی ادارات قائم کر لیں، لیکن باوجود ان ادارات کے قیام کے اندرونی اور بیرونی آزادی برقرار رہے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ ملکیتیں برابر ایک دوسرے سے مسلسل متحد و متفق رہیں گی تو ان میں یکجہتی و ہم آہنگی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، اور ایک زمانہ ایسا آتا ہے جب باہمی اعتبار و اعتماد کی وجہ سے وہ اپنے گزور مرکزی ادارات کو قوی بنا دیتی ہیں اور اپنے حیدرہ حیدر اختیار مرکز کے سپرد کر دیتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تیرہ امریکی نوآبادیوں کی وٹیلی ڈھائی عہدیت جو صرف انگریزوں سے لڑنے کے واسطے قائم ہوئی تھی وہ ۱۹۱۷ء میں ایک مستقل ملکیت بن گئی اور ہر ایک ریاست نے اپنے چند اختیارات، جدید مرکزی ادارات، کے سپرد کر دیئے۔

وفاقہ۔ اس عہدیت سے گذر کر (جو دراصل چند ملکیتوں کے ایک طرح سے اتحاد کا نام ہے) ہم وفاقہ کے طرف آتے ہیں جو آج کل کے زمانے میں ایک نہایت ہی اہم قسم ملکیت کی ہے وفاقہ میں عہدیت کے عکس مختلف رقبے اپنے بعض اختیارات مستقل ایک مرکزی ادارے کے سپرد کر دیتے ہیں اور بعض امور میں بالکل آزاد رہتے ہیں۔ وفاقہ کا اصول کسی اقامت خانے کی تنظیم سے سمجھ میں آئے گا۔ فرض کیجئے چنڑا لیب عالم کسی اقامت خانے میں رہتے ہیں، اور اقامت خانے میں جو قواعد جاری ہیں انہیں کی پیروی کرنی پڑتی ہے اب یہ ظاہر ہے کہ علاوہ ٹرسٹس، کھیت، کھیلنے، کودنے کے اور بہت سے مظاہر اتہ زندگی ایسے ہوتے ہیں جن میں اقامت خانے کا مودب مطلق دخل نہیں دیتا، مثلاً دن کے وقت باہر جانا، کھانا پینا، آرام کرنا، دوستوں سے بات کرنا، ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ بعض امور ایسے

ہوتے ہیں جن میں طالب علم کو مرکزی قواعد کی پابندی کرنی پڑتی ہے وفاقہ میں بھی
 بس یہی سمجھئے، بعض امور ایسے ہیں جو دستور کے ذریعے سے کلکتہ مرکزی حکومت
 کے متعلق کر دئے جاتے ہیں، جن میں سب سے اہم خارجی معاملات اور مکہ سازی
 ہوتے ہیں، اور بہت سے امور ایسے ہیں جن میں مرکزی ادارات مطلق کسی قسم کا
 دخل نہیں دے سکتے۔ گویا جملہ اختیارات دو قسم کے اداروں، یعنی مرکزی ادارات اور
 اجرائی یا ریاستی ادارات میں منقسم ہوتے ہیں، اور یہ دونوں ادارات ایک دوسرے
 سے کم و بیش آزاد اور ایک مشترک دستور کے تابع ہوتے ہیں۔ وفاقہ اور دوسری
 قسم کے ملکیتوں میں جو چیز اختیار ہے وہ یہی ہے کہ وفاقہ میں اجزاء ملکیت بعض
 امور میں آزاد اور بعض میں پابند ہوتے ہیں، فو یہ میں اجزاء کلکتہ مرکزی ادارات کے پابند
 ہوتے ہیں اور عہدیت کے اجزاء کلکتہ آزاد ہوتے اور محض اپنی مصیحتوں کی بنا پر بعض
 امور میں اتحاد عمل کر لیتے ہیں۔ عہدیت اور وفاقہ میں ایک دوسرا فرق یہ ہے کہ چونکہ
 وفاقہ ایک مستقل چیز ہے اس لئے اس کے اجزاء میں مانے طرز پر وفاقہیت سے علیحدہ
 نہیں ہو سکتے، درآٹھا لیکہ عہدیت میں انھیں اس کی آزادی ہوتی ہے، چنانچہ جب کبھی
 یہ دیکھا جائے کہ اجزاء اسے علیحدہ ہونا چاہا اور ملکیت نے انھیں علیحدہ نہ ہونے دیا تو
 کچھ لینا چاہتے کہ ملکیت عہدیت نہیں بلکہ فرد پر مبنی ہے۔ اس کی مثالیں سوستان
 کے جنگ ”عہدیت مفصلہ“ (۱۸۴۱ء) اور امریکہ کی خانہ جنگی (۱۸۶۱ء) سے ملتی ہیں
 جب ملکیت کے چند اجزاء نے سوستان اور مالک متحدہ امریکہ سے جدا ہونا چاہا لیکن
 انھیں جدا نہیں ہونے دیا گیا۔ ۱۸۶۱ء سے پہلے سوستان اور ۱۸۶۱ء سے پہلے
 مالک متحدہ امریکہ کی حیثیت عہدیت کی ہی تھی، لیکن ان تاریخوں کے بعد وہ یقیناً وفاقہ بن گئی۔

اگر کسی ملک کے مختلف قطعات کے مابین مکمل ہم آہنگی ہو تو پھر وہاں فرویدہ قائم ہوتا ہے نہ کہ وفاقیہ؛ وفاقیہ صرف اس وقت قائم ہوتا ہے جب مختلف حصص ملک میں ایک حد تک باہمی مناسرت ہو اور ساتھ ہی مستقل تعال کی خواہش بھی موجود ہو۔ اس قسم کی مناسرت نسی ہو سکتی ہے پالسانی یا مذہبی یا جغرافی یا محض تاریخی، یعنی اگر کسی ملک کے باشندے ہم نسل نہیں، یا ان کی زبان ایک نہیں، یا ان کا مذہب ایک نہیں، یا جغرافی اعتبار سے ملک بہت وسیع ہو، یا پڑانے زمانے میں وہ ایک دوسرے سے علیحدہ رہے ہیں، لیکن باوجود اس تنوع کے ان میں خواہش تعال موجود ہے، تو پھر ایسی حالت میں اس ملک میں وفاقیہ قائم ہو گا نہ کہ فرویدہ۔ بلاشبہ خواہش تعال مملکت کے تمام کی سب سے زبردست بنیاد ہے، لیکن یہ مختلف رقبوں اور ملتوں کے مکمل امتزاج کے لئے کافی نہیں، اور گواس کی وجہ سے مملکت قائم ہو جائے گی لیکن ایسی مملکت جس کے اجزاء ایک دوسرے سے یا مرکز سے بہت کچھ آزاد رہیں گے۔ مثال کے طور پر چند وفاقی مملکتوں کو لیجئے۔ وفاقیوں میں شاید سب سے اہم مملکت ممالک متحدہ امریکہ کی ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں جب تیرہ انگریزی لڑا بادلوں نے انگریزوں سے جنگ چھیڑی تو اس وقت شاید ان کا مقصد یہ نہ تھا کہ وہ مل کر ایک مملکت قائم کریں گی بلکہ وہ صرف ایک موثری اتحاد کی خواہش تھیں، تاکہ وہ انگلستان کے جیسی زبردست قوت سے مطابقتیں۔ جنگ کے دوران میں انھوں نے اتحاد و اتفاق کے برکات کو محسوس کیا، لیکن اول تو وہ ایک دوسرے سے دور افتادہ تھیں اور دوسرے اس

اتحاد سے پہلے ان کی طرز حکومت میں بھی فرق تھا اس لئے کہ بعض کے گورنروں کو خود بادشاہ نامزد کرتا تھا اور بعض جاگیرداروں کے قبضہ و اقتدار میں تھیں، چنانچہ جنگ ختم ہونے پر جو عہدیت قائم ہوئی اس میں نہ صدر تھا نہ عدالت تھی، اور چند ہی روز میں یہ اپنی کمزوری اور بے عملی کی وجہ سے مشہور ہو گئی تھی لیکن رفتہ رفتہ اتحاد عمل کی ضرورت روز بروز زیادہ محسوس ہونے لگی، اور آخر کار ہر مارچ ۱۸۹۷ء کو وفاقیہ امریکہ کے جدید دستور کا نفاذ ہو گیا۔

اب سوئٹان کو لیجئے۔ یہاں بعض کنیٹوں میں تیرہویں صدی عیسوی ہی ہیں ایک طرح کا اتحاد پیدا ہو گیا تھا اور ۱۶۴۴ء میں اس ملک کی اجتماعی طور پر آزادی تسلیم کر لی گئی تھی، نیپولیونی دور میں پہلے تو اسے مکمل مرکزیت حاصل ہو گئی اور اس کے بعد ۱۸۱۵ء میں نیپولین کے حکم سے مختلف اجزاء کو سیاسی اختیارات مل گئے، اور یہ عہدیت اس وقت تک وفاقیہ میں تبدیل نہیں ہوئی جب تک ۱۸۴۷ء میں مرکزی فوجوں نے مرکز گریز قوتوں کو میدان جنگ میں بچا نہیں دکھا دیا۔

الغرض وفاقیہ کے قیام کی وجہ وجود ایک تو مختلف اجزاء کی جماعتیں تھیں جو دوسرے مختلف اجزاء کے باہم ایک حد تک مغایرت ہے، ورنہ اس کے بغیر یہ مملکت فروہ بن جائے گی۔ جیسا اور بیان کیا گیا ہے یہ مغایرت کئی طرح کی ہوتی ہے اور مختلف اجزاء مملکت نہ ہستی، لسانی، جغرافی، معاشی، پچھلے تاریخی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ کسی ملک میں

۱۸۹۷ء دیکھو ویڈروون، "ملکت"، Woodrow Wilson: The State، باب ۱۔

ان میں سے کوئی ایک یا متعدد اختلافات پائے جاتے ہوں لیکن زبان کے باشندے انہیں اہم نہ سمجھیں اور باہمی اعتماد کے وجہ سے ان میں ایک فرد یہ قائم کر لے پرستار لے ہوں۔ اسپین میں علاوہ ہسپانوی زبان کے اندلسی اور باسک زبانیں بولی جاتی ہیں۔ فرانس میں ہر بریطانی، نارمن، اور پروانسال اپنی اپنی زبانیں بولتا ہے، تاہم کم از کم اس وقت تو اسپین اور فرانس کا فردوں میں شمار ہے۔ اس کے برعکس سویٹزرلینڈ جیسا چھوٹا سا ملک اس لئے وفاقیہ ہے کہ اس میں چار زبانیں ہیں (فرانسیسی، جرمنی، اطالوی، رومانش) تین مذاہب (رومن کیتھولک، کال دینی، یہودی) ہی نہیں بلکہ کیرکٹن کے تاریخی روایات ایک دوسرے سے بالکل جدا گانہ ہیں۔

اس اسپین کے زمانہ حال کی تاریخ سے وہ دلچسپ کیفیت ظاہر ہوتی ہے کہ کس طرح ایک فرد کے غیر ملکی اجزاء ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ۱۹۳۱ء کے انقلاب کے بعد جو دستور نافذ ہوا اس میں یہ شرط مروج تھی کہ اگر اسپین کا کوئی صوبہ جسے تاریخی یا لسانی یکسانی حاصل ہو، درخواست کرے تو اسے چند خاص شرطیں پورا کرنے کے بعد سواراج کے اختیارات حاصل ہو جائیں گے، لیکن اس اغراضی سواراج کے بعد بھی حسب ذیل امور مرکزی حکومت ہی کو حاصل رہیں گے، توپن، پمیری، کلیسیائی معاملات، خارجی معاملات، قومی قرضہ، عدالت، عالیہ کا عدالتی اختیار، مرکز کے مالی قوانین، مرکز کے زیر نگرانی ریل و ریل گاڑی، مثلاً ڈاک، تار وغیرہ۔ اسی کے ساتھ یہ بھی طے کر دیا گیا کہ کوئی سواراجی صوبہ چاہتا تو اپنے سواراجی حقوق سے دست بردار بھی ہو سکتا ہے۔ دیکھو سالانہ ممبرین

Stateman's Year Book ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۳۸۹ - ۱۳۹۰ء سے جو

خانہ جنگی ہو رہی ہے اس میں تو یہ دستور کا دستور مجسم ہو گیا ہے۔

اسی طرح سانی ونسلی مغائرت کی وجہ سے کناڈا، جزائی مغائرت کی وجہ سے آسٹریلیا اور تارنجی، جزائی ونسلی مغائرت کی وجہ سے مالک متحدہ امریکہ فرسے نہیں بلکہ وفاقیہ ہیں۔

مرکزی و اجزائی اختیارات۔ وفاقیوں میں مرکزی اور اجزائی اختیارات کی تقسیم دو طرح سے ہو سکتی ہے، ایک تو اس طرح کہ مرکزی اختیارات شمار کر لئے جائیں اور بقیہ اختیارات اجزائے ساتھ وابستہ رہیں، اور دوسرے اس طرح کہ اجزائی

۱۷ صوبہ داری مغائرت کے اثرات ہندوستان کے طرز انتظام پر اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہے ہیں مثلاً،
۱۸ "سے پہلے در اس، بجٹی، بینکال ایک دوسرے سے علیحدہ تھے؛
۱۹ "میں صرف صلح و جنگ کا اختیار ان سے لے کر گورنر جنرل کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا، باقی
اور میں وہ حسب سابق آزاد رہے؛

۲۰ "میں گورنر جنرل کو ہر صوبہ کی "ملکی و قومی حکومت اور مالیات کی کل نمائندگی کا اختیار ملے دیا گیا؛
نیز قانون سازی کے اختیارات کلیتہً مرکز سے وابستہ ہو گئے؛
۲۱ "میں معمول کو مالیاتی اختیارات دے گئے؛

۲۲ "میں در اس اور بجٹی کو قانون سازی کے اختیارات مل گئے؛
۲۳ "میں در اس پر ہر مقامی حکومت گورنر جنرل باجلاس مجلس انتظامی کے احکام کی تعمیل کرے گی؛
۲۴ "میں مرکز اور صوبوں میں تقسیم کارہ مرکز کے صوبہ داری انتظام میں ملے دینے کے محدود اختیارات؛
۲۵ "میں قانون حکومت ہند کی رو سے تمام ہندوستان کے وفاقیہ کے تمام کی تحریک "مرکزی اختیار" "صوبہ داری اختیارات" اور "متوازی اختیارات" کی تقسیم۔

اختیارات شمار کر ائے جائیں اور بقیہ اختیارات مرکز کے ساتھ وابستہ رہیں، چونکہ حکومتی اختیارات لائحہ دہوتے ہیں اور شمار صرف چند ہی اختیارات کئے جاسکتے ہیں اس لئے وفاقیہ کا وہی جزو قوی ہوتا ہے جسے یہ بقیہ اختیارات حاصل ہوں یہی وجہ ہے کہ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء سے پہلے ہندوستان میں جو سیاسی اور دستوری کشمکش رہی اس کے ابتدائی زمانے میں ایک فریق ایسا تھا جو صوبہ داری کیفیات کے تنوع کی وجہ سے صوبوں کی حکومتوں کو قوی دیکھنا چاہتا تھا اور کہتا تھا کہ آئندہ وفاقیہ ہند کے مرکزی اختیارات شمار کئے جائیں اور بقیہ اختیارات (یعنی اختیارات کا زیادہ تر حصہ) صوبوں سے وابستہ کئے جائیں، اور دوسرا گروہ ایسا تھا کہ ہندوستان میں مرکز گریز قوتوں کے استیصال کے مقصد کو مد نظر رکھ کر صوبوں کے اختیارات کو شمار کرنا اور بقیہ زیادہ تر اختیارات مرکزی ادارات کر دینا پسند کرتا تھا۔ ان تنازعات میں اُس وقت تک کیسوی نہیں ہوئی جب تک پہلی گول میز کانفرنس ۱۹۴۶ء میں ہندوستانی والیان ریاست کی طرف سے ہمارا جہ بیکانیر نے صاف صاف یہ نہ کہہ دیا کہ ہم والیان ریاست آئندہ وفاقیہ ہند میں شریک ہونے کے لئے تیار ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ مرکزی ادارات کو صرف چیدہ چیدہ اختیارات دئے جائیں اور بقیہ جملہ اختیارات صوبوں اور ریاستوں کو حاصل ہوں۔

۱۔ قانون ہند ۱۹۳۵ء (تتمہ نمبر) کی رو سے اختیارات کی سہ گونہ تقسیم کی گئی ہے :-

- (۱) وہ اختیارات جو کلکتہ مرکز کو حاصل ہیں (۲) وہ اختیارات جو کلکتہ صوبوں کو حاصل ہیں
- (۳) وہ اختیارات جو دولوں ادارات کو متوازی حاصل ہیں۔

مثال کی طور پر چند خاص خاص وفاقیوں کو لیجئے اور ان میں مرکز اور اجزاء کے اختیارات کے مابین جو تقسیم کار ہے اس پر غور کیجئے۔ ممالک متحدہ امریکہ میں چند مخصوص اختیارات مرکزی ادارت کو حاصل ہیں اور بقیہ جملہ اختیارات ریاستوں کے ساتھ وابستہ کر دئے گئے ہیں۔ مرکزی اختیارات میں حسب ذیل شامل ہیں:-

محاصل درآمد و برآمد اور چٹائی کا محصول عائد کرنا؛ روپیہ قرض لینا؛ غیر اقوام، مختلف ریاستوں اور اندیا کی قبائل کے ساتھ تجارت کرنا؛ توپن اور دیوالیہ کے لئے کیسے قوانین عائد کرنا؛ سکے، پیانے اور اوزان مقرر کرنا؛ ڈاک کا انتظام، حقوق طباعت و ایجابات کا تعین؛ عدالت العالمیہ کے ماتحت عدالتوں کا قیام، قانون اقوام کے خلاف ورزی پر سزا دینا؛ جنگ جاری کرنا؛ فوج مہیا کرنا؛ بیڑا؛ مستقر وفاقہ کا انتظام؛ ساتھ ہی اس مقصد کے لئے کہ مرکز یا ریاستیں ایک دوسرے کے حدود اختیار پر حملہ نہ کریں اور ایک دوسرے کے اختیارات کو دبا نہ بیٹھیں، وفاقی عدالت العالمیہ کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ اگر ان کے سامنے کوئی مقدمہ ایسا آئے کہ ان میں سے کوئی اختیار زیر بحث ہو تو اس حالت میں ان کا حکم ناطق سمجھا جائے گا اور آئندہ کے لئے ایسے مقدمات کے لئے نمونہ بن جائے گا۔

سوویتان میں ایسی ہی احوال پڑیں کیا گیا ہے کہ جو اختیارات مرکز کو حاصل نہیں وہ سب کے سب اجزائی کمیٹیوں کو حاصل ہیں۔ جیسا اس سے پہلے بیان کیا گیا ہے موجودہ وفاقہ کے احکام سے پہلے سوویتان کی کیفیت ایک عہد سیت کی تھی یعنی خیال یہ تھا

کہ مختلف کنٹینٹین صرف ہمسایوں کے حلوں کے بچاؤ کی وجہ سے باہم متفق ہیں اور جب
 چاہیں ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر سکتی ہیں، لیکن جب ۱۸۴۷ء میں ہنگری کی حکومت
 کنٹینٹینوں نے ایک ”عہدیت مفصلہ“ قائم کر کے علیحدگی کی کوشش کی تو مرکزی حکومت
 نے اس کے خلاف ایک سخت ہم سر کی اور بالآخر انہیں بچا دیکھا یا، چنانچہ ۱۸۴۷ء کے
 بعد کی تاریخ قطعی طور پر ایک وفاقیہ کی تاریخ سے ہے۔ لیکن موجودہ دستور میں بھی اسی
 عہدیتی اصول کے اثرات موجود ہیں، یہاں تک کہ گو سوئٹزرلینڈ ایک وفاقیہ ہے لیکن
 ۱۸۴۷ء کے دستور میں اسے جگہ جگہ ”عہدیت“ کے نام سے ملے گا کیا گیا ہے اور
 فی الجملہ اس اتحاد کے مقاصد یہ بتائے گئے ہیں کہ ”غیر اقوام کے حلوں سے ملک کو
 محفوظ رکھا جاسکے، اندرونی امن و امان قائم کیا جاسکے، اجزاء کی آزادی اور حقوق کی
 حفاظت کی جاسکے اور ان کے مشترک مفاد کا لحاظ کیا جاسکے“ نیز یہ صراحتاً بیان
 کر دیا گیا ہے کہ اقتدار اعلیٰ کی اس تحدید کے ساتھ ہر کنٹینٹین کو باقی ماندہ اقتدار حاصل ہے۔
 تاہم جب مختلف اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ مدت تک رہتے ہیں تو
 ان کی باہمی بے اعتباری کم ہوتی جاتی ہے، ان کا مفاد روز بروز مشترک ہوتا جاتا
 ہے اور وہ مرکز کے تقویت میں کچھ زیادہ حرج نہیں دیکھتے، بالوں کہیں کہ مرکز بروز
 قوت کوڑتا جاتا ہے اور وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ ۱۸۴۷ء کے بعد سے سوئٹزرلینڈ کی تاریخ

۵۵ دستور سوئٹزرلینڈ، باب ۱۰۶۔ اس دستور کے سلسلے دیکھو وینسٹ

Government in Switzerland.

۵۶ ایضاً دفعہ ۲۔

در اصل مرکز کے تقویت کی تاریخ ہے اور دستور میں بہت سی مثالیں ایسی ہیں گی جن سے یہ صاف ظاہر ہو تا ہے کہ مرکزی حکومت نے ان کمیشنوں کو کیسے اپنا دست نگر نالیا ہے ہم سوویتان کے دستور میں اس قدر صراحت و وضاحت کے ساتھ تقسیم کار کے وہ اصول نہیں پاتے جو امریکہ کے دستور میں ملتے ہیں بلکہ یہاں اصول کے ساتھ مستثنیات بھی ملتی ہیں، یعنی اگر کوئی شعبہ اصولاً مرکز کے تحت ہے تو اس میں بعض خاص شعبے اجزاء کے متعلق بھی ہیں۔ خارجی معاملات مرکز کے متعلق ہیں لیکن کمیشنوں کو جزوی معاملات، مثلاً سرحدی جھگڑوں، پولیس وغیرہ میں ہمسایہ غیر مسلموں سے مراسلات کرنے کا اختیار ہے، مستقل فوج تو سوویتان میں گویا ہے ہی نہیں، اس لئے مرکز کو ان کے زمانے میں یہاں مستقل فوج رکھنے کا اختیار نہیں ہے اور کمیشن کو صرف تین تین سو سپاہی رکھنے کا اختیار ہے۔ ۱۸۴۴ء سے ۱۸۹۶ء تک ۱۸۹۶ء سے ۱۹۰۷ء تک ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۸ء تک ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۹ء تک ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۹ء تک ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۹ء تک ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۹ء تک ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۹ء تک ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۹ء تک ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۹ء تک ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۹ء تک ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۹ء تک ۲۰۰۹ء سے ۲۰۱۹ء تک ۲۰۱۹ء سے ۲۰۲۹ء تک ۲۰۲۹ء سے ۲۰۳۹ء تک ۲۰۳۹ء سے ۲۰۴۹ء تک ۲۰۴۹ء سے ۲۰۵۹ء تک ۲۰۵۹ء سے ۲۰۶۹ء تک ۲۰۶۹ء سے ۲۰۷۹ء تک ۲۰۷۹ء سے ۲۰۸۹ء تک ۲۰۸۹ء سے ۲۰۹۹ء تک ۲۰۹۹ء سے ۲۱۰۹ء تک ۲۱۰۹ء سے ۲۱۱۹ء تک ۲۱۱۹ء سے ۲۱۲۹ء تک ۲۱۲۹ء سے ۲۱۳۹ء تک ۲۱۳۹ء سے ۲۱۴۹ء تک ۲۱۴۹ء سے ۲۱۵۹ء تک ۲۱۵۹ء سے ۲۱۶۹ء تک ۲۱۶۹ء سے ۲۱۷۹ء تک ۲۱۷۹ء سے ۲۱۸۹ء تک ۲۱۸۹ء سے ۲۱۹۹ء تک ۲۱۹۹ء سے ۲۲۰۹ء تک ۲۲۰۹ء سے ۲۲۱۹ء تک ۲۲۱۹ء سے ۲۲۲۹ء تک ۲۲۲۹ء سے ۲۲۳۹ء تک ۲۲۳۹ء سے ۲۲۴۹ء تک ۲۲۴۹ء سے ۲۲۵۹ء تک ۲۲۵۹ء سے ۲۲۶۹ء تک ۲۲۶۹ء سے ۲۲۷۹ء تک ۲۲۷۹ء سے ۲۲۸۹ء تک ۲۲۸۹ء سے ۲۲۹۹ء تک ۲۲۹۹ء سے ۲۳۰۹ء تک ۲۳۰۹ء سے ۲۳۱۹ء تک ۲۳۱۹ء سے ۲۳۲۹ء تک ۲۳۲۹ء سے ۲۳۳۹ء تک ۲۳۳۹ء سے ۲۳۴۹ء تک ۲۳۴۹ء سے ۲۳۵۹ء تک ۲۳۵۹ء سے ۲۳۶۹ء تک ۲۳۶۹ء سے ۲۳۷۹ء تک ۲۳۷۹ء سے ۲۳۸۹ء تک ۲۳۸۹ء سے ۲۳۹۹ء تک ۲۳۹۹ء سے ۲۴۰۹ء تک ۲۴۰۹ء سے ۲۴۱۹ء تک ۲۴۱۹ء سے ۲۴۲۹ء تک ۲۴۲۹ء سے ۲۴۳۹ء تک ۲۴۳۹ء سے ۲۴۴۹ء تک ۲۴۴۹ء سے ۲۴۵۹ء تک ۲۴۵۹ء سے ۲۴۶۹ء تک ۲۴۶۹ء سے ۲۴۷۹ء تک ۲۴۷۹ء سے ۲۴۸۹ء تک ۲۴۸۹ء سے ۲۴۹۹ء تک ۲۴۹۹ء سے ۲۵۰۹ء تک ۲۵۰۹ء سے ۲۵۱۹ء تک ۲۵۱۹ء سے ۲۵۲۹ء تک ۲۵۲۹ء سے ۲۵۳۹ء تک ۲۵۳۹ء سے ۲۵۴۹ء تک ۲۵۴۹ء سے ۲۵۵۹ء تک ۲۵۵۹ء سے ۲۵۶۹ء تک ۲۵۶۹ء سے ۲۵۷۹ء تک ۲۵۷۹ء سے ۲۵۸۹ء تک ۲۵۸۹ء سے ۲۵۹۹ء تک ۲۵۹۹ء سے ۲۶۰۹ء تک ۲۶۰۹ء سے ۲۶۱۹ء تک ۲۶۱۹ء سے ۲۶۲۹ء تک ۲۶۲۹ء سے ۲۶۳۹ء تک ۲۶۳۹ء سے ۲۶۴۹ء تک ۲۶۴۹ء سے ۲۶۵۹ء تک ۲۶۵۹ء سے ۲۶۶۹ء تک ۲۶۶۹ء سے ۲۶۷۹ء تک ۲۶۷۹ء سے ۲۶۸۹ء تک ۲۶۸۹ء سے ۲۶۹۹ء تک ۲۶۹۹ء سے ۲۷۰۹ء تک ۲۷۰۹ء سے ۲۷۱۹ء تک ۲۷۱۹ء سے ۲۷۲۹ء تک ۲۷۲۹ء سے ۲۷۳۹ء تک ۲۷۳۹ء سے ۲۷۴۹ء تک ۲۷۴۹ء سے ۲۷۵۹ء تک ۲۷۵۹ء سے ۲۷۶۹ء تک ۲۷۶۹ء سے ۲۷۷۹ء تک ۲۷۷۹ء سے ۲۷۸۹ء تک ۲۷۸۹ء سے ۲۷۹۹ء تک ۲۷۹۹ء سے ۲۸۰۹ء تک ۲۸۰۹ء سے ۲۸۱۹ء تک ۲۸۱۹ء سے ۲۸۲۹ء تک ۲۸۲۹ء سے ۲۸۳۹ء تک ۲۸۳۹ء سے ۲۸۴۹ء تک ۲۸۴۹ء سے ۲۸۵۹ء تک ۲۸۵۹ء سے ۲۸۶۹ء تک ۲۸۶۹ء سے ۲۸۷۹ء تک ۲۸۷۹ء سے ۲۸۸۹ء تک ۲۸۸۹ء سے ۲۸۹۹ء تک ۲۸۹۹ء سے ۲۹۰۹ء تک ۲۹۰۹ء سے ۲۹۱۹ء تک ۲۹۱۹ء سے ۲۹۲۹ء تک ۲۹۲۹ء سے ۲۹۳۹ء تک ۲۹۳۹ء سے ۲۹۴۹ء تک ۲۹۴۹ء سے ۲۹۵۹ء تک ۲۹۵۹ء سے ۲۹۶۹ء تک ۲۹۶۹ء سے ۲۹۷۹ء تک ۲۹۷۹ء سے ۲۹۸۹ء تک ۲۹۸۹ء سے ۲۹۹۹ء تک ۲۹۹۹ء سے ۳۰۰۹ء تک ۳۰۰۹ء سے ۳۰۱۹ء تک ۳۰۱۹ء سے ۳۰۲۹ء تک ۳۰۲۹ء سے ۳۰۳۹ء تک ۳۰۳۹ء سے ۳۰۴۹ء تک ۳۰۴۹ء سے ۳۰۵۹ء تک ۳۰۵۹ء سے ۳۰۶۹ء تک ۳۰۶۹ء سے ۳۰۷۹ء تک ۳۰۷۹ء سے ۳۰۸۹ء تک ۳۰۸۹ء سے ۳۰۹۹ء تک ۳۰۹۹ء سے ۳۱۰۹ء تک ۳۱۰۹ء سے ۳۱۱۹ء تک ۳۱۱۹ء سے ۳۱۲۹ء تک ۳۱۲۹ء سے ۳۱۳۹ء تک ۳۱۳۹ء سے ۳۱۴۹ء تک ۳۱۴۹ء سے ۳۱۵۹ء تک ۳۱۵۹ء سے ۳۱۶۹ء تک ۳۱۶۹ء سے ۳۱۷۹ء تک ۳۱۷۹ء سے ۳۱۸۹ء تک ۳۱۸۹ء سے ۳۱۹۹ء تک ۳۱۹۹ء سے ۳۲۰۹ء تک ۳۲۰۹ء سے ۳۲۱۹ء تک ۳۲۱۹ء سے ۳۲۲۹ء تک ۳۲۲۹ء سے ۳۲۳۹ء تک ۳۲۳۹ء سے ۳۲۴۹ء تک ۳۲۴۹ء سے ۳۲۵۹ء تک ۳۲۵۹ء سے ۳۲۶۹ء تک ۳۲۶۹ء سے ۳۲۷۹ء تک ۳۲۷۹ء سے ۳۲۸۹ء تک ۳۲۸۹ء سے ۳۲۹۹ء تک ۳۲۹۹ء سے ۳۳۰۹ء تک ۳۳۰۹ء سے ۳۳۱۹ء تک ۳۳۱۹ء سے ۳۳۲۹ء تک ۳۳۲۹ء سے ۳۳۳۹ء تک ۳۳۳۹ء سے ۳۳۴۹ء تک ۳۳۴۹ء سے ۳۳۵۹ء تک ۳۳۵۹ء سے ۳۳۶۹ء تک ۳۳۶۹ء سے ۳۳۷۹ء تک ۳۳۷۹ء سے ۳۳۸۹ء تک ۳۳۸۹ء سے ۳۳۹۹ء تک ۳۳۹۹ء سے ۳۴۰۹ء تک ۳۴۰۹ء سے ۳۴۱۹ء تک ۳۴۱۹ء سے ۳۴۲۹ء تک ۳۴۲۹ء سے ۳۴۳۹ء تک ۳۴۳۹ء سے ۳۴۴۹ء تک ۳۴۴۹ء سے ۳۴۵۹ء تک ۳۴۵۹ء سے ۳۴۶۹ء تک ۳۴۶۹ء سے ۳۴۷۹ء تک ۳۴۷۹ء سے ۳۴۸۹ء تک ۳۴۸۹ء سے ۳۴۹۹ء تک ۳۴۹۹ء سے ۳۵۰۹ء تک ۳۵۰۹ء سے ۳۵۱۹ء تک ۳۵۱۹ء سے ۳۵۲۹ء تک ۳۵۲۹ء سے ۳۵۳۹ء تک ۳۵۳۹ء سے ۳۵۴۹ء تک ۳۵۴۹ء سے ۳۵۵۹ء تک ۳۵۵۹ء سے ۳۵۶۹ء تک ۳۵۶۹ء سے ۳۵۷۹ء تک ۳۵۷۹ء سے ۳۵۸۹ء تک ۳۵۸۹ء سے ۳۵۹۹ء تک ۳۵۹۹ء سے ۳۶۰۹ء تک ۳۶۰۹ء سے ۳۶۱۹ء تک ۳۶۱۹ء سے ۳۶۲۹ء تک ۳۶۲۹ء سے ۳۶۳۹ء تک ۳۶

الغرض سوویت تان کے مرکز کو ملک متحدہ امریکہ کے مرکز سے کہیں زیادہ
 اختیارات حاصل ہیں؛ اسے پشتوں اور جنگلات کی پولیس، مہاشی گیری اور عسکار
 دفاعی جامہ کا قیام دہ آدہ و آدہ کے محمل، کارخانوں میں بچوں کی مزدوری کے بابت
 قواعد، قوانین دیوانی و فوجداری، اوزان اور پیمانے، اور ایسے ہی دوسرے بعض جزوی
 معاملات پر پورا قابو حاصل ہے۔ لیکن اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ ان ہمیب اختیارات
 کے بوجھ نشوون کو بہت کم اختیارات باقی رہ جائیں گے، اس لئے کہ ان کی زندگی
 کے روزمرہ کے بود و ماند کے اس قدر مساک ہیں کہ ان کے سامنے یہ تفصیل ہیچ ہے۔

تشکیل کیشن ہی کلیسا اور ملک کے درمیان تعلقات کا تعین کرتی ہے، وہی ایک بڑی حد تک تعلیمات کا انتظام کرتی ہے، سڑکوں اور ریلوں میں توسیع کرتی، شفا خانے اور ہسپتال قائم کرتی، غرباء اور حفظانِ صحت کا انتظام کرتی، زراعت کو صحیح راستے پر لگاتی، پولیس اور عدالت کا انتظام کرتی ہے، اور ایسے ہی بے شمار امور ہیں جن کا تعلق سوویتانوں کے عام زندگی سے ہے وہی مقتدر ہے۔

ایسی واقعتوں میں جہاں اجزاء کے اختیارات شمار کر دئے گئے ہوں اور بقیہ اختیارات مرکز کے تفویض کر کے اسے نسبتاً اہم بنا دیا گیا ہو، کتنا ڈاکا درجہ ممتاز ہے اس ملک میں جان بوجھ کر مرکز کو شاید اس لئے قوی کر دیا گیا ہے کہ کہیں انگریزی اور فرانسیسی آبادی کی باہم وکر کشش کی وجہ سے مرکز گر نہ پڑے تو وہی وفاقیہ کا خاتمہ نہ کریں۔ عام طور پر کئی صوبوں کو اپنے مقامی معاملات اور اپنے مقامی مالیات پر پورا قابو حاصل ہے تاہم تکنیک وہ مرکزی حکومت کے افعال و طرز کار میں خلل نہ ہوں یہ عملدان امور کے جن پر انھیں مختار کیا گیا ہے، حسب ذیل ہیں:-

صوبہ داری و سائیر (علاوہ ٹیکسٹ گورنر کے اختیارات کے)؛ براہ راست، محصل؛ سرکاری اراضیات کا انتظام؛ صوبہ داری شفا خانے یا آبکاری، مقامی ریل و رسائل کے طریقے (علاوہ ان سڑکوں، ریلوں وغیرہ کے جو مرکزی پارلیمنٹ اپنے متعلق کرے)؛ مناکحت؛ صوبوں کی عدالت کا (انتظام؛ تعلیم؛ نیز اگر کوئی صوبائی

سطح یہاں سوویتان کا بیان ذرا تفصیل کے ساتھ اس لئے دیا گیا ہے کہ باعتبار تنوع و زبان و مذہب، ملک ہندوستان کی گویا ایک صغیر شکل معلوم ہوتی ہے۔

(نوٹ: سالہ ۱۹۶۹ء)

قانون مرکزی قانون کے متضاد ہے اور مرکز کو صوبوں کے قوانین کو خلاف قانون قرار دینے کا اختیار حاصل ہے؛ ساتھ ہی شہد کی صورت میں صوبہ داری قانون ستر سمجھا جاتا ہے؛ صوبہ داری عادلوں کو مرکزی حکومت ہی مقرر کرتی ہے گو عدالتی انتظام کے ذمہ دار صوبے ہی ہیں۔^۱

جس طرح نئے روس نے میدان سیاسیات و معاشیات میں طرح طرح کے نئے نئے تجربے کئے اور ایک بالکل جدید قسم کی حکومت اور جدید قسم کا انتظام قائم کیا اسی طرح سے وفاقیہ کے سلسلے میں ایک بالکل جدید باب کا افتتاح کیا۔ عام طور پر وفاقیہ بہت سی فردی ریاستوں کی ترکیب سے بنتی ہے، لیکن روس میں انتظام کی شکل کم پیشی اسی قسم کی ہے کہ ہر ایک رقبہ جو زبان یا ل خیالات کے اعتبار سے منفرد ہو، اسے چند معاملات میں سواراج حاصل ہے۔ یہ سب ریاستیں مل کر وہ عظیم الشان ملکیت بنتے ہیں جنہیں سوویت روس یا روسی

(ریپبلک ۱۹۲۷ء کا) ^۱ دیکھو سالنامہ برین "Statesman's year"

Book. ۱۹۳۸ء ۲۹۹

دیکھو برکس "زادہ حال کی عینیتیں" - "Bryce: Modern Democ."

۲۳ باب ۲۳۰۰

^۲ "سودیت" کے معنی روسی زبان میں "مجلس" کے ہیں اور چونکہ آج کل کے روس میں تمام انتظام کا دار و مدار ^۳ ۱۹۲۳ء سے پہلے خاص نوع کی مجلس پر تھا اس لئے یہ لقب دیا گیا بلوٹو کی "کمیٹی" "کمیٹی" کے ہیں؛ آج کل کے روس کے حکمران علی الاعلان اپنے آپ کو (بقیہ صفحہ ۲۷۰ پر)

ملکیت کہتے ہیں۔ ۱۹۷۶ء کے جدید قانون سے پہلے اس عظیم الشان وفاقیہ میں چھوٹی چھوٹی وفاقیں بھی شامل تھیں، جیسے وفاقیہ ماورائے نھقاز، لیکن اب ان میں سے اکثر کو توڑ کر مختلف ریاستوں کا براہ راست مرکز سے تعلق پیدا کر دیا گیا ہے۔

روس کے دستور میں مرکز اور اجزاء کے امین تقسیم کار اس طرح پر کیا گیا ہے کہ بعض اختیارات صرف مرکز کو حاصل ہیں، بعض صرف اجزاء کو اور بعض اختیارات ایسے ہیں جو مرکز اور اجزاء دونوں کو حاصل ہیں، لیکن یہ قاعدہ مقرر کر دیا گیا ہے کہ اگر ان دونوں کے درمیان کسی قسم کا تضاد ہو تو ریاستی قوانین منسوخ تصور کئے جائیں گے۔ مرکزی حکومت جات میں خارجی معاملات، تہذیبی حدود، قرضہ خارجی تجارت، معاشی طرز عمل کا تعین، فوج، منفرد جمہوریتوں کے موازنہ جات کی عام نگرانی، سکھ سازی، عدالتیں اور ضابطے، مزدوری، تعلیمات عامہ و تندرستی عامہ کے اصول و قوانین

دقیقہ نوٹ ۱۹۷۹ء) اقلیت سمجھتے ہیں، اور جنوری ۱۹۸۱ء میں جو دستور ساز مجلس لکھنؤ نے طلب کی تھی اور جو صرف ایک دن کے بعد برخواست کر دی گئی اس میں بھی یہ اشتہالیت پسند "اقلیت میں ہی تھے" چنانچہ رفتہ رفتہ اس اشتہالیت پسند کردہ کا نام ہی "بلشویکی" پڑ گیا۔ نیز دیکھ باب ۱۴۔

تخلہ دیکھ "سالنامہ سویت" Soviet Year Book ۱۹۷۹ء ص ۱۱۱ حال ہی میں ایسی ہی کمیٹی ۱۹۷۹ء کے نصف آخر میں ایک ہدیہ منظور ہوا ہے جس میں اس کی ریاستی ہیئت مقدمہ تہذیبی کردی گئی ہے۔ لیکن جہاں تک مرکز اور ریاستوں کے درمیان اختیارات کے تقسیم کا سوال ہے وہ حسب سابق قائم رکھا گیا ہے۔ دیکھ سالانہ رجسٹر Annual Register ۱۹۷۹ء صفحہ ۱۰۷۔

اور ان ' پیمانے ' توطن وغیرہ ہیں ؛ اس میں سے مالیات ' اقتصادیات ، طعام ' مزدوری وغیرہ ریاستوں سے بھی متعلق ہیں لیکن مرکز ان کی تہمتز نگہ رانی رکھتا ہے ۔
 فائض زراعتی امور ایسے ہیں جیسے زراعت ' مقامی معاملات ' عدالتوں کی تنظیم ' تعلیم ' حفظان صحت (جن کے اصول کا تعین مرکز کی طرف سے ہوتا ہے) نیا پارہ ڈرامہ کسی کے اس منقولہ کا کہ مملکتیں مل کر عہدیت بنتی ہیں ' عہدیت امتداد زمانہ سے وفاقہ میں تبدیل ہوتی ہے اور جب وفاقہ کے مختلف اجزاء ایک دوسرے سے مانوس ہو جائے ہیں تو ان کا رجحان فردی مملکت کی طرف ہو جاتا ہے ' جرمنی کی حال کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے ' پچھلی صدی عیسوی کے دوسری دہائی میں ' نیپلین کے زوال کے بعد ' جرمنی میں جو عہدیت قائم ہوئی وہ اس قدر چھٹی دہائی اور اتنی غیر منظم تھی کہ اس میں مرکز کا تقریباً وجود ہی نہ تھا ' اور جو ادارہ سے مرکزی کہلائے جاسکتے ہیں وہ نہایت درجہ بے تربیتی میں پڑے ہوئے تھے ' چنانچہ بعض مرتبہ مرکزی عبادوں کی تقاضا میں چار چار برس تک برآمدہ رہتی تھیں ۔ اس عہدیت کی کمزوری کا باعث یہ تھا کہ قدیم آسٹریا اور جدید پروشیا کے درمیان بجاائے تعال کے مخالف کی کیفیت تھی جو ہر ادارہ عہدیت پر اپنا اثر ڈالے بغیر نہ رہی ۔ یہ صورت حال پورے پچاس برس قائم رہی یہاں تک کہ ۱۸۶۶ء میں پروشیا نے آسٹریا کو جبراً جرمنی سے نکال دیا ' اور ۱۸۷۱ء میں اپنے دوسرے در مقابل فرانس کو شکست دے کر خود فرانس کے باقیہ میں وفاقہ جرمنی کی بنیاد رکھی ۔ اس وفاقہ کی ریاستوں کو بہت سے امتیازات حاصل تھے ' اور بعض جنوبی ریاستوں کو ڈاک اور فوجی تنظیم کا بھی جداگانہ اختیار تھا اور ان میں سے چند کے حکمرانوں کو تو بادشاہ کا خطاب بھی حاصل تھا ۔ جنگ عظیم کے بعد

بعض ریاستوں نے اپنی کل آزادی کی کوشش کی، لیکن یہ کوشش بار آور نہ ہوئی بلکہ ۱۹۱۹ء میں جو دستور مرتب ہوا اس میں مرکز کو پہلے سے بھی زیادہ اختیارات حاصل ہو گئے اور اس تبدیلی کا ایک مظاہرہ یہ ہوا کہ ریاستوں کو اب ”علاقوں“ کا لقب دیدیا گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ ۱۸۶۶ء، ۱۸۶۸ء اور ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۶ء تک کی جنگ کا سب سے بڑا بار بے شکشیا ہی پر پڑا تھا اور یہ ناگزیر تھا کہ ۱۹۱۶ء کے دستور میں اس ریاست کو دوسری ریاستوں پر تفوق حاصل ہو جائے لیکن جو تبدیلی ۱۹۳۳ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۳۵ء میں کمال کو پہنچی اس کا بڑے سے بڑے پیش گو کو کبھی علم نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے کہ آسٹریوی نژاد منجملہ جس کا وطن مالواں بیوریامیں ہے اور جو اب جمہوریہ جرمن کا ”رہنما و صدر اعظم“ ہے اس نے نہ صرف جرمن پارلیمنٹ کے تمام اختیارات خود اپنی ذات کے لئے تفویض کر لئے ہیں بلکہ تمام علاقوں کے وسانیر کو محفل کر کے اور ان میں خود اپنی طرف سے ”تنظیم“ مقرر کر کے جرمنی کو آسٹریا سمیت آخر کار ایک فردیہ بنادیلے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکسی کے قول کی تصدیق جرمنی کی حال کی تاریخ سے بہتر کسی سے نہیں ہو سکتی۔

ہندوستانی صورت حال۔ اس بحث کے آخر میں ہم اس زمانے کے آخر ترین دستور میں وفاقی مرکز اور ریاستوں کے اختیارات کے مابین جو تغیرات کی گئی ہے اسے دکھائیں گے، قانون حکومت ہند میں وفاقی مرکز کے اختیارات، برطانوی صوبوں کے اختیارات اور ان اختیارات کا اعادہ کیا گیا ہے جو دونوں اختیارات کو متوازن طور پر بحال نہیں گئے۔

(۱) وفاقی اختیارات: ہندوستان کی حفاظت، فوج، بیڑہ، ہوائی جہاز

جاگیرداروں اور فرماںرواؤں کے مدارس، علی گڑھ و بنارس کے جامعات، کلیسیائی امور و یورپی قبرستان؛ خارجی معاملات؛ دفاتی عدالت؛ ریل و دیگر طرزیں و رسائل (علاوہ ریاستوں کے ریلوں کے) ڈاک، تار، ٹیلیفون، بے تار خبر رسانی، مکہ سازی، بنک، (فیون، پیٹرول اور بھیک سے اڑ جانے والی اشیاء، ایجادات؛ درآمد و برآمد، نمک؛ بعض علمی ذرائع تحقیقات؛ محصول آمدنی، محصول وفات؛ محصول معدنیات؛ وہ کاغذ محروس کا تعلق اس وقت مرکز سے، بلطن، افزان؛ وغیرہ۔

(۲) صوبہ داری معاملات، مقامی حکومت، بلدیات وغیرہ کے اختیارات، شفا خانے، پائل خانے، تعلیم (علاوہ دفاتی تعلیم کے)؛ امور عامہ، ریل و رسائل ریلیں وغیرہ (علاوہ دفاتی ریل و رسائل کے)؛ لگان، زمینداروں کا شکار کے تعلقات؛ صوبہ داری تجارت؛ جنگلات، عدل (علاوہ دفاتی عدل کے)؛ حبشہ؛ اوقاف؛ اوزان پیمانے؛ صوبہ میں قابل تائش احوال بچا، پولیس، جیل خانے، صوبہ داری خدمات عالیہ، دیسی قبرستان، محفل، سرکاری املاک سے، آبپاشی، بجلی، بازاروں وغیرہ سے، ایسے جرائموں سے جن کا تعلق صوبوں سے ہو، عدالتی محفل سے، ارباب سے جائداد سے، مکانات وغیرہ سے، شراب وغیرہ سے۔

(۳) علاوہ ان میں چند ایسے معاملات ہیں جن کا تعلق مرکز اور صوبوں دونوں سے ہے

سب سے پہلی دونوں ان پر قانون سازی کر سکتے ہیں۔ جو اصول مد نظر رکھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان معاملات میں زیادہ سے زیادہ یکسانی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی صوبہ داری احساسات کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ یکساں ہے کہ اگر اس ضمن میں صوبوں کے کسی قانون اور مرکزی قانون کے مابین اختلاف ہو تو صوبہ داری قانون مسترد سمجھا جائیگا

لیکن اگر کسی صوبہ داری قانون پر صرف گورنر صوبہ ہی کے نہیں بلکہ گورنر جنرل کے بھی دستخط ہو جائیں تو ایسی حالت میں صوبہ داری قوانین کو تلفیق حاصل ہو گا۔^۱ ایسے معاملات میں سے اہم حسب ذیل ہیں۔

ضابطہ دیوانی، قوانین آسٹریس، شہادت، مناکحت، تنہیت، تولیت، انتقال جائداد، وراثت، تعزیرات، ضابطہ توجہ داری، مزدوری، توہم تاریخی عمارتیں، دیوالیہ، وکالت، وڈاکٹری، اتحادات تجارتی، بجلی، سنیما کی فلمیں وغیرہ۔

اس تقسیم اختیارات کے ساتھ ہی یہ بھی طے کر دیا گیا ہے کہ گورنر جنرل کو اختیار ہو گا کہ وہ خاص اعلان کے ذریعے سے ایسے معاملات جن کا ان فہرستوں میں ذکر نہیں ہے، مرکزی یا صوبہ داری جماعت کے مقننہ میں سے کسی کو تفویض کر سکتا ہے یا ایسا محصول عائد کر لے گی جماعت مقننہ کو اختیار دے سکتا ہے جس کا ذکر اس فہرست میں نہیں، نیز کسی صوبے کی امن وامان یا تمام ملک کی امن وامان کے بچاؤ کی خاطر وہ صوبہ داری اقتدار کو عمل میں لانے کے طریقوں کے متعلق بھی ہدایت کر سکتا ہے۔^۲ اس سے یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے کہ شمار کردہ امور کے علاوہ "باقی ماندہ اختیارات" کا دار و مدار مرکزی صدر عالمہ یعنی گورنر جنرل کی مرضی پر ہو گا، یعنی خواہ ہندوستانی حکمران اور

۱۔ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء، تہمتہ ہفتم۔

۲۔ ایضاً دفعہ ۱۲۴ (۵)۔ اسی مسئلے پر فروری ۱۹۳۵ء میں ممالک متحدہ اور بھارت کی حکومتوں نے استغنیٰ پیش کر کے۔ بالآخر وزارتوں اور اقتدار عالمہ کے درمیان سمجھوتا ہو گیا۔

۳۔ ایضاً دفعہ ۱۰۴۔

”انگلینڈ“ کتنی ہی شہر ہیں کہیں نہ لگائیں کم از کم قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کے بموجب بہ نسبت اجزاء کے مرکز کو زیادہ قوت حاصل ہے۔

اور زیادہ تر برطانوی ہند کے صوبوں کی بابت غور کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ یہ بھی طے پا گیا ہے کہ ہندوستانی ریاستوں کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ بھی اس دنیا کے ہند میں شریک بن سکیں۔ ہندوستانی ریاستوں کی کیفیت بالکل ممتاز ہے؛ اس میں سے ہر ایک ریاست کے عہد نامے برطانوی حکومت کے ساتھ جدا گانہ ہیں اور ان عہد ناموں میں ہر ایک کی حیثیت مختلف مانی گئی ہے، چنانچہ بعض ریاستیں مثلاً مالک محروسہ سرکار نظام، گوایار، میسور، بڑودہ وغیرہ ایسی ہیں جنہیں اندرونی معاملات میں تقریباً مکمل اختیارات حاصل ہیں اور مالک محروسہ سرکار نظام میں تو علیحضرت خسر و کن کا سکے بھی چلتا ہے، انگریزی ڈاکھانے کے پہلو پہلو خود ان کا ڈاکھانہ ہے اور انہیں کی ریل ہے۔ اس کے برعکس بمبئیوں بلکہ سیکٹرول ایسی چھوٹی چھوٹی جاگیریں ہیں جنہیں بہت ہی جزوی اختیارات حاصل ہیں اور بعض کو تو قانون سازی اور عدالت کے بھی پورے اختیارات حاصل نہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی ایسی تقسیم جس میں ان سب الزام و

شلہ نیز کھیت قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء حصہ ۶۔

شلہ سکسہ سازی اور سکسہ رانی، بڑاک کا اختیار بعض دوسری ریاستوں کو بھی حاصل ہے، لیکن کہیں صرف تانبے کے سکے ڈھالے جاتے ہیں، کہیں صرف چاندی کے یہ اختیار صرف چھوٹے آبادکن ہی کو حاصل ہے کہ یہاں ہر قسم کا سکسہ ڈھالا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ نوٹ بھی لائچ بیجن کالین دین پوری قیمت پر ہوتا ہے۔

اقسام کی ریاستیں ایک ہی زمرے میں رکھی جائیں، درست نہ ہوگی؛ اسی لئے جب ۱۹۱۹ء میں ایران و البان ریاست موسومہ ”نزد منزل“ قائم ہوا، تو اس کی رکنیت کے لئے بعض منفرد ریاستوں کو اختیار ملا، بعض ریاستوں کے مجموعوں کو ایک ایک کر کے چھیننے کا اختیار ہوا اور بعض کو اتنا کتر سمجھا گیا کہ انھیں رکنیت کا سب سے اختیار ہی نہیں ملا۔ موجودہ حالات میں اس وقت بھی ہندوستانی شہنشاہی حکومت اور ان ریاستوں کے باہمی تعلقات بہ منزلہ ایک وفاقہ کے ہیں، جس میں مرکز کو چند مختصر اختیارات مثلاً خارجی معاملات، برطانوی ہند میں رہنما جان ریاستوں میں گھومتی ہیں، سکے سازی، سمار، بحری بحال درآمد نمک، ایسے امور پر اختیارات حاصل ہیں اور بقیہ جملہ اختیارات سب کے سب ریاستوں کو حاصل ہیں، لیکن ۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۷ء کی گول میز کانفرنسوں کے بعد قانون حکومت ہند ۱۹۴۷ء سے یہ طے ہو گیا ہے کہ آئندہ وفاقہ ہند میں ریاستیں شریک نہیں کیں گی، بلکہ وفاقہ اس وقت تک وجود میں نہیں آسکے گی جب تک اتنی ریاستیں اس میں شرکت نہ کریں کہ ان کا رقبہ جملہ ریاستوں کے رقبے کا نصف ہو۔ جب سے قانون حکومت ہند ۱۹۴۷ء پر مکمل عظیم جارج پنجم انجمنی کے دستخط کیے ہیں اس روز سے بلکہ اس سے بھی پہلے سے ریاستوں اور حکومت ہند کے درمیان شریک شرکت وفاقہ کے متعلق برابر بحث و مباحثہ ہو رہا ہے۔ یہ تو فرمایا جی اہر ہے اکثر ریاستیں وفاقہ ہند میں شریک ہو جائیں گی، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون کون سے اختیارات میں جن سے انھیں دست بردار ہونا پڑے گا، یعنی وہ

کون سے امور میں جن کی حد تک وفاقی جماعت، مختلفہ اور جماعت عامہ کو ریاستوں کے اندر اختیارات حاصل ہو جائیں گے۔ اس ضمن میں متحدہ کیپٹیل، و فوڈ کانفرنسوں کی ذمہ داری سے والیان ملک اور ان کے وزیر زمین میں حیدر آباد اور اس کے وزیر بائندیر رائٹ انریل نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر کا بڑا حصہ ہے) اپنے وعاہی حکومت ہند کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

یہاں ہندوستانی وفاقیہ، صوبوں اور ریاستوں کی بابت ذرا تفصیل سے اس لئے لکھا گیا ہے کہ اول تو ہم سب اسی ملک کے رہنے والے ہیں، اور پھر سیاسی اعتبار سے ہمارا ملک ایک نہایت دلچسپ ملک ہے، اس لئے کہ باوجود اس کے باؤل اور جزائیہ کے تنوعات کے اس ملک میں ہمیشہ جذب کی قوت کار فرما رہی ہے اور جو اقوام باہر سے آئی ہیں وہ اس ملک کی ہوئی ہیں۔ نیز تاریخ شام سے کہ جب کبھی مرکز گیر اثرات نے تفوق حاصل کیا تو ان کی کاٹ کے لئے ایسی کیفیتیں پیدا ہو گئیں کہ انھوں نے ان اثرات کو زیر کر لیا۔ سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ حالت آج صراحتاً اور سرگرمیت پبلکیشن اور پریس کے عہدوں میں پائی جاتی ہے تو اس طرف علامہ ابراہین علی محمد تعلق اور اورنگ زیب نے ان اثرات کو دیا ہے

لئے اس تمام بحث کے لئے دیکھو پاکستانیہ ہندوستانی ریاستیں اور ہندوستان کی حکومت

Panikkar: Indian State and the Government

باب ۱۳ of India

Beotra: The Two Indias.

پرتلا: "دونوں ہندوستان"

اور ملک میں قانونی اور انتظامی اتفاق پیدا کیا ہے۔ آج بھی باوجود ہر طرح کے تفرقوں کے جو ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، مشکل سے کوئی دل نہوگا جو کسی نہ کسی طرح سے اس ملک کو متحد و متفق دیکھنا نہ چاہتا ہو، اور اب جب ایک طرز حکومت ایسی نظر آتی ہے جو مغائرت کے ساتھ ساتھ اتفاق و اتحاد عمل کا امکان پیدا کرتی ہے تو تمام ہندوستانی ہندو مسلمان، برہمنوں کی ہندی، ریاستی ہندی، ثنائی اور کھنٹی سب اپنے اپنے مانتوں سے اسی کی طرف دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ کیا عجب کہ ایسی دفنائی طرز حکومت ہی اس پسماندہ ملک کی آئندہ ترقی کا لازماً ثابت ہو۔

Legislation

باب ۱۵

مقننہ .

قانون سازی کی اہمیت : قانون ساز جماعت مقننہ - دوا پرانی جماعت - ایوانوں کی ترکیب اختیارات
حق رائے دہی - اکثریت و اقلیت - تناسبی نیابت - ضابطہ منظوری جماعت عالمہ کی ذمہ داری

براہ راست قانون سازی
قانون سازی کی اہمیت - اس سے قبل یہ بتایا جا چکا ہے کہ
ہر ملک کی اندرونی تنظیم میں تین ادارے دوسروں سے ممتاز نظر آئیں گے یعنی
ادارہ مقننہ ، ادارہ عالمہ اور ادارہ عدلیہ اور چونکہ ادارہ مقننہ وہ ادارہ ہے جس کے
ذریعے سے قوانین بنتے ہیں اور باہمی تصادم کو روکنے کی غرض انسانی اختیارات کی
تحدید ہوتی ہے اس لئے ان تینوں میں سب سے اہم عضو حکومت مقننہ ہے نیز
یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ جس طرح قوانین انسان کے افعال کو محدود کرتے ہیں اسی طرح
سے محال کے ذریعے سے اس کی مالی آزادی میں تحدید کی جاتی ہے - چنانچہ
یہ دونوں امور ایک دوسرے کے مائل ہیں جس کی وجہ سے عام طور پر جس ادارے

۱۲ باب ۱۵

کے ذمے قانون سازی ہوتی ہے اسی کے ذمے محفل عائد کر کے کا اختیاری بھی ہوتا ہے۔ اس سے ایک کلیہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حکومت کی ہال کمالی گویا وہ ادارہ ہے جس کے سید و قانون سازی اور محفل عائد کر کے کا اختیار ہو، اگر یہ اختیار کسی شخص واحد سے متعلق ہے تو وہ شخص کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہوگا؛ اور اگر یہ اختیار کسی جماعت سے وابستہ ہے تو پھر کم از کم ادارہ عالمہ پر اس جماعت کا تعلق ہونا ضروری ہے۔

قانون ساز۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قانون سازی کے اختیارات کس کو محفل ہونا ملک کے لئے بہتر ہیں ہوگا۔ سب سے پیشتر یہ بات صاف کرنا ضروری ہے کہ کوئی سیاسی اصول یا مسلک ایسا نہیں جو تمام عالم کے ملکوں کے لئے یکساں مفید و کارآمد ہو سکے۔ ہر ملک کے رسم و رواج، عقائد و تاریخ اور کیفیت دوسرے ملک سے مختلف ہیں اور ہر ملک کے سیاسی ادارات ان کیفیات کے عمل اور رد عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لہذا ایک ملک سے کہ جس کے باشندوں کے گھٹی ہی

۱۵ جب جتنی ہی ملک کے برابر اختیار ہونے پر دلوں کی سیاہی بساط پٹی تو ہٹا کر سب سے پہلے یہ کیا کہ جہاں پارلیمنٹ سے قانون منظور کیا جائے وہاں اختیارات قانون سازی خود اپنے اور اپنی کامیابی کے ساتھ وابستہ کرانے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہٹا کر کے لڑیکہ بھی قانون سازی کے اختیارات عالمہ اختیار سے زیادہ اہم ہیں۔

۱۶ دیکھو بھگت "مبادی سیاسیات" Sidgwick: Element of
Politics. باب ۲۰۔

میں ملک کے بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان کشمکش کی روایات پڑی ہوئی ہیں اور یہی کشمکش دراصل ان دونوں کے باہمی جھگڑوں کی تاریخ ہے، ایسے ملک میں حکمران اور رعایا کے درمیان کسی قسم کا اعتبار و بنیاد نہ ہوتا اس وقت تک ممکن ہے جب تک ایک فریق دوسرے فریق کے اختیارات سلب نہ کرے۔ دوسرے ایسے بھی ملک ہیں جہاں حکمران اور رعایا ایک دوسرے کا معاملہ واحد سمجھتے ہیں اور جس میں بادشاہ رعایا کی بھلائی اور رعایا بادشاہ کے اثر کی حفاظت کرنا اپنا فرض عین سمجھتی ہے، ایسے ملک میں گو بادشاہ کے اختیارات میں کوئی ظاہری رکاوٹ نہ ہو لیکن فی نفسہ ملی روایات اور اخلاقی کیفیات ہی ملک والوں کی آزادی کی سب سے بڑی ضمانت سمجھی جاتی ہیں بعض دوسرے ملک ایسے ہیں جہاں کے عقیدے کے مطابق چونکہ انسان کامل تو انہیں نہیں بنا سکتا اس لئے بہترین قوانین دیئے گئے ہیں جو خدا بنا سکے، اور یہاں بعض قواعد و قوانین وقتاً اسی کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔

یہاں اس تفصیل کی ضرورت ایسے پیدا ہوئی تاکہ ہر ملک کی ذہنی اور مادی کیفیت

۱۔ انگلستان کی دستوری تاریخ اس قسم کی کشمکش سے بھری ہوئی ہے۔
 ۲۔ اکثر مشرقی ملک اس اصول کی مثال پیش کرتے ہیں جہاں بادشاہ "سید القوم خادمہم" کے مصلحت مند نہیں بلکہ خادم سمجھا جاتا ہے اور اس کے اختیارات میں کمی کو مملکتی اختیارات میں کمی کے مترادف تصور کیا جاتا ہے۔ جاپان میں آج بھی بادشاہ اور ملکی اقتدار دونوں ہم منہ می سمجھے جاتے ہیں۔
 ۳۔ قرآنی تائید اسی اصول پر مبنی ہے۔ یہی کیفیت دھرم شاستر کی ہے۔

درواہیات کے اثرات کا پتہ لگ سکے اور سیاست کے طالب علم کے لئے سب سے خطرناک جو معاملہ ہے، یعنی کسی ”عالمگیر“ اصول کو ہر ملک کے حالات پر مطبق کرنا، اس سے اسے بچایا جاسکے۔ آج کل بعض ممالک میں عام خیال یہ ہے کہ ملک کی جملہ سیاسی خرابیوں کا واحد علاج یہ ہے کہ قانون سازی کا کام ایک منتخب شدہ مجلس کے سپرد کر دیا جائے اور وزارت کو اس مجلس کے سامنے جواب دہ قرار دیا جائے۔ یہ خیال فاضل طور پر جنگ عظیم سے پہلے کی نصف صدی میں نشوونما پاتا گیا اور گو مختلف ممالک اور پھر مثلاً جرمنی و اٹلی میں آمریت کے قیام اور عمومی ممالک کی پے در پے پستی کی وجہ اس میں وہ زور نہیں رہا جو پہلے تھا تاہم اس وقت بھی ہندی نو جوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس طرز عمل کو تمام سیاسی سمیات کا تریاق تصور کرتی ہے۔ اگر غور سے دیکھی جائے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ منتخب شدہ حکومت کا طریقہ ہی انسانی فطرت کے مطابق ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ طریقہ صرف آسانی اور سہولت کے لئے ایجاد کیا گیا ہے اور اس کا دائرہ مار ملک دانوں کی معاشری عادات و اطوار پر ہونا چاہیے۔

جماعت مقننہ۔ اس میں تو شبہ نہیں کہ قانون سازی کے لئے صرف قانون

۷۷ اس خیال کو سب سے زیادہ عروج انیسویں صدی میں چل ہوا۔ اس صدی میں عام خیال یہ پھیلا ہوا تھا کہ ہر قوم کی حق کا راز یہ ہے کہ ملک میں پارلیمنٹی حکومت قائم کی جائے۔ اب یورپ میں یہ خیال دوڑ بروز فنا ہوتا جا رہا ہے۔

۷۸ سبک: ”مبادی سیاست“ باب ۲۰

دانی ہی کافی نہیں بلکہ اس کے لئے اس کی بھی ضرورت ہے کہ قانون اور ملک کے معاشرتی حالات کے مابین جو تعلق ہے اس کا اندازہ بھی کیا جائے انسانی ضروریات اور ان ضروریات کو پورا کرنے کے طریقوں سے اگر واقفیت ہو تو پھر جو قانون بنے گا وہ مکمل ہوگا اور محض اس وجہ سے کہ ان دونوں شعبوں کے متعلق جو معلومات انسان کو حاصل ہو سکتی ہیں وہ غیر مکمل اور ناقص ہیں، بعض اقوام نے ایسی قوانین کو اختیار کر لیا ہے، بعض ایک ایسے مکمل حکمراں کے انتظار میں ہیں جو ضروریات اور انسداد ضروریات کی تدابیر دونوں سے کیا حقہ واقف ہو اور جو حکمران خدا کی دینی کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے اور ایسا "افلاطونی" حکمران عناد و شہوات سے اس لئے چارونا چار ایسے طریقے ایجاد کئے جا رہے ہیں جن کے ذریعے سے مکمل نہیں تو انسانی اعتبار سے بہترین اور مقتضائے وقت قوانین بنائے جاسکیں۔

الغرض یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ منتخب شدہ جماعت مقننہ انسانی کمزوری اور نقص کا ایک مظاہر ہے۔ اگر ملک والوں کو ایسا شخص مل جائے جو ملک کی ضروریات سے واقف تصور کیا جائے اور جو اس کے انسداد کی تدابیر سوچ سکے تو وہ قانون سازی اسی کے سپرد کر دیں گے، ورنہ ایک مرکب جماعت ترتیب دی جاتی ہے اور اس

۱۵ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ آج کل بعض ملکوں میں آمریت کا جو دور دورہ ہے اس کی بنیادی اصول پر چمکتا ہے کہ آج کل کے گادیج ملک کے لئے بہتر ہوگا اور آج کے کو دار پر حرف زنی سیاسی اعتبار سے اتنی ہی نقصان رساں تصور کی جاتی ہے جتنی سی بی یا رسول کے کردار پر حرف زنی مذہبی اعتبار سے عذاب الہی کی مستحق تصور کی جاتی ہے۔

میں حتی الامکان ہر شعبہ زندگی یا ہر شعبے کا قائم مقام اور جدیدہ و جدیدہ اور جو جمع کئے جاتے ہیں تاکہ وہ اپنے اپنے شعبوں یا شعبوں کی ضروریات سے مجلس کو مطلع کرتے رہیں، نظام ہر شعبہ کہ اس قسم کی مرکب جماعت کا عوام الناس سے کچھ تعلق ہو گا اور ان کے ذریعے سے ایسے قوانین و قواعد مرتب کئے جائیں گے جو ملکی ضروریات سے مربوط ہوں، اور گوان قائم مقاموں میں سے بہت سے نمبر ہوں گے اور بعض کو زیادہ تجربہ ہو گا لیکن وہ فطری عقل و شعور کے اس عنصر کا اضافہ کر سکیں گے جن کی ہر انسانی تدبیر کو ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے۔

دو ایوانی جماعت۔ اگر ہم عمومی ممالک کے ادارات کا قانون سازی کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ قانون سازی کا کام ایک ایسی جماعت کے سپرد ہوتا ہے جس کے یا تو دو ایوان ہوں ورنہ ایک ہی ایوان ہو۔ ایوانوں کے تعداد کے دو سبب ہو سکتے ہیں، ایک تو تاریخی اور دوسرے سیاسی۔ جن ممالک میں مقننہ جماعتوں نے نشوونما پایا ہے ان میں سے بعض میں کسی زمانہ میں تین تین چار چار ایوان بھی بنے ہیں۔ لیکن اس وقت کوئی ایسا ملک نہ ملے گا جہاں دو سے زیادہ ایوانوں سے کسی قانون کی منظوری یعنی ضرورتی سمجھی جاتی ہو جیسا انجی بیان کیا گیا ہے، ممکن ہے کہ کسی ملک میں دو ایوانی جماعت مقننہ کا وجود محض تاریخی ارتقا کی وجہ سے ہو جیسا انگلستان میں ایسے ممالک میں دوسرے ایوان کی وجہ وجود معلوم

علامہ سجاد: ”ارتقاء نظم حکومت ایرپ (سلسلہ نصاب جامعہ عثمانیہ) خطبہ ۲۱۔ فرانس میں تو ۱۸۷۵ء کے بعد تک جماعت مقننہ سے ایوانی تھی۔“

کے لئے دہل کی دستوری تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے؛ یہاں صرف اس اصول سے بحث ہے کہ آیا کسی جدید جماعت مقننہ کے قیام پر اس میں ایک ایوان ہونا چاہئے یا دو۔

جب اس اصول پر کسی ملک والے قایم ہو گئے کہ قانون سازی کا کام عوام کے مختلف طبقوں کے نمائندوں کے سپرد ہونا چاہئے تو لفظ ہر دوسرے ایوان کی گنجائش نہیں رہتی، اس لئے کہ مختلف طبقوں کے جو نمائندے ہیں وہ سب ال بیٹھ کر تبادلہ آرا کریں گے تو مباحثے کی وجہ سے حق کا پتہ لگ سکے گا۔ لیکن تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ ایسی جماعتوں میں جہاں قائم مقاموں کا انتخاب عام دھڑ سے ہوتا ہے وہاں فریقی بندی ضرور پیدا ہو جاتی ہے، اور جماعتیں فوراً ایک گروہ دوسرے گروہ پر غالب آجاتی ہے۔ ایسی صورت میں خوف ہوتا ہے کہ کسی باہمی ضد کی وجہ سے غالب فریق اپنی اکثریت کے زعم و تائید میں ایسے قوانین منظور نہ کرے جو مخالف گروہ کے کسی خاص طبقے کیلئے مفید پڑتے ہوں یا بالآخر ملک کیلئے مفید ثابت نہ ہوں۔ مثلاً ظاہر ہے کہ کسی ملک میں زمیندار طبقہ یا اس کے قایم مقام ضرور اقلیت میں ہوں گے، اور یہی کیفیت تعلیم یافتہ طبقے کی بھی ہوگی۔ اگر قانون سازی کیلئے کسی ایک ایوانی جماعت مقننہ کے سپرد کر دی گئی تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ ایوان ایسی اقلیتوں کا فائدہ نہیں کرے گا جو زمین داناں یا ذریعہ ترقی کی پشت دہناہ ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ زیادہ تر جو لوگ ایوان عمومی میں منتخب ہوتے ہیں، وہ انچا جب زبانی اور زر خطابت، ورنہ اپنے مال و دولت کی وجہ سے منتخب کئے جاتے ہیں، اور یہ

بالکل ممکن ہے کہ ایسے قابل لوگ رہ جائیں جو یا تو فن خطابت کے ماہر نہیں ہیں یا ان کے پاس انتخاب کے اخراجات کے لئے کافی دولت نہیں، لیکن دراصل ان کا سیاسی تجربہ اور قابلیت مسلمہ ہیں۔ اس سلسلے میں تیسری بات یہ کہنی ہے کہ وفاقیوں میں شخص کے سامنے دو ٹول ہوتے ہیں، ایک کا مرجع قوم ہوتی ہے، دوسرے کا مرجع ریاست ہوتی ہے، اور مرکزی حکومت دراصل ان دونوں تخیلات کے امتزاج کا ہی کرشمہ ہوتی ہے۔ سیاسی تعمیر کاروں کا سب سے بڑا خیال یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح سے جماعت مقننہ ملک کی عام راز اور عام جذبات کا آئینہ بن جائے، چنانچہ جب انھیں کسی وفاقیہ کی جماعت مقننہ بنانی پڑتی ہے تو وہ اکثر ایک ایوان کو ”قومی“ یعنی مرکزی عناصر کا قائم مقام، اور دوسرے کو وفاقی یعنی ریاستی عناصر کا قائم مقام بناتی ہیں۔ ایوانوں کی ترکیب و اختیارات۔ ان مرض یہ وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر بہت سے ملکوں میں دو ایوانی مقننہ ترتیب دی جاتی ہے، گو یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے عناصر کی جو عام رائے سے منتخب نہ ہوئے ہوں، کسی یک ایوانی مقننہ میں نامزدگی کر دی جائے، جیسے ہندوستان کی جماعتوں میں ہوتی آئی ہے۔

۱۔ وفاقیوں میں ایوان بالائی کی ساخت میں دو متبادل اصول برتے جاتے ہیں، یعنی یا تو ہر ریاست کا مرتبہ ایک ہی سمجھا جاتا ہے اور مساوی تعداد رکاز کی منتخب کی جاتی ہے، جیسے ہالک متحدہ امریکہ، سوئٹان اور روس میں، ورنہ ان کی نمایندگی ایک حد تک آبادی کے متناسب سے ہوتی ہے جیسے کناڈا میں۔

اگر دوسرے یا اونچے ایوان کو انھی حلقوں سے یا اس مدت کے لئے یا بھی شرائط پر منتخب کیا جائے جن حلقوں یا مدت یا شرائط کے لئے ایوان عام منتخب کیا جاتا ہے، تو پھر یہ یا تو بے سود ہوگا یا کاموں میں رکاوٹ پیدا کرے گا، اور اس سے وہ مطلب حل نہیں ہوگا جو اوپر کے پارے میں اس کی وجہ وجود بنا یا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس میں نیچے ایوان کے بہ نسبت اعلیٰ وارفع تمدن یا اعلیٰ معیار زندگی یا اعلیٰ تعلیم کی نمایندگی ہو، چنانچہ جو اصول علیٰ العموم اس نیچے ایوان کے تقرر کے برتے جاتے ہیں وہ (علاوہ وراثت اور نامزدگی کے) ہیں کہ اس کے حلقہ جات راوی نسبتاً وسیع تر ہوتے ہیں، اس کے اراکین کی عمروں کا معیار طویل ہوتا ہے، وہ نسبتاً زیادہ مدت کے لئے منتخب ہوتے ہیں، اور بعض ممالک میں یہ ایوان ایک ایسٹبلشمنٹ ایوان ہوتا ہے جس کے اراکین کبھی بالکل بربخاست نہیں ہوتے بلکہ اس کا ایک ایک حصہ چند سال کے بعد بدلتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ایوان کے اختیارات عموماً ایوان اول سے ذرا کم ہوتے ہیں، چنانچہ بعض ممالک میں تو یہ اختیارات صرف اس حد تک محدود ہوتے ہیں کہ ملک کی صحیح راستے دریافت کرنے کی غرض سے ثانوی مسودات کو ایک خاص زمانے تک معطل کر دیا جائے، یعنی کسی مسودہ کو کلیتہً مسترد کرنے کا اختیار نہیں ہوتا اور اکثر و بیشتر ممالک میں کسی مالی مسودے کی ترمیم کا اختیار ایوان دوم کو نہیں دیا جاتا، تاکہ ملک کے انتظامات اس وزارت کے ذریعے سے جو ایوان زیریں کے سامنے ذمہ دار ہوئے چلتے رہیں، رکین نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض وفاقی ممالک میں جن کی بدیہی مثال ممالک متحدہ امریکہ ہے، ایوان دوم کو

(جسے سینات کہتے ہیں) بہت سے عاملانہ اور انتظامی اختیارات بھی حاصل ہیں (جیسے صدر جمہوریہ کے ساتھ مل کر ملک کے اعلیٰ ترین عہدہ داروں کا تقرر) لیکن ایسے ممالک اکثر وہی ہیں جن میں وفاقی طرز کی حکومت قائم ہے، اور جیسا اور بیان کیا گیا ہے ایسے ممالک میں انچا ایوان ایک خاص اصول یعنی وفاقی اصول کا قائم مقام ہوتا ہے۔ تاہم اس ضمن میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ان ممالک میں بھی ایوان دوم کو مالی امور میں ایوان اول کے مساوی اختیارات حاصل نہیں ہوتے۔ اسی طرح ان ممالک میں جہاں ذمہ دار وزارت، یعنی کابینہ طرز حکومت رائج ہے وہاں عام طور سے یہ وزارت صرف ایوان اول یعنی منتخب شدہ ایوان کے سامنے ذمہ دار ہوگی ورنہ عمومی حکومت قائم نہ رہے گی اور کابینہ حکومت کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا حقیقت یہ ہے کہ جیسا سمجھ لے لکھا ہے، ایسی جماعت مقننہ جس کے دونوں ایوانوں کے اختیارات بالکل یہ مساوی ہوں گی پارلیمنٹری نظام کا ایک نہایت ہی نامور عنصر ہوں گے۔

حق رائے دہی۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان ایوانوں کا انتخاب کیسے ہو سیکھے تو سچے ایوان یا ایوان عام کو سیکھے۔ بظاہر جس وقت ہم نے عمومی اصول کو تسلیم کر لیا، یعنی ہم اس اصول کو ماننے لگے کہ ہماری جماعت مقننہ ملک کی عام رائے کی قائم مقام ہوگی، پھر بادی النظر میں ہم خواہی بخوابی اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس ایوان کو عام ایسے لوگ انتخاب کریں جو عاقل و بالغ ہوں۔ لیکن

بہت سے ملکوں میں اس حق پر کئی طرح کی رکاوٹیں پیدا کی جاتی ہیں۔ بعض جگہ تو یہ کہا جاتا ہے کہ فی نفسہ عیسویت یا نیا بتی طریق کے معنی یہ نہیں کہ ہر کس و نا کس، خواہ اسے فطری اہلیت ہو یا نہ ہو ضرور ہی رائے دی کا مستحق قرار دیا جائے۔ مثلاً بہت سے ملکوں میں، جہاں قانونی سن بلوغ ۲۱ سال کا سمجھا جاتا ہے، حق رائے دی ۲۵ برس تک حاصل نہیں ہوتا، تاکہ انسان کو اپنے ذاتی معاملات پر اختیارات حاصل ہونے کے بعد کم سے کم چار سال کا مزید تجربہ حاصل ہو جائے پھر بہت سے سرمایہ دار ملکوں میں خیال کیا جاتا ہے کہ تا وقتیکہ انسان کسی نہ کسی طرح کی جائداد کا مالک یا اس پر قابض نہ ہو اس وقت ایک ایسے ملکی معاملات کا درود کیا ہو سکتا ہے، اس لئے کہ محض ادارہ گدراہ گیر کے لئے اچھا قانون کیا اور بُرا کیا؛ چنانچہ عمر کے ساتھ ایک شرط یہ بھی لگئی جاتی ہے کہ رائے دہندے کو تھوڑی بہت جائداد کا مالک یا کم از کم کسی مکان یا دوکان پر قابض ضرور ہونا چاہئے۔ حال ہی میں جنگ عظیم کے بعد دو ملکوں یعنی روس اور اٹلی میں نئے قسم کا معیار رائے دی مقرر ہوا؛ یعنی روس میں سترہ سال تک صرف انھیں لوگوں کو سیاسی رائے دی کے حقوق حاصل تھے جو اپنی ذاتی قوت بازو سے روزی پیدا کرتے ہوں اور ساتھ ہی دوسروں سے کام نہ لیتے ہوں، چنانچہ یہاں مدارس کے اساتذہ، مالکان کارخانہ جات اور ایسے ہی دوسرے طبقات کو سیاسی معاملات میں حصہ لینے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا؛ اٹلی میں ہر شخص کو رائے دی کا حق حاصل ہے جو حکومتی تجارتی میں سے کسی نہ کسی کارکن ہو اور اس کا چندہ دیتا ہو۔ پھر آج بھی بعض ملک ایسے ہیں (جیسے فرانس، اٹلی، جرمنی، جاپان) جہاں عورتوں کو رائے دی سے

اس وجہ سے محروم کیا جاتا ہے کہ ان کا دائرہ عمل گھروار کے اندر محدود ہے اور سیاسی معاملات میں حصہ لینے کی نہ انھیں فرصت ہے اور نہ اس کی اہلیت؛ دوسرے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر کسی گھرانے میں شوہر بیوی دونوں سیاست میں ملجوسی لینے لگیں تو کم از کم جزوی مخالفتوں کی وجہ سے ان کی زندگی تلخ ہو جائے گی، جو ملکی معاشرے کے لئے نقصان رساں ہوگی۔ اس کے برعکس زنانہ حق رائے کے حامی یہ کہتے ہیں کہ آج کل مشکل سے کوئی شعبہ زندگی ایسا ہوگا جس میں عورتیں مردوں کے روش بدوش حصہ نہ لیتی ہوں، اور عورتوں کو سیاسی معاملات سے کم از کم اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی مردوں کو؛ رہا یہی مخالفت کا مسئلہ، تو اس اصول کے بنا پر ہر گھرانے میں صرف ایک ہی شخص کو حق رائے دہی ملنا چاہئے، ورنہ شوہر بیوی کی طرح جو ان بیٹے اور باپ کے مابین بھی تو سیاسی اختلافات پیدا ہو سکتے ہیں۔ بعض ممالک میں رائے دہی مذہبی عقیدے پر مبنی ہوتی ہے، اور یہ ایک نہایت ہی دلچسپ مظاہرہ ہے کہ آج کے جدید یورپ کے شاید سب سے ”ترقی یافتہ“ ملک یعنی جرمنی میں جو کچھ بھی سیاسی حقوق باقی رہ گئے ہیں ان سے بھی یہودیوں کو بالکل محروم کر دیا گیا ہے بلکہ اب تو انکی پوری املاک پر قبضہ کر کے انھیں جالوردن سے

۱۹۱۳ء میں سب سے پہلا ملک جس نے عورتوں کو رائے دہی کا حق دیا وہ فرسٹان ہے؛ یہ حق ۱۹۱۹ء میں دیگاریاں کے بعد ڈنمارک نے ۱۹۱۹ء میں، ناروے نے ۱۹۱۹ء میں، جرمنی نے ۱۹۱۹ء میں، انگلستان نے ۱۹۲۸ء میں اور ہندوستان نے ۱۹۳۵ء میں عورتوں کو رائے دہی کا حق فراہم کیا۔ ہنگری کے برسر اقتدار ہونے پر جرمنی میں یہ حق سلب کر لیا گیا۔

جی بدتر شکل سے ملک سے ہٹکا یا جا رہا ہے، اور گزشتہ ۱۸۷۷ء سے کاغذ پر امریکہ سفید اور سیاہ باشندوں کو مساوی حق رائے دی دیا گیا ہے لیکن ان ریاستوں میں جہاں سیاہ اقوام کی تعداد زیادہ ہے، طرح طرح کے طریقے ایسے ایجاد کئے گئے ہیں کہ یہ لاکھوں بلکہ کروڑوں انسان سیاسیات میں کسی طرح کا حصہ لینے سے محروم ہو جائیں۔ بعض ممالک میں رائے دی کے لئے ایک خاص تعلیمی معیار ہونا لازمی سمجھا جاتا ہے تاکہ رائے دہندے سیاسی معاملات کو سمجھ سکیں اور بعض میں مختلف مذاہب کے پیروں کے حلقہ رائے دی جدا جدا ہیں اور ایک کا دوسرے سے مطلق سروکار نہیں۔

اکثریت و اقلیت - اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حلقہ جاست

تھ ۱۹۰۳ء کی مردم شماری کی رو سے ممالک متحدہ امریکہ میں سیاہ باشندوں کی تعداد ایک کروڑ سے زیادہ تھی۔ ان طریقوں کے لئے دیکھو برائٹس: "دولت عامہ امریکہ۔ Bryce: American can Commonwealth. جلد ۲، حصہ ۵، باب ۹۵۔

شلہ لاسکی اپنی کتاب "صرف نحو سیاسیات" Lascki: The Grammar of Politics. باب ۸، میں حدود رائے دی کی معاندانہ تنقید کرتا ہے اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ بہترین صورت حال وہ ہے جہاں ہر عامل و تابع کو رائے دی کے اختیار میں دے جائیں۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ جو تعلیم یافتہ ہوں وہ ماہرین سیاسیات بھی ہوں نیز اگر حق رائے کو صاحبان جائداد تک محدود کیا جائیگا تو پھر باقی ماندہ باشندے کوئی ٹیپ نہیں لے گی اور رائے دی کا اصل اصول فوت ہو جائے گا۔

رائے دی کی تنظیم کس نوع سے کی جائے۔ سب سے آسان شکل تو یہ ہے کہ تمام ملک یک کرنی حلقوں یعنی ایسے حلقوں میں تقسیم کر دیا جائے، جہاں کے باشندے مختلف امیدواروں میں سے ایک ایک امیدوار کو بذریعہ کثرت رائے منتخب کریں۔ آسانی کی وجہ سے یہ طریقہ بہت مقبول ہے، لیکن اس میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اگر فی حلقہ دو امیدوار ہوں تو نصف کے قریب رائے بے کار جاتی ہیں، اور دوسے زیادہ امیدوار ہوں تو ایسی حالت میں بعض مرتبہ جو شخص منتخب ہوتا ہے وہ بجائے اکثریت کے اقلیت ہی کا قیام مقام ہوتا ہے۔ اس طریقے کو اضافی رائے کا طریقہ

تسلطہ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:-

دو امیدوار: مفروضاً الف کے لئے ۱۰،۰۰۰ آراء

ب کے لئے ۹،۰۰۰ آراء

الف ۱۰۰ آراء سے منتخب ہوا، یعنی

ب کے لئے ۹،۰۰۰ آراء تھیں وہ ضائع ہو گئیں

دوسے زیادہ امیدوار: مفروضاً الف کے لئے ۱۰،۰۰۰ آراء

ب کے لئے ۹،۰۰۰ آراء

ج کے لئے ۸،۰۰۰ آراء

الف منتخب شدہ سمجھا جائے گا حالانکہ اس کے

مخالف ۱۰،۰۰۰ آراء ہیں اور ب کے موافق صرف ۹،۰۰۰۔

اگر ہم انگلستان، یعنی اس ملک کی نیابت پر غور کریں جو اس "اضافی کثرت رائے" کا (تقدیراً) شوقین ہے

کہتے ہیں، اور اس میں علاوہ اس بڑے نقص کے کہ کسی حلقہ میں اقلیت نیابت سے بالکلیہ محروم ہو جاتی ہے، ایک نقص یہ بھی ہے کہ مجلس مقننہ کے ارکان میں حلقہ واری اور صوبہ واری جذبات بہ نسبت قومیت کے جذبات کے کہیں زیادہ ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔

اس نقص کو رفع کرنے کے لئے دو طریقے عمل میں لائے جاسکتے ہیں، ایک تو یہ کہ اقلیتوں کی نمایندگی کی کوئی نہ کوئی شکل نکالی جائے، اور دوسرے یہ کہ بجائے جنرالی حلقے بنانے کے انتخابی حلقوں کا دارومدار پیشوں یا زندگی کے شعبوں پر ہو اور

(ایڈیٹڈ ۱۹۲۹ء) سب کا بڑا حامی سمجھا جاتا ہے تو ہم اس طریقے کے عجیب و غریب نتائج نہایت متنازعہ پائیں گے ۱۹۳۱ء کے انتخابات عام کی کیفیت یہ تھی۔

فریق	آراء حاصل کردہ تقریباً	نشتہائے دالالوم
(۱) ملکوتی فریق	۱۴۰ لاکھ	۴۹۳
(۲) آزاد مزدور	۶۶ لاکھ	۴۶
(۳) آزاد لبرل	ایک لاکھ	۴
(۴) دیگر	۳ لاکھ	۵
جملہ	۲۱۶ لاکھ آراء	۵۴۸ نشستیں

یہ اعداد انجمن نیابت متناہی Proportional Representation

Society کی روداد بہت ۱۹۳۱ء سے لئے گئے ہیں)

ہر طبقہ تمام ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ سب سے پہلے تو اقلیتوں کی نمایندگی کے اہم مسئلے کو لیجئے۔ لفظ ”اکثریت“ اور ”اقلیت“ کا دو مختلف مفہوموں پر انطباق ہو سکتا ہے، یعنی سیاسی اکثریت و اقلیت اور تمدنی اکثریت و اقلیت۔ سیاسی اکثریت و اقلیت میں وہ کیفیت شامل بھیجی جائے گی جس کے تحت جملہ آبادی کا سطح نظر ملکیت اور ملک کی بہتری ہو، لیکن چونکہ ہر شخص کا طرز کار جداگانہ ہوتا ہے اس لئے اس حصول کار کی تدابیر کے تعین میں ان میں سیاسی فریق بن گئے ہوں۔ لیکن جن ممالک میں حصہ جات آبادی متشکل تمدنی اکثریت و اقلیت میں منقسم ہوں، وہاں صورت حال بالکل جداگانہ ہوگی، اس لئے کہ یہاں لوگوں کا فوری سطح نظر ملک کی بہتری نہیں بلکہ خود اپنی جماعت یا اپنے ”طبقہ“ کی بہتری ہوتی ہے۔ جس وقت ہم سیاسی فریق بندی پر نظر ڈالیں تو ہمیں یہ غور کرنا چاہئے کہ جو فریق بندی ہمارے پیش نظر ہے وہ محض طرز کار کے تنوع کی وجہ سے ہے یا اس کی بنیاد حقیقی تمدنی اختلاف ہے۔ اگر تمدنی اختلافات فریق بندی کی بنیاد ہیں تو پھر یہ دیکھنا پڑے گا کہ یہ اختلافات کس حد تک جڑ پکڑ گئے ہیں اور فریق کے مابین کسی قسم کا سمجھوتہ ممکن ہے یا نہیں۔ مثلاً ہندوستان کی صورت حال کو لیجئے، ہندوستان میں علاوہ چھوٹی چھوٹی ”اقوام“ کے دو بڑی بڑی ”قومیں“ یعنی ہندو اور مسلمان آباد ہیں اور گرو غالباً ہر مسلمانوں میں سے ۵۵ ہندو اجداد کی اولاد ہیں، لیکن مذہب زندگی پر کچھ ایسا اثر ڈالتا ہے کہ تمدنی اعتبار سے وہ اپنے ہمسایہ (اور بہت سی

ہندوؤں میں ایک جدی (ہندو بھائیوں سے بالکل مختلف ہو گئے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان کی مقصد جاعتوں میں ان کی نیابت کیسے ہو۔ علاوہ مشترکہ رائے دی کے اس کا دو طریقے ممکن ہیں اور دونوں طریقے اس ایک پر مبنی ہیں کہ ہندو اور مسلمان کس حد تک باہمی سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔ اگر دونوں کے درمیان دیوار آہنی حائل سمجھی جائے اور دونوں کا ملکی سطح نظر ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہو تو پھر ایسی حالت میں نیابتی جاعتوں کو ملک کا صحیح آئینہ بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ہر ایک کو جدا گانہ حق نیابت دیا جائے، تاکہ ہندو اپنے ہم خیال ہندوؤں کو اور مسلمان اپنے ہم خیال مسلمانوں کو رائے دیں۔ لیکن اس طرز کار میں کم سے کم دو خرابیاں ہیں؛ ایک تو ایسے صورتوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں (اور اکثر صورتیں ایسی ہی ہیں) وہاں عمومی دور میں شکل سے کوئی ایسی صورت پیدا ہونے لگی کہ مسلمان وزیر اعظم پورے اعتماد سے اپنے مدت عہدہ میں کام کر سکیں یا نیابتی ایوان کا بہرہ بن جائے؛ دوسرے، فریقین کے سامنے جو سطح نظر ہو گا وہ ملکی فلاح کا نہ ہو گا بلکہ اپنی ذاتی اور "قومی" بہبود کا ہو گا۔ تیسرے ممکن ہے کہ اس طرز کار سے انتخاب میں امن قائم نہ رہے، بالآخر ملک برابر دو بڑے بڑے سطح کیپروں میں منقسم رہے گا جو اس کے مفاد کے لئے بغاوت مناسبت نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں فریق آپس میں ذرا سمجھوتہ کریں کہ ملکی مفاد کی خاطر رائے دی میں ایک دوسرے کے ساتھ خائف رہیں گے، لیکن ایک دوسرے کی جدا گانہ حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے نیابتی مجلس میں ایک دوسرے کے لئے نشستوں کی ایک خاص تعداد محفوظ رکھیں گے۔ اس طرز کار میں ایک حد تک یہ فائدہ ہو گا کہ ہندوؤں کو

مسلمانوں کے احساسات کا اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے احساسات کا پاس و لحاظ رکھنا پڑے گا اور دونوں میں سے کوئی ملکی مفاد کو پس پشت نہیں ڈال سکے گا۔ تیسری شکل یہ ہے کہ بعض دوسرے ملکوں کی طرح یہ دونوں خالص سیاسی فریق بنائیں اور ایک طرف مل جل کر ملک کی ترقی کے لئے کام کریں تو دوسری طرف اپنے اپنے فریق کے مفاد کے لئے بھی کوشش کرتے رہیں۔ اگر یہ ہوا تو ان کی مغایرت کسی جداگانہ عمرانی سطح نظر کی وجہ سے نہیں رہے گی بلکہ جو بھی اختلاف ہو گا اس کا دار و مدار ملکی ترقی کے مقصد کے حصول کے طرز کا ہو گا۔

۱۹۳۵ء جیسے جنگ عظیم سے پہلے اور اس کے بعد حال کے ”بھٹکری“ حکومت تک جرمنی میں تھا جہاں دن کی بھر لوگ شہریوں کے دو فریق مستقل سیاسی گروہ تھے۔ ۱۹۳۵ء میں بھٹکے کے حکم سے یہ گروہ برخاست کر دیے گئے۔

۱۹۳۵ء میں ہما ناگا نڈی اور اچھوت جاتوں کے درمیان رائے دی اور انتخاب کے متعلق جبراً رضی نامہ ہوا تھا اور جسے انگریزی حکومت نے منظور کر لیا، وہ اس لئے دلچسپ ہے کہ اس میں غلط اور جداگانہ انتخاب کے اصول کے درمیان ایک اوسط راستہ قائم کیا گیا ہے اور کیا عجیب ہے کہ بالآخر دورانِ فکر کے لئے یہی سمجھوتہ ہندو مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لئے کارآمد ہو۔ اس سمجھوتے میں یہ قرار پایا ہے کہ ہر صوبہ میں اچھوت جاتوں کی نشستوں کی تعداد مقرر کر دی جائے، اور انھیں مختلف ایک رکنی حلقہ جات رائے دی تقسیم کر دی جائے، اس کے بعد اچھوتوں کے حلقے بنا کر فی نشست مقررہ چار امیدواروں کا انتخاب کیا جائے، اور ان چاروں کو تمام ہندوؤں کے سامنے پیش کرے اس سے (باقی صفحہ پر)

اب محض سیاسی اقلیتوں کے نیابت کے مسئلے پر غور کیجئے۔ یہ ظاہر ہے کہ اقلیتوں کی نیابت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ملک کو ایسے حلقوں میں تقسیم نہ کیا جائے جو ایک سے زیادہ قائم مقاموں کا انتخاب کرتے ہوں، ورنہ یہ ظاہر ہے کہ ایک ہی قائم مقام اکثریت اور اقلیت دونوں کا نائب نہیں ہو سکتا۔ سب سے پہلے جن سیاست دانوں نے اس مسئلے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی وہ انگلستان میں بیر اور بل اور ڈنمارک میں آندرے تھے، اور انھوں نے یہ طرز کار پیش کیا کہ بجائے لازمی حلقوں کے ملک کو اختیاری حلقوں میں تقسیم کیا جائے، یعنی شخص کو خواہ کہیں کاروبار والا ہو یہ اختیار ہے کہ جس امیدوار کو چاہے رائے دے، اور ہر امیدوار کو اختیار ہے کہ ملک کے جس کسی شخص سے چاہے اپنے لئے رائے دوائے، پھر جن لوگوں کے لئے زیادہ سے زیادہ پرچیاں پڑیں گی انھیں بقدر تعدد مطلوبہ کے منتخب شدہ سمجھا جائے گا۔ مثلاً اگر ہاری نیابتی جماعت میں ۱۰۰۰ ارکان اور ان کے لئے ۱۰ لاکھ رائے دہندے ہیں تو اول تو مختلف سیاسی فریق دس دس ہزار راپوں کے حلقے بنائیں گے، اور پھر اطراف ملک سے دس دس ہزار راپوں فی امیدوار حاصل کر لے گی کوشش کریں گے۔ یہی طرز کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ایک طرف تو کسی امیدوار کا تعلق براہ راست رائے دہندوں سے نہیں رہے گا، بلکہ جو کچھ

دقیقہ نوٹ ۱۹۶۶ء کا) ایک منتخب کر لیا جائے۔ اس اصول کا ایک اچھا عملی تجزیہ ”انجمن نیابت تناسبی“ *Proportional Representation Society* کے رسالہ ”مقامہ پونا“ *The Purna Pact* میں دیا ہوا ہے۔

بھی تعلق ہے وہ سیاسی جوڑ توڑ والوں اور بزنس لوگوں کا رہ جائے گا، اور دوسرے
چونکہ تمام انتخاب کا دار و مدار کلیتہً سیاسی فریق بندیوں پر ہوتا ہے اس لئے جو لوگ
منتخب ہوں گے وہ بجائے اعتدال پسند ہونے کے غالی ہوں گے اور ان کے
اصول میں وہ بہت دکشادگی گنجائش نہ ہوگی جو سیاسی کاروبار چلانے کے لئے لازمی
ہے۔

تناسبی نیابت۔ اصل میں بہتری کے طرز کار سے تناسبی نیابت کا
اصول اخذ کیا گیا کہ بجائے ایسے امیدواروں پر ارادے کا ضائع کرنے کے جو بوجہ
قلت آواز کے منتخب نہ ہو سکیں یا جو بوجہ بے حد اکثریت کے منتخب ہو جائیں بہرائے
دہندہ کو یہ اختیار ہو کہ وہ جیتوں کا ایک سلسلہ اپنی مرضی پر قائم کر سکے، یعنی اگر اس کے
نزدیک جو بہترین امیدوار "الف" ہے اسے اس کی رائے کی ضرورت نہ ہو تو پھر
اس کی رائے ترجیح نمبر "ب" یعنی "ب" کو مل جائے تاکہ کسی حالت میں اس رائے
دہندہ کی رائے ضائع نہ جائے۔ اس کے ساتھ ہی عام طور سے یہ اصول بھی پیش نظر
رکھا جاتا ہے کہ باوجود ایسے حلقے مقرر ہونے کے جن کی طرف سے کسی کی رائے
منتخب ہوئے ہیں، ہر رائے دہندہ کو صرف ایک ایک رائے دینے کا اختیار ہو
تاکہ اکثریت والے اعتدال سے زیادہ نہ بڑھنے پائیں۔ الغرض نیابت تناسبہ
کا جو طریقہ سب سے زیادہ پسندیدہ ہے وہ یہ ہے کہ ملک کو بڑے بڑے حلقوں

بہتری کے طرز کار پر تجویز نے اپنی کتاب "دستور انگلستان" Bagshot: The
English Constitution باب ۵ میں فصل بحث کی ہے۔

یہ تقسیم کیا جائے اور ہر حلقے کی طرف سے چار چار پانچ پانچ یا اس سے زیادہ اراکین کے انتخاب کا حق دیا جائے لیکن ہر رائے دہندہ کو صرف ایک رائے کا حق حاصل ہو۔ رائیں ضائع نہ ہونے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے کہ ہر حلقے کے حملہ رائے دہندوں کی تعداد کو جملہ نشستوں کی تعداد میں ایک ملا کر اس پر تقسیم کر لیا جاتا ہے اور جس کسی امیدوار کے حاصل تقسیم کے برابر رائیں آئیں وہ اس کے انتخاب کے لئے کافی سمجھی جاتی ہیں اور اس سے زیادہ جو رائیں اس کی پرچوں میں ہوں وہ رائے دہندے کے دوسری ترجیحوں کو دیدی جاتی ہیں اور ان کی تقسیم میں وہی تناسب اختیار کیا جاتا ہے جو کسی امیدوار کی پرچوں کے دوسری ترجیحوں کا ہو تا ہے۔ اس کے بعد وہی عمل ہو تا ہے جو امیدوار اول کے ساتھ ہوا یعنی جس کے لئے حصہ رسی کے برابر رائیں آئیں وہی منتخب ہو گیا۔ یہ وہ طرز انتخاب ہے جسے ”تناسبی نیابت“ بذریعہ واحد قابل انتقال رائے کہتے ہیں اور جو باوجود رسی پیچیدگی کے روز بروز نئے نئے ملکوں میں رائج ہو رہا ہے۔

لٹد اس موضوع پر برگ و بالیٹ نے اپنی کتاب ”نیابت متناسب“: Hoag & Hallet: Proportional Representation میں بہت وضاحت و روشنی ڈالی ہے، نیز دیکھو لیکن نیابت متناسب کی رد و بابت انتخاب آئرستان ۱۹۳۳ء۔
Proportional Representation Society: Irish Free State General Election 1933.
لٹد آئرستان کے پچھلے انتخاب میں جو تناسب قائم ہوا اس کا مقابلہ انگلستان کے (تقریباً متناسب)

اس کے علاوہ دوسرے طریقے اقلیتوں کے نیابت کے بھی ہیں، مثلاً وہ طریقہ جو سوئٹزرلینڈ اور بھیم میں رائج ہے جس کی رو سے ہر فریق بنی بنائی ترجیحوں کی فہرستیں پیش کرتا ہے اور رائے دہندہ محض فہرستوں پر رائے دیتا ہے۔ اس میں بڑا نقص یہ ہے کہ رائے دہندہ کی آزادی کم ہو جاتی ہے، اور گواہی سے اختیار ہوتا ہے وہ چاہے تو ترجیحات بدل دے، لیکن وہ ملی العموم ایسا نہیں کرتا۔

بہت سے سیاسوں نے اس طرز کار کی مخالفت کی ہے اس لئے کہ ان کے نزدیک بڑے بڑے حلقوں میں اُمیدوار اور رائے دہندے کے درمیان روابط ہونا مشکل ہو جائے گا، عمومی حکومت کا جو براہ راست تعلق رائے دہندوں کے ساتھ ہونا چاہئے وہ نہیں رہے گا۔ اور فی نفسہ اس طرز کار کی پیچیدگی ہی اس کی ترقی میں ایک رکاوٹ ہے۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر عمریت کے معنی یہ ہیں کہ جو نیابتی مجلس ہو وہ ملکی عام رائے کا آئینہ ہو اور اس عام رائے کی چھوٹی سی تصویر ہو تو پھر اس سے بہتر معتدل قائم مقاموں کے منتخب کر لئے کا کوئی طریقہ اس وقت تک ایجاد نہیں ہوا، نقائص ہر انسانی طرز کار میں ہیں یہ دیکھنا چاہئے کہ کم سے کم نقائص کس طرز کار میں پائے جاتے ہیں۔

(ڈیٹریٹ ۱۹۲۹ء) عدم تناسب سے کیا جائے جس کا ذکر اوپر حاشیہ میں کیا گیا ہے۔

وزارت (ڈی ڈی)	تعداد آراء	تعداد نشستہاں
۴ لاکھ ۷۰ ہزار	۸۵	۸۵
۶ لاکھ ۱۵ ہزار	۶۸	۶۸

۱۹۲۸ء تا بنی نیابت کی تنقید کے لئے دیکھو لاسکی، حسب بالا، ۲۸۔

معیار امید واری - یہ تو رائے دہندوں کے معیار رائے دہی کا مسئلہ ہو؟
 جہاں تک امیدواران انتخاب کا تعلق ہے، عام طور پر ان کا معیار بجا ط عمر، دولت،
 تعلیم و سکونت رائے دہندوں سے اکثر ذرا زیادہ ہوتا ہے اور بعض ممالک میں
 تو ارکان مقننہ کے معیار میں اس قدر احتیاط برتی جاتی ہے کہ ان کے انتخاب کنندے
 خود منتخب شدہ ہوتے ہیں تاکہ انھیں مجلس مقننہ کے لئے چنا جائے وہ قطعی طور پر ان کے
 سے زیادہ قابل اور زیادہ ممتاز ہوں۔ لیکن اس دوسرے انتخاب کے طریقے میں
 چند نقائص میں جن میں ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اول تو جو لوگ ابتدائی رائے دہندے
 ہوتے ہیں ان کا ارکان کے ساتھ کوئی خاص تعلق ممکن نہیں ہوتا ہے۔ دوسرے
 جہاں سیاسی فریق بندی کے روابط زیادہ سخت ہیں وہاں پہلا انتخاب محض رسمی رہ جائیگا
 اس لئے کہ انتخاب کنندے دوسرے انتخاب کے لئے رائے دینے کے وقت لازمی
 طور پر اپنے فریق والوں ہی کو رائے دیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے جیسا کہ پہلے سے
 مسئلہ ۱۷ تک ہندوستان میں دستور تھا کہ نیابتی مجالس کے اراکین کا انتخاب مجالس
 بلدیہ اور دوسری مقامی مجالس کریں، لیکن اس طرز میں یہ مشکل ہے کہ جو لوگ ان مقامی
 مجالس کے لئے منتخب ہوں گے وہ زیادہ تر اس لئے منتخب ہوں گے کہ وہ مقامی
 ضروریات وغیرہ سے واقف ہوں گے اور یہ ضروری نہیں کہ انھیں سیاسی معیار جانچنے
 یا کسی قانون ساز جماعت کے اراکین چننے کی اہلیت ہو۔ انقض دوسرے انتخاب
 کا طریقہ ان ممالک میں مفید ہوگا جہاں ابتدائی رائے دہندوں کو کافی تجربہ نہیں، ورنہ

۱۷۲ یہ طریقہ مصر اور ترکی میں رائج ہے، نیز اسی پر ۱۷۳ء تک روس میں بھی عمل ہوتا تھا۔

علی العموم یہ ان ممالک میں زیادہ مقبول نہیں ہے جہاں نیا بتی طریقہ مدت سے کارفرما ہے۔

ضابطہ منظوری۔ آج کل کے زمانے میں قانون روزمرہ کے بود و ماند کے مسائل پر اس درجہ حاوی ہو گیا ہے اور اس کا دائرہ اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ یہ تقریباً ناممکن ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں مسودات قانونی کے ہر پہلو پر تمام نیا بتی جماعت مقننہ غور کر سکے، اور بالفرض اگر غور ممکن ہو تو یہ لازماً سرسری ہوگا۔ اس نقص کے دور کرنے کے لئے اول تو لامرکزیت کے اصول پر عمل کر کے بہت سے معاملات مقامی ادارات (مثلاً مجالس بلدیہ) کے سپرد کر دئے جاتے ہیں، اور دوسرے ہر شرعی نیا بتی مجلس کو مختلف ذیلی مجالس میں منقسم کر دیا جاتا ہے جس میں قانون سازی کے کسی نہ کسی مرحلہ پر مسودہ بھیج دیا جاتا ہے، تاکہ وہ اس پہلو پر سے طور پر غور کر کے مکمل ایوان کو اپنی رائے سے آگاہ کریں۔ یہ مجالس اکثر نسبتاً مختصر تعداد (۱۵، ۲۰) اراکین پر مشتمل ہوتی ہیں اور زیادہ تر اس میں مختلف سیاسی گروہوں کے نیابت کا اصول برتا جاتا ہے۔ ساتھ ہی یاد رکھنا چاہئے کہ گویا ذیلی مجالس ہی چھان بین کرتی ہیں لیکن منظور یا نامنظور کرنے کا اختیار ایوان ہی کو ہوتا ہے، غیر مفید قانون سازی کو روکنے کی غرض سے اکثر ممالک میں ہر ایک مسودہ کی کئی کئی خواندگیوں ہوتی ہیں۔ اور آخری خواندگی کے بعد ہی مسودہ منظور سمجھا جاتا ہے۔ حال کے زمانے

۲۵ مثلاً انگلستان کے دارالعوام میں ہر مسودہ کی منظوری کے لئے مفصلہ ذیل درج سے گزرنے کی ضرورت ہے۔

بقیہ نوٹ ص ۳ پر

میں بعض سیاست دانوں، مثلاً لاسکی اور ونسٹن چرچل نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اب سیاسیات مختلف مسائل زندگی پر اس قدر عادی ہو گئی ہیں کہ پارلیمنٹ کے اراکین کو ان میں سے بعض مسائل پر بحث کرنے کی اہلیت نہیں ہے اس لئے کہ وہ زیادہ تر اپنی لفظی اور خطابیت کے زور پر منتخب ہوتے ہیں، اور اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ وہ بالائزہم ایسے مسائل جیسے کوئی اہم بین الاقوامی مسئلہ یا عالمگیر معاشی مسئلہ، یا کسی ملٹی نیشنل پر کسی صاحب رائے کا اظہار کر سکیں اسی اصول کے تحت لاسکی جیسے سیاست دانوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ پارلیمنٹ کے تحت ایسی ذیلی مجلس ہونی چاہیے جو زیادہ تر فنی مبصرین پر مشتمل ہوں، اور ایسے مسائل کے متعلق جو ان فنون سے متعلق ہوں ان کو ان کے رائے کا دار و مدار ان مجلس

(۱) صدر کی اجازت؛

(۲) پہلی خواندگی، برائے نام؛

(۳) دوسری خواندگی، مباحثہ؛

(۴) ذیلی مجلس کے سپردگی، مکمل مباحثہ؛ روداد کی پیشی؛

(۵) تیسری خواندگی، برائے نام؛

(۶) دارالام کو ارسال۔

لنڈن دیکھو فنٹن چرچل کا خطبہ جو انھوں نے ایکٹمر ایونیورسٹی کے لارڈز پر منتخب ہونے کے وقت پڑھا اور جو ان کے جریدہ "ٹائٹلیم" *The Student* (۱۱ مارچ ۱۹۳۹ء) میں طبع ہوا ہے، نیز دیکھو لاسکی، "صرف و نحو سیاسیات" باب ۸، حصہ ۳

کی مبصرانہ رائے پر مبنی۔

جماعت عالمہ کی ذمہ داری۔ عاملانہ ذمہ داری کے تحت ہمیں دنیا کی جماعت ہائے مقننہ کو تین شعبوں میں تقسیم کرنا پڑے گا، ایک تو وہ مقننہ جو ملک متحدہ امریکہ کی طرح جماعت عالمہ سے بے تعلق ہے جس میں وزیرانہ نشست کرتے ہیں نہ اس کے سامنے ذمہ داری ہے؛ دوسری وہ مقننہ جس میں فرانس کی طرح بہت سے گروہوں کے مابین ہمیشہ ایک طرح کی ساکس سی ہوتی رہتی ہے؛ تیسرے وہ مقننہ جہاں، انگلستان کی طرح، دو اہم سیاسی گروہ ہیں اور وزارت کا دار و مدار کم و بیش مستقل اکثریت پر ہوتا ہے۔ پہلی قسم کے ایوان کا بڑا بھاری نقص یہ ہے کہ ایوان کو اعداد و شمار اور موجودہ قوانین کے نقائص معلوم کرنے کا، کوئی موقع حاصل نہیں ہوتا؛ دوسرے یعنی فرانسیسی طریقے میں نقص یہ ہے کہ وزارت کی حالت ہمیشہ ڈانٹاں ڈول

۱۷ تقریباً اسی قسم کا بلکہ اس سے زیادہ بڑے ہوئے خیال کا اظہار رائٹ آرمیل نو اسپر جیڈر نواد جنگ بھار نے اپنے نہایت ہی پر مغز خط جملہ تقسیم اسناد جامعہ عثمانیہ جیڈر آبادکن ۱۳۴۴ھ میں ظاہر کیا تھا جہاں وہ فرماتے ہیں کہ حکومت کے پاس ”ایسے ذرائع ہوں کہ اہم معاملات میں اسے یہ معلوم ہو سکے کہ جوئی پلیسی وہ اختیار کر لے دلی ہے اس کے متعلق ان لوگوں کا کیا خیال ہے جن پر اس کا سب سے زیادہ اثر پڑے گا اور وہ اس کے متعلق کیا تجاویز پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرف یہ مفاد عامہ کے تحفظ کی بڑی اچھی صورت ہوگی کہ خاص خاص طبقوں کے نمائندوں سے یہ دریافت کیا جاسکے کہ مسائل قانون کا کیا اثر پڑ رہا ہے، انھیں اس کی عمل درآمد میں کیا نقص نظر آتے ہیں اور ان کے نزدیک ان کے نقائص کے دور کرنے کی کیا تدبیریں ہو سکتی ہیں۔“

رہتی ہے اور اسے وہ اطمینان حاصل نہیں رہتا جو ملک کے لئے لازمی ہے، اور تیسرے
یعنی ”انگریزی“ طرز میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ جب ایک دفعہ ایوان کا انتخاب
ہو گیا اور وزارت بن گئی تو پھر ”خانگی رکن“ یعنی اس رکن کی آداوی سلب ہو جاتی ہے
جس کا وزارت سے تعلق ہے لیکن جسے بدقسمتی سے وزارت کا کوئی عہدہ نہیں ملا۔ ایسے
مکملوں میں وزارت کچھ تو اپنی مستقل اکثریت کی وجہ سے، جو سالہا سال رہتی ہے،
اور کچھ قواعد مباحثہ کی وجہ سے، ذلت پارلیمنٹ تک خود مختار ہوتی ہے۔ بہر حال
ان تینوں میں سب سے طاقتور مقننہ فرانسیسی مقننہ ہے، گو وہ جا رہے جا رہے عالمانہ
انتظامات میں ڈیل ہو کر وزارت کو بیکار کر دیتی ہے۔ بظاہر وہی طرز قانون سازی بہترین
معلوم ہوتا ہے جہاں مجلس قانون ساز امریکہ کی طرح جماعت عالمہ سے آزاد ہو اور وزراء
کو اس میں رائے دینے کا حق نہ ہو لیکن جس میں وزارت نشست ضرور کریں اور جس
معلومات کی مجلس کو ضرورت ہو اسے ہم پہنچائیں۔

براہ راست قانون سازی۔ اب ہم اس طرز کار پر آتے ہیں جسے
”براہ راست قانون سازی“ کہنا چاہئے اور جو بعض ممالک میں قانون سازی اور دستور
سازی کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ براہ راست قانون سازی کے تین طریقے ہیں، ایک
”تحریک گزاری“ دوسرے فیصلہ طلبی، تیسرے برخواست۔ یہ تینوں طریقے دراصل
اسی عدم اعتبار کا ایک مظاہرہ ہیں جو نیابتی مقننہ کے خلاف پیدا ہو گیا ہے۔ مثال کے
لئے دیکھئے، جو انقلاب فرانس کا پیشرو اور عمومی اصول کا ایک بہت بڑا گرو گذرا ہے، اپنی
کتاب ”معادہ معاشری“ میں کہتا ہے کہ اصل عوامیت وہ ہے جو براہ راست ہو،
یعنی جس میں لوگ براہ راست قانون سازی وغیرہ میں حصہ لیں، اس لئے کہ نیابتی جماعتوں کا

راے دہندوں سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا اور ان میں وہی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو بادشاہی اور جمہوری حکومت میں پائی جاتی تھیں۔ یہی اصول ہے جس کی بنا پر وہ کہتا ہے کہ انگلستان میں راے دہندے صرف پارلیمنٹ کے انتخاب عامہ کے وقت آزاد رہتے ہیں اور پھر غلام کے غلام بن جاتے ہیں۔ بہر حال آج کل کے عظیم الشان ملکوں اور انتہا درجہ پیچیدہ حکومتوں میں یہ تو ناممکن تھا کہ ہر قانون پر عوام الناس بحث کرتے اور اسے منظور یا نامنظور کرتے، لیکن قانون سازی پر عوام کے اثرات اور اس پر ان کا قابو پیدا کرنے کے تین طریقے نکالے گئے ہیں جو ایک سے زیادہ ممالک میں رائج ہو گئے ہیں۔

حق تحریک گزاری اس حق کو کہتے ہیں جو راے دہندوں کی ایک خاص تعداد کو حاصل ہوا اور جن کے تحت وہ مقننہ میں براہ راست، یعنی بغیر کسی قائم مقام یا وزیر کے کے واسطے کے، دستور یا کسی دوسرے قانون میں ترمیم پیش کر سکیں۔ یہ حق محض شریک تک محدود ہوتا ہے۔ اس کی سب سے ممتاز مثال سویٹزرلینڈ کے وفاقی اور ریاستی وساتیر میں ملتی ہے جہاں مرکزی دستور کی ترمیم کے لئے پچاس ہزار راے دہندوں کو تحریک کرنے کا حق حاصل ہے اور (علاوہ جینوا کے) کنکیشن میں راے دہندوں کی ایک خاص تعداد اسی طرح دستوری ترمیم کی تحریک کر سکتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ سلاوہ تین کنکیشنوں کے ہر ایک کنکیشن میں راے دہندوں کی ایک خاص تعداد معمولی قوانین کی تحریک بھی کر سکتی ہے۔

اس کے برعکس فیصلہ طلبی ایک منفی حق ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ چند خاص شرائط کے تحت دستوری ترمیمیں اور اہم قوانین کی ترمیمیں رائے دہندوں کے سامنے براہ راست پیش ہوں اور ان کی کثرت رائے کے موافق یا مخالف فیصلہ کرنے کا قطعی اختیار ہو۔ فیصلہ طلبی کا قاعدہ متعدد ممالک میں رائج ہو گیا ہے۔ جن میں سے اس موقع پر سوویتان اور آسٹریلیا کی مثال دینی کافی ہوگی۔ اس کی دو قسمیں ہیں ایک تو لازمی فیصلہ طلبی یعنی وہ شکل جس کے تحت ایک خاص نوع کا ہر مسودہ مثلاً ترمیم دستور (لازمائے رائے دہندوں کے سامنے پیش ہو؛ اور دوسرے اختیاری فیصلہ طلبی یعنی وہ شکل جس کے تحت اگر ایک خاص تعداد رائے دہندوں کے خواہش ظاہر کرے تو پھر مسودہ جملہ رائے دہندوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ ترمیم دستور کے لئے لازمی فیصلہ طلبی سوویتان کے وفاقی اور ریاستی و ساتیر میں آسٹریلیا کے دستور میں اور ^{۱۹۷۱} سال کی تبدیلیوں سے پہلے کے جرمانی دستور میں پایا جاتا ہے۔

لٹھل میں غور کیا جائے تو اس اصول کا تعلق انسان کے ابتدائی جذبے سے ہے جس کے تحت وہ کسی ایسی چیز کو تسلیم کرنے میں پس و پیش کرتا ہے جو اس کی پسند نہ ہو۔ تاریخی اعتبار سے اس کا تعلق ہندوستان قدیم کی ”مبھا“ ایچنڈر کی ”اکلیڈیا“ اور قدیم جرمانیہ کی ”مجلس دیمہ“ سے ہے جن میں ہر اہم قانون پر رائے دینے کے لئے جملہ حاکم و تابع ذکر کسی درخت کے نیچے نشست کرتے تھے؛ اور آج بھی سوویتان کی بعض کمیٹیوں میں بھائے کسی نیاجی جماعت کے سال میں ایک مرتبہ جملہ شہریوں کا جلسہ ہوتا ہے؛ اسی میں قانون منظور ہوتے ہیں اور جماعت عالمہ کا انتخاب ہوتا ہے۔

اور کہیں کہیں ممالک متحدہ امریکہ کی ریاستوں اور بلدیات میں بھی اس کا پتہ لگتا ہے۔
 حق برخواست وہ حق ہے جس کے تحت اگر رائے دہندوں کی اکثریت
 چاہے تو کسی عہدہ دار کو برخاست کر سکتی ہے، گو اس مسئلے پر اس وقت تک ملے
 نہیں لی جاتی جب تک ایک خاص تعداد رائے دہندوں کی اس کے لئے تحریک نہ
 کرے۔ یہ طریقہ ممالک متحدہ امریکہ کی بعض ریاستوں میں رائج ہے اور ان میں سے
 بعض میں تو عا دوں تک کو اس طرح سے برخاست کیا جاسکتا ہے۔ عسلا وہ ان
 دلائل کے جو براہ راست قانون سازی کے خلاف پیش کئے جاتے ہیں اور جن کا مختصر
 اعادہ اگلے پارہ میں کیا جائے گا، یہ خاص طریق نہایت ہی نقصان رساں ہے،
 اور بجائے اس کے کہ اس سے کسی طرح کی خوش انتظامی ہو، اس سے طرح طرح کی
 رشوت ستانی اور بخلی کا بازار گرم ہونے کا اندیشہ ہے۔

براہ راست قانون سازی خواہ کتنی ہی دل خوش کن کہوں نہ ہو، یہ ایک واقعہ
 ہے کہ نسبت کم ہی ایسے ممالک میں جہاں یہ رائج ہے، اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ
 اول تو عوام کو قانون سازی جیسی پیچیدہ چیز میں دلچسپی نہیں (حساب لگایا گیا ہے کہ کینٹان
 میں جو فیصلہ طلبی ہوتی ہے ان میں ۵۰ فیصدی سے بھی کم رائے دہندے حصہ لیتے ہیں)
 دوسرے یہ ظاہر ہے کہ فیصلہ طلبی یا تحریک گذاری میں جو لوگ حصہ لیتے ہیں ان میں بحث و جملہ

میں تفصیل کے لئے دیکھ لوں "براغلی یورپ میں حکومتیں اور سیاسی گروہ" *Lowell:*

*Governments and Parties in
 Continental Europe,*

کا موقعہ ملتی نہیں ملتا اور وہ صرف ان موافق و مخالفت دلائل پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں جو پرچی میں کسی مسودہ کے متعلق لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے دوسرے الفاظ میں یہ معنی ہوئے کہ جو بات کہ جماعت مقننہ میں دلوں، اور بعض مرتبہ ہفتوں کے مباحثہ کے بعد طے پاتی ہے اس رائے و ہندوں کو غور کرنے کا گویا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ بھر براہ راست قانون سازی کی ترویج سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ جن لوگوں کا خیال تھا کہ ان طریقوں کے رائج کر لے سے قانون سازی میں ترقی ہوگی وہ غلطی پر ہیں، اس لئے کہ جہاں بھی اس کا رواج ہے وہاں کی رائے بجائے ترقی پسندی کے قدامت پسندی کی طرف زیادہ مائل اور جلد جلد تبدیلیاں کرنے کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔

یہ تو براہ راست قانون سازی کے طریقے ہوئے، عام رائے مصدوم کرنے کو، خصوصاً جب وہ کسی عاملہ فعل کے بابت ہو، منشا طلبی کہتے ہیں منشا طلبی کی بڑی بڑی تاریخی مثالیں وہ ہیں جب نپولین اعظم نے، اور اس کے بعد نپولین سوم نے نئے و ساتھ شائع کرنے سے پہلے اور اپنے قبضے میں باضابطہ اقتدار لینے سے پہلے منشا طلبی کی تھی، یعنی فرانسیسیوں سے ان کی رائے دریافت کی تھی۔ حال کے زمانے میں جنگ عظیم کے بعد یورپ میں جگہ جگہ منشا طلبی کی گئی، مثلاً ٹیسوگ میں منشا طلبی اس مسئلے کی بابت کی گئی کہ وہاں کے باشندے جرمنی کے ماتحت رہنا چاہتے ہیں یا ڈنمارک کے۔ اور ۱۹۴۵ء میں وادی سار میں یہ منشا طلبی کی گئی کہ وہاں والے انجمن اقوام کے ماتحت رہنا چاہتے ہیں یا جرمنی کے ماتحت، یا فرانس کے۔

علاوہ براہ راست قانون سازی (اور دستور سازی) کے بعض (حاشیہ ۴ پر)

اصولی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں نیا بتی جماعتوں کے رحم پر نہیں چھوڑا جانا چاہئے
 ملک متحدہ امریکہ میں کسی جماعت کو اس کا آئینہ نہیں کہ جمہوری طرز حکومت کے
 بجائے لوکی طرز قائم کرے، اور لاسکی کی رائے میں عام معافی دینے کے مسئلے
 کو کسی عمومی جماعت کے سپرد کرنا خالی از خطرہ نہیں ہے۔ نیز اس قسم کی جماعت کو
 یہ حق نہیں ہونا چاہئے کہ وہ کوئی ایسا قانون بنا لے جس کا اثر واقعات سالہ پر
 پڑتا ہو، مثلاً "بغروت پنجاہ" ۱۹۱۹ء کی طرح فوجی قانون کو تاریخ نفاذ سے
 پہلے نافذ فرض نہیں کرنا چاہئے تاکہ اس میں ایسے مقدمات شامل ہو جائیں جو معمولی
 طور پر اس میں شامل نہیں ہو سکتے۔ ساتھ ہی جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے یہ ایک واقعہ
 ہے کہ جس طرح پر اور جن خصائص کو لئے ہوئے اراکین جماعت متفقہ متحجب ہو گئے
 ہیں اس میں سے اکثر میں یہ قابلیت مشکل سے ہوتی ہے کہ آج کل کے بعض پیچیدہ
 مسائل مثلاً عالمگیر معاشی مسائل یا معاشری مسائل کو پوری طرح سے سلجھاسکیں پنچانچہ
 بعض سیاست دان ایسی ماتحت مجالس کے قیام کی رائے دیتے ہیں جو بمصروں پر
 مشتمل ہوں اور جن کی رائے کا نیا بتی پارلیمنٹ پر سے طور پر لحاظ کر لیتے ہیں۔

۱۵ دستور سازی کے لئے دیکھو باب ۲۱۔

۱۵ لاسکی حسب بالا، ۱۵ واقعہ یہ ہے کہ ان ہی اسباب کی بنا پر ان ملک تک میں جہاں پارلیمنٹی و نیا بتی حکومت
 گویا لوگوں کی گٹھلی میں پڑی ہے، روز بروز پارلیمنٹ سے باہر اس قسم کے ادارے قائم ہوتے جلتے ہیں
 جیسے آجروں اور مزدوروں کی باضابطہ سرکاری پنچائیں (آسٹریلیا میں) اعلیٰ معاشرتی مجلس جرمنی
 کے ۱۹۱۹ء والے دستور میں، اعلیٰ انتظامی جماعت (اطلی) میں نیز خارجی معاملات روز بروز
 پارلیمنٹ کے حدود سے باہر ہوتے جلتے ہیں۔

Examples of legislation

ضمیمہ باب ۱۵

تمثیلات مقننہ

فریڈ: برطانیہ کلاں و شمالی ایرستان، اجستان، فرانس، جاپان، اٹلی
دفاٹے: ملک متحدہ امریکہ، سوئیڈن، روس، ہندوستان

(الف) فریڈ۔

برطانیہ کلاں و شمالی ایرستان

دارالعوام۔

اہلیت رائے ڈی: قانون نیابت عام ۱۹۱۱ء، ہر مرد (اور ۱۹۲۸ء
کے بعد ہر عورت) جو کسی صوبے میں دس پونڈ تقریباً مالک، سالانہ کے مکان
میں سکونت پذیر ہو یا ایسی ہی دوکان میں کاروبار کرتا ہو، رائے دے سکتا ہے،
بشرطیکہ اسی صوبے میں پچھلے تین ماہ رہا ہو۔ نیز جامعات کی طرف سے انتخابات کے لئے

ملہ اس تہہ کا مواد نکل دوسری کتابوں کے "سالانہ مدبرین" *Statutory Year Books*
۱۹۲۵ء سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ سالانہ اس قسم کے مصلحت کے لئے بنائیت کا نام ہے۔ جو مواد
اس سے نہیں اخذ کیا گیا اس کا الگ حوالہ دیا گیا ہے۔

ہر طبیبانی رائے دے سکتا ہے۔ کوئی شخص دوسرے زیادہ رائیں نہیں دے سکتا، اور دواؤں کی صورت میں بھی ایک رائے کا دار و مدار قیام پر ہونا چاہئے۔ لارڈ، نابارغ، غیر ملکی، دیوالیہ، دیوانہ، یہ سب رائے نہیں دے سکتے۔ طرز شمار، اضافی اکثریت، لیکن جاسوائی قیام مقاموں کے انتخاب کے لئے تناسبی نیابت مع واحد قابل انتقال رائے کا طریقہ نافذ ہے۔

تعداد اراکین و مدت عہدہ: ۱۵۰-۶۱۵ سال کے لئے یا جب بھی پارلیمنٹ موقوف ہو۔

اقتیارات اراکین۔ آزادی تقریر، آزادی ذات، اندرونی انتظام کی آزادی، تنازعہ انتخابات کا تصفیہ۔

ضابطہ دارج منظوری قوانین کے لئے دیکھو حاشیہ ۲۶، بالا۔

درا لامرا

ارکان و تعداد: ۴۰۔ (۱) شاہی شاہزادے، تقریباً ۲۰، لیکن یہ حصہ نہیں لیتے؛ (۲) دینی موروٹی امرا، تقریباً ۶۴۰؛ (۳) حین حیاتی قانون امرا، ۷؛ لیکن یہ قانون سازی کے وقت شرکت نہیں کرتے، (۴) ایستانی امرا منتخب شدہ، ۲۸ حین حیات؛ (۵) اسکاچستانی امرا، منتخب شدہ، نامدت پارلیمنٹ (دارالعوام)؛ (۶) کینٹربرجی دیارک کے اساقف عظمیٰ؛ (۷) اسقف لندن؛ (۸) ۲۸ اساقف جو عمر میں باقی سب اساقف سے بڑے ہوں۔

دونوں ایوانوں کے باہمی تعلقات۔ قانون پارلیمنٹ (۱۵۰)۔

(۱) تمام مالی مسودات، اگر دارالامرا انھیں بلا ترمیم منظور نہ کرے تو بغیر اس کی

رضامندی کے انتظار کے " بادشاہ کے تختہ کے لئے بھیج دئے جاتے ہیں۔
 (۲) علاوہ مالی مسودات اور ایسے مسودات کے جن کے ذریعے سی پابلیشمنٹ
 کی مدت کو بڑھانا مقصود ہو یا جن میں دارالامرا ترکیب پر اثر پڑتا ہو، باقی ہر مسودہ
 بلا رضامندی دارالامرا بادشاہ کے تختوں کے لئے چلا جائے گا، (الف) اگر وہ دارالعوام
 کی مسلسل تین نشستوں میں پیش ہو کر دارالامرا میں جائے (ب) دارالعوام کی پہلی
 نشست کی دوسری خواندگی اور تیسری نشست کی تیسری خواندگی کے درمیان
 دو سال کا وقفہ ہو اور (ج) ہر نشست کے اختتام سے ایک ماہ پیشتر ہر مسودہ
 دارالامرا میں بھیج دیا جاسکے۔

ایکستان کی نئی مجلس سینات (۱۹۳۹ء) -۱

جملہ تعداد اراکین - ۶۰

صدر ایستات کے نامزد کردہ - ۱۱

دو جماعت کی طرف سے - ۶

ایوان زیرین کی طرف سے - ۲۱

مختلف شعبہ جات زندگی، تعلیم، زراعت،

مزدوری، صنعت و حرفت و تجارت،

تمدن و نظم و نسق کی طرف سے ۲۲

۶۰

مجلس سینات کو کسی مسودے کے نامتظیر کر کے کا اختیار نہیں لیکن وہ ۹۰ دن

تک اس پر غور کر سکتی ہے تاہم مدعو کیلئے ایوان زیریں کے پاس بھیج سکتی ہے۔

فرانس

دارالوکلار

تعداد اراکین ۱۵۶۔ ہر سال کے لئے ہر شہری مرد جس کی عمر ۲۱ سال کی ہو اور جو چھ ماہ تک کسی شہر یا کسی باخستیار بلدیہ میں رہا ہو اور فوج میں ملازم نہ ہو، اسے حق رائے دی جاتی ہے۔ ہر ۲۵ سالہ شہری امیدوار کنیت بن سکتا ہے۔ طرز انتخاب۔ کبھی نیابت تناسب کے اصول اور کبھی ایک رکنی حلقوں کے ذریعہ سے انتخاب ہوتا ہے۔ آج کل ایک رکنی حلقوں کا طریقہ رائج ہے اور ہر ضلع ایک ایک رکن کا انتخاب کرتا ہے۔

ضابطہ قانون سازی، سرکاری مسودے صدر جمہوریہ کے جانب سے، اور غیر سرکاری مسودے پہلے ایک ”مأموریت ہدایت“ کے سامنے جاتے ہیں اور اگر اس کی رائے خلاف ہو تو پھر چھ مہینے تک دوبارہ پیش نہیں ہو سکتے۔ ہر مسودہ کسی نہ کسی مستقل موقتی ذیلی مجلس کے سامنے جاتا ہے، اور اس مجلس کی روداد طبع ہر ارکان دارالوکلار میں گشت کرائی جاتی ہے۔ اس کے بعد ایوان میں دو خواندگیاں کم از کم ۵ روز کے وقفہ سے ہوتی ہیں۔

مجلس سینیات

حلقہ رائے دی میں حسب ذیل شامل ہیں: (۱) ہر کمیون (بلدیہ) کی طرف سے ایک خاص تعداد رائے دہندوں کی جو مجلس کمیون کے اراکان کی تعداد سے متساوی ہے (۲) ہر صوبہ کی طرف سے اراکین دارالوکلار۔ (۳) ہر صوبہ کے اراکین مجلس صوبہ

(۲) ہر صوبہ کے مختلف اضلاع کے اراکین مجلس ضلع۔
 سینا تیوں کی تعداد ۳۰۰ ہے۔ یہ نو نو سال کے لئے چنے جاتے ہیں اور ہر تیس سال ایک تہائی سینا تیوں کا انتخاب ہوتا ہے۔ امیدواروں کی عمر کم از کم ۲۰ سالہ ہونی لازمی ہے۔

اختیارات

دونوں ایوانوں کے اختیارات مساوی ہیں لیکن (۱) ہر مالی سہ ماہی پر پہلے دارالوکلہ میں غور ہونا چاہئے اور اس کی منظوری کے بعد یہ سینا ت میں پیش ہونا چاہئے۔
 (۲) ایوان وکلہ اس کی موقوفی سے پہلے ہمدردی پر یہ کہ سینا ت کی منظوری لینا لازمی ہے۔

جاپان

ایوان نمائین۔

۴۶ ارکان۔ ہر جاپانی مرد کو جس کی عمر ۲۵ سال کی ہو، اور جو اپنے حلقے میں

رہتا ہے (۲۱) فرانس میں کل ۸۴ ہزار کمین "یا ہدیا ت ہیں" اور ایسے رے و ہندوں کی تعداد ۴۴ تک ہوتی ہے۔

فرانس کے دستور کے لئے دیکھو "ڈروکسن"، "ملکت" Woodrow Wilson.
 The State باب ۱۔

Kitajawa: The Govern- ment of Japan.
 ment of Japan.

ایک سال رہا ہو، رائے دی کا حق حاصل ہے، لیکن درباری عہدہ داروں، پجاریوں اور پاوروں، طلبہ، ابتدائی مدارس کے اساتذہ، ٹھیکہ داروں اور عہدہ داران انتخاب کو رائے دی کا حق حاصل نہیں۔ ۳۰ سال سے کم عمر کا کوئی شخص منتخب نہیں ہو سکتا۔ حلقہ جات انتخاب بڑے بڑے ہیں اور واحد قابل انتقال رائے کے اصول پر عمل ہوتا ہے۔

ایوان امراء

۴۰۴ ارکان۔ ان میں حسب ذیل شامل ہیں:-

عمر بھر کے لئے: (۱) شہنشاہی خاندان کے بالغ شاہزادے، ۱۶؛

(۲) پرنس اور مارکوئیس جن کی عمر ۳۰ سال سے زائد ہو، ۱۵ + ۳۰؛

(۳) ۳۰ سال سے زائد عمر کے لوگ جنہیں شہنشاہ نے ممتاز درجہ

ملکی وجہ سے کابینہ کی رائے کے بموجب مقرر کیا ہو۔ ان کی تعداد

کبھی ۱۲۵ سے زائد نہ ہونی چاہئے۔

سات سال کے لئے: (۱) کاونٹ، دالی کاونٹ اور بیرن جن کی عمر ۳۰ سال سے زائد

ہو، ۱۰ + ۶۶ + ۶۶۔

(۲) شہنشاہی اکادمی کے نمائندے ۴۔

(۳) ہر صوبے کے دو یا ۲۰۰ اعلیٰ محامل ادا کر لے والوں کے

ایک یا دو قائم مقام، ۶۶۔

جملہ ارکان: خطاب یافتہ، ۲۱۱؛ بے خطاب، ۱۹۵۔

دونوں ایوانوں کے تعلقات

دوڑوں الیادوں کے اختیارات بالکل مساوی ہیں، سوائے اس کے کہ
موازنہ پہلے دارالنائین میں پیش ہوتا ہے۔ اگر کسی مسئلے پر دونوں اپنی اپنی جگہ اڑ
جائیں تو دونوں کے مساوی التعداد اراکین کی کانفرنس ہوتی ہے اور اس کا فیصلہ ملحق ہوتا ہے
الحی مجلس عظمیٰ؛

تقریباً ۲۵ ارکان، جن میں وزیر اعظم ایسے ارکان کا اضافہ کر سکتا ہے جنہوں
نے ملک کے لئے فاشی انقلاب کے لئے کارائے نمایاں انجام دئے ہوں۔
یہ ۲۵ ارکان حسب ذیل ہیں :- (۱) روم پر دھاوے کے ۴ سپہ سالار، تاجرات
(۲) ارکان باعتبار عہدہ ۱- ارکان کا بیٹہ ملکی، سینات و دارالنائین کے صدر مجلس علمی
کا صدر، فاشی جماعت کے معتد و نائب معتد اور بعض دیگر عہدہ دار،
(۳) بعض دیگر اراکین، تین سال کے لئے۔

اختیارات، فاشی مجلس عظمیٰ کو یا تمام اطالوی سیاسیات کا مرکز ہے۔
اس کی رائے لازماً حسب ذیل امور پر لی جاتی ہے: شاہی وراثت، باؤشاہ
لور وزیر اعظم کے اختیارات، سینات اور ایوان کی ترکیب و کاروبار، صنعتی و دیگر
اتحادیات سرکاری، پوپ سے تعلقات، ایسے عہد نامے جن کی رو سے اعلیٰ یا
اس کے مقبوضات کی آراغی میں کمی ہوتی ہو۔ سب سے اہم فرض یہ ہے کہ

۵۵ دیکھو ٹی لائی، اطالوی شخصیات، ملکیت Pitigliani : The Italian

Corporative State. باب ۱۵۔

یہی مجلس دارالوکلار کے امیدواروں کی فہرست تیار کرتی اور رائے دہندوں کے سامنے پیش کرتی ہے۔

ایوانِ وکلار

۲۵ ارکان ۵۵ سال کے لئے حق رائے دہی ۲۱ سالہ مردوں یا ۱۸ سالہ ایسے مردوں کو حاصل ہے جو شادی شدہ ہوں یا ایسے رٹڈ وے ہوں جن کے بیٹے موجود ہوں۔ ہر رائے دہندہ کو کسی پیشہ بھکا چندہ یا سولیہ (تقریباً ۵۵ روپے) سے زیادہ دوسرا کوئی محصول ادا کرنا ضروری ہے۔ تنخواہ یا بون اور وظیفہ یا بون کو حق رائے دہی حاصل ہے۔

صرف ۲۵ سالہ شہری امیدوار رکنیت ہو سکتے ہیں۔

دارج انتخاب: ۱) تمام ملک رقبہ داری نہیں بلکہ طبقہ داری حصوں میں منقسم ہے۔ ملک کی تیرہ بڑی بڑی پیشہ بھکائیں ۸۰۰ نام اور بعض بڑے بڑے تمدنی یا تعلیمی ادارے ۲۰۰ نام پیش کرتے ہیں؛ (۲) ان ۱۰۰۰ ناموں میں سے فاشی مجلسِ عظمیٰ ۲۰۰ چن لیتی ہے؛ (۳) ان ۲۰۰ کو رائے دہندوں کے سامنے نظر کیا یا منظور کی گئی ہے؛ (۴) نام منظور کی صورت میں از سر نو فہرستیں تیار کرنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔

مجلسِ سینیات

اس میں حسب ذیل شریک ہیں (۱) ۲۱ سالہ شاہزادے؛ (۲) ۲۵ سال کی عمر تک رائے نہیں دے سکتے؛ (۳) غیر معین تعداد ارکان جن کی عمر کم از کم ۲۵ سال کی ہو؛ جنھوں نے سیاسیات، ادبیات یا دوسرے کسی افادہ شہہ زندگی میں نام

پیدا کیا ہو، جو تین ہزار لبر کے (تقریباً ۱۰۰ روپیہ) سالانہ کے محصل دیتے ہوں اور جنہیں بادشاہ نے سیناتی مقرر کیا ہو۔ اس وقت سینانیوں کی تعداد ۶۷۳۷۶ ہے جس میں ۸ شاہزادے ہیں۔

(ب) وفاقی ممالک متحدہ امریکہ - مرکزی مقننہ؛ دو دیوان، ایوان ناہین، سینات۔

ایوان ناہین؛
اہلیت رائے وہی ہے۔ ہر ریاست میں جو اہلیت اس ریاست کے ایوان اول کے اراکین کے انتخاب کے لئے ہے وہی اراکین۔ مرکزی ایوان ناہین کے لئے ہے، لیکن دستور کے تحت ہر کسی قسم کا جنسی یا نسلی امتیاز نہیں ہونا چاہئے۔ بعض ریاستوں میں پڑھنا، بعض میں سکونت دہن ماہ سے ۲ سال تک، بعض میں شہریت اور بعض میں شہری بننے کا خیال وغیرہ کافی تصور کئے جاتے ہیں جنوبی ریاستوں میں ”رنگینوں“ کو عملاً حق رائے دہی حاصل نہیں ہے رائے دہندوں کے لئے ۲۱ سال کی عمر کی قید ہے۔
اہلیت رکنیت؛ ۲۵ سال کی عمر، ۷ سال کی شہریت جس ریاست کا قائم مقام ہو اسی میں سکونت۔

تعداد اراکین ۱۰۴۳۵؛ دو سال کے لئے ہر نائب (رکن) ایک ایک رکنی حلقے سے جس کا تعین ہر ریاست اپنے طور پر کرتی ہے۔

اندرونی تنظیم و مدارج قانون، مستقل ذیلی مجالس جن کی رکنیت کے سلسلہ مختلف سیاسی گروہوں کی طرف سے اُمیدوار پیش ہوتے ہیں اور ایوان ان میں سے انتخاب کرتا ہے۔ انھی مجالس کے سپرد مختلف مسودات کی چھان بین کا کام ہے اور یہی عالمہ اور مقننہ کے درمیان ایک طرح کا رابطہ پیدا کرتی ہیں۔

مجلس سینیات ۱۹۶۱ اراکین؛ ایک وفاقی جماعت ہے۔ اس میں ہر ریاست سے ۲۱ اراکین نشست کرتے ہیں جن کا انتخاب تناسبی نیابت کے اصول پر ریاست کے رائے و منہدے کرتے ہیں۔ یہ چھ چھ سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں اور مجلس کے ترمیم کے حصے کا انتخاب دو دو سال بعد ہوتا ہے۔

اختیار رات سینیات (۱) قانون سازی۔ علاوہ مالی مسودوں کے اس کے اور ایوانِ نائبین کے اختیار رات بالکل مساوی ہیں۔ مالی مسودات کی ابتدا صرف دارالنائین ہی میں ہوتی ہے۔ لیکن مجلس سینیات جو ترمیم چاہے کر سکتی ہے۔ (۲) علامہ؛ مجلس سینیات کے ۱۲ راکے کے بغیر کوئی عہدہ نامہ مرقعہ نہیں بھا جاتا۔ نیز اسے اختیار ہے کہ صدر جمہوریہ جس عہدہ دار کو مقرر کرے اس کے تقرر کو نامنظور کر دے۔

(۳) عادلانہ؛ اگر کسی عہدہ دار کا ایوانِ نائبین مواخذہ کرے تو وہ مواخذہ مجلس سینیات کے سامنے پیش ہوگا۔

ریاستی قانون ساز جماعتیں

ان کے انتخاب وغیرہ میں وہی اصول برتے جاتے ہیں۔ جن پر مرکز میں عمل ہوتا ہے۔ ہر ریاست میں دو ایوانی مقننہ ہوتی ہے، اکثر میں اوپے ایوان کے حلقہ جات نیچے ایوان کے حلقہ جات انتخاب سے بڑے ہوتے ہیں۔ اوپے ایوان مرکزی سینات کی طرح ”سلسل“ ایوانات میں۔ معیار کمریت ہر ریاست میں جداگانہ ہے۔

سویٹان۔ مرکزی مقننہ :-

نیچا ایوان ”مجلس قومی“، اس میں ہر بیس ہزار کی طرف سے ایک رکن ہوتا ہے۔ لیکن حلقہ جات رائے ریاستی حدود کو نہیں کاٹتے۔ اس وقت ۱۸۷ اراکین ہیں، جو رائے دہی عامہ کے اصول پر تین تین سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں اور نیچا ایوان ”مجلس اجزاء“، کینیٹن سے دو دو اور ہر نصف کینیٹن سے ایک ایک رکن۔ اس مجلس میں ۴۲ اراکین ہیں۔ کینیٹن کو اس مجلس کے اراکین کا مشاہرہ طرز انتخاب اور مدت عہدہ کے تصفیہ کرنے کا اختیار ہے، اور عام طور پر ان کا انتخاب ایک سے چار سال کے لئے ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ براہ راست انتخاب کا طریقہ رائج ہو رہا ہے۔

اختیار راست : دونوں ایوانوں کے اختیارات بالکل مساوی ہیں، اور چونکہ ملک میں فیصلہ طلبی کا دستور ہے اس لئے ان میں بہت کم مستقل اختلاف ہوتا ہے۔

وفاقی اسمبلی :- دو ذیل ایوانوں کے یکجائی جلسے کا نام ہے ۔ اس کے سپرد تین کام ہیں :

(۱) وفاقی ادارات کے متعلق مختلف فیہ مسائل طے کرنا ؛ (۲) معافی دینا ؛ (۳) بعض بڑے بڑے عہدہ داروں ، مثلاً ارکان عدالت عالیہ ، سپر سالار وغیرہ کا انتخاب ۔

اجزائی مقننہ جات

(۱) جہاں عوامی اسمبلی ہے یعنی جہاں براہ راست قانون سازی کا طریقہ رائج ہے ان ریاستوں (کنٹینوں) میں یہ اسمبلی ہر سال صبح ہوتی ہے ، آئندہ سال کے عہدہ داروں کا انتخاب کرتی ہے اور سال بھر کے معاملات پر بحث کرتی ہے ۔ اس میں تمام رائے دہندے شامل ہوتے ہیں ،

(۲) جہاں نیابتی مجلس ہیں وہاں بھی مقننہ ایک ایوانی ہوتی ہے جو دو تین یا چار سال کے لئے منتخب ہوتی ہے ۔ اس کے سپرد قانون سازی ، محاصل اور اہم عہدہ داروں کا انتخاب ہوتا ہے ۔ اس مجلس کو ” بڑی مجلس “ یا ” مجلس کنین “ کہتے ہیں ۔

براہ راست قانون سازی :

فیصلہ طلبی ، وفاقی حکومت میں :

(۱) تبدیلی دستور کے لئے جملہ آراء کی کثرت اور کنینوں کی کثرت لازمی ہے ۔

(۲) تبدیلی قانون کے لئے جب آٹھ کنین (مجموعہ ۲۳) یا ۳۰ ہزار رائے دہندے

اپنی خواہش کا اظہار کریں، اس وقت معمولی قوانین بھی فیصلہ طلبی کے لئے پیش ہو سکتے ہیں۔

کینٹوں میں:-

(۱) تبدیلی دستور کے لئے فیصلہ طلبی لازمی ہے۔

(۲) دوسرے قوانین کے لئے: کینٹوں میں جملہ قوانین کے لازماً، میں جب ایک خاص تعداد رجسٹریشن میں مختلف ہو چاہے تین میں بعض قوانین کے لئے لازمی بعض کے لئے اختیاری۔

تحریک گذاری، ذاتی حکومت میں، تبدیلی دستور کے لئے ۵۰ ہزار رائے دہندوں کو تحریک گذاری کا حق ہے۔

کینٹوں میں: جمہور کے علاوہ ترمیم دستور کے لئے خاص خاص تعداد کو تحریک گذاری کا حق ہے اور سوائے تین کینٹوں کے باقی سب میں معمولی قوانین کی تحریک بھی اسی طرح سے کی جاسکتی ہے۔

روس: دستور ۱۹۳۶ء کی تبدیلیوں کے بعد:-

مجلس اعلیٰ جملہ اختیارات کی حامل ہے۔ اس میں دو ایوان ہیں یعنی

(۱) مجلس اتحاد (۲) مجلس اقوام

Revue des Sciences politiques.

شہ "جریڈ علوم سیاسی"

Annual Register

"سالانہ رجسٹر"

جولائی ستمبر ۱۹۳۶ء

۱۹۳۶ء صفحہ ۲۰۰

مجلس اتحاد: اس میں ہر تین لاکھ نفوس کی طرف سے ایک ایک قائم مقام نشست کرتا ہے۔ لیکن (برخلاف پرانی مجلس اتحاد کے) یہ قائم مقام خفیہ رائے دہی کے اصول پر اسی طرح منتخب ہوتے ہیں جیسے عمومی مالک کی پالیسیوں کے لئے ہوتے ہیں۔

مجلس اقوام میں (بجائے سات جمہوریتوں کے) گیارہ جمہوریتیں اپنے قائم مقام دروازہ کرتی ہیں۔ جن کا انتخاب ان کی مجلس کی طرف سے عمل میں آتا ہے۔

مجلس اعلیٰ کو مکمل اختیارات عالمہ و عدلیہ حاصل ہیں اور دستوری ضمانت کا بھی اختیار ہے بشمولیکہ ہر ایوان کا پانچ حصہ اس کے موافق ہو۔ ہر قانون کی شریک دونوں ایوانوں میں سے کسی ایک ایوان میں کی جاسکتی ہے۔ جب مجلس اعلیٰ نشست نہ کر رہی ہو تو اس کے جملہ اختیارات ایک ”صدریہ“ کو تفویض ہو جاتے ہیں۔

یہاں تک کہ اسے جنگ کرانے اور عہد ناموں پر دستخط کرنے کا اختیار بھی حاصل ہے۔ اس میں ۴۰ ارکان ہیں جن میں دونوں ایوانوں کے مقرر کرتے ہیں۔ اعلیٰ میں روزمرہ کا کاروبار یہی مجلس انجام دیتی ہے درنہ مجلس اعلیٰ سال میں صرف دو مرتبہ چند ہفتوں کے لئے بٹھتی ہے۔ پرانی سوویت حکومت کا دراصل خاتمہ ہو گیا ہے اور گوبیسوویتیں اب بھی موجود ہیں لیکن ان کا کام صرف مقامی حکومت چلانا ہے۔

۱۵۔ ساتھ میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ۱۲ جنوری ۱۹۵۷ء کو مجلس اعلیٰ کے جو ۳۳ اراکین منتخب ہوئے وہ سب کے سب بلا کسی مقابلے یا مخالفت کے منتخب ہوئے تھے اس لئے صرف آئینی لڑائی ہی کو امیدوار پیش کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔

ہندوستان

قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کی رو سے وفاقی حکومت اس وقت قائم ہوگی جب اس میں اتنی ہندوستانی ریاستیں شریک ہوں گی کہ وہ مجلس مملکت کے ۱۴ ارکان کو منتخب کرنے کی اہل ہوں اور ان کی آبادی تمام ریاستوں کی آبادی سے کم از کم نصف ہو۔

۱۔ ہندوستان کے موجودہ دستور کے لئے دیکھو ایڈری ولوٹن؛ "ہندوستان کا نیا دستور"

Eddy & Lawton: *Indias new Constitutions*.

۲۔ گیتھ؛ "ہندوستان کی دستوری تاریخ" A. B. Keith: *A Constitutional*

History of India باب ۱۰۔

مجلس مملکت : برطانوی ہند کی نمائندگی

صوبہ یا قوم	پیشین	عاشقین	سکھ	مسلم	عورتیں	جہلی ذاتیں
مداس	۲۰	۱۴	×	۴	۱	۱
بہلی	۱۶	۱۰	×	۴	۱	۱
جنگل	۲۰	۸	×	۱۰	۱	۱
مالک متحدہ	۲۰	۱۱	×	۶	۱	۱
پنجاب	۱۶	۳	۴	۸	۱	×
مالک متوسطہ	۸	۶	×	۱	×	۱
بہار	۱۶	۱۰	×	۴	۱	۱
آسام	۵	۳	×	۲	×	×
صوبہ شمال مغرب	۵	۱	×	۴	×	×
اڈیسہ	۵	۴	×	۱	×	×
سندھ	۵	۲	×	۳	×	×
بلوچستان	۱	×	×	۱	×	×
دہلی	۱	۱	×	×	×	×
اجمیر وارواڑ	۱	۱	×	×	×	×
کوکٹ	۱	۱	×	×	×	×
اینگلو ہندی	۱	×	×	×	×	×
یورپی	۶	×	×	×	×	×
ہندی عیسائی	۲	×	×	×	×	×
جملہ برطانوی ہند	۱۵۰	۷۵	۴	۴۹	۶	۶

یہ تو برطانوی ہند کے منتخب شدہ ارکان ہوں گے، ان کے علاوہ گورنر جنرل کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنی طرف سے چھ ارکان کو رکن مقرر کرے گا۔

علاوہ ان ۵۰ نشستوں کی مجلس مملکت میں زیادہ سے زیادہ ۱۰۴ ارکان ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے ہوں گے، چنانچہ قانون حکومت ہند کے تتمہ نمبر ۱ میں ہر ریاست کی طرف سے جتنے ارکان بالآخر اس وقت جب ہر ریاست رفاقیہ میں شریک ہو جاوے گی، ان کی تعداد کا شمار کر دیا گیا ہے۔ اس نہرست میں حیدرآباد کا نام سب سے ممتاز ہے اس لئے کہ اس قلمرو کو دیشٹرٹیکہ وہ رفاقیہ ہند میں شامل ہو جائے، تمام منفرد ریاستوں سے زیادہ یعنی ۵۸ نشستیں ملیں گی۔

ریاستی نمائندوں کو ریاستیں نامزد کریں گی؛ برطانوی ہند کے قائم مقام سال کے لئے منتخب ہوں گے اور ایوان کا ایک تہائی ہر تیسرے سال منتخب ہوا کرے گا۔

سطح نشستوں میں سے تین تمام ہندوستان کی تجارت و حرفت کے قائم مقاموں کے لئے اور ایک تمام ہندوستان کے مزدوروں کے لئے وقف ہیں۔

نوشتاتی اسمی

[illegible]

ان برطانوی ہندی قائم مقاموں کے علاوہ دفاتی جمعیت میں زیادہ سے زیادہ ۱۵۰ ارکان ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے ہوں گے، چنانچہ قانون حکومت ہند کے تحت نمبر ۱ میں ہر ریاست کی طرف سے جتنے ارکان بالآخر ہوں گے (اس وقت جب ہر ریاست وفاقہ میں شریک ہو جائے گی) ان کی تعداد کا شمار کر دیا گیا ہے۔ اگر حیدرآباد وفاقہ میں شریک ہو جائے تو اسے ۱۶ ارکان جمعیت وفاقہ میں بھیجے کا حق حاصل ہوگا۔

برخلاف مجلس مملکت کے انتخابات کے، جو براہ راست ہوں گے، جمعیت وفاقہ کے انتخابات بالواسطہ ہوں گے، یعنی اس جمعیت کے اراکین کو رائے دہندہ منتخب نہیں کریں گے بلکہ مختلف صوبوں کی مجالس مقننہ کے اراکین منتخب کریں گے۔ اس کے لئے یہ قرار پایا ہے کہ صوبہ واری جمعیت مقننہ کے اراکین قوم داری انتخاب واحد قابل انتقال رائے دہی کے اصول پر کریں گے، یعنی عام شخصیتوں کے لئے عام اراکین، مسلم شخصیتوں کے لئے مسلم اراکین وغیرہ۔ عورتوں کے انتخاب کے لئے تمام جمعیت مقننہ کے اراکین اناتل کر ایک حلقہ رائے دہی بنائیں گی اور اس نوع سے انتخاب کریں گی کہ منجملہ نوعوں میں کم از کم دو مسلمان اور ایک عیسائی ہو۔

صوبہ واری مجالس مقننہ

منجملہ گیارہ گورنری صوبوں کے چھ صوبوں میں دو ایوانی اور پانچ صوبوں میں ایک ایوانی جماعت مقننہ ہیں۔ اونچے ایوان کو مجلس مقننہ اور نیچے ایوان کو مقننہ اسمبلی کہتے ہیں۔ (اراکین کی تقسیم صفحہ ۳۳۰ پر درج ہے)

صوبہ واری مجالس مقننہ

صوبہ	پنشنیں	ج	تسم	پروپی	پنشن	پنشن	پنشن
ملکس	۵۵-۵۴	۳۵	۷	۱	۳	×	۱۰-۸
بہائی	۳۰-۲۹	۲۰	۵	۱	×	×	۴-۳
ہنگال	۶۵-۶۳	۱۰	۱۷	۳	×	۲۷	۸-۶
حاکم متحدہ	۶۰-۵۸	۳۴	۱۷	۱	×	×	۸-۶
بہار	۳۰-۲۹	۹	۴	۱	×	۱۲	۴-۳
آسام	۲۲-۲۱	۱۰	۶	۲	×	×	۴-۳

(مقننہ اسمبلیوں کا نقشہ ۱۳۳۳ء پر ملاحظہ کیجئے)

منہجہ باب ۱۵

[illegible]

اہلیت رائے دی :-

دفاقی اسمبلی کا انتخاب تو صوبہ واری اسمبلیاں کریں گی، اس لئے اس کے واسطے تو اہلیت رائے دی کے قواعد کی ضرورت ہی نہیں؛ مجلس مملکت کے لئے یہ قرار پایا ہے کہ اس میں کم و بیش وہی اصول مدنظر رہیں جو قانون ۱۹۲۵ء والی مجلس مملکت میں مدنظر تھے، چنانچہ اس کے انتخاب میں تقریباً ایک لاکھ رائے دہندے حصہ لیں گے۔

صوبہ واری جمعیوں کے لئے یہ اصولیہ کو حلقہ جات انتخاب میں تقسیم کیا گیا ہے جو جغرافیہ بھی ہیں اور قوم واری بھی۔ کسی شخص کو ایک سے زیادہ رقبہ واری حلقہ میں رائے دینے کا اختیار نہیں ہے، لیکن عورتیں ایک سے زیادہ حلقہ میں رائے دے سکتی ہیں۔ حلقہ رائے دی میں رائے دہندے کی سکونت کے لئے مختلف مدتیں مشروط ہیں، چنانچہ مدراس میں ۱۲۰ دن، بمبئی میں ۱۸۰ دن ہیں۔ عام طور پر یورپ رائے دہندوں کے لئے شرطیں نسبتہ ملائم ہیں جبکہ ایرانی حلقوں میں رائے دی کے لئے کچھ نہ کچھ مالگزاری یا محصول آمدنی یا لگان معیار قائم کرتے ہیں اور ہر صوبہ میں یہ معیار مختلف ہے۔ نیز رائے دی کے لئے مختلف تعلیمی معیار بھی قائم کئے گئے ہیں اور خاص خاص حلقہ جات کے لئے جیسے تجارت، حرفت، زمینداری وغیرہ کے لئے بھی جدا جدا معیار ہیں۔

دفاقی ایوان کے متعلق قواعد مندرجہ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء۔

(۱) دونوں ایوان سال میں کم از کم ایک مرتبہ نشست کریں گے اور نشستوں کے درمیان ۱۲ ماہ سے زیادہ وقفہ نہ ہو گا۔

(۲) مجلس مملکت ایک "سلسل" مجلس ہوگی؛ وفاقی اسمبلی اگر پہلے ہی موقوف ہوئی ہو تو ۵ سال تک برقرار رہے گی۔
 (۳) گورنر جنرل کو دونوں یا ایک ایوان کے طلب کرنے، ملتوی کرنے یا وفاقی اسمبلی کو موقوف کرنے کا حق ہوگا۔
 (۴) ہر وزیر یا مصلح کار کو اختیار ہوگا کہ وہ جس ایوان میں چاہے تقریر کرے۔

(۵) مفصلہ ذیل دونوں میں سے کسی ایوان کے رکن نہیں ہو سکتے؛
 (۱) علاوہ وزراء کے صوبہ جات ریاست اسے، ہر عمدہ دار سرکاری؛
 (۲) تجویز شدہ خاتہ نقل؛ (۳) دیوالیہ؛ (۴) وہ شخص جس پر انتخاب کے سلسلے میں رشوت ستانی کا الزام عائد ہو چکا ہو؛ (۵) دو سال سے زیادہ سزا پر مبنی۔ لیکن گورنر جنرل اس شرط کو اپنے حکم سے کالعدم کر سکتے ہیں۔
 لیکن دوران سزا میں کوئی شخص منتخب نہیں ہو سکتا۔
 (۶) دونوں ایوانوں کے اختیارات مساوی ہیں اور عام طور پر کوئی قانون اس وقت تک گورنر جنرل کے پاس منظور کیا کے لئے نہیں جائے گا جب تک کہ دونوں ایوان منظور نہ کریں۔ مالی مسودات پہلے جمعیت وفاق میں پیش ہوں گے۔

علاوہ حق انتناع کے گورنر جنرل کو قانون سازی کے حسب ذیل اختیارات حاصل ہیں:-
 (۱) کسی ضروری امر کے متعلق "احکام" صادر کرنا، لیکن یہ مقصد کے انعقاد

کے بعد صرف چھ ہفتے تک نافذ رہیں گے۔

(۲) کسی ایسے امر کے متعلق جس کا دار و مدار اس کی ذاتی رائے پر ہو، جب کبھی اس کی خواہش اور ضرورت ہو احکام نافذ کرنا۔

(۳) ایسے قوانین جو اس کے نزدیک مقصد میں منظور ہونے چاہئے تھے لیکن مقصد نے انہیں منظور کرنے سے انکار کر دیا، انہیں وہ بطور ”گورنر جنرلی قوانین“ کے نافذ کر سکتا ہے۔ ”گورنر جنرلی قوانین“ کی اطلاع فوراً وزیر ہند کو دی جائے گی اور انہیں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔

صوبہ جات کے گورنروں کو بھی تقریباً اسی قسم کے اختیارات اپنے صوبوں کی حد تک حاصل ہیں جیسے گورنر جنرل کو ہندوستان کے متعلق حاصل ہیں۔

Executive

باب ۱۶

عالمہ

عالمہ کا کام اور اہمیت - نائشی اور کارزما - بادشاہی - شخصی بادشاہی - پتوری بادشاہی
جمہوریہ - صدر کا انتخاب - وزارت - پارلیمینٹی - کابینہ - صدارتی کابینہ - آمری کابینہ -
مفرد مرکب عالمہ - ترکیب وزارت مجلس متعلقہ کابینہ - سول سروس -

عالمہ کا کام اور اہمیت - اس سے پہلے ایک باب میں یہ بیان
کیا جا چکا ہے کہ حکومت کی ایک بہت اہم شاخ جماعت عالمہ ہے جس کا کام
فی الجملہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کے آئین و قوانین کا نفاذ کرے اور ایک طرف جماعت
مقننہ اور دوسری جانب محکمہ عدلیہ کے احکام کو عمل میں لائے۔ نیز یہ بھی بتایا جا چکا
ہے کہ چونکہ اندرونی امن و امان قائم رکھنا اور بیرونی حملوں اور دوسرے خطرات
سے ملک کو محفوظ رکھنا، دونوں کے لئے پولیس، فوج اور بیڑے کی ضرورت
اس وجہ سے خارجی معاملات بھی جماعت عالمہ کے سپرد ہوتے ہیں، گوان شہیوں
کی نوعیت دیگر فرائض و اختیارات سے بالکل جداگانہ ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے

کہ یہ جماعت ایک کمزور جماعت ہوگی اس لئے کہ جب اس کا کام ہی مقننہ کے بنائے ہوئے قوانین اور عدلیہ کے اعلان کی ہوئی تجویزوں کا نفاذ نہ ہو تو پھر اس کا میدان عمل نسبتاً تنگ ہوا، لیکن ذرا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی یہی وہ شاخ ہے جس کا دوسری شاخوں سے کہیں زیادہ بدیہی طور پر مظاہرہ ہوتا ہے اور جو اپنی فوج، پولیس اور جیڑے کے ذریعے سے اس قدر زیادہ لوگوں پہلے انڈولٹی رہتی ہے کہ لوگ اکثر حکومت کی باقی ماندہ دونوں شاخوں کو بھول جاتے ہیں اور نہا عالمہ ہی کو حکومت سمجھنے لگتے ہیں۔ مقننہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، جب اس کا میقات ختم ہو جاتا ہے تو اس کے راگین (عام آبادی میں گھل مل جاتے ہیں، اور عدالتوں کا اثر تو زیادہ تر ان ہی لوگوں پر ہوتا ہے جو کسی مقدمہ میں مدعی یا مدعا علیہ، مستغنیث یا ملزم ہوں، لیکن جماعت عامہ کے نقیب عمیل ہر جگہ نظر آتے ہیں؛ جہاں دیکھو پولیس کے جوان کھڑے ہیں، فوجی قواعد ہو رہی ہے، حکام کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی ہیں، بادشاہ کے لئے سیٹیاں بیچ رہی ہیں، مہو جلو ہو رہا ہے، اور ہر قیدی کو سنکڑیاں بیڑیاں پہنائے جاتے ہیں، اور ہر کسی پر لایہانی کی ڈگر سی ہو گئی ہے تو اس کا مال فرق کیا جا رہا ہے بغض خواہ کسی کو سیاست سے لچھی ہو یا نہ ہو، حکومت کی یہ شاخ ایسی ہے کہ اس کا اثر ہر شخص پر پڑنا لازمی اور لا بد کی ہے۔

حکومت کے بعض شعبے ایسے ہوتے ہیں جو باوجود مقننہ کے اثرات کے اس کے خستہ کار سے باہر ہوتے ہیں لیکن عامہ کے اختیار سے باہر نہیں ہوتے۔ آج کل کی عموقیوں میں مقننہ عامہ پر عادی نظر آتی ہے، اور اس نے حکومت کے

سب سے بڑے بڑے یعنی مالیات پر اپنا قابو جالیا ہے، لیکن آج بھی بڑی سے بڑی عمومی ملکوتوں میں ایسے شعبے جیسے خارجی معاملات، خاص طور پر عالمہ کے متعلق سمجھے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اگر کسی ملک (جیسے مملکت متحدہ امریکہ) میں مقننہ کی کسی شاخ کو ان پر کوئی اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو اسے ایک غیر معمولی حوالہ عالمہ قلمیہ پر سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح جب کبھی ملک کسی خاص مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے یا اس میں کسی طرح کا سیاسی بحران ہوتا ہے تو قانون سازی کے کام کو خود مقننہ عالمہ کے تفویض کر دیتی ہے اور اسے احکام سازی کے وسیع اختیارات دے دیتی ہے، یہاں تک کہ سرگرمی عالمہ کو بعض مواقع پر آمر مطلق بھی بنا دیتی ہے جیسا زمانہ موجودہ میں متحدہ ممالک میں ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ اگر ایسا نہ بھی ہو تو بھی انچہ انتہائی مصروفیت اور قانون سازی کی گوناگوں پیچیدگیوں کی وجہ سے

ملکہ مملکت متحدہ امریکہ کی مجلس سنیات کو حسب ذیل عالمہ اختیارات حاصل ہے:-

- ۱۔ مجلس سنیات کے پٹ اکثریت کو عدالت سے مسترد کر کے اختیار۔
- ۲۔ مجلس سنیات کی تشریف صدر کے ہر ایک تقریر بلاذنی ہے، گو کانگریس کو اختیار ہے کہ نیچے درج کے تقریرات کے لئے سنیات کی منظوری کو غیر ضروری قرار دے، اس وقت یہ بھی مندرجہ ذیل عادلانہ عدالت العالمیہ اور پڑے پڑے عہدہ داروں کے لئے توثیق لازمی ہے۔
- ۳۔ ایسی تفویض کی بھی خالص حال کے زائے کی آمرتیں ہیں جیسے انکی میں فاشی آمریت اور جرمنی میں نازی آمریت۔ لیکن پیشکش سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں طرز اس کے حکومتی بعض غرضی ہیں۔

چند خاص امور میں مقننہ عالمہ کو اختیار دے دیئے ہیں کہ جیسا چاہے قانون بنائے۔
 اس صورت حال کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اگر ویسے سنی میں دیکھا
 جائے تو عالمہ ایک نہایت ہی تشدد جانتی ہوتی ہے جس میں ہزاروں نفوس کسی
 عظیم الشان کل کے پرزوں کی طرح کام کرتے ہیں، لیکن دراصل اس کا جو حصہ باقی
 کاغذ پر کرتا ہے وہ صرف چند ہی نفوس پر مشتمل ہوتا ہے اور بعض مرتبہ تو اس کا
 عملی مرکز ایک فرد واحد ہوتا ہے جو کئی معاملات پر پوری طرح سے حاوی ہوتا ہے یہی
 سب سے بڑا فرق مقننہ اور عالمہ کے طرز کار میں ہوتا ہے کہ جہاں ایک عمومی مقننہ میں
 ہر مسئلہ پر ہر ایک بعض مرتبہ دونوں اور بعضوں تک بحث ہوتی ہے اور کئی کا کوئی پہلو
 راز میں نہیں رہتا، وہاں عالمہ کے مباحث اکثر بالکل راز میں رہتے ہیں اور اس
 میں جو معاملات پیش کیے جاتے ہیں وہ سب جلد سے ہو جاتے ہیں۔ اسی سبب
 سے جیسا اور بیان کیا گیا ہے سبب ملک کسی سیاسی بحران میں ہو کر نکلتا ہے
 تو یہی سبب معلوم ہوتا ہے کہ قانون سازی کے اختیارات پھر عالمہ ہی کے سپرد
 کر دیئے جاتے ہیں تاکہ اسے کار مباحث سے چھٹکارا دیا اور ملک جلد سے جلد سیاسی بحران
 سے نکالا جاسکے۔

یہ اس کی ایک بڑی مثال سلطنت عثمانیہ کی شاہی آزادیوں کی قانون سازی کی ہے جہاں احکام عوامی
 کے ذریعے سے عمل میں آتے ہیں نہ کہ پارلیمنٹ کے قوانین کے ذریعے سے دیکھو آئین ۱۹۰۸
 در سوس دستور المملکت " *Law and Custom of*

the Constitution جلد ۱، حصہ ۱ باب ۴، جدول ۲، حصہ ۱ باب ۵، جدول ۱۔

صفحہ ۳۳۹

نمائشی اور کارفرما۔ اب سے چند سال پیشتر یہ کہا جاسکتا تھا کہ عالمانہ اقتدار کو وہ تفوق حاصل نہیں رہا جو کسی زمانے میں اسے حاصل تھا، اور رفتہ رفتہ مقننہ (دنیائی مجلس) کے دست برد سے ایسے شعبے بھی نہیں بچے جو خاص طور پر عالمیہ کے گویا اجارہ سمجھے جاتے تھے۔ لیکن پہلے اگلی ہیں، اس کے بعد جرمنی میں اور اب یورپ، امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ممالک میں اکثریت نے جو جگہ اپنے لئے پیدا کر لی ہے اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ عالمانہ اقتدار کو پھر دوسری، بلکہ ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ عروج نصیب ہو جائے جو اسے کسی زمانے میں حاصل تھا۔^۱ دینی سیاسی اقتدار کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی عمومی ملکوں، آمریوں اور پرانی بادشاہتوں، سب میں ایک چیز مشترک ہے، اور وہ عالم کا اثر اور عیب وائب ہے۔ اس کا اقتدار قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری سمجھا جاتا ہے اس کے قائم مقاموں میں ایک خاص تقدس روا رکھا جائے، فوج اور پولیس کو دریاں نہانی چائیں، ان میں سے معمولی سے معمولی سپاہی کو ایسے اختیارات دئے جائیں جو بڑے سے بڑے شہری کو بھی حاصل نہیں، اس کے منہ دلوں

(فیوٹ ۱۹۳۵ء) ۵۵۔ اسپن کے سابق آمر جنرل ریویری نے کہا تھا کہ عمومی حکومت ان ممالک کے لئے بہت موزوں نہیں جن میں روپیہ دانی ہے اور مسائل بھی بہت ہیں اس لئے کہ یہاں کے لوگ کسانوں سے چھوٹی چھوٹی باتوں کے تصفیہ میں دن بے دن اور مہینے گزار سکتے ہیں، لیکن ان ممالک میں جہاں افلاس کا دور دورہ ہے اور جہاں ملکی کام بہت کم ہے وہاں آمریت ہی بہتر ہے۔
۵۶۔ آمری اقتدار کیلئے دیکھئے اسی باب کا پارہ مرسومہ آمری کا مینڈ۔

اور وزیر کی حیثیت بڑھائی جائے، ان کے لئے خاص خاص آزام و انسٹیشن کے طریقے مہیا کئے جائیں، بادشاہ ہو یا صدر جمہوریہ اس کا ایک خاص رعب داب قائم کیا جائے۔ یہاں یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ چشم و خدام اور یہ نمائش کوئی غیر ضروری چیزیں ہیں بلکہ ان کا ایک نہایت زبردست افادہ می پلوی بھی ہے۔ جیسا دستور انگلستان کے ایک بہت بڑے نقاد نے لکھا ہے، عوام میں سے اکثر و بیشتر اس وقت تک حکومت کی برکات اور اس کی وحدت کو نہیں سمجھتے جب تک اس کا مظاہرہ ان کی نظر سے نہ گزر جائے۔ اگر کوئی شخص اپنے باورچی یا سائیس کے سامنے سیاسیات کے نکات سمجھانے بیٹھے تو اس باورچی یا سائیس کے لئے اس کا سمجھنا اتنا ہی مشکل ہو گا جتنا کسی غیر زبان کا، لیکن کسی شہر میں وائسرائے کی آمد پر وہی باورچی تماشہ دیکھنے جائے، اور شو بھجوستے اور پولیس اور فوج کو دور و بیصف بستہ دیکھنے تو حکومتی اقتدار کی تصویر اس کے سامنے ہو کر پھر جائے گی لیکن یہ کہ اگر ہر شخص سیاسیات کے نکات کافی طور پر سمجھ لیتا اور حکومت کی ماہمیت اس کے ذہن میں آجاتی تو اس ناگشی عنصر کی ضرورت نہ ہوتی، لیکن موجودہ حالات و واقعات اس کے مقتضی ہیں کہ جماعت عالمہ کو جس کا تعلق عوام الناس سے نہایت ہی قریب کار تھا ہے ایک خاص قسم کا نقد سنایا جائے اور اس مصنوعی طریقے سے اس کا اثر قائم رکھا جائے بعض مرتبہ یہ نمائش کیفیت حقیقی کارفرما جزو عالمہ میں پیدا کی جاتی ہے اور بعض مرتبہ نمائشی جزو سے واقعی کاروبار کے اختیارات نکال کر اسے محض اثر قائم

کرنے کے لئے رہنے دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے۔ ممالک متحدہ امریکہ کا صدر یا ہندوستان کا ولید اس کے ایک طرف تو واقعی ان ممالک کی عالمہ کا گویا صدر ہے اور دوسری طرف اسے بہت کچھ ظاہری حشم و خدام حاصل ہوتا ہے، اور اگر ان دونوں کے حشم و خدام میں فرق ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک غیر ملک کے دائرہ کے کہ یہاں کے باشندوں پر زیادہ اثر ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے بہ نسبت امریکہ کے صدر کے، اور اسی وجہ سے دائرہ کے کی ناکافی کیفیت زیادہ ہے۔ بہر حال یہ یقینی ہے کہ ان دونوں حالتوں میں نانشی اور کارکن صدر عالمہ دونوں ایک ہی فرد میں شامل ہیں۔ آج کل کے زمانے میں یہ صورت حال آرتیوں میں نظر آتی ہے جہاں کارکن غنیمت اور اس کے صدر کو نانشی اغراض اور تشہیر کے لئے بڑا حشم و خدام رکھنا پڑتا ہے، بلکہ بعض کا تو خیال ہے کہ بغیر تشہیر کے محض کارفرمائی سے آمرانی قوت قائم ہی نہیں رکھ سکتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص محض ناکشی ہو اور دوسرا محض کارفرما ہو؛ ایک از پیدا کرے دوسرا اس اثر کو کام میں لاکر دوبار مملکت انجام دے۔ اس کی بدیہی مثال انگلستان اور فرانس سے ملتی ہے جہاں حقیقی مرکز عالمہ وہ نہیں ہے جسے ریاستی تقدس حاصل ہے۔ انگلستان کے بادشاہ اور فرانس کے صدر کی نہایت درجہ وقعت ہے نہیں سیاست اور لوگوں کی عام زندگی سے بالآخر اور اہم تر سمجھا جاتا ہے، وہ کچھ کہتے ہیں یا کہیں جانے میں تو ہر شخص ان کے قول و فعل کو بہت کچھ مرعوب ہو کر سنتا اور دیکھتا ہے لیکن ساتھ ہی ان کو ملک کی عام سیاست اور عام مملکت علی میں بہت کم دخل ہے، اور کام کرنے والے دراصل وزراء ہیں جن کا برائے نام تقریر بادشاہ یا

صدر کے قبضے میں ہوتا ہے لیکن جو دراصل اپنے حدود کے اندران سے کہیں زیادہ
نظارہ ہوتے ہیں۔

بادشاہی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے اس عظیم الشان نظام کا جسے
مجموعی طور پر جماعت عالمہ کہتے ہیں، صدر کون ہونا چاہئے اور اس کا تقرر کس نوع
سے ہونا چاہئے۔ اس کا سب سے آسان اور ایک بڑی حد تک کارآمد اور قدیم
طریقہ تو وہ ہے جس کے تحت یہ صدر بادشاہ ہو اور اسے حکومت کا صدر بننے
کا موروثی حق ہو۔ یہ ایک عجیب اور بہت آموز کیفیت ہے کہ ان ممالک میں بھی
جہاں جمہوریہ قائم ہے، یعنی جہاں موروثی بادشاہ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی بلکہ صرف
چند سال کے لئے کسی شہری کو موتی صدر منتخب کر لیا جاتا ہے، وہاں بھی سوائے
اس کے کہ حکمران موروثی نہیں، باقی اسے جملہ صفات شاہی سے مزین کر دیا جاتا ہے
نہ صرف یہ بلکہ جس طرح بادشاہ کہیں خود مختار بھی ہو سکتا ہے اور کہیں دستوری،
اسی طرح کہیں تو در ممالک متحدہ امریکہ کی طرح، اس صدر کو جزاً و کلاً عالم انداز اختیارات
حاصل ہوتے ہیں اور کہیں دفراس کی طرح، اس کا مقصد زیادہ تر مختلف عناصر
مملکت کی یک جہتی قائم رکھنا اور نمائشی ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ بادشاہت
کا ادارہ خواہ اسے بعض مخالف کتنا ہی از کار رفتہ کیوں سمجھیں، اس میں شبہ
نہیں کہ بعض نام کو نظر انداز کر کے اس کے جو مناصب ہیں وہ مملکت کے لئے ہر
ملک میں ضروری سمجھے گئے ہیں۔

بہر حال ملوک کی طریقہ میں جماعت عالمہ کی صدارت باپ سے بیٹے کی طرف
یا سابق سلاطین آل عثمان کی طرح، بزرگ خاندان کی طرف بلا کسی ہزین انتخاب

کے تحویل ہوتی ہے۔ بادی النظر میں یہ نہایت حیرت خیز معلوم ہوتا ہے کہ مملکت کا سب سے ممتاز ادارہ غیر مشروط طریقے سے باپ سے بیٹے یا بھائی سے بھائی کی طرف منتقل ہوا اور اعتراض کر کے والے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ اسی طرح لایعنی ہے جیسے کہ طبیب کا بیٹا طبیب اور ہندس کا بیٹا ہندس ہو، اور اس بات کا کون ضامن ہے کہ سابق فرمانروا کے دار میں خود تہی قابلیت ہوگی کہ وہ مملکت کی ناک و کوبیاہی کے ساتھ باز لگا سکے گا۔ یہ اعتراض ایک عہد تک بجا ہو، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انسانی ادارات میں کچھ نہ کچھ قائم ہونا لازمی ہے اور غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ موروثی صدارت، یعنی بادشاہی میں جو قسم میں آیا اس کے محاسن ان اسقام کو دبا سکتے ہیں یا نہیں۔ سب سے پہلے موروثی بادشاہت میں ایک قسم کے تسلسل کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ کسی دوسری قسم کی صدارت میں نہیں پائی جاتی۔ بادشاہ کا ارتحال ہو گیا، زندہ بادشاہ جدید، اگر یا ایک ہی تسلسل میں دونوں باتیں ادا ہو جاتی ہیں اگر کسی قسم کے وقفے یا بدامنی کا خوف نہیں رہتا، خصوصاً ایسے ممالک میں جہاں کلانیت کا قاعدہ بندھا ہوا ہے۔ جہاں بادشاہی کا وار و مدار خود رعایا کی خواہش اور خوشنودی پر ہے وہاں تو یہ ادارہ اور بھی زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک موروثی بادشاہ کا

نہ سلطنت تنہیہ ایسی سلطنت کی مثال ہے جہاں کلانیت کا قاعدہ نہیں تھا، یعنی جہاں سر بادشاہ کے بعد اس کی اولاد میں جھگڑا ہوتا تھا اور جو غالب ہوتا تھا وہی بادشاہ بن جاتا تھا۔ دکن کی سلطنت بہمنیہ کی بھی تقریباً یہی کیفیت رہی۔ (بقیہ نوٹ ۹۵ ملاحظہ فرمائیے)

اس گئے گزروے زمانے میں بھی دوسرے ممالک میں ایک خاص اثر ہوتا ہے اور جب کبھی وہ گویا بطور قومی سفیر کے دوسرے ممالک میں سفر کرتا ہے تو خواہا نہ خواہی اس کی زیادہ خاطر دلواضع کی جاتی ہے۔ پھر اس میں شبہ نہیں کہ اندرونی معاملات میں بھی ایک ذہین بادشاہ کو (خواہ اس کے دستوری اختیارات کیسے ہی سلب کیوں نہ کر لئے گئے ہوں) معاملات مملکت اور داخلی بلقی دداروں کا اتنا تجربہ ہوتا ہے کہ (خواہ وزارت اسے مانے یا نہ مانے) اس کی رائے کو خاص وقعت سے دیکھا جاتا ہے۔

بادشاہی کی تین چیزیں ہیں، ایک تودہ طریقہ جس کے تحت یہ عہدہ بادشاہ مثنوی کے بڑے اس کے کہ پہنچتا ہے، دوسرے وہ طریقہ جس کے تحت یہ عہدہ مثنوی کے بعد جو سب سے عمر بزرگ کا خاندان ہوا اسے دیا جاتا ہے، تیسرے (جیسا انگلستان کے قدیم اینگلو سیکسن زمانے میں قائم تھا) بادشاہ کے مرنے کے بعد نئے بادشاہ کا انتخاب ہوتا ہے، اور گویا عام طور سے طرابطہ ہی تخت پر بیٹھتا ہے لیکن اگر وہ کم عمر یا نادان ہو تو پھر خاندان شاہی میں سے کسی ایک کو تخت نشین کیا جاتا ہے۔ آخر میں ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بادشاہ کے ملے پر اس کی اولاد میں جو شخص سب سے زیادہ اپنا جوہر مردانگی دکھائے اور

(بقیہ نمٹ ۱۳۳) یہ واقعہ ناقابل انکار ہے کہ پچھلے جنگ کے بعد انگلستان کی ملکیت بجائے کمزور ہونے کے شائد پہلے سے بھی زیادہ مستحکم ہو گئی ہے، یہ دوسری بات ہے کہ اس کے اختیارات سب سے کم ہو گئے ہوں۔

جس میں باقی تمام دعویداروں کو زیر کرنے کی قوت ہو ورنہ تاج شاہی پہننے کا مستحق سمجھا جائے، یہ طریقہ خاندان مغلیہ اور خاندان ہمنیہ میں مروج تھا۔

شخصی ملکیت - بادشاہت یا ملکیت کو باہت بار اختیارات و حقوق میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، یعنی ایک تو مطلق العنان یا شخصی ملکیت اور دوسری آئینی یا دستوری ملکیت۔ شخصی ملکیت تو ہر ملک میں ایک ہی طرح کی ہوتی ہے یعنی جہاں جہاں یہ رائج ہو وہاں بادشاہ کا جزو کل پر اختیار ہوتا ہے وہی دُورا مقرر کرتا ہے جو اس کے سامنے ذمہ دار ہوتے ہیں، وہی قانون بناتا ہے، وہی عادلوں کو مقرر کرتا اور انھیں معزول کرتا ہے، اپنی فوجی مہات سر کرتا ہے، گو یا کہ مملکت اس کی جاگیر ہے اور حکومت کا نظام اسی کے ذاتی احکام سے قائم رہتا ہے۔ ایسا دور تقریباً ہر ملک میں گذرا ہے جب وہاں کی حکومت کم و بیش مطلق العنانی پر مبنی تھی۔ انگلستان میں عہد ہنری فرانس میں عہد بوربون، جرمنی میں ہونزولرن عہد، غرض مطلق العنانی کی ایک رو بھی جو ایک زمانے میں دنیا کی ملکیتوں پر چھائی ہوئی تھی۔ آج بھی یہ طرز حکومت ناپید نہیں ہے بلکہ آہستہ آہستہ اس کا دوبارہ احیاء ہوا ہے۔

دستوری ملکیت - ملکیت کی دوسری قسم یہ ہے جسے دستوری ملکیت کہتے ہیں۔ اس میں بادشاہ قوم اور حکومت کے نمائندے کی فرائض انجام دیتا ہے، لیکن عملی طور پر کاروبار حکومت میں علاوہ صلاح اور رائے فیصلہ کے اسے کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ وزارت اس کے سامنے نہیں بلکہ قومی مجلس کے سامنے (جو اکثر قائم منتخب شدہ جماعت کی ہوتی ہے) ذمہ دار ہوتی ہے

یہ صورت حال کہیں تو (انگلستان کی طرح) صدیوں کے غیر شعوری دستوری ارتقا کا نتیجہ ہوتی ہے، اور کہیں (بہت سی دوسری بادشاہتوں کی طرح) اس کے اختیارات کی حد بندی کسی خاص دستاویز میں کر دی جاتی ہے جو ملک کے دستور کا منبع و ماخذ ہوتا ہے۔ دستوری بادشاہتوں میں حکمران کی حیثیت زیادہ محض نمائندگی ہوتی ہے اور حقیقی صدر عالمہ و زیراعظم ہوتا ہے جو بادشاہ کے بغیر حکومت کا کارفرما عنصر ہوتا ہے۔ یہ طرز عمل ایک طرح پر قدیم و جدید سیاسی خیالات کے امتزاج کا نتیجہ ہوتا ہے، یعنی ایک طرف تو قدیم ملوکى ادارہ قائم رکھا جاتا ہے اور دوسری جانب حکومت کو ایک ایسے شخص پر مرکوز کر دیا جاتا ہے جو جمہوریوں کی طرح عوام میں سے منتخب کیا گیا ہو اور جو قومی مجلس کے سامنے جواب دہ ہو۔

شلہ حق امتناع - تقریباً ہر ملک میں خواہ اس میں عموماً کتنا ہی انوکھوں نہ ہو، صدر عالمہ کو تھوڑا بہت اختیار امتناع کا ہوتا ہے، یعنی جو قوانین جماعت عالمہ منظور کرے اسے نامطلوب کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ انگلستان میں بادشاہ کو یہ اختیار حاصل ہے لیکن غلطی سے اس کا استعمال نہیں ہوا اور شاید اب کبھی نہ ہو۔ لیکن یہاں چونکہ خود کا بیٹہ وزارت نیابتی مجلس یعنی پارلیمنٹ کی ایک ذیلی مجلس ہوتی ہے اس لئے اس قسم کا داخلی حق نہ ہونے سے کچھ زیادہ ہرج مہرج نہیں ہوتا۔ فرانس میں بھی (غالباً انگلستان کی نقل کے طور پر) صدر جمہوریہ کو حق امتناع حاصل نہیں، گو صدر از سر نو غور کے لئے کسی قانون کو پارلیمنٹ کے سامنے بھیج سکتا ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ میں اگر صدر کسی سودنے کا امتناع کر دے تو وہ واپس کانگریس کو جائے گا اور اگر ہیرالڈ آف اکثریت سے (بقیہ حاشیہ ۳۴۶ پر)

جمہوریہ - جمہوریہ اس حکومت کا نام ہے جہاں بادشاہ نہ ہو بلکہ ملک کا انتظام قوتی قومی نااہلوں سے متعلق ہو۔ دستوری ملکیت اور اس میں فرق یہ ہے کہ یہاں نمائشی موروثی عنصر کا خاتمہ کر دیا گیا ہے، ورنہ (جیسا اور بیان کیا جا چکا ہے) آزاد سے آزاد جمہوریوں میں بھی جو شخص ملک کا مرکز سمجھا جاتا ہے اور جسے صدر جمہوریہ کا لقب دیا جاتا ہے وہ کم دیش شاہی اختیار کا حامل ہوتا ہے۔ جمہوریتیں دو شعبوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں، یعنی باعتبار مدت صدارت و باعتبار اختیارات۔ مدت صدارت عام طور پر زیادہ سے زیادہ سات برس (جیسے فرانس میں) اور کم سے کم ایک سال (جیسے سوئیٹان میں) ہوتی ہے۔ بعض ممالک میں ایک ہی شخص کو کئی مرتبہ صدر منتخب ہو سکتا ہے، بعض میں صرف دو مرتبہ اور بعض میں صرف ایک ہی مرتبہ، چنانچہ جہاں ترکی میں جمہوریہ کے قیام سے لے کر اپنے انتقال تک کمال اتاترک (غازی مصطفیٰ کمال پاشا) مسلسل صدر جمہوریہ رہے، وہاں ممالک متحدہ امریکہ میں رداجا کوئی شخص دو مرتبہ سے زیادہ صدر نہیں ہو سکتا اور فرانس میں کوئی شخص ایک ہی مرتبہ

(ذبیحہ عالمیہ ۳۲۷) اسے منظور کرنے تو پھر وہ خود بخود قانون بن جائے گا۔

۱۹۴۷ء کے قانون حکومت ہند کی دسویں کمیٹی مسودہ کا، جو دونوں ایوانوں میں ہو کر گزر چکا ہے گورنر جنرل خود بھی اتفاق کر سکتا ہے اور اسے بادشاہ کی مرضی کے لئے محفوظ کر سکتا ہے۔ دوسری صورت میں اگر بادشاہ کی مرضی ایک سال تک معلوم نہ ہو تو مسودہ نامعلوم سمجھا جائے گا۔

صدارت جمہوریہ منتخب ہو سکتا ہے۔ باعتبار اختیارات، صدارت تین ذریعہ کی ہو سکتی ہے۔ ایک تو اس جمہوریہ کی صدارت ہے جس میں صدر عاملانہ، مقننہ اور عادلانہ تینوں مناصب کا حامل ہو۔ ایسی صدارت کا، جسے اصطلاح میں "آمریت" کہتے ہیں، سب سے زبردست مظاہرہ اٹلی، جرمنی اور بعض دوسرے ملکوں میں ہو رہا ہے جہاں مسولینی اور ہٹلر کو جملہ اختیارات حکومت پر قابو حاصل ہے، اور موشیکو کے اس قول کی صداقت ثابت ہوتی نظر آتی ہے کہ نفرت اختیار کے فقدان میں حقیقی آزادی بھی مفقود ہو جائے گی۔ آمر اعضاء حکومت پر اس قدر قابو یافتہ ہوتا ہے کہ ایک طرف مسولینی نے شاہ اٹلی کو معطل کے طور پر نظر انداز کر دیا ہے، تو دوسری طرف اپنی صدر اعظمی کے زمانے میں ہٹلر نے آزموہ کار اور ہر دلعزیز فون ہینڈنبرگ صدر جمہوریہ جرمنی کو اختیارات کی حد تک بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اس سے یقیناً مختلف وہ طرز کار ہے جو پیار اسلام کے بعد کی خلافت راشدہ کے عہد میں کارفرما تھا، اس لئے کہ گو خلیفہ کا تابعین جیتا انتخاب ہوتا تھا، اور گو وہ اپنے زمانے میں جملہ اختیارات حکومت کا مرکز تھا،

۱۹۱۹ء فرانس کے دستور میں اس قسم کی کوئی تحدید نہیں ہے لیکن ۱۹۳۹ء تک یہ گویا دستوری بھوتہ تھا کہ کوئی شخص ایک مرتبہ سے زیادہ صدر منتخب نہ ہو سکے۔ لیکن فریسیسی پاپی کو حکم کرنے کی غرض سے ۱۹۳۹ء میں فرانس کے صدر بیریول دومری مرتبہ سات سال کے لئے صدر منتخب ہوئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اب صدر جمہوریہ نے علی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔

لیکن اسے اس الہی قانون کے سامنے سرخم کرنا پڑا تھا جسے عمل طرہ پر قرآن مجید کہتے ہیں۔ آج کل کے زمانے کی عمومی ملکیتوں میں سب سے زیادہ ذی اختیار امریکہ کی متحد ریاستوں کا صدر ہے جسے اپنی جماعت عالمہ پر پورا قابو حاصل ہے، جو عالمانہ امور میں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں اور قانون سازی کے معاملات میں اپنے ”صدارتی پیامات“ کے ذریعے سے تو فی مجلس یعنی ”کانگریس“ پر اثر ڈالتا ہے، جسے جلد قوانین پر ایک محدود حق انتفاع حاصل ہے، اور مجلس سینیات سے مل کر نہ صرف سفرا بلکہ وفاقی عدالت عالیہ کے جادلوں کا بھی تقرر کرتا ہے۔ ”تیسری نوع“ ”دستوری“ یا ”آئینی“ صدوروں کی ہے جس کی بدیہی مثال فرانس میں ملتی ہے۔ فرانس کا صدر جمہوریہ انگلستان کے آئینی بادشاہ کی طرح وزارت کے سامنے بالکل بے دست و پا ہے اور ایک زبردست وزارت کے سامنے کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ ایک عجیب و غریب حقیقت ہے کہ فرانس میں پواں کاٹے جیسے حوصلہ مند مدبر کے لئے صدارت جمہوری کافی علو میں نظر آتا اور وہ ساٹھ سال تک اس بظاہر بڑے عہدہ پر فائز رہنے کے بعد بھی ایک نئے صدر جمہور کے ماتحت وزیر اعظم بننے پر تیار ہوتا ہے۔

صدر کا انتخاب۔ ظاہر ہے کہ صدر جمہور عوام ہی میں سے منتخب ہو گا اور اگر یا تو خود عوام منتخب کریں گے ورنہ جماعت مقننہ اور بعض ممالک میں ایک خاص نیابتی مجلس کے سپرد صدر کا انتخاب کر دیا جاتا ہے۔ سب سے زبردست صدر امریکا وہ ہوتی ہے جسے عوام الناس براہ راست منتخب کریں یا عوام الناس کی کوئی خاص نیابتی مجلس منتخب کرے۔ آج کل کے فرنی سیاسیات میں ہر ایک شخص پر

فرقی رنگ اس درجہ غالب ہوتا ہے کہ دوسری صورت میں نیا تہی مجلس خود دریا
زیادہ فریقوں کی مصنفہ شکل بن جاتی اور مجلس کے انتخاب کے فوراً بعد یہ معلوم
ہو جاتا ہے کہ وہ کس فریق کے امیدوار کو منتخب کرے گی۔ یہ کیفیت صدر جمہوریہ
امریکہ کے انتخاب میں خاص طور پر پائی جاتی ہے جہاں عین انتخاب سے ہفتوں
پہلے محض مجلس انتخاب کی ترکیب ہی سے پتہ چل جاتا ہے کہ کس فریق کا کون
شخص آخر صدر منتخب ہوگا۔ بہر حال انتخاب صدر اس طرح سے برائے نام بالواسطہ
یا ذاتیابراہ راست ہو رہے ہیں۔ ۱۸۷۵ء کے انقلاب کے بعد ۱۸۷۵ء میں فرانس
میں ہوا (دو ذیلی صورتوں میں صدر جمہوریہ کے انتخاب کنندے دی ہوئے ہیں جو حالت
مقتضی کے ہوتے ہیں، اور چونکہ اس پر عاملانہ اقتدار یعنی فوج و پولیس کے قابو کا
اضافہ ہوتا ہے اس لئے عاملانہ اقتدار کا پڑا بھاری ہو جاتا ہے، چنانچہ تمام
امور پر نہیں تو کم از کم عاملانہ اقتدار کی حد تک وہ جماعت مقتضی سے بے نیاز
ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جہاں فرانس کی طرح صدر جمہوریہ جماعت مقتضی کا نامزد
کر دے ہوتا ہے وہاں اسے بہت کم اختیارات ملتے ہیں اور واقعی اختیار راست کا

ملاہٹا ملک متحدہ امریکہ کے صدر کا واقعی انتخاب، جنوری کو ہوتا ہے لیکن چونکہ منتخب کنندگان کے
انتخاب کا نتیجہ نومبر میں نکل آتا ہے اور منتخب کنندگان کی بابت یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس
فریق کی اکثریت سے منتخب ہوئے ہیں اس لئے جس صدر کے واقعی انتخاب میں کئی ہفتے
باقی ہوتے ہیں اسے پہلے ہی سے مبارکبادیں دی جاتی شروع ہو جاتی ہے اور وہ خانگی
طور پر امریکہ کے معاملات عام میں ایک طرح کا حصہ لینا شروع کر دیتا ہے۔

منع جماعت مقننہ ہی ہوتی ہے۔

وزارت۔ اب وزارت کی طرف آئیے۔ تاریخ عالم میں وزیر کی حیثیت بہت بڑی ہے، چنانچہ مشرق میں وزیر ہمیشہ بادشاہ کا نفسِ ناطق سمجھا جاتا تھا اس لئے کہ وزیر ہی تو تھا جو نیم پوشیدہ بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان آتا تھا اور اپنی مدد سے نصیحتوں کے ذریعے سے بادشاہ کے کام کو ہلکا کرتا تھا۔ تاریخی زمانے میں ہندوؤں میں منتری گویا راجہ کے تخت کا پشتیبان سمجھا جاتا تھا اور اسلامی خلافت کے زمانے میں ”وزیر نفویض“ اور خلیفہ وقت میں صرف میراث ہی کا فرق رہ جاتا تھا۔ آج کل کے زمانے میں باعتبار ذمہ داری، مناصب و فرائض و وزارت تین قسم کی ہوتی ہے، ایک کو پارلیمنٹری دوسری کو صدارتی اور تیسری کو آمری کہتے ہیں۔ پارلیمنٹری وزارت اسے سمجھنا چاہئے جو پارلیمنٹ کے سامنے اپنے افعال کے لئے ذمہ دار ہو، صدارتی وہ جو بادشاہ یا صدر جمہور کے سامنے ذمہ دار ہو اور آمری وہ جو دراصل کسی کے سامنے ذمہ دار نہ ہو بلکہ برائے نام بادشاہ یا عوام کے سامنے ذمہ دار سمجھی جائے۔

پارلیمنٹری کا پس منہ۔ سب سے پہلے پارلیمنٹری طرز کی وزارت کو لیجئے جو خاص طور پر انگلستان کے دستوری ارتقا کا نتیجہ ہے اور جس کا چرچہ انیسویں صدی میں تقریباً تمام یورپی ممالک میں اتارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کا سب سے ممتاز

نملہ دیکھو گولیا: ارتھ شاستر باب ۸

نملہ دیکھو اردو: الاحکام السلطانیہ (ترجمہ اردو جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن) باب ۱۔

خاصہ یہ ہے کہ وزیر اعظم اور دیگر وزرا اس ذریعہ کے سرگرم ہوتے ہیں جس کی دارالعلوم میں اکثریت ہو۔ انگلستان کی دستوری تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ صورت بالکل زمانہ حال کی پیداوار ہے۔ ورنہ اٹھارہویں صدی تک وزرا بادشاہ کے ذاتی ملازم سمجھے جاتے تھے اور بعض مرتبہ وہ دارالعوام سے خالفا برتاؤ بھی کرنے لگتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ جس قسم کے قوانین کی بادشاہ کو ضرورت ہوتی تھی اس قسم کے قوانین نہیں بنتے تھے، اور اس خرابی کو رفع کرنے ہی کی غرض سے چارٹر آف ۱۸۳۲ کے وزیر اعظم سر رابرٹ والپول نے اراکین دارالعوام کو رشوت کے ذریعے سے سہوار کرنا چاہا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جو سیاسی ذریعہ دارالعوام میں برسرِ اقتدار ہوتا ہے، اس کے سرگرمہ کو بادشاہ کی طرف سے وزیر اعظم مقرر کیا جاتا ہے اور وہ اپنے ممتاز رفقاء کو دوسرے عہدے تفویض کرتا ہے۔

پارلیمنٹ عالمہ کے خصائص یہ ہیں کہ گروہ پر سے طور پر جماعت مقننہ کے ساتھ مل کر کام کرتی ہے، ایک طرف تو وہ نیابتی ایوان کی گویا ایک ذیلی جماعت ہوتی ہے اور دوسری جانب دکم از کم انگلستان اور دوسرے ممالک میں، اسے شدید اختلاف کی صورت میں نیابتی ایوان کو برخاست کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ گو یا کہ قانون سازی اور عدالت اختیار، دونوں میں باہمی تعامل شرط اول ہے؛ اگر یہ شرط کسی وجہ سے پوری نہ ہو تو یا تو وزارت کی تبدیلی عمل میں آئے گی، اور اگر وزارت کو ملک کی تائید پر اعتماد ہو تو پھر نیابتی ایوان بدل دیا جائے گا۔ دوسری خصوصیت اس طرح کی وزیر کی کئی ایک جماعتی ہے، یعنی جہاں تک عام حکمت عملی کا

تعلق ہے وزیراعظم اور جگہ وزرا کو ہم آواز ہونا چاہیے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب کا بینہ
 ایک فریقی جماعت ہوئی تو اس فریق کی مجموعی آواز ہی کا بینہ کی مجموعی آواز ہوگی، اور
 وزیراعظم کو لا محالہ دوسرے وزرا کے ساتھ ہم آہنگی برتنی پڑے گی ورنہ مستغنی ہونا
 پڑے گا۔ نیز ایسے ممالک (جیسے فرانس) میں جہاں بجائے دو بڑے سیاسی
 فرقیوں کے، نیابتی ایوان میں دس دس بارہ بارہ فریق ہوتے ہیں، وزیراعظم کی
 سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مختلف النوع گروہوں کو کسی مشترک
 لائحہ عمل میں متحد رکھا جائے، چنانچہ جب کسی حکمت عملی پر اس مخلوط وزارت کا
 کوئی رکن اور اس کے ساتھ اس رکن کا سیاسی گروہ کا بینہ کی رائے سے مخوف
 ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے دارالنائین میں مخالف کا بلڈا جھک جاتا ہے
 تو کا بینہ کو خواہی خواہی استعفا دینا پڑتا ہے۔ تیسری اہم خصوصیت اس پارٹی
 کا بینہ کی یہ ہے کہ حکومت کا روزمرہ کام مستقل حال کے قبضے میں ہوتا ہے، چلنے
 اپنے محکموں کے کام میں گویا ماہر ہوتے ہیں اور وزرا کے زیر ہدایت کام کرتے
 ہیں، لیکن خود وزرا محض شوقین سیاست باز ہوتے ہیں اور عمدہ وزارت قبول کرنے
 سے پہلے وہ اپنے محلکے کے کاروبار سے اکثر بیگانہ ہوتے ہیں۔ لہذا ہر اس
 سے تعجب ہوتا ہے کہ باوجود اس بیگانگی کے کام برابر چلتا رہتا ہے، لیکن اس
 کی وجہ بس یہی ہے کہ پارلیمنٹی کا بینہ کسی امر کی تفصیل پر زیادہ توجہ نہیں کرتی بلکہ اس
 کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ اپنے سیاسی گروہ کے اصول کو پیش نظر رکھ کر قانون
 سازی کرے اور اس خصوص طرز کے اصول کو مستقل عہدہ داروں کے سامنے
 رکھ دے۔ آخری قابل لحاظ خصوصیت اس طرز کی یہ ہے کہ اس کے تحت وزرا

خود اراکین پارلیمنٹ ہوتے ہیں اور نہ صرف عاملانہ امور کی نگرانی کرتے ہیں بلکہ انہی کی رائے اور صلاح سے قانون سازی بھی ہوتی ہے، اور چونکہ سائین کا مینہ کے بھی اکثر ارکان رکن ہوتے ہیں اس لئے ہر ایک قانون کی پورے طور پر چھان بین ہوتی رہتی ہے۔ آخری خصوصیت یہ ہے کہ یہ پارلیمنٹی وزارت (جیسا کہ خود اس کے نام سے ظاہر ہے) اپنے جملہ افعال کے لئے خود نیا تہی ایوان کے سامنے ذمہ دار ہوتی ہے، چنانچہ اگر کسی اہم مسئلے پر نیا تہی ایوان اس کے خلاف رائے دیدے تو اسے مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ فرانس میں تو یہ قاعدہ برتا جاتا ہے کہ اگر کسی وزیر سے کوئی معمولی سے معمولی سوال کیا جائے اور اس سوال پر رد لکیر کسی پیشگی اطلاع کے (مباحثہ شروع ہو جائے اور اس مباحثہ کے درمیان میں اکثریت کا تہ کے خلاف ہو جائے تو کا مینہ کو یا کم از کم اس خاص وزیر کو فوراً مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ اس عمل کو اصطلاح میں وضاحت طلبی کہتے ہیں۔

صدارتی کا مینہ :- صدارتی کا مینہ اس وزارت کو کہتے ہیں جو صرف صدر یعنی بادشاہ یا صدر جمہور کے سامنے ذمہ دار ہو۔ اس میں ان تمام ممالک میں جہاں لوکیت کا رواج تھا، ورنہ بادشاہ کے ملازم، اس کے مشیر کا درجے کے افعال کے لئے صرف اسی کے سامنے ذمہ دار ہوتے تھے، اور اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے

۱۵ پارلیمنٹی حکومت کے حسن درج کے لئے دیکھو بجاک : "مادی سیاست"

Sidgwick: Element of Politics. باب ۲۱۔

لاکھی "صرف نخبہ سیاست" The Government of لاکھی باب ۷۔

Politics.

کہ بیٹرز پارلیمنٹی کا بنیہ سے قدیم اور اس سے زیادہ تاریخی ہے۔ بادشاہ اور وزیر کی ہم آہنگی سے پرانے قصے اور تاریخیں بھری پڑی ہیں، درآنحالیکہ پارلیمنٹی کا بنیہ کو زیادہ تر انیسویں صدی عیسوی کی پیداوار سمجھنا چاہئے۔ جمہوریہ ممالک متحدہ امریکہ اور انقلاب فرانس کی کامیابی کے زمانے میں مؤسکیت کے خیالات کا بول بالا تھا۔ اور اس کے نظریہ تفریق اختیارات کو تمام سیاسی امراض کا گویا واحد علاج سمجھا جاتا تھا، چنانچہ (باوجودیکہ یہ جمہوریتیں ملکیت کے سخت خلاف تھیں تاہم) ان میں تفریق اختیارات کے اصول کے مد نظر صدر جمہور اور جماعت عالمہ کو جماعت مقننہ سے جدا رکھنے کے لئے وزراء کے کا بنیہ کو صدر جمہوریہ کے سامنے ذمہ دار قرار دیا گیا۔ امتداد زمانہ سے فرانس کا جمہوریہ بہت سے چولے بدلے کے بعد اب ۱۸۷۰ء سے پارلیمنٹی جمہوریہ بن گیا ہے، لیکن ممالک متحدہ امریکہ اور اس کی نقل سطلی اور جنوبی امریکہ کی جمہوریتوں میں اراکین کا بنیہ کا تفرقہ صدر جمہور (مالک متحدہ امریکہ بعض دوسری ملکوں میں مجلس سینات کی منظوری کے بعد) خود کرتا ہے اور جبہ وزراء اسی کے سامنے ذمہ دار ہوتے ہیں، وہی ان سے جواب طلب کر سکتا ہے اور چاہے تو وہی انھیں برخواست کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں پارلیمنٹی کا بنیہ کے ہر ایک رکن کو اپنے افعال کی تنقید کا خوف لگا رہتا ہے،

نقلہ انقلابی و سائبر فرانس کے لئے دیکھو مونٹز اسٹینیز، انقلابی یورپ Morse Stephens: Revolutionary Europe. ترجمہ جادو غمانیہ، حیدرآباد دکن۔ نیز دیکھو باب ۱۲، بالا۔
خلا شلا ارضائن۔

دراں صدارتی کا بنیہ کے ارکان عوام سے گویا پس پردہ رہتے ہیں، اور گو انہیں بعض جگہ جن رہتا ہے کہ وہ دارالناہین میں جا کر تقریر کریں، لیکن علی العموم انہیں دراں مسلسل نشست کرنے کا اختیار نہیں ہوتا اور نہ وہ تقسیم آراء کے وقت رائے ہی دے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ صدارتی کا بینوں میں جو کچھ تعلق دارالناہین سے ہوتا ہے وہ زیادہ تر سیاسی ذہنی بندی کے ذریعے سے ہوتا ہے، اور اگر سیاسی ذہنی بندی نہ ہو تو پھر دشواریاں بڑھ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ صدارتی طرز کے حامی یہ کہتے ہیں کہ ان کے طرز کے بموجب وزراء نہایت یکسوئی سے ایک مرکز یعنی صدر جمہور کی ہدایات کے مطابق قوانین کا بہترین طریقے سے نفاذ کرتے ہیں اور پارلیمنٹی عالمہ کی طرح قانون سازی اور بلے کا مباحثہ میں نہیں پڑتے، اور محض اپنی تقریر بازی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی حکومتی قابلیت اور تجربہ کی وجہ سے مقرر ہوتے ہیں۔

آمری کا بنیہ۔ عالمہ کی تیسری شکل، جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، امری عالمہ ہے۔ انیسویں صدی میں (جو سیاسی اور دستوری اعتبارات سے گویا جنگ عظیم ختم ہوتی ہے) پارلیمنٹی طرز کی حکومت کو ہر سیاسی مرض کے لئے تریاق تصور کر لیا گیا تھا، لیکن اس خیال کو جنگ عظیم میں بڑا زبردست دھکا لگا، اور دنیا کا بڑا حصہ ایک طرف تو اشتالی بولشویت پسند ممالک اور دوسری جانب آمریت پسند ممالک کے درمیان تقسیم ہو گیا۔ اٹلی اور جرمنی کے بعد اب دوسرے یورپی ممالک نے امری جو لہر بہن لیا ہے اور آمری اصولی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے تیار ہیں، اور ایسے ملک بھی جو نظام اس اصول سے بعد سمجھے جاتے تھے جیسے

انگلستان، فرانس، ممالک متحدہ امریکہ، وہاں بھی ایک فرق ملک میں آمریت کو رائج کرنا چاہتا ہے۔ جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے آمریت والے ملکوں میں نیابتی مجلس کے اختیارات آمر اور اس کی تاثر زد کردہ جماعت عالمہ سلب کر لیتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ ذمہ داری کا اصول باقی نہیں رہتا۔ فوج کو آمر اپنی بنالیتا ہے، اور گو آج کل کے زمانے میں اس کا مقصد ملک کی فلاح و بہبود ہو تا ہے، لیکن کم از کم فی الفور تو وہ سب سے مطلق العنان بادشاہ سے بھی زیادہ مطلق العنان معلوم ہوتا ہے، بلکہ داخلی طرح، اصلی بادشاہ اور سٹیڈنگ کی جگہ کی طرح، صدر جمہوریہ کی حیثیت بالکل ثانوی ہو جاتی ہے۔ آمری کا بنیہ اور پارلیمنٹی و صدارتی کا بنیوں میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ آمری کا بنیہ نہ صرف عاملانہ بلکہ مقننہ اور بعض مرتبہ عادلانہ اختیارات کا بھی حامل ہو جاتا ہے۔

مفرد و مرکب عالمہ۔ بہر حال یہ امر یقینی ہے کہ دوسرے سیاسی ادارات کی طرح حکومت کی ساخت کا تعین بھی محض مصنوعی طرز پر، جیسا جی چاہے نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ زیادہ تر ملک کے سیاسی حالات اور تاریخی اسباب کی وجہ سے

شہ جہی کی برسر اقتدار جماعت ناسی کے سرگروہ تہذیبی، جو پہلے وزیر اعظم اور فون سٹین برگ کے انتقال پر رہنے کے جراتیہ بن گیا، جو ۱۹۳۲ء میں اپنے مخالفوں کو بغیر کسی قسم کے مقدمے کے گولی کا نشانہ بنا دیا، شہزادے الحق کے بعد ۱۰ اپریل ۱۹۳۷ء کو جرمنی میں نئے ماتحت شاہ کا جو "انتخاب" ہوا تھا اس میں "رادو ہندوں" کے سامنے ہٹلر کی بنائی ہوئی اراکین کی فہرست پیش کی گئی تھی اور رادو ہندوں سے صرف "ہاں" یا "نہیں" کا استفسار کیا گیا تھا۔

موتا ہے۔ ظاہری تشکیل کچھ بھی کیوں نہ ہو، یہ امر خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہئے کہ حکومت ایک وحدت ہے اور اس کے ارکان میں مکمل بیگانگت لازمی ہے، اس لئے کہ اس کے اجزاء کے درمیان ایک ہی عضویت کے اجزاء ہونے کی وجہ سے باہمی ربط و تعلق لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ممالک میں جماعت عالمہ کا مرکز ایک واحد شخصیت ہوتی ہے، خواہ وہ وزیر اعظم ہو یا صدر جمہوریہ یا بادشاہ، اور اسی کے سامنے جملہ وزراء جواب دہ ہوتے ہیں، چنانچہ ایسے ملکوں میں جہاں پارلیمانی حکومت قائم ہے وہاں اگر کوئی وزیر یا وزیر اعظم سے کسی اہم معاملے میں اختلاف رکھتا ہو تو یا تو اسے کاہنہ سے الگ ہو جانا پڑے گا، ورنہ اگر وہ کاہنہ کے زیادہ تر ارکان کو (جو دراصل ایوان عام کے قائم مقام ہوتے ہیں) ایوان عام کی اکثریت کے خلاف اپنا ہم رائے بنائے تو وزیر اعظم اور تمام کاہنہ کو مستعفی ہونا پڑے گا۔ گویا عالمی انجمن جماعت عالمہ ایک مرکز کے تابع ہوتی ہے اور مرکز سے ہٹ جانے کی صورت میں یا تو اسے مرکز کا مطیع ہونا پڑتا ہے ورنہ اس کا مرکز جدا گانہ بن جاتا ہے۔ چونکہ یہ بمنزلہ ایک فرد کے ہوتی ہے اس لئے اسے اصطلاح میں مفرد عالمہ کہتے ہیں۔ اس کے برعکس ایسی عالمانہ جماعتیں بھی ملتی ہیں جو بظاہر مرکب ہوتی ہیں، یعنی جن میں ذمہ داری اجتماعی نہیں ہوتی بلکہ ہر وزیر انفرادی کسی جماعت کے سامنے ذمہ دار ہوتا ہے، یا یوں کہتے ہیں کہ جس میں اقتدار حکومت کی حیثیت اجتماعی نہیں ہوتی بلکہ اس کا ایک ایک جزو ہر وزیر کے سپرد ہوتا ہے۔ ایسی عالمہ کو مرکب عالمہ کہتے ہیں۔ اصولی اعتبار سے یہ طریقہ پسندیدہ نہیں اس لئے کہ اس کے ذریعے سے حکومت کی فطری وحدت کو ضمیمہ پہنچنے کا اندیشہ ہے، اور اگر غور سے دیکھا جائے تو آج کل

کے زمانے میں شاید سوائے سوویتان یا امریکہ کی اجڑائی ریاستوں کے باقی شکل سے کوئی مملکت ایسی ہوگی جہاں اس پریل ورآمد ہو تا ہو اور ان ممالک میں بھی دراصل علامانہ اقتدار نیابتی جماعت میں مرکوز ہوتا ہے، یعنی ہر روز پربراہ راست اس کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔ زمانہ قدیم میں ضرور اسپارٹا، ایتھنز و روم میں علامانہ اقتدار مرکب ہوتا تھا، چنانچہ اسپارٹا میں دو بادشاہ، ایتھنز میں نو "آرخن" اور روم میں دو فیصلوں کا ذکر پڑھنے میں آتا ہے، لیکن یا تو یہ مرکب ادارہ جان بوجھ کر علامانہ اقتدار کم کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا تھا (جیسے روم میں) یا اس طرح سے غیر شعوری طور پر یہ اقتدار رفتہ رفتہ کم ہو گیا (جیسے اسپارٹا اور ایتھنز میں) اور ان عہدہ داروں کی جگہ دوسرے عہدہ داروں نے لے لی۔

ترکیب وزارت جہاں تک دوزار کی تعداد اور ان کے درمیان تقسیم کار کا تعلق ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف ممالک میں مختلف طریقے رائج ہیں۔ اصولاً تو وزارت کو دو بڑی بڑی شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، یعنی وہ شعبہ جس کا تعلق ممالک غیر سے ہو اور وہ جس کا تعلق اندرونی انتظام سے ہو، ان میں ایک تیسرے شعبہ یعنی شعبہ قانون و عدالت بڑھایا جاسکتا ہے۔ لیکن حکومت کا کام اس درجہ بڑھ گیا اور پیچیدہ ہو گیا ہے اور اس کا عملی حلقہ اقتدار اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ وہ داخلی معاملات کے لئے بھی متعدد وزارتیں بنانی پڑی ہیں، جیسے تعلیم، حفظان صحت، تعلقی ادارات کی نگرانی، تجارت، صنعت و حرفت، ریل و رسائل، فوج، بیڑا، ہوائی جہازیں، اور حال میں بعض دوسرے شعبہ جات بھی کھل گئے ہیں جن کا مقصد عوام الناس کی بہبودی ہے، جیسے مزدوری اور رفاہ عام۔ اس کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ ملک میں

بعض ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے صلاح و مشورے سے وزارت مستفید ہونا چاہتی ہے لیکن جو بوجہ اپنے بڑھاپے یا کسی دوسرے سبب کے تلمذ ان وزارت نہیں سنبھال سکتے۔ دوسرے آج کل کے زمانے میں جب سیاسی فریق ہندی کا نیا بتی اپان ہی میں نہیں بلکہ کاہنہ پر بھی عظیم الشان اثر پڑتا ہے اور بعض مرتبہ کاہنہ کی زندگی ہی کا فرضی تنظیم پر مدار ہوتا ہے، ایسے لوگوں کو وزارت میں جگہ دینی پڑتی ہے جن کے سپرد کوئی ملکی کام نہ ہو بلکہ جو مقتدر سیاسی فریق کو منظم و مستحکم رکھیں۔ ایسے وزراء کو وزراء کے بلا تلمذان کہتے ہیں۔

مگر یہ امر بادی النظر میں بالکل صاف معلوم ہوتا ہے کہ جماعت عالمہ کے فرائض عالمانہ ہونے چاہئیں، یعنی اس کا کام صرف یہ ہونا چاہئے کہ جو قوانین مقننہ نے منظور کر لئے ہوں یا جو قوانین قابل نفاذ ہوں انہیں اپنے اثر و ثروت کے ذریعے سے نافذ کرے، لیکن یہ اصول ہر حالت میں صادق نہیں ہوتا بلکہ بہت سے ممالک میں عالمہ کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف مقننہ کو اپنا تابع کرے بلکہ عدلیہ پر بھی اپنا اثر ڈالتی رہے، خصوصاً ایسے ممالک میں جن سے اسے خاص طور پر دلچسپی ہو۔ تاریخ میں بار بار پڑھنے میں آتا ہے کہ مطلق الخان بادشاہ محض فرامین کے ذریعے سے حکومت کرتے ہیں، اور گو وہ خود کسی عظیم الشان سلسلہ قاری

۱۹ کیفیت انجمن تان کے "صدر پریوی کونسل" اور "لارڈ پریوی سیل" (دشا ہی ہر ہر دور) کی ہے جن کے سپرد تفسیر یا کوئی کام نہیں سوائے اس کے کہ ولایتی سیاسی فریق کو یکجا منظم رکھیں۔

جیسے دھرم فاسٹر، شرع اسلامی، انجیلی اصول، یا رواج کے ماتحت ہوتے ہیں لیکن ان فرامین میں بہت مرتبہ ان بالاتر اصول کو نظر انداز بھی کر دیا جاتا ہے، اور گویا کوشش کی جاتی ہے کہ باضابطہ قوانین کی جگہ فرامین لے لیں۔ انگلستان جیسے آزادی پسند ملک میں خود جماعت مقننہ یعنی پارلیمنٹ نے ۱۷۰۱ء میں ایک عجیب و غریب قانون منظور کیا جس کی رو سے قانون سازی کے اکثر اختیارات بادشاہ کے حوالہ کر دئے گئے، اور تا وقتیکہ یہ منسوخ نہ ہوا قانون سازی کا یہ طریقہ برابر قائم رہا۔ باوجود سیاسی خیالات میں اس قدر ترقی ہو جانے کے آج بھی یورپی ممالک تک میں وہاں کے نیابتی مجالس اس قسم کے خود کش قوانین منظور کرتی رہتی ہیں جن میں سب سے زیادہ ممتاز مثالیں آٹلی اور جرمنی کی ہیں جہاں کے پارلیمنٹوں نے اپنے وسیع اختیارات میں سے تقریباً سب کے سب باضابطہ طور پر اصرار مطلق کے حوالہ کر دئے ہیں۔ اسی طرح جماعت عالمہ کی یہ کوشش

۱۷۰۱ء سے ۱۷۰۲ء تک نافذ رہا۔ ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ فرامین صرف اس وقت قابل نفاذ قرار دئے جاتے جب تک فرامین کی اکثریت ان کے موافق ہوتی اور جب وہ کسی کی "میراث" "عہدہ"، "آزادی"، مال منقولہ وغیرہ منقولہ یا موجودہ قوانین کے متافی نہ ہوتے۔ دیکھو ویل لینگ میڈ، "تاریخ دستور انگلستان"۔ Langmead: English Constitutional History, باب ۱۰۔

۱۷۰۱ء میں ۱۷۰۲ء میں اور آٹلی میں ۱۷۰۳ء میں پارلیمنٹ اپنے تمام اختیارات سے دست بردار ہو گئی اور جرمنی میں محض کاہنہ نے اور آٹلی میں دہشتی مجلس عظمیٰ نے ایک حد تک اس کی جگہ لے لی۔

بھی رہتی ہے کہ محکمہ عدلیہ پراثر ڈالے، گو صدیوں کی کشمکش کے بعد محکمہ عدلیہ ذاتی مقدمات کی حد تک ضرور اس دست برد سے آزاد ہو گیا ہے اور اکثر ممالک میں عادلوں کو عمر بھر کے لئے عادل رہنے کی ایک طرح پر ضمانت سی ہو گئی ہے لیکن آج بھی یہ امر شبہ ہے کہ اگر کوئی مقدمہ ایسا ہو جس میں عالمہ کو براہ راست دلچسپی ہو تو وہ مقدمہ واقف قانونی اصول پر طے ہو گا یا نہیں۔

مجالس متعلقہ کا بیٹہ۔ بعض ممالک میں یا تو وزارتوں کے متعلق مجالس بھی ہوتی ہیں جو عالمہ کی صلاح کار ہوتی ہیں ورنہ انھیں خود بھی عالمانہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ ممتاز مجالس وہ ہیں جو تاریخی یا آئینی اہمیت سے خود دستور کا جز ہیں جیسے انگلستان میں پریوی کونسل، ممالک متحدہ امریکہ میں مجلس سیناٹ اور فرانس میں مجلس مملکت۔ جہاں تک ملکی سیاسیات کا تعلق ہے انگریزی پریوی کونسل کے اختیارات اب بمنزلہ محدود کم کے ہیں اور اس کی جگہ مجلس کا بیٹہ نے لے لی ہے۔ لیکن ممالک متحدہ امریکہ کی مجلس سیناٹ کو نہایت اہم سیاسی حقوق اس وقت بھی حاصل ہیں

۱۵۲ اس کا ایک دلچسپ مظاہرہ اتھنسی جرمنی کے مشہور عدلیہ کے ایک ماہرینی قانون کے ذریعے سے ہوا ہے۔ جس کے بموجب اگر عادل محسوس کر لے کہ موجودہ قانون کا مقدمہ زیر بحث پر منطقی کرنے سے ملک کو کوئی نقصان ہو گا تو اس قانون کو بالائے طاق رکھ کر اپنی ذاتی مولیٰ پر عمل کر سکتا ہے۔ "سان نامہ دیرین" ۱۵۳ ص ۹۷۔

۱۵۳ دیکھو "دیس" حسب بالا جلد ۲، حصہ اول، باب ۲۔

چنانچہ یہ کسی عہد نامے کو منظور کر سکتی ہے اور اسے بڑے بڑے عہدہ داروں کے عہدوں کے نام منظور کر لے کا اختیار ہے۔ فرانس کی مجلسِ مملکت کے اراکین کو صدر جمہوریہ فرانس نامزد کرتا ہے اور یہ چار ذیلی مجلس میں منقسم ہو جاتے ہیں اور ہر ذیلی مجلس ایک ایک شعبہ حکومت کے متعلق کر دی جاتی ہے۔ یہ تو دستوری مجلس ہو میں، ان کے علاوہ بھی بعض شعبہ جات کے متعلق صلاح کار جماعتیں ہوتی ہیں، جیسے وزارتِ بحریہ اور وزارتِ فوج کے متعلق مبصرانہ ذیلی جماعتیں یا توابع کے ہاں ذیلی مجلسیں۔ ان میں سے بعض مجالس کے اقتدار زمانے سے فنا ہو جانے کے باوجود دستوری ان کا ذکر باقی رہتا ہے، جیسے انگلستان میں ایک وزیر "صدر مجلس تجارت" کہلاتا ہے حالانکہ مجلس تجارت کا صرف نام ہی نام باقی ہے، اور یہی کیفیت انگلستان کی مجلسِ تعلیمات کی بھی ہے۔

سول سروس۔ اب علامہ اقتدار کی ایک نہایت اہم شق، یعنی سول سروس کا ذکر باقی ہے۔ ہم وزیر کا ذکر سنتے ہیں، بادشاہ کا حشم و خدام دیکھتے ہیں، پولیس کو برتتے ہیں لیکن وہ لوگ جو دراصل حکومت کی گریباں لگانی ہیں، جو بس پر وہ حکومت کا دائمی کاروبار انجام دیتے ہیں، ان سے ہمیں نسبتاً کم سروکار ہوتا ہے۔ سول سروس دراصل آن منخواہ یا ب عہدہ داروں کا

۱۷ ذیلی مجلس کا بیان ملگر سٹ: "اصول علم سیاسیات" Gilchrist :
 Elements of Political Science. باب میں کیا: یا ہوا ہے

نام ہے جو ابتدا میں خواہ انتخاب کے ذریعے سے یا امتحان کے ذریعے سے حکومت کے مگر بن جاتے ہیں اور جو اس کے انتظامی جھینوں کی ترتیب دیندہ میں مصروف رہتے ہیں۔ ایسے مالک میں، جہاں پارلیمنٹی حکومت کا طریقہ رائج ہے، یعنی جہاں وزرا دراصل اپنی تقریر بازی اور فرنی مہر کی وجہ سے وزیر مقرر ہوتے ہیں، دہاں یہ کی خدمت نہایت درجہ اہم ہوتی ہے اس لئے کہ گوتام طرز عمل کا تعین کا مینہ ہی کرتا ہے لیکن اسے چلانے کا فرض خاص طور پر ان مستقل عہدہ داروں کے سر رہتا ہے۔

ملکی خدمات پر تقرر کے لئے کئی طریقے ممکن ہیں۔ پہلا اور بادی النظر میں آسان ترین طریقہ تقرر کا ہے، یعنی کوئی حاکم مناسب امیدواروں میں سے کسی کا تقرر کر دے۔ لیکن تجربے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اول تو اس سوال کا جواب مشکل ہے کہ کون سی شخصیت ایسی ہونی چاہئے جو بلا درودر عایت اچھے سے اچھے امیدوار کا تقرر کر سکے گی۔ پھر آج کل کے زمانے میں جب ملک میں اس قدر غربت و افلاس ہے اور کساد بازاری کے سبب سے اس درجہ بے روزگاری ہے، یہ ناممکن ہے کہ تقرر کرنے والے عہدہ دار کے پاس ایسے لوگ طرح طرح کی سفارشیوں نہ پہنچائیں جنہیں محض اپنی قابلیت کی بنا پر تقرر کی امید نہیں ہے یا عہدہ دار ان بالادست اپنے دوستوں اور عزیزوں کو برسر کار لانے کی کوشش نہ کریں۔ دوسرا طریقہ امتحان کے ذریعے سے مختلف عہدے پر کرنے کا ہے لیکن محض امتحان سے انسان کی تربیت اور چال چلن کا پتہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ انہیں اسباب کی بنا پر خدمت ملی کا تقررات کے لئے بہترین طریقہ ایک مستقل

مامور یہ مقرر کرنے کا ہے ؛ اس میں عام طور سے کم از کم تین ارکان ہوتے ہیں جن میں معتد بہ تنخواہ ملتی ہے ، اور یہ مامور یہ تقرر اور امتحان دونوں طریقوں کو یکجا کر کے مختلف عہدوں کو پُر کرتا ہے ۔ ان دونوں طریقوں کو یا تو اس طرح یکجا کیا جاسکتا ہے کہ پہلے امیدواروں کی سرکاری طور پر نامزدگی ہو جائے یعنی جو امیدوار ایک خاص معیار پر نہ اُترتے ہوں انہیں سرسری طور پر خارج کر دیا جائے اور اس کے بعد ان کا امتحان لے لیا جائے اور اس میں انہی کو اولیت حاصل ہو جو امتحان میں بہترین طور پر کامیاب ہوں ۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پہلے مقابلتی امتحان لے لیا جائے اور جو لوگ اس میں کامیاب ہوں ان میں سے جن کو بلحاظ تربیت و قابلیت کا تقرر کر دیا جائے ۔ لیکن دوسری شکل میں خوف اس بات کا ہے کہ خارج شدہ امیدوار سمجھیں گے کہ ہمارے ساتھ بالخصوص کی گئی اور حکام بالا دست سمجھیں گے ہم نے انصاف کیا ، اس لئے پہلا طریقہ ہی بہتر معلوم ہوتا ہے ۔

آخر میں یہ بات واضح کرنی ضروری ہے کہ کسی حالت اور صورت میں خدام ملکی محض اپنے افسروں کی خوشی کی خاطر علیحدہ نہیں ہونے چاہئیں بلکہ ان کی خدمات مستقل ہونی چاہئیں ، اور تاوقتیکہ وہ اپنے فرائض ادا سداورجہ کی قابلیت سے ادا کرتے ہیں انہیں علیحدہ نہیں کرنا چاہئے ۔ یہ طرز کہ خدام ملکی کو ان کے سیاسی فرائض کی بندی یا سیاسی خیالات پر برخاست کر دیا جائے یا موقع بے موقع

انھیں علیحدہ کر دیا جائے نہایت مضر ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے
 کہ خدام ملکی براہ راست سیاسیات میں حصہ نہ لیں اور ملک اور حکومت کے
 وفادار رہیں۔

Examples of exercises

ضمیمہ باب ۱۶

تمثیلات ترکیبیت عاملہ

(الف) فریضے؛ برطانیہ کلاں؛ شمالی ایرستان؛ فرانس؛ جاپان؛ جرمنی؛ ترکی
دب؛ دفائیض؛ مالک متحدہ امریکہ؛ سوویتان؛ روس؛ ہندوستان

(الف) فریضے

برطانیہ کلاں و شمالی ایرستان

(۱) یہاں بادشاہت موروثی ہے لیکن خود شاہی حق تخت نشینی ایک
ضابطہ قانون یعنی قانون ہندوستان پر مبنی ہے۔ اس قانون کی
روس سے بادشاہ کا پرنٹسٹ ہونا لازمی ہے۔

(۲) حقیقی عاملہ ایک وزارت ہے جس کا صدر وزیر اعظم ہوتا ہے۔ وزارت کے
دو حصے ہیں، (۱) وزراء اندرون کا بیٹہ (۲) وزراء بیرون کا بیٹہ۔

وزیر اندرون کا بیٹہ :-

(۱) وزیر اعظم (اول امیر خزانہ، رہبر دارالعوام) (تقریباً بے قلمنی) (۲) صدر مجلس

۱۵ دیکھو ڈروکین: "ملکت" Woodrow Wilson: The State (باب ۲)

(نقشہ حاشیہ ۲ شک ۳ پر ملاحظہ ہو)

شاہی (بے قلمدانی)۔ (۳) لارڈ چانسلر، اول امیرِ نصفت، صدر دارالامرا۔ (۴) چانسلر آف دی ایچکر (وزیر خزانہ)۔ (۵) متہد ملک متعلق صیغہ دارِ علمہ (وزیر دارِ علمہ)۔ (۶) متہد ملک متعلق صیغہ خارجہ۔ (۷) متہد ملک متعلق قلمروائے۔ (۸) متہد ملک متعلق نوآبادیات (۹) متہد ملک متعلق جنگ۔ (۱۰) متہد ملک متعلق ہند (وزیر ہند)۔ (۱۱) متہد ملک متعلق فضائیہ۔ (۱۲) اول امیر بحریہ۔ (۱۳) صدر مجلس تجارت (یہ مجلس بمنزلہ مفقود کے ہے)؛ صرف صدر کار فرما ہے۔ (۱۴) وزیرِ مختارِ صحت (۱۵) وزیرِ زراعت و ماہی گیری۔ (۱۶) متہد اسکاچستان (۱۷) صدر مجلس تعلیمات (اس کی بھی وہی کیفیت ہے جو نمبر ۱۶ کی ہے) (۱۸) شاہی مہر بردار (بے قلمدانی)۔ (۱۹) وزیرِ مزدوری۔ (۲۰) وزیرِ برہمن بطی و دفاع۔ (۲۱) وزیرِ ریل و رساکی۔

وزیرِ ارب و بیرون کا بنیہ :-

(۱) صدر وکیل سرکار۔ (۲) چانسلر لارڈ چانسلر (بے قلمدانی) (۳) صدر ناظمِ ڈاک و تار۔ (۴) وزیرِ وظائف۔ (۵) صدرِ مشیرِ قانونی (۶) لارڈ ایڈوکیٹ اسکاچستان۔ (۷) مشیرِ قانونی اسکاچستان۔ (۸) اول امور امورِ عامہ۔

۲۷ سالانہ مدبرین *Statesman's year Book* ۱۹۳۷ء

۲۸ بے قلمدانی عہدہ سے یہ مراد ہے کہ جو کام اس عہدہ دار کو تفویض کئے گئے ہیں وہ محض برائے نام ہیں اور خاص اس عہدے کے متعلق کوئی اہم قانونی نزاع نہیں ہیں۔ ایسے وزراء کا کام زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ فرقی تنظیم قائم کریں۔

بادشاہ کے ہر حکم پر کسی نہ کسی وزیر کے دستخط لازمی ہیں۔ ان کے وزرا کے تقرر وزیر اعظم کرتا ہے اور وزیر اعظم دارالعوام کی اکثریت کا رہبر ہوتا ہے سیاسی فریق بندی اور صرف و دوڑے بڑے فریق ہونے کی وجہ سے ایسا کم ہوتا ہے کہ دارالعوام کی اکثریت کسی اہم معاملے پر اپنی ہی بنائی ہوئی وزارت کے خلاف رائے دے۔

۳) پرلوی کونسل اب برائے نام رہ گئی ہے، گو اس کی بعض ”ذیلی مجلس“ باضابطہ قوانین کے ذریعے سے مستقل جماعتیں ہو گئی ہیں، جن میں سے ”عدالتی ذیلی مجلس“ علاوہ برطانیہ عظمیٰ کے باقی تمام سلطنت برطانیہ کے لئے عدالت مرافعہ کا کام دیتی ہے، اور ”جزائر و دوبار کی ذیلی جماعت“ وہاں کے انتظامات کی نگہداشت رکھتی ہے۔ دراصل اس قسم کی جماعتوں کو اصلی پرلوی کونسل سمجھنے کوئی تعلق نہیں۔ اصلی پرلوی کونسل صرف بعض رسمی کاروبار سنبھالنے کے لئے جمع ہوتی ہے، لیکن اس وقت اس میں علاوہ بادشاہ اور ”صدر مجلس خاص“ کے باقی صرف دو تین ارکان ہوتے ہیں اور یہ اکثر وہی وزرا ہوتے ہیں جن کے متعلق کام پیش ہونے والا ہے۔ اس قسم کے امور فرامین، احکام مجلس یا بت لڑاؤ یا بات شناسی وغیرہ ہیں۔ ہر رکن پرلوی کونسل کو رائٹ آفیسر کا لقب دیا جاتا ہے اور یہ خطاب اب ایک حد تک محض اعزازی رہ گیا ہے۔ (۴) مختلف وزارتوں کے متعلق مجلس پر۔

۱۔ واقعی مجلس :- مجلس بحریہ مجلس ہند۔

(الف) مجلس بحریہ، جس کا صدر اول امیر بحریہ ہے اور ارکان چار بحری امرا اور ایک ”دیوانی امیر“ ہیں۔ ان کے اجلاس ہوتے رہتے ہیں؛ لیکن فنی معاملات کے علاوہ اول امیر بحریہ کو جو کابینہ کا رکن ہوتا ہے ملق اختیارات حاصل ہیں۔

(ب) وزیر ہند کی صلاح کار مجلس ہند تھی جس میں ۱۹۱۹ء کے قانون حکومت ہند کے بموجب ۸ سے ۱۲ تک اراکین تھے۔ ۱۹۳۷ء سے مجلس ہند کو تخفیف کر کے اب وزیر ہند کی ایک صلاح کار جماعت بنائی گئی ہے جس میں ۴ سے ۵ تک رکن ہیں۔ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے بعد وزیر ہند کے عہدہ منصب ایک مامور اعلیٰ کے سپرد کر دئے گئے ہیں۔ باقی مناصب جن سے اہم ترین حکومت ہند کی عام نگرانی سے دوڑے بڑے صیغوں میں تقسیم ہیں یعنی صیغہ رسل و رسائل اور صیغہ حساب کتاب۔

(۵) سول سروس :-

علاوہ اعلیٰ ترین عہدہ داروں مثلاً وزراء، پارلیمینٹری مستدین و وزراء اور بعض دوسرے ایسے عہدہ داروں کے جن کا کام فنی نوعیت کا ہے، انھیں ان کی سول سروس کے اکثر اراکین امتحان کے ذریعے سے لئے جاتے ہیں اور ان کی کارگزاری کے زمانے تک برابر لازم رہتے ہیں اور اسی کی بنا پر ترقی پاتے ہیں۔ یہ مستقل ملکی خدمت کہلاتی ہے کام نہایت خوبی سے چلتا رہتا ہے۔ مستقل سول سروس کے اراکین کو سیاسی رائے دہی کا حق ہے لیکن براہ راست سیاسیات میں دخل

دینے، سیاسی تقریر کرنے، سیاسی مضامین لکھنے، اور پارلیمنٹ کے کسی حلقے کی طرف سے امیدوار ہونے کی ممانعت تھی۔

فرانس

(۱) صدر جمہوریہ سات برس کے لئے منتخب ہوتا ہے اور انتخاب کا حق دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں، جو دیر سالی میں منعقد ہوتا ہے اور جسے "قومی جمعیت" کہتے ہیں بغیر کسی قسم کی تحریک یا تائید کے قطعی کثرت رائے سے ہوتا ہے۔ صدر جمہوریہ کو قوانین کے نافذ کرنے، معافی دینے اور غیر ملک سے عہد نامہ کرنے کا حق حاصل ہے لیکن ایسے عہد نامے جن کا اثر فرانس یا اس کی نوآبادیوں پر پڑتا ہو ان کے لئے پارلیمنٹ کی منظوری لازمی ہے۔ یہ دونوں ایوانوں کے اراکین میں سے وزراء مقرر کرتا ہے لیکن بعض مرتبہ فنی عہدوں، مثلاً وزارت جنگ، وزارت بحریہ وغیرہ پر وہ ایسے لوگوں کو بھی مقرر کر دیتا ہے جو رکن نہ ہوں۔ صدر کے ہر حکم پر کسی نہ کسی ذریعہ کے تحت لازمی ہیں۔

چونکہ دونوں ایوان بجائے دو بڑی بڑی سیاسی جماعتوں میں منقسم ہونے کے بہت سے سیاسی جمہوریوں میں منقسم ہوتے ہیں اس لئے ہر وزارت ایک طرح سے مخلوط وزارت ہوتی ہے جس میں ہر فریق اس فریق کے قائم مقام ہوتے ہیں

۱۷۔ انجمن کی سرل سرہیں کا بہت اچھا بیان آگے آچکوتا ہے یہاں

Government of Europe. باب ۶ میں دیا ہوا ہے۔

۱۸۔ ڈرووین، حسب الارباب، ۷۔

جس کے مطابق شہنشاہ کے بعد اولاد کو تخت پہنچتا ہے۔ اگر اولاد ذکر نہ ہو تو قریب ترین عزیز کو تخت جانا ہے۔

شہنشاہ کے اختیارات بہت وسیع ہیں۔ وہ سپہ سالار اور امیر البحر ہے، وہ قانون کو منظور دیا یا منظور کر لے، پارلیمنٹ طلب کرتا ہے، ملوثی کرتا ہے، منتشر کرتا ہے، پارلیمنٹ نشست نہ کر رہی ہو تو اس شد ضرورت کے وقت احکام صادر کرتا ہے (جو پارلیمنٹ کے نشست کرتے ہی اس کے سامنے منظوری یا انا منظوری کے لئے پیش ہوتے ہیں)، تقررات کرتا ہے، وزیر خاں مقرر کرتا ہے، جنگ، صلح اور عہد نامے کرتا ہے۔ لیکن اس کا کوئی حکم اس وقت تک قابل نفاذ نہیں جب تک کہ اس پر کسی وزیر کے دستخط نہ ہوں۔

۴۲، وزیراء۔ ہر وزیر اپنے صیغے کے معاملات کا ذمہ دار ہے۔ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر وزارت کا تیار کردہ موازنہ پارلیمنٹ منظور نہ کرے تو سال باسبق کا موازنہ منظور ہوجا جائے اور اس طرح وزارت کے پاس کام چلانے کے لئے کافی رقم رہتی ہے، خواہ پارلیمنٹ منظور کرے یا نہ کرے۔

شہنشاہ وزیر اعظم کا تقرر کرتا ہے اور وہ دوسرے وزراء کا جملہ وزراء شہنشاہ کے سامنے جواب دہ ہیں۔

(۴۳) پریلوی کو نسل۔ شہنشاہ کی صلاح کار مجلس۔ اس میں جملہ وزراء اور ۲۶

مزید ارادہ کین میں جنہیں شہنشاہ ان کے عمر اور تجربہ کی بنا پر مقرر کرتا ہے مجلس صرف اس وقت نشست کرتی ہے جب کاغذ کے کہنے سے شہنشاہ اسے طلب کرتا ہے۔ اس کے سامنے جو معاملات شہنشاہ پیش کرتا ہے اس پر بحث ہوتی ہے اور پریوی کونسل اپنی رائے پیش کرتی ہے۔

(د) ، سول سروس :- چار قسم کے عہدہ دار ہیں :-

(الف) شی -ن - وہ عہدہ دار جنہیں خود شہنشاہ نامزد کرتا ہے جیسے وزراء وغیرہ۔

(ب) چو کوئن - وہ عہدہ دار جنہیں شہنشاہ وزراء کے کہنے سے نامزد کرتا ہے۔

(ج) سوئن - وہ عہدہ دار جنہیں شہنشاہ صدر ان شعبہ جات کے کہنے سے نامزد کرتا ہے۔

(د) لون - وہ عہدہ دار جنہیں خود صدر ان شعبہ جات نامزد کرتے ہیں۔

جرمنی :-

ناٹسی فرنٹ کے برسر اقتدار ارکان سے پہلے اس ملک کی حکومت کی

بنیاد ۱۹۱۹ء کا دستور تھا جس کے مطابق مرکزی عالمہ ایک صدر (جو سات برس

کے لئے انتخاب عامہ کے ذریعے سے منتخب ہوتا تھا) ایک وزیر اعظم (چانسلر)

جو مجلس سلطنت (رائخسٹاگ) کے اکثریت کا سربراہ تھا اور ایک وزارت پر (جسے

وزیر اعظم نامزد کرتا تھا) مشتمل تھی لیکن تسمیوں کے برسر اقتدار آلے پرانے

میں مجلس سلطنت نے ایک قانون کے ذریعے سے اپنے تمام اختیارات خود کاغذ

کے سپرد کر دئے، اور صدر جمہوریہ پنڈت بھگت کی وفات کے بعد تاسیسی کے رہنما اور نمائندگی چائلر بھگت نے اعلان کیا کہ صدارت کے اعلیٰ عہدے کا فائزہ پنڈت بھگت کے ساتھ ساتھ ہو گیا اور آئندہ بجائے صدر کے اس ملک کے اعلیٰ ترین عاملانہ عہدہ دار ”رہبر سلطنت“ ہو گا جس کی ذات میں صدارت اور وزارت عظمیٰ دونوں شامل ہیں۔ رہبر سلطنت مقننہ اور عاملہ دونوں شعبوں کا رہنما ہے؛ اب تو راجستھاغ کے اراکین کی فہرست یہی ترتیب دیتا ہے اور محض ان یا نہیں کہنے کے لئے دیکھ لوں کہ صرف ان کہہوائے کے لئے ”رائے“ و ”بھندوں“ کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ ملک بجائے وفاقیہ ہونے کے کلیتہً فر دین گیا ہے اور مختلف صوبوں میں بھگت کے ”ذاتی قائم مقام“ بطور صوبہ داروں کے کار فرما ہیں۔ ہر بڑے عہدہ دار کو بھگت کی وفاداری کا حلف لینا پڑتا ہے؛

تسکی پٹو

۱) صدر: مجلس ملیہ عظمیٰ اپنے اراکین میں سے کسی کو چار سال کے لئے صدر منتخب کرتی ہے لیکن ایک ہی شخص کا بار بار انتخاب ہو سکتا ہے۔ دوران صدارت میں صدر نہ تو اس مجلس میں بیٹھ سکتا ہے نہ رائے دے سکتا ہے لیکن ہر سال نومبر میں سال گذشتہ کی کارروائی سننے یا دوسرے سے پڑھوانے کا اسے حق حاصل ہے۔ غیر مالک کو جو سفر بھیجے جاتے ہیں انھیں صدر ہی

شاہ دیکھو دستور تسکی، ضمیمہ ب۔ نل۔ بھارگو، ”کمال پاشا“: B. L. Bhargava.

Kamal Pasha.

نامزد کرتا ہے۔ اسے حق انتخاب حاصل نہیں ہے اور زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ اگر اسے کوئی قانون پسند نہ آئے تو دس روز کے اندر اپنے دلائل نگاہ کر مجلس عظمیٰ کو بھیج دے؛ اگر پھر بھی یہ مجلس اس قانون کو منظور کرے تو وہ خود بخود قابل نفاذ ہو جاتا ہے۔ لیکن دستوری ترمیمات اور موازنہ کی کارروائی صدر کے اس حق سے بھی مستثنیٰ ہیں۔

(۲) ”صدر مامورین عالمہ“۔ یعنی وزیر اعظم۔ اسے صدر جمہور منتخب شدہ اراکین میں سے مقرر کرتا ہے اور یہ پھر باقی ماندہ وزراء کی فہرست صدر جمہور کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ہر مجلس ”مامورین عالمہ“ کے اراکین انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح مجلس عظمیٰ کے سامنے جواب دہ ہیں اور کوئی صدارتی حکم متبادل نفاذ نہیں سمجھا جاتا جس کی کسی نہ کسی مامور کے دستخط نہ ہوں۔ ہر مامور کو تقرر کے ایک ہفتہ کے اندر مجلس عظمیٰ سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنا ہوتا ہے۔

(۳) مجلس مملکت۔

اس کے اراکین کو مجلس عظمیٰ منتخب کرتی ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ ٹھیکوں، تعبیروں اور اجاروں کی بابت حکومت کو مشورہ دے اور جدید قوانین کا مسودہ کر کے پیش کرے۔ اس میں بڑے بڑے تجربہ کار اور مبصر لوگ ہوتے ہیں۔

(ب) وفاقی۔

ممالک متحدہ امریکہ۔ مرکزی حکومت

(۱) صدر جمہور۔ اس کا انتخاب چار برس کے لئے ہوتا ہے اور دہلیور کے اعتبار سے اس انتخاب کے لئے ہر ریاست سے اتنے ہی ارکان چنے جاتے ہیں جتنے ارکان اس ریاست کی طرف سے دارالناکین اور سیناٹ میں بیٹھتے ہیں۔ خیال یہ تھا کہ اس طرح ملک کے چیدہ چیدہ لوگ ملک کے سب سے بڑے رہبر کا انتخاب کریں گے، لیکن سیاسی فریق بندی کی تنظیم اور تادیب کی وجہ سے صدر کا واقعی انتخاب مہینوں پہلے ہی محض اس مجلس انتخاب کے اجتماع کی ترکیب سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کس کو صدر منتخب کیا جائے گا۔ دستور میں اس کی صراحت نہیں ہے کہ کتنی مرتبہ ایک شخص صدر ہو سکتا ہے، لیکن رواج ایسا پڑ گیا ہے کہ دو مرتبہ سے زیادہ ایک ہی شخص صدر منتخب نہیں ہوتا۔ ہر وہ شخص صدر مقرر ہو سکتا ہے جو پیدائشی فہری مالک متحدہ کامبو جس کی عمر ۴۵ سال یا اس سے زیادہ کی ہو اور کم از کم ۱۴ سال ملک میں رہ چکا ہو۔

(۲) نائب صدر۔ اس کا انتخاب بھی صدر کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے لیکن اس کے سپرد کوئی عاملانہ کام نہیں بلکہ وہ مجلس سیناٹ کی صدارت کے فرائض انجام دیتا ہے اور صدر کی علیحدگی یا وفات پر باقی ماندہ مدت کے لئے صدر بن جاتا ہے۔

کابینہ دس وزرا پر مشتمل ہے جن میں اصطلاح میں مستدین کہتے ہیں اور صدر کے صواب و دید پر (سیناٹ کی منظوری سے) مقرر ہوتی ہے اور کلیتہً صدر کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے، صدر جس وزیر کو چاہے اور جب چاہے بغیر کسی منظوری کے علیحدہ کر سکتا ہے۔

(۲) سول سروس

مالک متحدہ امریکہ میں بہت کم ایسے عہدہ دار ہیں جن کا تقرر صحت حیات ہو اکثر محض چند سال کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں اور انہی مدت کے بعد اگر سیاسی اعتبار سے وہ عہدہ دار بالادست کے ہم رانے ہوں تو اس حالت میں ان کی توسیع ہوتی ہے ورنہ عہدہ دار بالادست اپنے ہمراہ لوگوں کو مقرر کر دیتا ہے۔ یہ کیفیت ایسے محکموں میں بھی ہوتی ہے جیسے ڈاکخانہ اور محصول خانہ جن سے سیاسی عقائد کو کچھ تعلق نہیں ہونا چاہئے۔ اسے اصطلاح میں ”عہدہ ٹائی“ کہتے ہیں جس سے یہ مطلب ہے کہ یہ عہدے گویا مال غنیمت ہیں جو عہدہ دار بالادست کے سیاسی پیروں کو مال غنیمت کے طور پر دئے جاتے ہیں۔ حال میں اس طرز کے خلاف ایک طرح کا رد عمل پیدا ہو گیا ہے اور ۱۸۷۸ء سے عہدوں کو پھر کرنے کے لئے ایک ”ماموریہ سول سروس“ مقرر ہو گیا ہے جو صدر جمہوریہ کے سامنے جواب دہ ہے اور سابقہ ہی مقابلتی امتحان کا طریقہ بھی بہت سے عہدوں کے لئے جاری کر دیا گیا ہے۔ اب عہدوں کی تقریباً نصف تعداد اس قانون کے تحت آگئی ہے۔

ریاستی حکومت

گورنر :- دور یا ستوں میں ایک ایک سال کے لئے اور باقیوں میں دو دو چار چار سال کے لئے براہ راست رائے دہی کے ذریعہ سے انتخاب ہوتا ہے۔ اس کے لئے محض شہریت کافی ہے جس کی کم سے کم مدت کہیں صرف دو سال کہیں زیادہ ہے؛ بعض ریاستوں میں میں سال کی شہریت لازمی ہے اور صرف

ایک ریاست دین میں اس کا امر کی نژاد ہونا ضروری ہے۔ گورنر کو اپنے باقی
ساتھیوں پر کوئی خاص تفویض حاصل نہیں ہے اس لئے کہ ان میں سے تقریباً سب
اسی طرح منتخب شدہ ہوتے ہیں۔ علاوہ انفرادی فرائض کے گورنر کا سب سے
بڑا امتیاز یہ ہے کہ اسے قانون سازی پر ایک حد تک قابو ہوتا ہے۔ بعض ریاستوں
میں اسے مستند ریاست بھی مقرر کرنے کا (ایوان دوم کی رضامندی سے) حق
حاصل ہے، لیکن ایسا بہت کم ریاستوں میں ہے۔ ریاستی وزارتیں مرکب ہوتی
ہیں نہ کہ مفرد یعنی اعلیٰ عہدہ دار گورنر کے سامنے نہیں بلکہ ایوانوں کے سامنے
یا راجد ہندوں کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔

سوئٹسٹان

مرکز: ۱۔ صدر اور نائب صدر جمہور ان معنی میں گویا ہیں یہی نہیں جن معنوں
میں دوسرے جمہوریوں میں ہوتا ہے، بلکہ دو عہدہ داروں کو جنہیں "صدر جمہوریہ"
اور "نائب صدر مجلس وفاقہ" (مجلس عالمہ) کہتے ہیں، عالمہ کے ارکان میں سے
وفاقی اسمبلی یا پارلیمنٹ سالانہ منتخب کرتی ہے۔ لیکن سولے اس کے کہ یہ دونوں
اپنے اپنے مخصوص شعبوں کا دوسرے ارکان مجلس عالمہ کی طرح کام کریں اور
"صدر جمہوریہ" جمہوریت کی قائم مقامی دوسرے ممالک کے مقابلے میں کہے ان
دونوں عہدہ داروں کو کوئی امتیازی تفویض دوسرے ارکان پر حاصل نہیں ہے۔

۲۔ دیگر ایضاً، باب ۴۴، سوئٹسٹان میں "وفاقی اسمبلی" پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے
مشترکہ اجلاس کو اور "وفاقی مجلس" مجلس عالمہ کو کہتے ہیں۔

سالانہ انتخاب و اصل صرف نائب صدر مجلس و وفاقیہ کا ہوتا ہے اس لئے کہ علی العموم نائب صدر ہی صدر بنایا جاتا ہے۔

(۲) وفاقی مجلس یہ عالمہ کا نام ہے۔ اس میں سات شعبے ہوتے ہیں:-

(۱) خارجی معاملات (۲) داخلی معاملات (۳) عدالت و کوٹوالی (۴) فوج

(۵) مالیات و محاصل (۶) اقتصادیات عامہ (زراعت و صنعت) (۷)

ڈاک و ریل۔

ان سب عہدوں پر ایک ایک رکن ہوتا ہے، اور خارجی معاملات کا کام عام طور پر صدر جمہوریہ کرتا ہے۔ وفاقی اسمبلی، وفاقی مجلس کے ارکان کا انتخاب تین تین سال کے لئے ہوتا ہے اور یہ شرط ہے کہ کسی کنٹین سے ایک سے زیادہ رکن کا انتخاب نہ ہو۔ یہ مجلس خفیہ معنوں میں جمعیت کی ذیلی جماعت اور اس کے حکم کے تابع ہے۔ اور ہر رکن فرداً فرداً اس کے سامنے جواب دہ ہے۔ گو اکثر معاملات عامہ میں اس کے اراکین متفق ہوں لیکن بہت سے معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں آپس میں اتفاق نہیں ہوتا، لیکن اس کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ نیز اگر کسی رکن کی کسی تحریک کو جمعیت مسترد کر دے تو بھی وہ رکن برابر فائز رہتا ہے۔ یہاں کے دوسرے اوسط مدت عہدہ ۱۰ سال ہے، اور یہ وزارت (اگر اسے یہ لقب دیا جائے) دنیا کی مستقل ترین وزارتوں میں سے ہے۔

کنٹین :- کنٹین یا ریاست میں عالمانہ اختیار ایک مجلس کے سپرد ہے اور کنٹین میں اس کا نام مختلف ہے، گو اکثر میں یہ اسمبلی مجلس کہلاتی ہے، اس کے اراکین مثل مرکزی مجلس وفاقہ کے بار بار منتخب ہوتے رہتے ہیں۔ اور کبھی

ان کے انتخاب کا حق جملہ شہریوں کو کہیں مجلسِ مقننہ کو حاصل ہوتا ہے۔ انہیں جماعتِ مقننہ میں نشست کرنے اور اس کے معاملات میں آزادانہ حصہ لینے کا اختیار حاصل ہے اور دراصل اسے جماعتِ مقننہ کی ہی ایک کاروباری ذیلی مجلس کہنا چاہیے۔
روس :-

۱۹۳۶ء کے نئے دستور کے اعتبار سے جماعتِ عالمہ کے طرزِ انتخاب میں تبدیلی ہوئی ہے۔ پہلے اس کا انتخاب سو ویتوں کی کانگریس میں ہوتا تھا، لیکن اب اسے ”مجلسِ اعلیٰ“ مقرر کرتی ہے۔ روس کی مجلس کا ممبر کو ”مجلسِ مامورینِ عوام“ کہتے ہیں۔ یہ عالملانہ اختیارات کی حامل ہے اور ۱۹۳۶ء کے بعد پوری طور سے مجلسِ اعلیٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس مجلس کا ایک صدر، چار نائب صدر اور حسبِ ذیل شعبوں کے سرگروہ ہیں :- خارجہ، دفاع، اشیاءِ خوردنی، داخلی تجارت، خارجی تجارت، زراعت، برقی ریل و رسائل، ڈاک و ”مار“، بھاری مصنوعات، ہلکی مصنوعات، لکڑی، مہنگی کھیت، مالیات، داخلی امور۔ اس مجلس کے فرائض و اختیارات حسبِ ذیل ہیں :- ”مجلسِ اعلیٰ“ اور ”صدریہ“ کے سامنے مسودات کا پیش کرنا، بین الاقوامی عہد ناموں کو مسودات تیار کرنا، موازنہ تیار کرنا، جملہ محلی امور کا تصفیہ، مختلف جمہوریوں کے مابین

۱۲ دیکھو الیکسی مالے وچ، ”روس“، Malovsky - Malovitch: Russia

۱۳ U.S.S.R. باب ”نظمِ ریسی“ دفعہ ۷۰، حال کی تبدیلیوں کے لئے دیکھو ”جریہ“ علومِ سیاسیہ“
Revue des Sciences politiques جولائی - ستمبر ۱۹۳۶ء؛ سالانہ جلد ۳۶ - ۱۹۳۶ء۔

نقص کا تصفیہ عام طبع پر قانون سازی کی تحریک کرنا۔

ہندوستان

دچونکہ باوجود قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کی منظوری کے مرکزی حکومت اس وقت تک ۱۹۱۹ء کے قانون ہی پر مبنی ہے اس لئے اس کی ترکیب و ڈول قوانین کے بموجب دکھائی گئی ہے، اس کے برعکس عہدہ داری حکومتوں میں تبدیلی عمل میں آگئی ہے اس لئے ۱۹۱۹ء کے اثرات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے (الف) انگلستان کی نگارنی حکومت ہند پر۔

۱۔ ملک معظم شاہ انگلستان قیصر ہند۔ جو اختیارات تاج کے ساتھ وابستہ ہیں وہ سب برطانیہ کھال کے دستوری ذرا (بالخصوص وزیر ہند) کی صلاح منظوری سے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان اختیارات میں سے حسب ذیل بھی ہیں:-
”صلاح کاران وزیر ہند کے کسی رکن کو دونوں ایوانہ کے پارلیمنٹ کی متفقہ عرضداشت پر علیحدہ کرنا، مفصلہ ذیل عہدہ داروں کا تقرر، طر کی کثرت سلطنت، گورنر جنرل، ارکان مجلس انتظامی گورنر جنرل، گورنران اور مستقل میجرس عدالت الاعلیٰ

۱۹۳۵ء کے قانون کے لئے دیکھو حکومت ہند ۱۹۳۵ء، سالنامہ ہندوستان Indian Year Book ۱۹۳۶-۳۷ء، ایڈیٹر جی۔ ایچ۔ سب بال۔

۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند کے لئے دیکھو ”امان“ برطانوی ہند کا نظام سیاسی

اردو ترجمہ مغل عہد جامعہ عثمانیہ، رپورٹ، ماسٹریٹ سن حصہ دیگر

نیز دیکھو کیتھ، ہندوستان کی دستوری تاریخ، Keith: Constitutional History of India.

صوبہ جات کے وکلاء کے سرکار، اساتذہ، مکلفہ، دھاس، بھٹی، نیز تاج کو اختیار ہے کہ ان قوانین کی آخری منظوری دے جو گورنر جنرل کے اتنا دسے منظور ہونے ہوں۔

۲۔ وزیر ہند - یہ کامیابہ، انگلستان کا رکن ہوتا ہے۔ ۱۹۱۹ء کے بموجب اس کے متعلق ایک "مجلس صلاح کاران" ہے جس کا ذکر انگلستان کے تحت کر دیا گیا ہے، وزیر ہند کو ہندوستان کی آمدنی اور حکومت پر "کل نگہ رانی" تالو اور ہدایت کے اختیارات حاصل ہیں اور ہندوستان کے ملکی اور قومی انتظام میں گورنر جنرل اس کا تابع ہے۔ حکومت ہند کے ہر اہم سیاسی عمل کے لئے تقریباً لازمی ہے کہ پہلے وزیر ہند کو اس کی اطلاع ہو جائے، اور پھر اس کے احکام کے جنگ صلح یا عہد نامہ نہیں ہو سکتا۔ گورنر جنرل کے احکام کے چھ ماہ کے اندر وزیر ہند کے دستخط لازمی ہیں۔ نیز بعض امور کے متعلق اس وقت تک قانون سازی نہیں ہو سکتی جب تک وزیر ہند کی اجازت نہ دی جائے، جیسے عیسائی مذہبی علماء کی حیثیت۔

۳۔ ہندوستان کا ڈپٹی کمشنر، انگلستان میں ۱۔ اس کے سپرد اشیا و اسباب کے خرید و فروخت کے اختیارات، جو پہلے وزیر ہند کے متعلق تھے، کر دیے گئے ہیں۔ ابتداء سے اس عہدے پر کوئی نہ کوئی ہندوستانی فائز ہو رہا ہے۔
(اسب) مرکزی حکومت ہند۔

(۱) گورنر جنرل - پانچ سال کے لئے بادشاہ کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں
نظیر دوسرے اختیارات کے (الف) پٹنہ کو طلب کر سکتے ہیں، منتشر کر سکتے ہیں
اس کی مدت بڑھا سکتے ہیں (ب) بغیر ان کی سفارش کے کسی دھم کو کسی میں ختم

کرنے کی تحریک نہیں ہو سکتی (ج) علاوہ ٹیگی منظوری کے حسب ذیل امور پر کوئی تحریک مقننہ میں نہیں ہو سکتی :

- ۱۔ ہندوستان کا قرضہ عامۃ یا ہندوستان کی آمدنی عام (۲۳) مذہبی معاملات (۲۴) فوجی معاملات (۲۵) غیر مملکت یا ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ تعلقات۔
- (۵) وہ صوبہ واری امور جو مرکزی مقننہ کے حدود سے باہر ہیں (۶) کسی مقامی مقننہ کے قوانین کا استرداد یا ترمیم (۷) گورنر جنرل کے احکام کا استرداد یا ترمیم (۸) ان کی رائے کے خلاف مرکزی مقننہ کوئی قانون منظور کر لیتا ہے تو گورنر جنرل کو "استنار" کا حق حاصل ہے کہ وہ یہ کہیں کہ یہ قانون برطانوی ہند کی حفاظت، امن، امان یا مفاد کے لئے ضروری ہے (۹) انھیں حق امتناع حاصل ہے اور وہ ۶ ماہ کے لئے احکام صادر کر سکتے ہیں۔

(۲۶) گورنر جنرل کی مجلس انتظامیہ۔

- ۱۔ محکمہ معاملات خارجہ۔ خود گورنر جنرل جائزہ دار ہوتے ہیں اور اپنے معتمد خارجہ کے ذریعے سے کام کرتے ہیں۔ اس محکمہ کا تعلق غیر مملکت اور ہندوستانی ریاستوں سے ہے (۲) محکمہ داخلہ (۳) محکمہ مقننہ۔ اس کا کام قانونی سروسے تیار کرنا ہے اور حکومت کو قانونی رائے دینا ہے (۴) محکمہ ریل و تجارت (۵) محکمہ صنعت و حرفت و مزدوری۔ اس کے سپرد ڈاک و تار بھی ہیں (۶) محکمہ تعلیم حفظان صحت و اراضیات (۷) محکمہ مالیات (۸) محکمہ افواج۔

یہ مجلس گورنر جنرل کی صدارت میں ہر ہفتہ نشست کرتی ہے اور عام طور پر معاملات اکثریت کے اصول پر طے ہوتے ہیں، لیکن گورنر جنرل چاہیں تو مجلس

اکثریت کے خلاف حکم دے سکتے ہیں۔ نیز ہر شعبہ کے مفکر کو براہ راست گورنر جنرل سے مشورہ کا اختیار حاصل ہے۔

قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء

۱۔ وزیر ہند کے صلاح کاروں کے لئے دیکھو بالا۔ مامور اعلیٰ کی حیثیت اور امتیازات حسب سابق ہیں۔ جدید قانون کی رو سے وزیر ہند اس حد تک گورنر جنرل کے افعال کے نگران رہیں گے جس حد تک نوازندہ کر کو پنی ذاتی رائے پر عمل کرنے کا اختیار ہوگا۔

۲۔ گورنر جنرل کی مجلس وزراء:- اس میں زیادہ سے زیادہ ۱۰ ارکان ہوں گے اور جب گورنر جنرل کی خواہش ہوگی وہ اس مجلس پر صدارت کریں گے۔ اگر کوئی وزیر جماعت متفقہ کارکن عرصہ ۱ ماہ تک نہ رہے تو وہ وزارت سے علیحدہ ہو جائے گا۔ وزیر کی تنخواہ دوران کارکردگی میں کم نہ ہو سکیگی وزیر عیسوی کلیسیائی معاملات، ملکی دفاع اور خارجی معاملات کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ نیز حسب ذیل امور گورنر جنرل کی ”مخصوص ذمہ داریوں“ میں شامل سمجھے جائیں گے:- ہندوستان کا امن و امان، مالیاتی توازن، اقلیتیں، سول سروس کے حقوق، سلطنت متحدہ اور برہما کے اسباب کی آزادانہ درآمد، ہندوستانی ریاستوں کے حقوق۔

گورنر جنرل کا جی چاہے تو ایک مالیاتی صلاح کار مقرر کر سکتا ہے۔

۳۔ صوبہ داری انتظام:-

صوبہ داری ذرا کا انتخاب خود گورنر کریں گے اور ان کی خوشنودی تک

قلمدان وزارت آن کے پاس رہے گا۔ گورنر اپنی صوابدید پر مجلس و ذرا کی صدارت کریں گے۔ اگر کوئی وزیر مسلسل چھ ماہ تک جماعتِ متفندہ کا رکن نہ ہو تو وہ وزارت سے علیحدہ ہو جائے گا۔ کسی وزیر کی تنخواہ اس کی مدتِ عہدہ تک کم نہ ہو سکے گی۔ گورنر کی مخصوص ذمہ داریاں تقریباً وہی ہیں جو گورنر جنرل کی، ان کے علاوہ صوبہ متوسط کے گورنر کی خاص ذمہ داری یہ ہے کہ وہ دیکھیں کہ محاسن کا کافی حصہ براہِ صرف ہوتا ہے یا نہیں۔ نیز ایسے صوبوں کے گورنروں کو، جن کے بعض ”مستثنیٰ“ رقبے، رقبہ جات و زر کی دست برد سے علیحدہ کر دیے گئے ہیں (اور ایسے نفعات بہت سے ہیں) یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ وزراء کے کسی فن سے ان رقبات کے انتظام میں تو کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا۔ گورنروں کو اختیار ہو گا کہ وہ کسی کو اپنے صوبہ کا وکیل سرکار مقرر کریں۔ گورنر کو اختیار ہو گا کہ پولیس کے قواعد میں ترمیم کریں، اور اگر وہ دیکھیں کہ بعض لوگ حکومت کو تہ و بالا کرنے کی فکر میں ہیں اور اس سے صوبہ کے امن و امان کو خطرہ ہے تو وہ جو انتظامات چاہیں اپنے تہذیبی کر سکتے ہیں۔ نیز وہ اس قسم کے قواعد بنا سکتے ہیں کہ کسی خاص مسئلے کے متعلق پولیس والے بغیر ان کی اجازت کے کسی کو کاغذات نہ دکھائیں۔

۴۔ سول سروس۔

سول سروس کے ارکان کا تقرر مرکزی خدمات پر گورنر جنرل اور صوبہ داری خدمات پر گورنر کریں گے۔ جو لوگ اس قانون سے پہلے سول سروس کے

اگرچہ ان کی بابت کوئی ایسے قواعد نہیں بنائے جاسکتے جن سے ان کے حقوق، تنخواہ وغیرہ میں کسی قسم کی کمی واقع ہو؛ اس قسم کا اختیار صرف ان عہدہ داروں کو حاصل ہوگا جنہیں یہ اختیار ۱۹۲۲ء سے پہلے حاصل تھا۔

انڈین سول سروس، انڈین میڈیکل سروس، انڈین پولیس سروس کے تقررات خود وزیر ہند کی طرف سے عمل میں آئیں گے۔ وزیر ہند اس کا تعین کریں گے کہ کتنے تقررات ایسے ہوئے چاہئیں جو ان کی جانب سے عمل میں آئیں۔ ان ”محفوظ خدمات کے قواعد مشاہدہ، رخصت و وظائف کی بابت خود وزیر ہند قواعد تیار کریں گے۔ ہر مقرر شدہ شخص کو کسی ایسے احکام سے گورنر جنرل یا گورنر کے سامنے مرافعہ کا اختیار ہوگا جسے وہ خلاف انصاف تصور کرے۔ ایک عام قاعدہ یہ ہے کہ ہر شخص کو وہی عہدہ دار پر فائز کر سکتا ہے جسے اس کا تقرر کرنے کا اختیار ہو۔

(بقیہ حاشیہ ۲۸۵)

۱۵۔ یہ سب قانون کے الفاظ ہیں۔ لیکن جب سے صوبوں میں سول سروس کا عمل درآمد ہوا ہے، گورنر بہت سے مخصوص اختیارات سے عملاً دست بردار ہو گئے ہیں۔

Palatinal Party

باب ۱

سیاسی فریق بندی

فریق بندی کے علمبر فریق بندی اور یوٹیٹ۔ سیاسی فرقوں کے اصول جس دفع
فریق بندی کے عناصر پچھلے باب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بہت سے
عمومیت پسند ممالک میں وزارت کا دار و مدار جماعت متقنہ کی سیاسی اکثریت پر
ہوتا ہے۔ یہ کوئی محض اتفاقی واقعہ نہیں ہے، بلکہ آج کل جب عمومیت پسند
ممالک میں نیابتی جماعتوں کا رجحان یہ ہے کہ وہ نہ صرف قانون سازی کے
معاملات کا تصفیہ کریں بلکہ عاملانہ امور میں بھی مداخلت کریں، تو عاملہ اور مقننہ کے
باہمی تضادم کا سد باب بھی ہو سکتا ہے کہ کسی نہ کسی ترکیب سے دونوں کی رائے
ایک ہی ہو یا کم از کم دونوں میں گہرا تعلق پیدا کیا جائے، اور زیادہ سے زیادہ ارکان
چند بڑے بڑے اہم معاملات پر ہم رائے ہو جائیں تاکہ فریق مخالف کی طرف
سے زک پہنچنے کا احتمال کم رہے۔ خود ان ممالک میں بھی جہاں ”صدرانی طرز حکومت“
مالج ہے، یعنی جہاں عاملہ اور مقننہ کے علقہ جات اقتدار جدا گانہ ہیں، وہاں بھی
اس کی ضرورت ہے کہ کوئی انتظام ایسا ہو جس کے ذریعے سے دونوں اعضائے
حکومت کے مابین ربط و یگانگت پیدا ہو جائے۔

لیکن ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہے کہ مختلف انفرادیتوں کے مابین مکمل ہم خیالی بالکل ناممکن ہے، اور جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص ہم خیال ہیں تو اس سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ یہ ہم خیالی زیادہ اہم امور میں ہے نہ کہ فروغ میں۔ سیاسیات میں باہمی مفاہمت کے عنصر کی بڑی اہمیت ہے، اور تا وقتیکہ اہم اور ممتاز امور میں بہت سے لوگ متفق نہ ہو جائیں کسی طرح کی سیاسی تنظیم ناممکن ہے بلکہ خود حکومت کا چلنا بھی محال ہے۔ ہر سیاسی تحریک پر نظر ڈالنے کے متعدد پیرائے ہوتے ہیں، چنانچہ اکثر ممالک میں باوجود کچھ ترقی کی کوشش کے تمام ملک واسلے ایک ہی نقطہ نظر پر متفق نہیں ہو سکتے جس کی وجہ سے کہیں دو اور کہیں دو سے زیادہ سیاسی فریق بن جاتے ہیں، اور ان ممالک میں جن کے باشندوں کو خدا نے مفاہمت کا مادہ کم دیا ہے، دس دس بیس بیس سیاسی مجموعے بن جاتے ہیں جنہیں بعض مرتبہ باہمی مخالفت اور عناد سے فائدہ اٹھا کر کوئی مطلق العنان حکمران یا آمر مطلق سب کو زیر کر دیتا ہے اور خود انہی قوت قائم کر لیتا ہے۔

۱۵۔ یہ تو امریت کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ عمومیت انہیں ممالک میں کامیاب ہو سکتی جن میں بغیر اسپین کے سابق آمر ریگوردی دیو برلاس کے، قدرت نے وقت، دوست اور عام حمایت تسلیم فرمادی (جیسے انگلستان)، اور جہاں معمولی معمولی مسائل پر بھی طویل بحث ایسے ہو سکے کہ ان کی وجہ سے ملک کو کوئی نقصان نہ پہنچے؛ اس کے عکس جن ملک کو کسی مصیبت کا ساتھ کرنا پڑے وہاں عمومی حکومت اور سیاسی فریق بندی ملک کے لئے ہر پچاسا مضرت رسال ہوں گی۔

فریق بندی اور کمیونیت۔ بہر حال یہ امر یقینی ہے کہ عمومی اصول پر کوئی حکومت نہیں چل سکتی تا وقتیکہ ملک میں دو یا دو سے زیادہ سیاسی فریق نہ ہوں، یعنی دو یا دو سے زیادہ ایسے سیاسی محوسے نہ ہوں جو اپنی اپنی حد تک چند خاص اصول پر متفق نہ ہو سکیں ہوں۔ یہ اصول مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں، لیکن اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو یہ محسوس ہوگا کہ ہر مسئلے پر اپنی طرح کی راہیں ہو سکتی ہیں، ایک وہ جو بہر حال ترقی کے خواہاں ہیں، دوسرے وہ جو قدیم روایات کو قائم رکھنا چاہتے ہیں اور تیسرے وہ جو قدیم روایات کا خیال رکھتے ہوئے ملک کے لئے معتدل ترقی پسند کرتے ہیں۔ اب بعض ممالک (مثلاً انگلستان) ہیں جہاں لوگ اندرونی معاملات میں مفاہمت کے عادی ہیں، سیاسی فریق انھیں تین اصول کے حامل ہیں، خواہ ان کا نام کوئی بھی کیوں نہ رکھا جائے، لیکن جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے، دوسرے ممالک (مثلاً فرانس) ایسے ہیں جہاں دونوں انتہا پسند فریقوں اور اعتدال پسند فریق کے میسجوں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں جو بعض فردی امور پر آپس میں مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ سیاسی فریقوں کے اصول۔ جن امور کو سیاسی فریق بندی کی بنیاد بنایا جاتا ہے وہ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں مختلف ہوتے ہیں۔ بعض جگہ تو یہ فریق بندی

۱۵ بقول فائر "حکومت عالیہ کا نظریہ اور عمل" *Feiner: Theory and Practice of Modern Government*، باب ۱۵، فرانس میں ہر ایک انتخاب کے ساتھ ساتھ مختلف سیاسی فریقوں کی نہ صرف حکمت عملی میں فرق پیدا ہو جلتے ہیں بلکہ نام بھی تبدیل ہو جاتے ہیں، اور جن پر پیروی کرتے ہیں "فریق" مشتق ہوتے ہیں وہ بھی بدلی جاتے ہیں۔

محض نہیں اصول پر مبنی ہے جو ان پر لگائے گئے ہیں، بعض انتہا پسند اور اعتدال پسند، بعض جگہ اس کی بنیاد معاشی ہوتی ہے، جیسے تجارت کی آزادی یا حفاظت، بعض جگہ نسلی اختلاف ہوتا ہے، جیسے ناکسوں سے پہلے جرمنی میں یہودی گروہ یا آئرستانی سوراخ سے پہلے برطانوی پارلیمنٹ میں آئرستانی، تیسری وجہ اختلاف تمدنی ہو سکتی ہے، جیسے ہندوستان میں مسلمانوں کے گروہ اور یہاں میں ہندوستانی گروہ۔ ان ممالک میں جہاں کسی غیر ملک کی حکومت ہوتی ہے ایسی حکومت کا وجود ہی باعث تفریق بن سکتا ہے، جیسے ہندوستان میں، جہاں کی سیاسی فریق بندی ایک بڑی حد تک برطانوی حکومت ہند کے ساتھ ملوک پر مبنی ہے، اور جہاں تقریباً ہمیشہ ایک فریق ایسا رہتا ہے جو اس حکومت کو بہتر طریقے سے نکل دینے پر تیار رہتا ہے۔ یوں تو اس طرح کے بہت سے اسباب اختلاف ہو سکتے ہیں بلکہ یوں کہئے کہ ہر ملک اور ہر زمانے میں مختلف اسباب فریق بندی پیدا ہوتے رہتے ہیں، لیکن ایک وجہ اختلاف ایسی ہے جس کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ ایسے ملکوں میں جہاں وفاقی طرز حکومت رائج ہے وہاں علی العموم ایک فریق تو ایسا ہوتا ہے جو مرکز کو اجزاء کے مقابلے میں تقویت دینا چاہتا ہے اور دوسرے فریق کا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح سے اجزاء کے اختیارات بڑھائے جائیں۔ یہ صورت حال ایک بڑی حد تک نہ صرف ممالک متحدہ امریکہ میں پائی جاتی تھی بلکہ تقریباً ہر ایک وفاقیہ میں نظر آتی ہے۔

۱۔ ملک متحدہ امریکہ میں جو دو بڑے فریق ”عمومی“ اور ”جمہوری“ ہیں (بقیہ مانتیہ مانتیہ)

حسن وقوع۔ ان اصول کو شمار کرنے کے بعد جو مختلف ممالک میں سیاسی فریق بندی کا باعث ہوئے ہیں اب ہم اس کے حسن وقوع پر بحث کریں گے۔ سیاسی فریق کی بابت سب سے پہلی بات تو یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگر عوامیت کے اصول پر حکومت چلائی ہے، یعنی اگر عوام ملک کو حکومت پر تھوپا رہیت قابو دینا ہے تو سیاسی فریق بندی ناگزیر ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ہر ایک فرد مملکت میں اس قدر سیاسی احساس ہو کہ وہ بغیر کسی قسم کی رہبری کے حکومت کے پیچیدہ معاملات کو سمجھ سکے اور ان کی اہمیت کا صحیح اندازہ کر سکے، اور جب کسی قسم کی تنظیم ہوئی تو لامحالہ ملک والے اپنے خیالات کے مطابق چند مخصوص فرقوں میں منقسم ہو جائیں گے۔ اسی سے ایک دوسری بات معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ سیاسی فریق عوام الناس کے ایک طرح کے مظہر ہوتے ہیں اور ان کے ذریعے سے عوام الناس کو چند خاص راستے معلوم ہوتے ہیں جن ریل کر داپنے اپنے تئیں اس کے بموجب، ملک کی نجات ممکن ہے۔ ساتھ ہی چونکہ (فریق بندی) فی لفظہ باہمی مفاہمت کا نتیجہ ہوتی ہے اس لئے انتہا پسند فرقوں کی حکمت عملی بھی بہت سی

(الفیہ حاشیہ ۱۸ کا)، اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ عمومی فریق جمہوریت پسند نہیں اور جمہوریت پسند جمہوریت پسندوں کی حکومت کا جان بیا، اور دونوں میں سے کوئی فریق ان دونوں میں سے کسی سے بھی متفرق نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں نامخص اصطلاحات ہیں اور ان کا زیادہ تر تضاد امر کی خارج جنگی سے ظاہر ہوتا ہے جب ایک گروہ مرکزی اقتدار کے حقوق کا طرفہ اٹھاتا اور دوسرا چاہتا تھا کہ ریاستوں کے اختیارات کو تقویت پہنچے۔ ان دونوں کے ناموں سے ان کے مفاد کا مطلق اظہار نہیں ہوتا۔

افراد کی حکمت عملی سے زیادہ مقبول ہوتی ہے، اور اعتدال اکثر حالتوں میں کامیاب سیاست کی جان بھجنا چاہئے۔ اس سلسلے میں آخری بات یہ کہنی ہے کہ سیاسی فریق بندی میں خصوصاً اس فریق بندی میں جس کے تحت دو بڑے بڑے فریق ایک دوسرے کے مقابل ہوتے ہیں، ہر مسئلے کے موافق اور مخالف پہلوؤں کی چھان بین ہو سکتی ہے، اور وہ بھی اعتدال کے ساتھ، اس لئے کہ فریق مخالف کو بھی یہ خیال رہتا ہے کہ میری طرف سے کوئی ایسی مبالغہ آمیز بات نہ کہی جاوے کہ کل کو جب وزارت میرے قبضے میں آئے تو مجھے قائل ہونا پڑے کہ جو اعتراض میں نے دوسروں پر کیا تھا وہ خود مجھ ہی پر عائد ہو رہا ہے حقیقت میں دو فریقی نظام کی یہ سب سے بڑی خوبی ہے کہ ایک تو ”فریق مخالف“ کو یہ خیال ہوتا ہے کہ تنقید حد اعتدال سے آگے نہ بڑھے، دوسرے اس حالت میں جب وزارت موجودہ کو ملک کے اکثریت یا کم از کم اس کے قائم مقاموں کی تائید نصیب نہیں ہوتی تو دوسری وزارت فوراً جائزہ لینے کو تیار ہو جاتی ہے۔ تاہم یہ کہنا درست نہیں کہ سیاسی فریق بندی میں خوبیاں ہی خوبیاں ہیں۔

لکھی اپنی کتاب ”صرف دو سیاسیات“ *Dasaki: Grammar of Politics* باب ۸ میں کہتا ہے کہ دو فریقی نظام ہی ایک ایسا نظام ہے جس میں لوگ واقفا حکومت کے ارکان کا انتخاب کر سکتے ہیں، درآنحالیکہ جہاں بہت سے فریق ہوں وہاں گونا گویا جس حقیقت حال کا آئینہ ہوتی ہے، لیکن حکومت ہمیشہ مکر در کرتی ہے اور اکثریت کے عدم استقلال کا شکار رہتی ہے۔

بکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جس طرح عمومی اصول کے تحت اس وقت انسان اس اصول سے آگے نہیں بڑھ سکا کہ اکثریت کو اقلیت پر تفوق حاصل ہو اسی طرح سے سیاسی فریق بندی کا نظام اس اصول کا ایک ناگزیر نتیجہ سمجھنا چاہئے، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اکثریت کا اقلیت پر تفوق اور ملک کو مختلف سیاسی گروہ میں تقسیم ہونا یہ دونوں عمومیت سے پیدا ہے اور یہ ایک دوسرے کے ساتھ گویا توام ہیں، چنانچہ اچھے مول یا بُرے اور لاد ہونے کی وجہ سے انھیں بہرِج پالنا پوینا پڑتا ہی ہے۔ حکومت کا ایک یا چند خاص سیاسی فریقوں کے ارکان پر متکثر ہونے سے فی نفسہ یہ نتیجہ نکلے گا کہ ملک کی ایک بڑی اقلیت ملک کی حکومت میں حصہ لینے سے محروم رہے گی، اور بقول کسی کے بہت سے ناقابلِ حکومت کے رکن بن جائیں گے اور بہت سے قابلِ لوگ حکومت سے باہر رہ جائیں گے۔

۱۹۲۵ء کے عام انتخاب کے موقع پر جنوبی انگلستان میں ساڑھے گیارہ لاکھ برلر اور مزدوروں کی طرف سے صرف دو برلوں کا انتخاب ہوا، درانحالیکہ اس سے دو گنے سے بھی کم یعنی ساڑھے بیس لاکھ اتحادیوں نے ۷۷ ارکان کو منتخب کیا۔ اسی طرح ۱۹۳۰ء کے برلاس کے انتخابات میں عام نشستوں کے لئے ۲۵ لاکھ کانگریسی رائے دہندوں نے ۱۳۰ نشستیں اپنے قائم مقاموں سے چکیں لیکن ان کے ۱۱ لاکھ مخالف صرف سات نشستیں چرکری کے۔ عمومی ممالک میں، جہاں حکومت کا دار و مدار نشستوں کی اکثریت پر ہوتا ہے، یہ اعداد نہایت عبرت ناک اور سبق آموز ہیں۔ دیکھو کتنا بچہ بن نیابت مناسبہ لندن ۱۹۲۶ء (۱۹۲۶ء) و ۱۹۲۷ء (۱۹۲۷ء) فائزر، حسبِ بالا، باب ۱۵۔

علاوہ ازیں چونکہ اب تو سیاسی فریق بندی کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح حکومت پر قابو حاصل ہو جائے، اور اس مقصد کے لئے بعض مرتبہ اسے اصول اختراع کرنے پڑتے ہیں جن پر زیادہ سے زیادہ تعداد اراکین متفق ہو سکے، اس لئے یہ اراکین اس قدر زیادہ ملک کے ہی خواہ نہیں ہوتے جتنے اپنے اپنے گروہ کے ہی خواہ، اور ممکن ہے کہ ملک کی ہی خواہی کی حیثیت ثانوی ہی رہ جاتی ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ منظم ممالک میں جہاں ملکی خدمت انسان کے دنیوی مذہب کا اول ترس رکن ہوتا ہے، فرقی و فاداری ملکی وفاداری کے منافی نہیں ہوگی۔ لیکن نیم منظم ممالک میں جہاں حب وطن کے علی مظاہرہ کے لئے نسبتاً کم مواقع ہوں وہاں یہ خطرہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ فرقی و فاداری ملکی وفاداری کے جذبہ کو بالکل پست نہ کر دے۔

۷۵ اس کا ایک عجیب و غریب مظاہرہ ۱۹۱۴ء میں ہوا جب ان تمام مخاصم سیاسی فریقوں نے جو انگلستان کی پارلیمنٹ میں اور اس کے باہر لڑ رہے تھے، جنگ عظیم شروع ہوتے ہی آپس میں صلح کر لی اور دوش بدوش آکر دشمن کے زیر کرنے میں مشغول ہو گئے بعض ایسے لوگ بھی تھے جو اصولاً اس جنگ کے مخالف تھے جیسے لارڈ مورلے، لیکن انھوں نے سرے سے سیاست ہی سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ دیکھو تو اسے کاخط وزیراعظم کے نام جو استعفیائے کے وقت لکھا تھا Morley's letter to the Prime Minister on his Resignation.

حقیقت یہ ہے کہ زمانہ حالیہ میں صرف انہی ممالک میں عمومیت کا راج باقی ہے جہاں ملک کو فریق پر ترجیح دی جاتی ہے اور جہاں سیاسی فریق بندی کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اس کے ذریعے سے رہبران ملک اپنی ذات کا بھلا کر سہ، ورنہ روتیں، جرتیں، اٹلی اور ایسے دوسرے ممالک میں، جہاں یہ دیکھا گیا کہ سیاسی فریق بندی سے بجائے اس کے کہ ملک کی عام رائے منظم ہو، ملکی مفاد کو نقصان پہنچ رہے، اس فریق بندی کا سرے سے خاتمہ کر دیا گیا ہے، یا یوں کہہ صرف برسرِ اقتدار فریق قائم رہے اور دوسرے فریق کو فنا ہونا پڑا ہے۔ سیاسی فریق بندی اسی وقت سودمند ہوتی ہے جب وہ مملکت سے باہر ہو کر جھگڑنے کے بجائے، مملکت کا ایک جزو بن کر محض حکومت کے طرز کار پر جھگڑے۔ یعنی جو ملک کی یہ حالت میں شدت کے ساتھ وفادار اور صرف موجودہ حکومت کے طرزِ عمل کو ناقص سمجھ کر اس کی تہ کیسی کے درپے ہو، اور ساتھ ہی ناؤتیکہ وہ خود برسرِ اقتدار نہ ہو جائے ان قوانین پر بارِ عمل پیرا رہے جو موجودہ حکومت کے زیرِ سیاست منظور کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ سب سے بڑا کہ عمل جو سیاسی فریق کے قبضے میں ہوتا ہے، یعنی وسیع ترین

۱۰ حال میں سب سے سبب آؤز تدریجی خاتمہ جو مختلف سیاسی گروہوں کا جرمنی میں ہوا ہے وہ قابلِ لحاظ ہے۔ دیکھو سالانہ رجسٹر "Annual Register" ۱۹۳۳ء جس میں اس خاتمہ کا مفصل ذکر دیا ہوا ہے۔

۱۱ فائزر حسبِ بالا

معنی میں تبلیغ، اسے بھی اس طرح استعمال کیا جائے کہ جیسے لوگوں کو دھوکے میں ڈالنے کے اس کے ذریعے سے انھیں صحیح حالات یا کم از کم صحیح نقطہ نظر سے مانوس کر لیا جائے، ورنہ اگر جھوٹی تبلیغ کے ذریعے کوئی سیاسی فریق برسرِ اقتدار ہو گیا اور عہدہ قبول کر لے کے بعد وہ وعدہ وعید پورے نہ کر سکا تو لوگوں میں رفتہ رفتہ اس فریق کے خلاف بے اعتباری پیدا ہو جائے گی اور پھر گھڑی کے رقاص کی طرح عام رائے یک بیک دوسرے فریق کی جانب چلی جائے گی۔

سیاسی فریق بندی میں سب سے اہم خرابی یہ معلوم ہوتی ہے کہ ”آذاذ“ یا ”خاگی“ اصول کے کسی شخص کو کامیابی کی امید نہیں ہوتی تا وقتیکہ وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی بڑے سیاسی فریق کا تابع نہ کر دے۔ جیسے جیسے سیاسی گروہ منظم ہوتے جاتے ہیں ویسے ویسے انسان سیاسی گروہ کی زبردست مشین کا ایک پتیا بنتا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کی وقعت شطرنج کے مہرول کی سی ہوتی جاتی ہے یہ سیاسی فریق بندی کی تکمیل ہی کا نتیجہ ہے کہ ممالک متحدہ امریکہ کے صدر کے وقتی انتخاب سے پہلے ہی نتیجہ نکل آتا ہے، اس لئے کہ جو لوگ اس کے انتخاب کے لئے منتخب ہوتے ہیں وہ پہلے ہی سے ایک یا دوسرے سیاسی بڑے گروہ کے ارکان ہوتے ہیں اور یہ پہلے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان انتخاب کنندوں کی اکثریت وقت آنے پر کس طرف رائے دے گی۔

مثلاً یہ کوئی راز نہیں کہ موجودہ صدر فرکلن روز ویلٹ کے پہلے انتخاب کے اعلان سے کم از کم چار ماہ پیشتر، یعنی انتخاب کنندگان کے انتخاب کے وقت، نہ صرف یہ معلوم (بقیہ مشعر)

کلاں میں سیاسی فریق بندی اس درجہ منظم نہیں، تاہم آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے ہی لارڈ کرزن نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ ”اب یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ اگر حکومت کسی بات کو طے کرے اور طے شدہ اصول پر عمل کرنے لگے تو اس میں ذرا شک نہیں کہ جو حکومت علی حکومت اختیار کرے گی اس کی موجودہ دارالعوام لازماً توثیق کرے گا“ انگلستان میں اگر کسی ایوان میں ایک حد تک آزادانہ رائے زنی ہوتی ہے تو وہ دارالامرا ہے، اور یہاں رائے زنی کو اس لئے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے کہ یہاں کی اکثریت اور اقلیت کا کامینہ کی ترکیب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بہر حال جیسا اوپر لکھا جا چکا ہے، کامیاب سیاست کا سب سے اہم عنصر راجی مفاہمت کی قابلیت ہے، اور اگر کوئی شخص ایسا ہو جس میں قابلیت مفقود ہو، یعنی جو اپنی ڈیڑھ اسیٹ کی مسجد ہی پر قانع ہو، تو پھر ایسے ان لوگوں کی شکایت نہیں کرنی چاہئے جو باہم منظم ہو کہ اسے زک پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں۔

بہر حال کچھ بھی ہو، جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے، عمومیت اور سیاسی فریق بندی لازم و ملزوم ہیں، اور آج کل جو جگہ جگہ آمریت کا راج ہوتا جا رہا ہے وہ دراصل

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۹۹) ہو گیا تھا کہ اس میں سے اکثر ریزرو ایکٹ کے لئے رائے دیں گے، بلکہ یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ملک کی اکثریت جواز سکرات کی طرف ہے، اس لئے چند ماہ میں سکرات کی ساخت اور اس کا بنیادوں میں مالک متحدہ امریکہ میں جائز ہو جائے گا۔
 (۱۱) یہ اتھس فائنل کی کتاب، جلد ۱، صفحہ ۶۲۲، حاشیہ پر دریا ہوا ہے۔

سیاسی فریق بندی کے خلاف ردِ عمل کا مظاہرہ ہے، اگر ملک میں امن وامان اور اطمینان ہو اور مختلف سیاسی فریق ملک کے مفاد کو پیش پیش رکھیں، نیز ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کریں اور باہمی اختلاف کو مخالفت اور غداری کا جامہ نہ پہنچائیں تو پھر جو ان مواقع کے جوہر امر پر رائے زنی کے لئے پیدا ہوتے رہتے ہیں، سیاسی فریق بندی ملک کے لئے باعثِ رحمت ہے۔ لیکن اگر صورت حال اس کے عکس ہے، یعنی ملک کسی بحرانی کیفیت میں مبتلا ہے، لوگوں میں ذاتیات اور باہمی بغض و عناد پیدا ہو گیا ہے اور ملک پر فریق اور ذات کو ترجیح دی جانے لگی ہے، تو پھر سیاسی فریق بندی سے زیادہ کوئی چیز قابلِ ملامت نہیں ہوگی اور اسی حالت میں ملک کے لئے شاید وہی طرزِ حکومت بہترین ثابت ہو جس کے تحت ہر ایک ہی فریق کی عملداری ممکن ہے اور دوسرے فریقوں کو ملک کا دشمن سمجھ کر دبا دیا جاتا ہے۔

۱۱۔ خلیفہِ پیغمبرِ اسلام صلعم آج سے تیرہ سو برس پہلے فرما گئے ہیں کہ ”میری امت کا اختلاف باعثِ رحمت ہے لیکن قسمی سے یہ اختلاف آج کل اکثر صورتوں میں مخالفت ہی نہیں بلکہ محاندت کی شکل میں رونما ہونے لگتا ہے، اور پھر وہ باعثِ رحمت ہونے کے بجائے باعثِ رحمت بن جاتا ہے۔“

ضمیمہ باب ۱، سیاسی فرقی بندی کی تشکیلات

متعدد فرقی :- فرانس ؛ ہندوستان
دو فرقی :- انگلستان ؛ ممالک متحدہ امریکہ -
ایک فرقی :- روس ؛ اٹلی ؛ جرمنی -
(الف) جہاں بہت سے سیاسی فرقیوں کی تقریباً مساویانہ قوت ہے -
فرانس

یہاں سیاسی فرقی بندی میں اس قدر تلون برتا جانے ہے کہ سینات کے گروہوں کے نام مختلف ہیں اور ایوان وکلاء یہ نام تقریباً ہر انتخاب پر بدلتے رہتے ہیں -
حقیقت یہ ہے کہ ایک حد تک مکمل فرقی نظام صرف تین یا چار سیاسی فرقیوں میں پایا جاتا ہے،

اور ہر انتخاب کے بعد نہ صرف رکنیت بدلتی رہتی ہے، بلکہ سیاسی فرقیوں کے ناموں

۱۵ فرانس کی سیاسی فرقی بندی کے لئے دیکھو "واگ"؛ "حکومت اے کے یورپ" ۱۹۹۹
Government of Europe، باب ۲۴، "فاکٹر"، حسب بالا باب ۱۵، حصہ ۵ -

میں بھی تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ بعض فریقوں کے ارکان کی تعداد سو سو سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور بعض میں بارہ بارہ پندرہ پندرہ رکن بھی ہوتے ہیں۔ ایوانوں میں نشستوں کا انتظام بھی اسی اصول پر کیا گیا ہے کہ نسبتہ گروہ دایاں طرف اور نسبتہ افراطی گروہ بائیں طرف اور نسبتہ معتدل گروہ مرکز میں بیٹھتے ہیں۔ دراصل انگریزی یا امریکی طرز کی سیاسی فریق بندی یہاں مفقود ہے، صرف ”میلانات“ ہیں جن کی ظاہری شکل بدلتی رہتی ہے۔ جو ”فریق بندی“ ہے وہ صرف پارلیمنٹ تک محدود ہے اور اس کی رکنیت تبدیلی پذیر ہے اور عام طور پر جو امور نزاعی ہیں وہ اکثر ذاتی یا خانگی یا مقامی ہیں۔ دو فریق صورت حال اس لئے ناممکن ہے کہ فرض کیجئے کہ دایاں ارکان جو زیادہ تر لوگ یا خدمت پسند میلانات کے ہیں، برسرِ اقتدار ہو جائیں تو پھر سوال یہ ہے کہ آیا ملوک حکومت ہو جائے گی؟ دوسرا سبب چند فریقیت کا یہ ہے کہ فرانسیسی قوم حساس اور نظریہ پرست واقع ہوتی ہے اور مختلف گروہ کسی قسم کے مستقل مفاہمت کے لئے تیار نہیں۔

بند و مثال

الغور کیا جائے تو اصل معنی میں منظم سیاسی فریق بندی کا اس ملک میں حال ہی میں ظہور ہوا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو نام نہاد غدر ۱۹۵۷ء کے بعد ہی سرسید احمد خاں دہلی کی تحریک ملی گڈھانے ایک رسالہ ”اسباب بغاوت ہند“

پر لکھا تھا جس میں انھوں نے (ہندوستان کے لئے) یہ اس وقت کے لئے ایک
 تحریک پیش کی کہ ہندوستانی مجالس مقننہ میں ہندوستانیوں کو شامل کیا جائے تاکہ
 وہ اپنے نقطہ نظر سے حکام کو مستفید کرتے رہیں۔ لیکن سیاسی فریق ہندی حقیقی
 معنی میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام (۱۸۸۵ء) سے پہلے نہیں کہی جاسکتی۔
 اس ادارے کے ذریعہ سے حکومت کے سامنے باضابطہ دعویٰ پیش کئے
 جانے لگے۔ پہلی مرتبہ ہندوستانیوں کو تھوڑا بہت انتخاب کا حق ۱۹۰۹ء کے
 متلو مار کے اختلافات کے تحت دیا گیا اور اس کے تحت جب سوال
 کرنے اور موازنہ پر بحث کرنے کا موقع دیا گیا تو کہنا چاہئے کہ چند فریق
 مستقل طور پر مجالس مقننہ میں ایسے پیدا ہو گئے جن کا کام حکومتی معاملے
 پر نکتہ چینی کرنا تھا، اور چونکہ انھیں بھی حکومت میں حصہ لینے کا موقع
 نہیں تھا اس لئے یہ نکتہ چینی بعض مرتبہ غیر ذمہ دارانہ بھی ہوتی تھی۔ ملک
 میں حکومت کے علاوہ دو یا تین بڑے بڑے گروہ تھے ایک
 ”معتدل“ یعنی وہ جو حکومت کے ساتھ تھے لیکن خود حکومت کے ہی
 مفاد اور بقا کی خاطر اس کے ایسے تحریکات پر نکتہ چینی کرتے تھے جو ملک
 کے لئے مضر ہوں۔ اس کے رہنماؤں میں شاید سب سے ممتاز گوگلے
 تھے۔ دوسرے وہ فریق تھا جسے انتہا پسند کہتے تھے اور جو حکومت کی
 مخالفت کرنا ہی اپنا نصب العین بنائے ہوئے تھا، ابتدائی زمانے
 میں اس کے رہنما سر بنیدر دتا تھے، برہمنی اور تلک سمجھنے چاہئیں۔ تیسرا وہ
 گروہ تھا جو سیاسی اعتبار سے کلیہ انگریزوں کا ساتھ دینے کے لئے تیار تھا

چوتھے بحیثیت قوم کے مسلمان تھے، جنہیں سرسید احمد خاں مرحوم نے سیاسیات سے علیحدہ رہنے اور اپنے آپ کو سیاسی کشمکش کے لئے تیار کرنے کے لئے کہا تھا، لیکن جو ۱۹۰۷ء سے ایک حد تک منظم ہو گئے تھے اور کانگریس کے جتنے کے خلاف انہی ایک جدید انجمن مسلم لیگ کی شکل میں بنائی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں سے مل کر مسلمانوں کے لئے جداگانہ حقوق حاصل کریں۔ اس تحریک کو ۱۹۰۹ء میں یہ کامیابی ہوئی کہ علاوہ عام حلقہ جات رائے دہی کے مسلمانوں کو ہر مجلس مقننہ کے لئے چند جداگانہ نشستیں مل گئیں۔ اس طرح ایک جدید سیاسی فرقہ یعنی مسلم فرقہ کا اضافہ ہوا جس کا مطمح نظر یہ ہو گیا کہ سب سے پہلے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے اس لئے کہ ان کی مستقل قیادت ہے اور اکثریت سے اس کا مفاد جداگانہ ہے۔ جنگ عظیم کے دوران میں لوگوں کے قلوب میں نئی نئی انگلیں اور آرزوئیں پیدا ہوئیں۔ اور ۱۹۱۷ء ہی سے خود مسلمانوں کے خیالات میں بہت کچھ فرق پیدا ہو گیا، چنانچہ وہ روز بروز کانگریس کی طرف آنے لگے، یہاں تک کہ ۱۹۱۷ء میں کھنوا کے تمام پر کانگریس اور مسلمانوں کے درمیان وہ عہد آفریں سمجھوتہ ہوا جسے عرف عام میں ”کانگریس لیگ سمجھوتہ“ کہتے ہیں۔ اس سمجھوتے کے بموجب کانگریس نے مسلمانوں کے جداگانہ حق انتخاب کو تسلیم کر لیا اور مسلمان اکثر بانی ماندہ ملحقہ جات انتخاب میں حصہ لینے سے دست بردار ہو گئے۔ اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں مسلمانوں کے وہ طبقے جنہیں سیاسی مس تھا، باہم متفق

ہو گئے اور ۱۹۲۱ء کے عدم تعامل کے زمانے میں دونوں کا سیاسی مقصد بظاہر ایک ہو گیا، وہ یہ کہ ملک سے برہمی اقتدار کا خاتمہ کر دیا جائے۔ لیکن یہ بہت جلد ثابت ہو گیا کہ اتحاد کا یہ مظاہرہ محض ایک خواب ہے، حقیقت میں ہندو مسلمانوں کے درمیان کی خلیج وہ دراصل وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کا انتخاب اب صرف مسلمانوں کی طرف اور ہندوؤں کا صرف ہندوؤں کی طرف ہو گیا، اور باوجودیکہ بہت سے اتحاد پسند رہنماؤں مثلاً مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مہاتما گاندھی، ہندو متی لال نہرو وغیرہ نے ہندو مسلمانوں کا دل ملانے کی کوشش کی، لیکن اس اتحاد سے پانچ چھ سال بعد ہی مسلمان بحیثیت قوم کے کانگریس سے علیحدہ ہو گئے۔ اس وقت مقننہ جماعتوں میں جو سیاسی فریق بندی ہے وہ سببِ حال میں ہے اور بنگال، پنجاب، آسام، بمبئی کی اسمبلیوں میں تو بارہ بارہ پندرہ پندرہ سیاسی گروہ ہیں۔ فرانس کی طرح یہاں کی مجالس میں بھی فریق ان کے اصول اور کنیت برابر ملتے رہتے ہیں۔ یہاں صرف چند اہم ترین سیاسی گروہوں کے اصول کا ذکر کرنا کافی ہو گا:-

(۱) سب سے منظم گروہ کانگریس کا ہے جس نے کئی سال کے عدم تعامل کے بعد از سر نو جماعت ہائے مقننہ میں شرکت منظور کر لی ہے اور جدید قانون حکومت ہند کی رو سے جو صوبہ داری جماعتیں مرتب ہوئی ہیں ان میں سے متحدہ میں اس کی اکثریت ہے۔ یہ جماعت انتخابات کے شعبہ گیارہ گزری صوبوں کی اسمبلیوں میں کانگریسی فریق ۱۔ بقیہ نوٹ مشابہ

میدان میں نئے قانون کا خاتمہ کرنے کے لئے آئی تھی، چنانچہ جن صوبوں میں اس کی اکثریت ہوئی اور گورنروں نے اسے وزارت ترتیب دینے کی دعوت دی تو اس کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ تاوقتیکہ گورنر اپنے اختیار خصوصی کو استعمال نہ کرنے کا وعدہ نہ کرے اس وقت تک ہم وزارت ترتیب نہیں دیں گے۔ آخر کئی مہینے کی کشمکش کے بعد جب آخر کار جولائی ۱۹۳۶ء میں کانگریس نے چھ صوبوں میں، جہاں اس کی اکثریت تھی، قلمدان وزارت سنبھال لئے، اور اس وقت سے اس وقت تک یہ ایک بدیہی واقعہ رہا کہ (۱) علاوہ ۱۹۳۵ء کے استدار کے جب سیاسی قیدیوں کے چھوٹے پر ایک نازک صورت حال پیدا ہو گئی تھی (کسی صوبے کا گورنر بظاہر کسی معاملے میں مداخلت نہیں کرتا بلکہ معلوم تو یہ ہوتا ہے کہ گورنروں نے اپنے مخصوص اختیار سے بھی (جو قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء میں انھیں دئے گئے تھے) کمزورہ کنشی اختیار کر لی ہے۔

بقیہ نوٹ ۱۹۳۵ء کا کانگریسی اکثریت ۱۔ مدراس، ۱۵۹؛ صوبہ متحدہ، ۱۳۵؛
پنجاب، ۹۹؛ ادریسہ، ۶۶؛ صوبہ وسط و براہ، ۱۱۲؛ بمبئی، ۸۹۔
کانگریسی اقلیت ۲۔ صوبہ سرحد، ۱۹؛ سندھ، ۱۶؛ آسام، ۳۸،
بنگلہ، ۵۴؛ پنجاب، ۱۱۵۔

سرحدی صوبہ آسام میں کانگریسیوں نے بعض دوسرے فریقوں کے ساتھ سمجھ کر کے خود اپنی سیادت میں کا سینے ترتیب دے لئے ہیں اور سندھ میں جو مخلوط وزارت ہے گورنر کا لگائی نہیں لیکن اس کا سیلان بہت کچھ کانگریسی اصول کی طرف ہے۔
۱۲۔ ان ذمہ داروں کے لئے دیکھو ضمیمہ باب ۱، بالا۔

(۲) مسلم لیگ ۱۹۳۷ء تک مسلمان بحیثیت ایک سیاسی گروہ کے اتنے منظم نہیں تھے جیسے کانگریس، اور ان ہی طرح طرح کے تقرریں پڑے ہوئے تھے، لیکن ۱۹۳۷ء میں محمد علی جناح نے مسلم لیگ میں ایک نئی روح پھونک دی اور بمبئی، لکھنؤ، کلکتہ اور ٹیٹنہ کے جلسوں سے اسے وہ استحکام اور تفریق پیدا ہو گیا جو اس سے پہلے نظر نہ آتا تھا۔ کلکتہ کے اجلاس میں مسلم لیگ نے بھی کانگریس کی طرح ہندوستان کی مکمل آزادی کو اپنا مطمح نظر قرار دیا لیکن ایسا ہندوستان جو آزاد صوبہ داری ریاستوں کا ایک وفاقیہ ہوا جس میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق کا پورا پورا تحفظ ہو۔

(۳) سکھ۔ یہ صرف پنجاب میں پائے جاتے ہیں اور ان کا سب سے بڑا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ جتنی ان کی آبادی پنجاب میں ہے اس مناسبت سے زیادہ حقوق انھیں ملیں۔

(۴) یورپی و ہندوستانی عیسائی۔ ان کی تنظیم نسبتاً مکمل ہے۔ گوبندرا میں یہ حکومت کی گورنر تقلید کرتے تھے اب رفتہ رفتہ انھیں یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ اس ملک کے مفاد کے ساتھ ان کا مفاد وابستہ ہے، خواہ اس کا حصول حکومت کا ساتھ دینے میں مضمر ہو یا مخالفت کرنے میں۔

(۵) زمیندار۔ ان صوبوں میں جہاں زمینداری اور جاگیر داری کا طریقہ رائج ہے، انھوں نے بھی اپنے فرین بنائے ہیں۔ حال میں ایک رجحان حکومت اور عوام دونوں کے چند خاص طبقتوں میں پایا جاتا ہے کہ ان کے اقتدار اور آمدنی میں کمی کی جائے، چنانچہ انھوں نے اپنی حفاظت کی خاطر یہ جتنے بنائے ہیں۔

انتہائی سزا کا معیار دیا جوتا ہے اور اس معیار کے پہنچنے تک جتنے دارج سزائے ہیں وہ سب کے سب عادل کے اختیار میں ہوتے ہیں۔

الغرض گونڈا پر عادل قانون کی محض تاویل اور اس کا انطباق و اعات پر کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہ ایک طرح کا قانون ساز بھی ہوتا ہے، اور بعض ممالک میں تو اعلیٰ عدالتوں کے تصفیوں کی ماتحت عدالتیں اسی طرح پابندی کرتی ہیں جیسے محکم قانون ساز کے رائج کردہ قوانین کی۔

انسان کا خاصہ ہے کہ اگر اس میں دانائی اور فراست ہو تو وہ دوسروں کے تجربہ سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ تاکہ اُسے ایسے امور میں نا تجربہ کاری اور ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑے جن میں دوسرے کامیاب ہو چکے ہیں۔ اب اگر کسی عدالت کے سامنے کوئی ایسا مقدمہ آئے جس کے متاثر کسی اعلیٰ عدالت میں کوئی مقدمہ پیش ہو کر تجویز پا چکا ہو تو اس دوسری عدالت کے لئے نہ صرف اس میں آسانی ہوگی کہ وہ اس پیش رو تجربہ کا پاس کرے اور اس کا اتباع کرے بلکہ سہولت اور کیسانی کے لحاظ یہ بہتر ہوگا کہ اس اعلیٰ عدالت کا تصفیہ ماتحت عدالتوں کے لئے بمنزلہ نظیر سمجھا جائے، یعنی آئندہ

مثلاً چور کی سزا زیادہ سے زیادہ سات سال ہے اور اس کے اندر کسی موت کے لئے قید کا اختیار حاکم عدالت کو ہے۔ برطانوی ہند میں تو قتل کی سزا بھی مقرر نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ سزائے موت ہے۔ عدالت اس سے جتنی کم چاہے سزا دے سکتی ہے۔ اس کے لیس انگلستان میں قتل عدا ثابت ہو تو موت کی سزا لازم ہے۔

(تاؤنٹیکہ قانون ہی تبدیل نہ ہو جائے) اس کی ہر ماتحت عدالت پر دی گئی ہے یہی نظائر کا اصول ہے جس کی وجہ سے بعض مرتبہ عدالت عالیہ کے ارکان کو "قانون ساز" کا لقب دیا جاتا ہے اس لئے کہ وہ تنہا اپنی کریپوں پر بیٹھ کر ایسی تجاویز شائع کرتے ہیں جن کا رتبہ آئندہ کے لئے وہی ہوتا ہے جو باضابطہ مقننہ میں بنے ہوئے قوانین کا۔

وفاقی عدلیہ۔ علاوہ ازیں بعض ممالک میں، بالخصوص ان ممالک میں جہاں وفاقی طرز حکومت رائج ہے اور جہاں اجراءِ مملکت اور اعضائے حکومت کے حدود اختیار کے مابین نزاع کا امکان ہے، وہاں بعض مرتبہ عدالت عالیہ کو یہ طے کرنے کا اختیار ہوتا ہے کہ جو مسئلہ نزاعی ہے وہ کس ادارے کے دائرہ اختیار میں ہے۔ یہ اختیار سب سے ممتاز حیثیت سے ممالک متحدہ امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ جہاں (کسی نزاعی امر کے مقدمہ کی شکل میں پیش ہونے پر) عدالت عالیہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ یہ طے کرے کہ جس قانون کے احاطے میں مقدمہ آتا ہے اس کی منظوری کا اختیار ریاستی جماعت مقننہ کو حاصل ہے یا مرکزی کانگریس کو۔ اگر غور کیا جائے تو وفاقیوں کے دساتیر دراصل اجزاء اور مرکز کے مابین ایک طرح کے عہد نامے ہوتے ہیں

یہ طرز عمل زیادہ تر سلطنتِ برطانیہ اور ممالک متحدہ امریکہ میں رائج ہے۔ اس پر عام بحث کے لئے دیکھو گئے: "قانون کی اصل اور اس کے مآخذ" Gray: Nature and Sources of the Law.

اور عدالت عالیہ کا یہ اختیار دراصل ان عہد ناموں کی تاویل کا اختیار ہے جس کے ذریعے سے یہ معلوم کرتے ہیں کہ دستور سازوں کا رجحان نزعی معاملے کے متعلق کیا ہوگا۔ یہ کیفیت فردی مملکتوں میں نہیں پائی جاتی جہاں جملہ اختیارات کا ماخذ مرکزی مقننہ ہوتی ہے، اور یہاں عدالتوں کو کسی قسم کے دستوری نزاعات کا فیصلہ کرنا نہیں ہوتا۔ تاہم یہ امر یقینی ہے کہ جب کوئی مسئلہ ایسا ہوتا ہے جس میں کوئی دستوری امر نزعی ہو جیسے فرد اور حکومت کے درمیان تنازعات، تو ایسی حالت میں عدالت کو تاویل و تجویز کے بہت وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔

یہ سب امور میں جن سے ہمیں محکمہ عدلیہ کی دستوری اہمیت کا انداز ہوتا ہے۔ عادل نہ صرف قوانین کی تاویل کرتا ہے اور اسکا انطباق نزعی مسائل پر کرتا ہے بلکہ بعض حالات کے تحت ایک نوع کر کے قانون سازی بھی کرتا ہے، اور بعض مرتبہ دستوری معاملات پر نہ صرف رائے دہی کرتا ہے بلکہ اس کا حکم ناطق سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے عہدہ دار کے انتخاب اور شرائط خدمت میں بہت ہی ہوشیاری سے کام لینا پڑے گا، اور جہاں تک انسانی امکان کا تعلق ہے ہمیں اس کے لئے ایسی کیفیات پیدا کرنی پڑیں گی کہ وہ کسی طرح پر دوسروں کا دست نگر نہ رہے اور جو کرے نہایت درجہ آزادی اور پوری دیانت داری کے ساتھ کرے تاکہ قانون کے تحت کسی کا بھی حق تلف نہ ہو۔

ججوں کا تقرر۔ انرض سب سے پہلے جو سوال پیدا ہوتا ہے

وہ یہ ہے کہ عادل کا تقرر کون کرے اور کیسے کرے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اگر کہیں ”تفریق اختیارات“ کے مسئلے کی حقیقی معنی میں اہمیت ہے تو وہ عدالت کا محکمہ ہے، اور اس کی بہت ضرورت ہے کہ عادل ہر ذی دباؤ سے بالکل آزاد ہو۔ کہتے ہیں کہ انگلستان کی آزادی کی سب سے قوی بنیاد قانون بندوبست سلسلہ ہے، جس کے بموجب ”حسن کارکردگی“ کے دوران میں عادل کو کوئی علیحدہ نہیں کر سکتا، اور وہ صرف اس وقت علیحدہ ہو سکتے ہیں جب پارلیمنٹ کے دونوں ایوان متفقہ طور پر بادشاہ کے حضور میں کسی عادل کے خلاف محضر پیش کریں۔ بعض ممالک مثلاً سوئٹزرلینڈ اور ممالک متحدہ امریکہ کی دو تین ریاستوں میں عدالت عالیہ کے ارکان کا تقرر مجلس مقننہ کرتی ہے۔ سوئٹزرلینڈ کو نظر انداز کر دیا جائے (اس لئے کہ یہاں کے جملہ ادارات کی ایک خاص نوعیت ہے اور مقننہ، عالمہ عدلیہ سب کے سب اعضاء حکومت دراصل مقننہ عموم کے عہدے سمجھے جاتے ہیں) تو صرف ممالک متحدہ امریکہ کی چند ریاستیں ہی رہ جائیں گی جہاں عادلوں کا اس طرح سے تقرر کیا جاتا ہے۔ اس طرز تقرر اور عام انتخاب میں کوئی خاص فرق نہیں، اس لئے کہ بالخصوص ان ملکوں میں جہاں سیاسی فریق بندی منظم ہے، ان عادلوں کا تقرر ان کے سیاسی رجحانات کی وجہ سے ہوگا کہ

اُن کی قانون دانی کی وجہ سے، اور جہاں یہ انتخاب صرف ایک محدود مدت (مثلاً دو چار سال کے لئے) ہوتا ہو وہاں تو اتنی ہی حد سے گزر جانے کا اندیشہ ہے، اس لئے کہ اول تو تقرر کی بنیاد ہی غیر قانونی جذبات ہوئے، اور پھر تقرر کے بعد بجائے بے لوث عدلی خدمت کے عادل کو یہ خیال نگارہ کہ کسی نہ کسی طرح اپنے مویدوں کو خوش رکھے تاکہ آئندہ انتخاب کے وقت وہ اپنی پٹیچہ نہ دکھائیں۔ دراصل اُن ہی مالک میں عادل سب سے زیادہ بے لوث اور غیر جانبدار ہوتے ہیں جہاں انہیں استقلال نصیب ہوتا ہے۔

عام انتخاب اور تقرر بذریعہ جماعت متفہن کو نقصان رساں تصور کرنے کے بعد اب دو ہی صورتیں باقی رہتی ہیں، یعنی ایک تو یہ کہ جماعت عامہ نامزد کرے اور دوسرے یہ کہ نامزدگی کا اختیار خود اعلیٰ ترین عدالت یا اس کے افسر اعلیٰ کو حاصل ہو۔ سب سے پہلے تو عدالت عالیہ کے طرف سے نامزدگی کو لیجئے۔ آج کل کے زمانے میں یہ بات گویا طے شدہ سمجھنی چاہئے کہ کسی پیشے کے کارکن کے انتخاب کے لئے اس پیشے والوں کو تقرر نہیں کیا جاتا، تاکہ جہاں تک ہو سکے دعوت نظر سے کام لیا جائے، عموماً یہ کہ دونوں طریقوں، یعنی کاہنی طریقے اور صدر قاضی طریقے دونوں میں کسی فوجی یا بحری عہدے کے لئے جو انتخاب ہوتا ہے اس کی بابت علی العموم حکم ناظر کا اختیار اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو نہ سپاہی ہوتا ہے نہ ملاح، بلکہ جوابی فرست و درایت کی وجہ سے حکومتی کاروبار کا صدر

ہوتا ہے۔ خود انتخابی کا طریقہ (کم سے کم عمومیت پسند ممالک میں) پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ عادلوں کے انتخاب کے وقت یہ بات صرف تجربہ کار عادل ہی سمجھ سکتے ہیں کہ فلاں امیدوار کی قانونی قابلیت کتنی ہے، اور اس میں مختلف قوانین کو حالات مقدمہ منطبق کرنے کی کس حد تک اہلیت ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی عمر بھر ایک ہی کام کرتے کرتے ممکن ہے کہ وسعت نظر میں کمی پیدا ہو گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ گواہ تحت عادلوں (منصفوں) وغیرہ کا تقریقاً عدالت عالیہ کی سفارش سے ہوتا ہے، لیکن اس کی بابت آخری حکم کا اختیار جماعتِ عاملہ کے ارکان ہی کو حاصل ہوتا ہے، اور وہی ان کی ترقی کے بھی ذمہ دار ہوتے ہیں۔

لیکن جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ عادل جہاں تک ہر مسئلے عاملہ کے دباؤ میں نہ آئیں، اور اس کے لئے مختلف ممالک میں مختلف طریقے رائج ہیں۔ انگلستان میں تو، تاؤنٹیکہ دونوں ایوان ہائے پارلیمنٹ بادشاہ کے سامنے محضر پیش نہ کریں، عدالتِ عالیہ کے ارکان کو برخاست نہیں کیا جاسکتا، اور ممالک متحدہ امریکہ میں نہ صرف یہ بلکہ ان کی

لئے اس اصول کے خلاف بریٹی شال بمثلستان کی ہے جہاں لارڈ جانسلر جو عدالت کا یا تو خود تقرر کرتا ہے وہ اس کی سفارش پر ان کا تقرر ہوتا ہے۔ لیکن یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ لارڈ جانسلر صرف عادل ہی نہیں بلکہ وہ کاؤنسلر بمثلستان کا ایک ممتاز رکن اور دارالامر کا صدر بھی ہوتا ہے۔

تنخواہ میں کسی حالت میں کمی نہیں کی جاسکتی تاکہ ان پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالا جاسکے ترقی یافتہ ممالک میں عادل کا رتبہ اس قدر بلند تصور کیا جاتا ہے کہ شاذ ہی ایسا ہوتا ہو گا کہ عدالت العالیہ کا کوئی رکن حکومت مستعدی تو کیا، وزیر بھی بننا پسند کرے، شاید اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر بعض علمائے سیاست کا خیال ہے کہ بہترین طریقہ یہ ہو گا کہ نہ تو کوئی وزیر کبھی عادل بنایا جائے نہ کسی عادل کو کبھی کوئی عاملانہ خدمت دی جائے۔

معاوضہ خدمت۔ عادلوں کی آزاد می رائے کی ایک ضمانت یہ بھی ہونی چاہئے کہ انھیں جو معاوضہ ملے وہ اتنا ہو کہ وہ کسی قسم کی ناجائز آمدنی کے خیال سے بھی محفوظ رہیں۔ عدالتوں میں جو دیوانی اور فوجداری کے مقدمے آتے ہیں ان میں فریقین یعنی مدعی اور مدعا علیہ دل کھول کر خرچ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اور بعض مقدمات میں تو کچھ ایسی ضد پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ تعین مقدمے سے بدرجہا زیادہ روپیہ خرچ کر دیتے ہیں، چنانچہ یہ گویا ایک راز آشکارہ ہے کہ جو گواہ مختلف مقدمات میں پیش ہوئے ہیں ان کی ایک بہت بڑی تعداد مصنوعی ہوتی ہے اور جو فریق انھیں پیش کرتا ہے انھیں معاوضہ دیتا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ مقدمہ جیتنے کے لئے مدعی اور مدعا علیہ کس طرح اچھے وکیلوں کی خدمات حاصل کرنے کے لئے بیش بہا معاوضے دیتے ہیں۔ ان حالات اور اس فضا کے تحت عادل کو خواہ اسے ہر یا نہ

نہ صرف ایک عمدہ قانون داں اور صاحب فراست ہونا چاہئے بلکہ اس کے کردار کا معیار بھی نہایت بلند ہونا چاہئے تاکہ کسی قسم کی ترغیب و تحریص ایسے انتہائی غیر جانبداری کی شاہراہ سے سر مو بھی نہ ہٹا سکے اور حکومت کو اس قسم کا انتظام کرنا چاہئے کہ ہر درجہ کے عادلوں کی تنخواہ اپنے اپنے طبقے کی عام طرز معاشرت کے اعتبار سے وافر ہو۔ یہی وہ اصول ہے جس کے تحت انگلستان میں لارڈ چانسلر یعنی میر عدل کی تنخواہ وزیر اعظم کی تنخواہ کی برابر ہے اور خود برطانوی ہند میں مختلف عدالت ہائے عالیہ کے چیف جسٹس کی تنخواہ اکثر غریب داران حکومت سے زیادہ ہوتی ہے۔

اعزازی عمال۔ یہاں ایک خاص ادارے کی طرف توجہ مبذول کرنی ہے، اور یہ ادارہ اعزازی عمال (آزیری جیسٹس) کا ہے۔ اعزازی عمال بہت سے ممالک میں مقرر کئے جاتے ہیں اور ان میں سے اکثر زمیندار یا تاجر ہوتے ہیں جن کی اپنے اپنے ضلع میں وقعت ہوتی ہے اور ساتھ ہی جنھوں نے حکومت کی سیاسی خدمت کی ہوتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو اعزازی عامل بنانا دراصل ایک طرح کا معاوضہ یا خطاب ہے جسے حکومت زمینداروں یا تاجروں کو دیتی ہے جو کم از کم ابتدائی واقعی خطاب کے اہل نہیں سمجھے جاسکتے لیکن ساتھ ہی جو آگے چل کر (بشرط وفاداری و کارکردگی) خطابوں کے امیدوار بن جاتے ہیں۔ اس موقع پر سیاسی خطابوں یا دوسرے خطابوں پر بحث نہیں کی جاسکتی، لیکن صحیح سیاسی نظر سے کسی سیاسی خدمت کے معارف سے کسی شخص کو "آزیری جیسٹس" یا "آزیری اسٹنٹ کلرک"

بنانا یقیناً ان تمام اصول سے روگردانی کرنا ہے جن پر محکمہ عدلیہ میں ہونا چاہئے۔ اکثر اعزازی مجسٹریٹ ابتدائی قانون سے واقف نہیں ہوتے اور اس کیفیت کے حاصل کرنے میں انھیں ہینڈ بکسوں لگ جاتے ہیں جس دوران میں وہ میسوں مقدموں میں انصاف کا خون کر چکے ہوتے ہیں، ان کے پیشکار علی العموم جہاں دیدہ ہوتے ہیں اور چونکہ حکومت کی طرف سے انھیں اکثر معاوضہ نہیں ملتا (گو خود مجسٹریٹ صاحب مزید خوشنودی حکام کی عرض سے انھیں اپنی جیب سے کچھ دیتے ہوں) اس لئے وہ اہل معاملہ سے لینے دینے میں ذریعہ نہیں کرتے، خصوصاً اس لئے کہ اعزازی حاکم عدالت خود کم علی کی وجہ سے نگرانی نہیں کر سکتا، اور چونکہ عدالت عام طور پر کسی قصبہ میں ہوتی ہے اس لئے پیشکار کو کسی دوسرے کا در نہیں ہوتا۔ آخری بات یہ ہے چونکہ مجسٹریٹ صرف چار یا پانچ سال کے لئے مقرر ہوتے ہیں، مستقل نہیں ہوتے، اس لئے انھیں کسی قسم کے آزادانہ طرز عمل کا موقع نہیں ملتا بلکہ بعض بالا تر حکام کے کہنے پر چلنا اپنے لئے ضروری تصور کرتے ہیں۔

۱۹۳۳ء کے بعد ہندوستان کے بعض صوبوں میں اس مسئلے پر خاص طور پر غور کیا گیا ہے، مثلاً صوبہ متحدہ میں شریع میں ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جسے اعزازی عدالت کے نام پیش کرنے کا اختیار ہے۔ نیز ان کا دائرہ اقتدار ان کی زمینداری یا

اللہ اس مسئلے پر لاسکی نے..... نہایت اچھی بحث کی ہے "صرف و نحو سیاہیات"

ذاتی اثر کے رقبے سے باہر رکھا گیا ہے۔ لیکن اس کا انیس ہے کہ اس اصول کے تحت جو عمل مقرر کئے گئے ہیں ان میں سے اکثر تقرر میں بھی ان کی سیاسی خدمات کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ سیاسی خدمت خواہ بطانوی حکومت کی ہو یا کانگریسی حکومت کی، اس کی نوع ایک ہی ہے اور صیغہ عدالت میں تقرر یا ترقی میں مہر نہیں ہونی چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ کم از کم ہندوستان میں بجائے ان ”اعوازی“ عمال کے مناسب یہ ہے کہ قدیم پنچائتی طریقے کو آج کل کی کیفیات کے سانچے میں ڈھال کر از سر نو رائج کیا جائے تاکہ اس کے ذریعے سے ایک طرف تنخواہ دار عالموں اور عادلوں کے کام میں کمی ہو اور دوسری جانب ان کے ذریعے سے ملک کی معاشرتی حالت میں ترقی ممکن ہو۔

انتظامی عدالتیں۔ جیسا پہلے ایک باب میں بیان کیا گیا ہے، بعض ممالک، خصوصاً ان ممالک میں جہاں موٹسکیو کے نظریہ تفریق اختیارات کا اثر پڑتا ہے، جن میں فرانس کی طرح ”ضابطہ نیولین“ کا رواج ہوا ہے، علاوہ معمولی عدالتوں کے انتظامی عدالتیں بھی ہیں جن میں وہ مقدمات پیش ہوتے

۱۹۵۰ ہندوستان میں پنچائت کا طریقہ صدیوں سے جاری ہے۔ اگر اس کو پہلے کی سی توت دی گئی تو تنخواہ دار عادلوں اور غلاموں کا کام بھی گھٹ جائے گا اور مقامی سواراج کے لئے گاؤں والے تیار بھی ہو جائیں گے پنچائتوں کے عام مضمون کے لئے دیکھو رادھا کمال کو جی: ”مشق میں عمر میں“ Radha Kamal Mukerjee: Democracies in East۔ باب ۱۵۔

۱۹۵۰ دیکھو بالا، باب ۱۲۔

ہیں جن میں ایک فریق حکومت کا کوئی رکن ہوتا ہے، بشرطیکہ نزعی امر اس سے دوران فرائض منصبی میں سرزد ہوا ہو۔ دراصل یہ عدالتیں اس خیال کی وجہ سے قائم ہوئی ہیں کہ جس طرح عالمہ کو عدلیہ پر اختیار نہ ہونا چاہئے اسی طرح سے عدلیہ کو بھی کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ ارکان عالمہ کے افعال پر تجویز دے، چنانچہ انتظامی عدالتوں میں اکثر عہدہ داران عالمہ میں بیٹھتے ہیں، اور سب سے بڑی عدالت انتظامی کا صدر عام طور سے میجر جنرل عدالت عالیہ نہیں بلکہ وزیر عدلیہ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں یوں تو انگلستان کی طرح ”قانون کا راج“ ہے یعنی معمولی سے معمولی فرد بھی وزیر ہند اور حکومت ہند کو کسی قدرے میں مدعا غلبہ بنا لیتا ہے، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو مال کی عدالتیں ایک طرح پر انتظامی عدالتیں کہی جاسکتی ہیں اس لئے کہ مالگداری اور رگان کی تشخیص جو عمال حکومت کرتے ہیں وہی ان کے متعلقہ مقدمات میں تحکیم بھی کرتے ہیں۔ انتظامی عدالتوں کے قیام میں دو امور قابل غور ہیں، ایک تو یہ کہ محض غیر پیشہ در اشخاص جب قانونی تحکیم کرنے بیٹھیں گے تو وہ قانون کی ”خود دہ قانون“ انتظامی“ ہی کیوں نہ ہو، صحیح تاویل کر بھی سکیں گے نہیں دوسرے یہ کہ ایسی عدالتیں جو علائقہ جماعت عالمہ کے ارکان کے ماتحت ہیں اور یہ ارکان یا ان کا کوئی ماتحت مقدمہ زیر بحث میں مدعی یا مدعا علیہ ہے صحیح معنیٰ کی غیر جانبدارانہ انصاف بھی کر سکتی ہیں؟ پہلا امر تو اس طرح حل ہو جاتا ہے کہ جن ممالک میں ”انتظامی عدالتیں قائم ہیں“ ان انتظامی قانون بھی راجح ہے جو علی العموم سیدھا سادہ ہوتا ہے اور اس میں پیچیدگی نہیں ہوتی۔ دوسری بات کا

جواب یہ ہے کہ جانبداری اور غیر جانبداری، انصاف اور بے انصافی کا معیار ملک ملک اور عدالت عدالت میں مختلف ہے، اور انتظامی عدالتوں کے مرکز یعنی فرانس میں جہاں تک علمائے سیاسیات کی رائے کا تعلق ہے، غیر جانبداری کے شکایات زیادہ سننے میں نہیں آتے۔

قانونی مساوات۔ اس کے علاوہ اس طرز عمل کے خلاف یہ آواز اٹھائی جاتی ہے کہ جن ملک میں انتظامی قوانین کا رواج اور انتظامی عدالتوں کا قیام ہے وہاں قانونی مساوات کے اصول پر عمل نہیں کیا جاتا۔ اگر اس مسئلے پر نظر غائر ڈالی جائے تو یہ افسوسناک امر محسوس ہوگا کہ ان نام نہاد ملک میں بھی جہاں کا تمام ضابطہ اسی "قانونی مساوات" کے اصول پر مبنی ہے، حقیقی مساوات بالکل غیر موجود ہے۔ اول تو عام طور پر بیچارے غریب آدمیوں کے پاس اتنا روپیہ ہی کہاں ہوتا ہے کہ وہ عدالت میں چارہ جوئی کریں۔ اگر کوئی شخص کسی غریب کو زد و کوب کرے تو عام طور پر اس کے خلاف کوئی چارہ جوئی نہیں کی جاتی، لیکن امیر پر ہاتھ اٹھانے کا نتیجہ نہایت تلخ نکلتا ہے۔ یہی کیفیت یوگانی مقدہ مانسکی ہے، اس لئے کہ کوئی غریب آدمی مدعی ہو تو رسوم عدالت اور وکیل کی فیس کے لئے روپیہ کہاں سے لائے، اور یہ عالیہ ہو تو وہ اسی میں بہتری سمجھتا ہے کہ مدعی سے معاملہ کر لے اور قسط بندی کر لے، جبکہ اس کے کہ اس سے

یہ انتظامی قانون کے مسئلے کے لئے دیکھو ڈاٹسی۔ "قانون دستور" : *Discry : Law*

of the Constitution. باب ۱۲ -

لڑکر اپنے آپ کو بر باد کرے۔ اسی طرح کسی امیر پر کوئی فوجداری مقدمہ قائم ہو تو بالفرض عدالت پر کسی قسم کے اثرات نہ ہونے کی حالت میں بھی (وہ ایک اعلیٰ درجہ کے وکیل کی خدمات خرید سکتا ہے جو پوشیدہ قانونی پہلوؤں کو آشکارا کر کے اور قانونی داؤں پیچ کو کام میں لا کر اسے چھڑائے) اور اگر بالفرض اس امر پر جانہ ہو بھی جائے تو اس جو مانہ کا (بوجہ اس کی دولت کے) اس پر کہیں یا کم اثر پڑے گا بہ نسبت اس غریب کے جس کے پاس دو وقت کی روٹی بھی نہیں اور جس کے لئے منگہ فتنہ روپیہ کی حقیقت ایک قارون کے خزانے سے کم نہیں۔ وہ یہ ہے کہ اس نقطہ نظر سے شکل سے کسی ملک کا قانون ہو گا جس کی تادیل عدلیہ کی پونجی کے اعتبار سے کی جاتی ہو، اور تا وقتیکہ جج اس کا لحاظ رکھیں، مساوات قانونی کے راگ الاپنا بیکار سا معلوم ہوتا ہے۔

جیوری۔ قانونی مساوات کی خاطر ایک اور طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، یعنی بجائے اس کے کہ صرف ایک عادل مقدمے کا تصفیہ کرے، اس تصفیہ میں عوام الناس کے ایک چھوٹی سی تعداد اسے مدد دیتی ہے، جسے عدت عام میں جیوری کہتے ہیں۔ جیوری میں اکثر متوسط طبقے، اور زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں ادنیٰ طبقے کے بھی افراد شریک ہوتے ہیں اور مقدمہ ختم ہونے پر عادل ان سے واقعہ زیر بحث کے بابت استفسار کرتا ہے، جیسے کہ آیا ملزم زید کے گھر میں گھسایا نہیں اور جوری کے ارادے سے اسے بندوں کا نشانہ بنایا یا نہیں۔ اس جیوری کو مقدمے کے قانونی پہلو سے تعلق نہیں ہوتا اور اس کے تصفیہ کا عدلیہ خود کلیتہً مختار ہوتا ہے۔ برطانوی ہند میں ایک اور طریقہ ایسروں کا رائج ہے، وہ یہ

کہ ہرگز نہیں مقدمہ میں تین یا چار غیر سرکاری اصحاب بلائے جاتے ہیں اور مقدمے کے اختتام پر (جیوری کی طرح) ان سے راقعات مقدمہ کی بابت رائے لی جاتی ہے۔ ایسروں اور جیوری کے درمیان جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ جج ایسروں کی رائے سے نہایت آزادی کے ساتھ اختلاف کر سکتا ہے، درآنحالیکہ وہ جیوری کی رائے سے عام طور پر اختلاف نہیں کر سکتا۔ عام خیال ہے کہ ان شرائط کے تحت ایسیری میں کام کرنا ایک بڑی حد تک تفسیع اذقات ہے اس لئے کہ اگر مقدمہ کی سماعت کے بعد جج محض اپنے ذاتی خیال کی بنا پر جو چاہے کر سکے تو پھر ان لوگوں نے جو ایسیری کی خدمات انجام دی ہیں اور اپنے وقت کو خرچ کیا ہے ان کے دامن رہنے سے کیا فائدہ ہوا۔ جیوری کا طریقہ جن ممالک میں رائج ہے وہاں یا تو اہلیاں جیوری کا مکمل اتفاق رائے لازمی سمجھا جاتا ہے ورنہ محض کثرت رائے اس میں شیعہ نہیں کہ چونکہ جیوری والے قانونی داؤں پیچ سے واقف نہیں ہوتے اور مقدمہ پوری قانونی پیچیدگی کے ساتھ ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ کسی قسم کا اشتباہ باقی نہ رہے اور عامائی نقطہ نظر خصوصاً اہم مقدمات میں بالکل صریح اور عیاں ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ۱۲ (یا ۹) آدمیوں کا ایک ہی نقطہ نظر متفق ہونا بعض مرتبہ نہایت ہی دشوار ہوتا ہے، خصوصاً ایسی حالت میں جب مقدمہ پیچیدہ ہو یا اس میں ایسے نسلی امتیازات ہوں جو نقطہ نظر کو تبدیل کرنے کے لئے کافی ہوں^{۱۵}، اور کسی پیچیدہ مقدمے میں^{۱۶} خلاف ملک آنجنائی کے مشہور مقدمہ نہایت میں انگریز اہل جیوری سزائی کے موافق تھے اور ہندوستانی برادرت کے۔

از سر نئی جیوری کے سامنے مقدمہ چلایا جانا نہایت درجہ تکلیف دہ امر ہو گا۔ یہ مسئلہ کہ جیوری کا طریقہ کس قسم کے مقدمات میں جاری کیا جائے، مختلف ممالک میں مختلف طریقے پر طے ہوا ہے۔ انگلستان اور پرٹگال میں جیوری جملہ اہم مقدمات میں استعمال ہوتی ہے، خواہ وہ دیوانی کے شعلق ہوں یا فوجداری کے باقی جن جن ممالک میں جیوری رائج ہے وہاں یہ صرف اہم فوجداری کے مقدمات میں بٹھائی جاتی ہے۔

جن ترقی یافتہ ممالک میں جیوری کا رواج عام نہیں وہاں یہ قاعدہ ہے کہ عام طور پر معمولی مقدمات بھی ایک عادل کے سامنے نہیں بلکہ متعدد عادلوں کے سامنے ”جلسہ کاملہ“ کے سامنے پیش ہوتے ہیں جس میں کم از کم تین عادل ضرور ہوتے ہیں۔ اس قاعدے کا وسیع ترین رواج فرانس میں یا ان ممالک کیا گیا ہے

۱۔ جلسہ جیوری کا طریقہ مختلف ممالک میں :-

۱۔ انگلستان میں دیوانی مقدمات میں جیوری سے کام لینا اختیاری ہے۔ اہم فوجداری مقدمات میں ایک فہرست میں سے ہر مقدمے میں بارہ جیوری والے چنے جاتے ہیں لیکن ملزم کو غداری میں ۲۵ اور دوسرے اہم مقدمات میں ۲۰ ناموں پر اعتراض کر لے کا اختیار ہے۔ سزا یا لی کے لئے اس جیوری کا متفق الراء ہونا لازم ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ میں تقریباً اسی قسم کا رواج ہے اس کے اس کے کہ اتفاق۔ اسے کی ضرورت نہیں بلکہ محض اکثریت کافی سمجھی جاتی ہے۔ برطانوی ہند میں سیشن کے مقدمے میں جیوری یا ایسیوں کا ہونا لازمی ہے اور عدالت العالیہ کے ابتدائی مقدمات میں ایسی نہیں بلکہ جیوری کے سامنے مقدمہ ہوتا ہے۔ (بقیہ نوٹ ص ۴۳۵ پر)

جہاں عدلی معاملات میں فرانس کا اتباع ہوا ہے۔ جیوری اور اجلاس عادلین میں جو اصولی فرق ہے وہ یہی ہے کہ جیوری میں واقعات کے متعلق ہجوم الناس کی جماعت سے استخراج کیا جاتا ہے اور جہاں اجلاس کا قاعدہ ہے دہل واقعات اور قانون دونوں میں تین یا تین سے زائد عادلوں کی رائے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

عدالتی تنظیم۔ عدالتوں کی تنظیم متعدد اصول کی بنیاد پر کی جاسکتی ہے اول تو یہ ظاہر ہے کہ قانون کی پیچیدگیوں اور بعض مرتبہ نظام کے اختلاف کی وجہ سے اس کی ضرورت ہے کہ اہل معاملہ کو اپیل کی اجازت دی جائے

(بقیہ نوٹ ۴۳۴) بعض اضلاع ایسے ہیں جن کی بابت حکومت اعلان کر دیتی ہے کہ ان میں جیوری کے ذریعے سے اہم مقدمات کا تصفیہ ہوگا۔ اگر کسی مجسٹریٹ کے سامنے یورپی برطانوی رعایا پر مقدمہ پیش ہو تو اسے اختیار ہے کہ اس غیر اہم مقدمہ میں بھی جیوری طلب کرائے، اہل جیوری کی تعداد برطانوی ہند میں ۳ سے ۹ تک ہوتی ہے اور محض کثرت رائے کے مطابق تصفیہ ہوتا ہے۔ ہندوستانی ریاستوں میں شاید حیدر آباد ہی ہے جس میں جیوری کا رواج ہے۔ یہاں جو اہم نوحداری ابتدائی مقدمہ عدالت عالیہ میں پیش ہو جس میں جیوری طلب کی جاتی ہے۔ ہر تین ماہ کے لئے ایک فہرست ۵ ارکان جیوری کی طیار ہوتی ہے اور اس میں سے ۹ اشخاص کو کورٹ کے ذریعے سے کسی مقدمے کے لئے خاص طور پر چون کیا جاتا ہے۔ جج کو جیوری سے اختلاف رائے کا اختیار ہے لیکن جج شیوں کے رد سے یہ اختیار محض مستثنیات سے سمجھنا چاہئے۔ اختلاف کی حالت میں اسباب بتانے ضروری ہوتے ہیں۔

تاکہ قانونی اختلافات کو یکسو کیا جاسکے، لیکن اس قسم کی قانونی نگرانی کا اختیار
لسبتہ محدود ہوتا ہے۔

اگر ایک عادل نے صحیح تاویل کرنے میں خطا کی ہے تو دوسری عدالت
اسے اغلباً درست کر دے گی۔ دوسرا سبب مرافعہ کا وہ ہے جس کے تحت
نخبویز سے شاکی فریق کو واقعات مقدمہ کی بنا پر مرافعہ کا اختیار دیا جاتا ہے۔
اگر عدالت مکمل طور پر بغیر جانبدار ہو پھر بھی واقعات کے نقطہ نظر میں فرق ہونا
ممکن ہے، اور یہ فرق یقیناً قابل لحاظ ہوگا اگر اس پر کسی ایک فریق کے مفاد
کا دار مدار ہو۔ اسی لئے علی العموم ایک سلسلہ عدالتہائے مرافعہ کا قائم کیا جاتا
ہے جو بالآخر جا کر عدالت عالیہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ ابتداء کی عدالتوں اور عدالت
ہائے مرافعہ کے علاوہ، عدالتوں کو ان کے کاموں کی نوعیت کے اعتبار سے
بھی تقسیم کیا جاتا ہے، یعنی بعض عدالتیں فرجہ داری کے کام کے لئے، بعض دیوانی
مقدمات کے لئے اور بعض ایسے معاملات کے لئے جن کا تعلق مالگذاری سے
ہو، مقرر کی جاتی ہیں اور ہر ایک کا سلسلہ مرافعہ جداگانہ ہوتا ہے۔ نیز بعض ایسے
ممالک میں جہاں بجائے فردی حکومت کے وفاقی حکومت رائج ہے، دستوازی
عدالتی سلسلے قائم کئے جاتے ہیں، ایک مکمل سلسلہ ان عدالتوں کا جن کا تعلق مرکزی
قوانین سے ہو اور دوسرا مکمل سلسلہ ایسی عدالتوں کا جن کا تعلق ریاستی قوانین سے
ہو، لیکن بعض دفاقتے ایسے بھی ہیں جہاں عدالتوں کا ایک ہی سلسلہ دونوں قسم
کے قوانین کی تاویل و انطباق کرتا ہے۔ ایسے دفاقیوں کی بہترین مثال قیصری
جرمنی سے ملتی ہے جہاں مختلف ریاستوں میں مختلف قوانین رائج تھے اور

عدالت عالیہ، جو لائبرگ میں نشست کرتی تھی، مرا فہ کے وقت ان میں سے ہر ایک کی تاویل کرتی تھی۔ اسی نوع کی برطانوی پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی بھی ہے جو برطانوی سلطنت مختلف حصوں کی مرا فہی عدالت کا کام دیتی ہے اور جسے بیسویں قسم کے قوانین اور احکام کی تاویل کرنا پڑتی ہے۔

علہ حال ہی میں ایرستان کے وزیر خارج نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ برطانوی پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی کو ایرستانی مقدمات کی سماعت کا اختیار باقی نہیں رہا۔ اس بارے میں برطانوی حکومت نے کوئی کارروائی نہیں کی اور اب اس اختیار کو معطل سمجھنا چاہئے۔

Examples of Judicial

ضمیمہ باب ۱۸ تمثیلات ترکیب جماعت عدلیہ

انگلستان - فرانس - مالک متحدہ امریکہ - سوئزرستان - ہندوستان
انگلستان :-

(۱) تعزیری عدالتیں مع عدالت مرافعہ

محافظان امن (ہر صوبے میں تقریباً ۳۰۰ - غیر تنخواہ دار
مقررہ کردہ ہر سفارش لارڈ لفسٹنٹ)

باضابطہ

سرسری

(اہم مقدمات)

چھوٹے مقدمات

صرف ابتدائی تحقیقات (محافظان امن کے سامنے)

مرافعہ کراؤٹیشن

(۱) مکمل مقدمہ کراؤٹیشن کے سامنے

(جس میں جتنے محافظ امن چاہیں بیٹھ

جیوری کے ساتھ جس کا تعین رائے ہونا لازم ہے)

سکتے ہیں بصدرت لارڈ لفسٹنٹ)

۱۸ دیکھو آرگن "حکومت ہائے یورپ" باب ۱۲ - نیز این "قانون و رواج دستور" : Anson

Law and Custom of the Constitution. جلد ۲ حصہ ۱ باب ۱۸

۲۲) عدالت العالیہ کے دورہ دار عادل
کے سامنے ”ایسٹریز“ میں مکمل مقدمہ

مع جیری حسب بالا

مرافعہ

عدالت مرافعہ تعزیری میں

(۱) واقعات پر جرحہ قدمات میں ۲۲) قانون پر اس عدالت کی اجازت

آخری مرافعہ

دارالامرا میں ملہ

(صرف قانونی نکات پر بشرطیکہ انکی کوئی

اہمیت عامہ ہو)

۲) دیوانی عدالتیں

(الف) چھوٹے مقدموں کے لئے انگلستان میں تقریباً ۵۰۰ ”صوبہ داری“

عدالتیں ہیں۔ لیکن چونکہ کام اتنا زیادہ نہیں کہ ہر عدالت کے لئے ایک ایک عدالت
مقرر کیا جائے اس لئے ملک بچاس بڑے بڑے عدلی اضلاع میں منقسم ہے

ملہ جب دارالامرا کا اجلاس عدالت مرافعہ کی حیثیت سے رہتا ہے (خواہ دیوانی صیغہ
میں یا نوعداری صیغہ میں) تو اس میں صرف لارڈ چانسلر اور جس سے کم سے کم دو قانونی
امرا یا ایک قانونی امیر اور ایک سابق لارڈ چانسلر ہوتے ہیں اور سبکی دارالامرا اس سے کوئی
نشت نہیں کرتا۔ قانونی امرخواہ یا بھوتے ہیں، عمر بھر کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں اور انہیں اور
جوں میں کوئی نوعی فرق نہیں ہوتا۔

اور ضلع میں ایک ایک جج ہے جو اپنے ”صوبہ داری“ عدالتوں میں مقدمہ کرتا رہتا ہے اور ہر عدالت میں ایک ماہ میں تقریباً ایک مرتبہ اجلاس کرتا ہے۔
نسبتاً اہم مقدمات میں مرافعہ عدالت عالیہ میں ہوتا ہے۔ اس کے لئے عدالت عالیہ کے جج ملک میں دورہ کرتے ہیں تاکہ فریقین پر اخراجات کا زیادہ بار نہ پڑے۔

(ب) بڑے مقدموں کیلئے { صوبہ داری عدالتوں کے لئے عدالت مرافعہ۔
عدالت عالیہ { اہم مقدمات کے لئے عدالت ابتدائی۔

اس کے تین اجزاء ہیں :-

۱۔ عدالت شاہی۔ ۵۱ جج بصدارٹ لارڈ چیف جسٹس۔

۲۔ عدالت نصف۔ ۵ جج بصدارت لارڈ جانسز۔

۳۔ عدالت وراثت، طلاق و معاملات بحری۔ ایک جج ایک صدر۔

(نمبر ۱ و نمبر ۲ کے درمیان تقسیم کار محض برائے نام ہے)

عدالت مرافعہ۔ عدالت عالیہ سے مرافعہ جات آتے ہیں جب قانونی شکایت

ماہ النزاع ہوں :-

اس میں ”امراٹے قانونی“، عدالت عالیہ کے تینوں صدور سابق لارڈ

جانسز (حسب خواہش) بصدارت ماسٹر آف دی رولز نشست کرتے ہیں۔

اس کا نصف تین ہے اور عام طور پر ایک عدالت میں تین نشست کرتے ہیں۔

دج) ”دارالامرا“ جو انگلستان کی اعلیٰ ترین عدالت مرافعہ ہے۔

فرانسس

عادلون قانون وزیر عدالت کی سفارش پر صدر جمہوریہ کرتا ہے۔ اور صرف عدالت

تسلیم ہی انہیں برطرف کر سکتی ہے۔ عدلی نظام ایک حد تک انگلستان کے نظام کے مماثل ہے۔ یہاں بھی محافظان 'من' دیوانی، فوجداری اور تجارتی، ابتدائی اور ثانوی عدالتیں ہیں اور اسٹرنز اور جیوری سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن جیوری میں اتفاق رائے کی بجائے اکثریت کی رائے کافی سمجھی جاتی ہے، اور جن عدالتوں میں جیوری نہیں ہے وہاں کئی کئی جج (تحت عدالتوں میں بھی) ایک ایک مقدمہ سننے کے لئے بیٹھتے ہیں۔ دیوانی اور فوجداری دونوں کا مرانہ ایک عدالت تسلیم کے سامنے جاتا ہے جس میں ایک صدر، تین نائب صدر اور ۴۴ عادل ہیں۔ یہاں بھی مقدموں کی سماعت کے لئے کئی کئی جج نشست کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ "انتظامی عدالتیں" بھی ہیں۔ سب سے چھوٹی عدالت صوبہ واری مجلس پرنسپل کی ہے اور مرانہ "مجلس مملکت" میں ہوتا ہے جس میں ۲۵ معمولی ارکان ۲۶ غیر معمولی ارکان، ۴۴ "نظامی معروضات" اور ۴۴ "مستوفی" ہوتے ہیں۔

"معمولی" اور "انتظامی" عدالتوں کے باہمی تقصیر رفع کرنے کی نوعیت سے ایک "فاری عدالت" قائم ہے جس کا صدر وزیر عدل ہوتا ہے اور ارکان میں تین قائم مقام مجلس مملکت کے اور تین عدالت تسلیم کے ارکان ہوتے ہیں۔

ممالک متحدہ امریکہ

(الف) وفاقی عدالتیں - حدود سماعت، علاوہ ان مقدمات کے جن کا

سرپرست: "مملکت ہالیوڈ کے کل پرنس" *Marriott: Mechanism*

of the Modern State باب ۳۳ (۳)

تعلق وفاقی قانون سے ہے، وہ تمام مقدمات جن میں دیوار یا ستیں یا دور یا ستوں کے شہری فریق ہوں۔

(۱) عدالت عالیہ۔ ایک میجر مجلس اور ۶ جج۔ ان میں سے نصاب کے لئے چھ ججوں کی موجودگی لازمی ہے۔ اسے ان مقدموں میں ابتدائی اختیار سماعت حاصل ہے جن میں یا تو کسی ملک کے سفیر ورنہ کوئی ریاست فریق ہو۔ نیز اسے ریاستی عدالتوں سے ایسی حالت میں مرافعہ کا حق حاصل ہے جب ریاستی و مرکزی توازن یا ریاستی و مرکزی دستور کی تاویل نزاعی ہو۔ ایسی حالت میں اس کی تجویز ناظرین سمجھی جاتی ہے۔ نیز قسمت داری عدالت ہائے مرافعہ سے بھی مرافعوں کی سماعت ہوتی ہے۔

(۲) قسمت داری عدالت ہائے مرافعہ۔ ۹ عدد۔

(۳) ضلع داری عدالت ہائے ابتدائی۔ ۸۱ عدد، ایسے کہ ہر ریاست کم سے کم ایک عدالتی ضلع سمجھی جاتی ہے، اس عدالت کے ساتھ ساتھ مرکزی عدالت بھی ہوتے ہیں جو ان عدالتوں کے احکام کا نفاذ کرتے ہیں۔

(ب) ریاستی عدالتیں:-

(۱) ریاستی عدالت عالیہ۔ عام طور پر عدالت کی عدالت مرافعہ

(۲) ”برتر عدالتیں۔ عدالت مرافعہ اور اہم مقدمات میں عدالت ابتدائی

(۳) کونٹری کی عدالتیں۔

(۴) محافظان امن

ریاستی عادلان اور مرکزی عادلان میں عظیم الشان تباہی پایا جاتا ہے چنانچہ

- (۱) مرکزی عادلوں کو صدر جمہوریہ مجلس سینا کی اجازت سے مقرر کرتا ہے۔ ریاستی عادلوں کا عوام الناس انتخاب کرتے ہیں۔
- (۲) مرکزی عادل تقریباً عمر بھر کے لئے ہوتے ہیں۔ ریاستی عادل عام طور پر دو دو چار چار سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں۔
- (۳) مرکزی عادل سوائے مواخذے کے کسی طرح سے نہیں ہٹائے جاسکتے۔ کم سے کم چھ ریاستوں کے عادلوں کو محض عام رائے کے ذریعے سے علیحدہ کیا جاسکتا ہے۔

سویٹان

”محکمہ وفاقیہ“ یا عدالت عالیہ ۱۔

محکمہ وفاقیہ میں ۳۳ ارکان ہیں جن میں چھ سال کے لئے جماعت مغنہ منتخب کرتی ہے، اور گورنر (دفعہ ۱۰۸) میں اس کی قید نہیں کہ یہ قانون داں ہوں، عام طور پر صرف قانون داں لوگوں کو مقرر کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک کو صدر اور ایک کو نائب صدر دو دو سال کے لئے منتخب کیا جاتا ہے۔ عادلوں کے انتخاب میں یہ امر ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ جرنی، فریسی اور اطالوی سویٹان کے قائم مقام منتخب ہوئے۔ اس محکمہ کا صدر مقام برن نہیں، چونکہ کا دارالحکومت ہے، بلکہ لوزان ہے۔ یہ شاید

۵۵: دیکھو نام و تہا: ”نظریہ سیاسی دیکھو تہا: عالیہ Ram & Sharma“

Political theory and modern

Govt. جلد ۲، باب ۲۔

اس لئے کہ عدلیہ عالمہ سے آزاد ہے۔

محکمہ عدلیہ کا اختیار سماعت :-

- (۱) وہ مقدمات جن میں دفاعیہ ایک فریق ہو۔
- (۲) وہ مقدمات جن میں کوئی کیٹن ایک فریق ہو۔
- (۳) غداری یا بغاوت کے مقدمات۔

(۴) بین الاقوامی قانون کے خلاف مقدمات۔

اس ”محکمہ“ کے ماتحت کوئی عدالت مختلف کیٹنوں میں نہیں ہے۔ بلکہ کیٹنوں میں خود اپنی عدالتیں ہیں جو ممالک متحدہ امریکہ کی ریاستی عدالتوں کی طرح بالکل مکمل ہیں۔

ہندوستان :-

دیوانی و فوجداری (۱) اعلیٰ ترین عدالت مرافعہ، جو ڈیش کیٹی پریوسی کونسل، لندن۔

(الف) مرافعہ دیوانی۔ کسی عدالت عالیہ کے کسی فیصلے کے خلاف خواہ مرافعی ہو یا ابتدائی، بشرطیکہ تعین نامش یا تعین مرافعہ متعلقہ روپیہ سے کم نہ ہو، اور اگر عدالت مرافعہ نے عدالت ماتحت کی رائے سے اتفاق کیا ہے تو مزید مرافعہ کے لئے کوئی قانونی امر ہو۔

جیکو گکرسٹ: ”اصول سیاسیات“ Gilchrist: Principles

of Politics باب ۲۳، فصل ۶۔

(ب) فوجداری مراجعہ ان مقدمات میں جن کی کسی ہائی کورٹ میں ابتدائی طور پر سماعت ہوئی ہو یا جس میں عدالت ماتحت نے عدالت عالیہ سے کسی قانونی امر کے بابت استفسار کیا ہو۔ بہرینچ پریوی کونسل میں فوجداری مراجعہ پیش کرنے کے لئے عدالت عالیہ کی رضامندی لازمی ہے۔

جوڈیشیل کمیٹی میں حسب ذیل ارکان ہیں:-

۱۔ صدر پریوی کونسل (عام طور پر نہیں نشست کرتا)

۲۔ پریوی کونسل کے وہ ارکان جو بڑے بڑے عدالتی عہدوں پر فائز رہے ہوں۔

۳۔ قانونی امر (دیکھو عدلیہ انگلستان)۔

۴۔ منظرہ اور ہندوستان کے کم سے کم دو واران کان جنہیں دیاں کا عادلانہ تجربہ ہو۔

ہر سماعت پر کم سے کم چار ارکان کا ہونا لازمی ہے اور صرف وہی ارکان نشست کر سکتے ہیں جنہیں سماعت کے لئے طلب کیا جائے۔ جوڈیشیل کمیٹی کی تجاویز کی شکل سفارشوں کی ہوتی ہے۔

(۲) عدالت اس کے عالیہ:-

ہر بڑے صوبے میں ایک ایک عدالت عالیہ اور ہر بعض صوبوں میں

وہ جو ڈیپشیل کشتہ کی عدالتیں ہیں جن کے اختیارات اکثر امور میں عدالتِ عالیہ کے مائل ہیں۔ صوبہ دہلی پنجاب کے عدالتِ عالیہ کے ماتحت ہے۔ زیادہ سے زیادہ ۲۰ عادل ہونے چاہئیں جن کے علاوہ گورنر جنرل موقعی طور پر زائد جج مقرر کر سکتا ہے۔ ان عادلوں میں کم سے کم $\frac{1}{10}$ انڈین سول سروس کے ارکان ہونے چاہئیں۔

اختیارات :-

(۱) مال کے مقدمات ان عدالتوں کے اختیار سماعت کے بالکل باہر ہیں اس لئے کہ یہ کلیتہً بورڈ آف ریونیو (محس مال) کے تابع ہیں جو ہر صوبے میں ہے۔

(۲) اہم مقدمات میں کلکتہ، بمبئی، مدراس کے شہروں کے لئے عدالتِ عالیہ کو ابتدائی اختیارات حاصل ہیں۔ مرافعہ جلسہ کاملہ میں ہوتا ہے۔ اس

(نٹیہ نوٹ ۴۴ کا) وفاقی عدالت کا قیام عمل میں آیا ہے جس میں ایک ”میرٹھس عدالت ہند“ اور دو جج مقرر کئے گئے ہیں۔ اس عدالت کو ان تمام امور کی بابت اختیار حاصل ہو گا جن کا تعلق اس قانون سے ہے اور یہ اختیار ابتدائی بھی ہو گا اور مرافعی بھی۔ نہ صرف یہ عدالت برطانوی ہند کی عدالت اسے عالیہ سے مرافعہ سننے کی بلکہ جو ریاستیں وفاقیہ ہند میں شریک ہو گئی ہیں ان کی عدالت اسے عالیہ سے بھی اس میں مرافعہ جائیں گے، بشرطیکہ ان میں اس قانون کا کوئی نکتہ زیر بحث نہ ہو۔ نیز مرکزی جماعت مقننہ اس کے اختیار کو وسیع بھی کر سکتی ہے۔ جب ابتدائی عدالت کی حیثیت سے فیضست کر رہی ہوگی اس وقت اس کا مرافعہ جو ڈیپشیل کمیٹی میں جاسکتا ہے۔

اختیار کی رو سے عدالت العالیہ کسی مقدمہ کو بھی اپنے یہاں جوڑ کر سکتی ہے (۳) یہ عدالت العالیہ اپنے حدود کے اندر اعلیٰ ترین عدالت مرافعہ ہے۔
 ماتحت فوجداری عدالتیں - عدالت العالیہ کے ماتحت تعزیری امور کے لئے عدالت کے سشن میں جو تقریباً ہر ضلع میں ہوتی ہیں، اور ان کے ماتحت بعض مرتبہ زائد سشن جج اور مدکار سشن جج بھی ہوتے ہیں۔ ان عدالتوں کو ہر قسم کی سزا دینے کا اختیار ہے، لیکن سزائے موت بغیر عدالت عالیہ کی توفیق کے نہیں دی جاسکتی۔

ان کے نیچے مجسٹریٹوں کی عدالتیں ہیں۔ بعض مجسٹریٹ درجہ اول کے ہیں، بعض درجہ دوم کے اور بعض درجہ سوم کے، اور یہ درجہ بندی اختیار رات عدالت کی رو سے کی جاتی ہے۔ درجہ سوم اور درجہ دوم کے مجسٹریٹوں کا مرافعہ درجہ اول کا مجسٹریٹ سنا ہے اور درجہ اول کے مجسٹریٹ کا مرافعہ سشن جج۔
 اہم مقدمے، جو عدالت سشن کے متعلق ہوتے ہیں ان کی ابتدائی تحقیقات مجسٹریٹ ہی کرتا ہے، اور اگر بادی النظر میں الزام معلوم ہو تو سشن سپرد کیا جاتا ہے ورنہ اسی عدالت سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ڈپٹی کلکٹر ہی ضلع کا درجہ اول کا مجسٹریٹ ہوتا ہے اور تحصیلدار درجہ دوم و سوم کے مجسٹریٹ ہوتے ہیں، اور چونکہ ان میں سے بعض مالی معاملات سے فرصت نہیں ملتی اس لئے عدالتی کام کا بیشتر حصہ درجہ اول و دوم و سوم کے اعزازی مجسٹریٹوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو عام طور پر پانچ سال کے لئے مقرر ہوتے ہیں اور انھیں اپنے اپنے حلقوں میں تعزیری اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔

ما تحت دیوانی عدالتیں ۱۔

(۱) ضلع کلج جو عام طور پر سشن جج بھی ہوتا ہے { ان دونوں کا مراعات
(۲) نائب جج جو عام طور پر ناڈیشن جج ہوتا ہے { عدالت عالیہ میں جاتا ہے
(۳) منصف۔ اس کا مراعات ضلع کلج سنبھلے اور اگر وہ چاہے تو اسے
نائب جج کے سپرد کر دیتا ہے۔ اسے چھوٹے چھوٹے مقدمات کے
اختیارات ہوتے ہیں۔

مال کی عدالتیں ۱۔

(۱) بورڈ آف ریلو نیو۔

(۲) کلکٹر

(۳) کلکٹر

(۴) اسٹنٹ کلکٹر درجہ اول و درجہ دوم۔

(۵) تحصیلدار

ہندوستانی عدالتوں کا نظام ۱۔

دیوانی	نوجہاری	مال
	محکمہ ٹریٹ درجہ سوم	تحصیلدار
	محکمہ ٹریٹ درجہ دوم	اسٹنٹ کلکٹر درجہ دوم
		ڈپٹی کلکٹر درجہ اول
	محکمہ ٹریٹ درجہ اول	کلکٹر
		کلکٹر
		کلکٹر

منصف

تشکلات عدلیہ

۴۴۸

ضمیمہ باب ۱۸

زائیدشن ایچ
سنشن ایچ

سب ایچ
ضلعواری ایچ

عدالت العالیہ

دفاقی عدالت

جورڈیشیل کیٹیگری پریوی کونسل

LOCAL GOVT.

باب ۱۹

مقامی حکومت

مقامی حکومت کی تاریخ مقامی ادارات۔ ان کا انادی پہلو۔ مقامی رتبہ۔

تقسیم اختیارات

اس وقت تک جتنے اداروں ہدایت کی گئی تھی وہ سب اس اعتبار سے ممتاز ہیں کہ ان کا تعلق ملک کے ایک مرکز سے ہے، لیکن اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کا ان افراد سے جو متفرک ملک یا پائے تخت سے دور رہتے ہیں اتنا قریب کا تعلق نہیں ہے، اور وہیات و قصبات میں رہنے والوں کے بود و ماند پران کے اثرات کی حیثیت محض بالواسطہ ہے منفرد لوگوں پر اس کا نہایت ہی کم اثر پڑتا ہے کہ جماعت مقننہ کے کئے ایوان ہیں اور ہر ایوان میں کئے رکن ہیں، عدالت العالیہ کے عادلوں کے اختیارات کیا کیا ہیں اور دربار بادشاہ کے سامنے ذمہ دار ہیں یا جماعت مقننہ کے۔ اس کے برعکس انسان خواہ غریب ہو یا امیر، ذی اقتدار ہو یا بے اقتدار، شریف ہو یا رذیل، اس پر اس امر کا براہ راست اثر پڑتا ہے کہ اس کی سواری کے آنے والے کے لئے کس قسم کی سڑکیں ہیں، راستے میں پل ہے یا نہیں اور ان کی مرمت ہو چکی ہے یا

وہ غیر مستحکم ہیں، اس کے بچے کے لئے اس کے گاؤں یا قصبے یا تحصیل میں کس قسم کے مدارس ہیں، اس کے نواح کی آب و ہوا کس قسم کی ہے، اور اس کے مکان کے قریب کسی جگہ پانی ٹھہرنے سے غلاظت تو نہیں ہوگی۔ الغرض انسان کی روزمرہ زندگی کی کیفیات کا براہ راست تعلق اس قدر مرکزی حکومت سے نہیں جتنا مقامی حکومت سے ہے۔ اس باب میں اس ادارے پر بحث کی جائے گی جس کے ذریعے سے ان امور کا انتظام عمل میں آتا ہے۔

مقامی حکومت کی تاریخ۔ مقامی حکومت کی تاریخ دراصل حکومت ہی کی ابتدا کی تاریخ ہے، اس کے لئے بڑی بڑی وسیع منطقتیں، نو نسبتہ حال کی پیداوار ہیں اور ابتدا میں تو ہمیں زیادہ تر ایسے چھوٹے چھوٹے رقبے نظر آتے ہیں جن کے باشندے اپنا کام خود انجام دیتے ہوں۔ ایسے سواراجی رقبے تقریباً ہر ملک میں نظر آتے ہیں، لیکن یہ نسبت مغربی ملک کے مشرقی ملکوں میں زیادہ ممتاز ہیں۔ مغربی ایشیا میں زمانہ قبل اسلام میں (جسے اصطلاحاً ایام جاہلیت کہتے ہیں) شہر مکہ کی حکومت ایک نہایت منظم جماعت کے سپرد تھی جس نے شہر کے پانی کا انتظام، مجلس شوریٰ کے زائین کے آرام و آسائش، کعبہ کی حفاظت اور ایسے ہی دوسرے ضروری امور کو جدا جدا شعبہ داروں کو تفویض کر دیا تھا۔ مشرقی ایشیا میں جاپان میں

۱۹ دیکھو شریانی، "اسلامی دولت عامہ کی ابتدا" *Shriyani: The Origin of Islamic State*.

حیدر آباد، ۱۹۲۶ء *of Islamic Polity*.

گو جاگیرداروں کا ملک پر بہت بڑا قابو تھا اور ملک شوگن کے چنگل کے اندر پھنسا ہوا تھا، تاہم دیہات کا اندرونی انتظام خود کسان کرتے تھے۔ یورپ میں یونان کو لیپے تو داں نظر آئے گا کہ شہری مملکت کی مرکزی حکومت، خواہ عمومی ہو یا امیر سرری دیہات کا انتظام تقریباً بلا استثناء خود دیہات کے شہریوں کو حاصل تھا۔ روم کی حیثیت محض ایک بلدیہ کی تھی، اور جب تک روم روم بنا رہا اس وقت تک بلدیہ ہی رہا۔ اسی طرح تمام فنیقی تہذیب د تہذیب کا مرکز اور سدا دوفتی بلدیات ضرور سدا تھے اور ان کا یہ تصور اس وقت بھی برابر واجب نفیقوں نے بڑھتے بڑھتے تمام بحیرہ روم ایک فنیقی سمندر بنا لیا۔ ہندوستان اس مقامی حکومت کا ہمیشہ سے مرکز رہا ہے اور کون ایسا ہے جو پنچایت کے لفظ سے واقف نہیں، جو حقیقت میں قدیم ہندوستان کے جذبہ مفاہمت کو ظاہر کرتا ہے۔ چونکہ یہاں صرف رقبائی انتظام کافی نہ تھا بلکہ ملک علاوہ رقبوں کے ذاتوں میں بھی منقسم تھا اس لئے اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ رقبائی پنچایتوں سے بھی زیادہ اہم مختلف ذاتوں کی پنچائیں قائم ہوں اور ان پنچایتوں کو (رقبوں یا) ذاتوں کا اندرونی انتظام یا تادیب سپرد کی گئی۔

۱۵ مکرجی: "مشرقی عمومیں" *Mutcrjee: Acenocrocies of the East.*
 ۱۵ دبلیٹنٹر، ۱۹۱۶ء، ص ۱۵۸

۱۵ رام و شرما: "مبادی مدنیات"،
Ram & Sharma: Elements of Civics. باب ۱۰۔

مقامی ادارات۔ اصل میں مقامی حکومت ہی ہے جس میں وحدت ہوتے ہوئے آج کل کی عظیم انسان سلطنتوں کی تشکیل ہوئی ہے، ادارات مقامی ادارات کو جو بھی اختیارات حاصل ہوئے وہ علی العموم مرکزی ادارات ہی کے دئے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سبک نے مقامی ادارات کی تعریف کی ہے کہ ”مقامی ادارات ایسے اعضا ہیں جو مکمل طور پر مرکزی مقننہ کے ماتحت ہونے کے ساتھ تقررات اور ایک حد تک اپنے تجاویز کے بارے میں مرکزی ادارات سے آزاد ہوتے ہیں اور ساتھ ہی مالیات عامہ کے چند اجزاء پر ایک حد تک نیم مختارانہ طور پر قابو یافتہ ہوتے ہیں۔“ حقیقت یہ ہے کہ یہ تعریف عالمگیر نہیں قرار دی جاسکتی، اس لئے کہ گو یہ سچ ہے کہ اکثر و بیشتر ممالک میں مقامی ادارات کے اختیارات مرکزی ادارات کی طرف سے تفویض کئے ہوئے ہوتے ہیں، لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ممالک متحدہ امریکہ کی اکثر ریاستوں میں مقامی اختیارات ریاستوں کی طرف سے تفویض نہیں کئے جاتے بلکہ اسی طرح دستور کا جزو سمجھے جاتے ہیں جیسے کہ خود ریاستوں کے دستاویز یعنی جس طرح ریاستوں کے اختیارات کا تعین مرکزی دستور کرتا ہے بالکل اسی طرح مقامی اختیارات کا تعین ریاستی دستاویز کی طرف سے ہوتا ہے، اور جیسے مرکزی حکومت کو ریاستی اختیارات میں کمی بیشی کرنے کا اختیار نہیں ویسے ہی

سبک: ”مبادی سیاسیات“ Sidgwick: Elements of

ریاستی حکومتیں مقامی اختیارات میں کمی بیشی نہیں کر سکتیں یہ علاوہ اس اہم استثناء کے، کسی فردیہ کے مقامی حکومت اور وفاقیہ کی ریاستوں کے درمیان جو فرق عام طور پر نظر آتا ہے وہ یہی ہے کہ فردیہ میں مقامی اختیارات مرکز کے مفروضہ ہوتے ہیں اور وفاقیہ کی ریاستوں میں ریاستی ادارات مرکزی حکومت کے تابع نہیں ہوتے۔

مقامی ادارات کے سپرد دو طرح کے کام کئے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ امور جن کے واسطے یہ ادارات قائم ہیں، یعنی مقامی لوگوں کے فوری بہبود کے انتظامات، جیسے ان کی صحت و تندرستی، ان کا آرام و آسائش، ان کی تعلیم و تربیت کے انتظامات۔ اکثر مقامی ادارات کے سپرد روشنی، پانی کا انتظام، حفظان صحت، موریات، نالیاں، جمالیاتی اور طبی نقطہ نظر سے تعمیرات کی عام نگرانی، ابتدائی تعلیم، بازی گاہیں، مقامی سڑکیں، پل اور سواریل کی نگرانی درجہ جات، یہ سب امور ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایسے امور بھی ہیں جو بعض مرتبہ محض آسانی اور سہولت کے خاطر ان ادارات کے سپرد ہوتے ہیں، جیسے بعض دفعہ مقامی رقبوں کو انتخابات کے لئے اکائی قرار دیا جاتا ہے بعض ممالک میں مقامی مالی نگرانی اور پولیس انھیں کے سپرد ہوتی ہے اور زیادہ تر قی یا فائدہ مقامی رقبوں میں ان رقبوں کے عدالتی امور بھی انھیں کے متعلق ہوتے ہیں۔

۵۵ ہیرس، "مقامی حکومت بہت سے ملکوں میں" Harris: Local

Government in many lands. باب ۱۵۔

۵۶ دیکھو رام و شرما، حسب بالا۔

مقامی اوارات کا افادی پہلو۔ اصل میں جو اصول مقامی اختیار کیا کی گویا بنیاد ہیں وہ متعدد ہیں۔ اول تو یہ واقعہ ہے کہ جس شخص کا کام ہو گا اسے وہی شخص بہترین طریقے پر انجام دے گا۔ اس اصول کو آگے بڑھایا جائے تو معلوم ہو گا کہ مختلف رقبوں یا ملتوں والے خود اپنے ہی کام بہترین طور پر انجام دیں گے اور ہمیشہ یہ خیال آن کے مد نظر رہے گا کہ اپنا بہبود کم از کم خرچ پر حاصل ہو جائے۔ یہ انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ اگر اسے یہ احساس ہو جائے کہ بہبود میرا اپنا ہے اور جو روپیہ میں خرچ کر سکتا ہوں اسے خرچ کرنے پر جو بچے گا اس پر میرا ہی اختیار رہے گا، تو وہ اپنے حصول مقصد کی کوشش کے ساتھ اس کے لئے کم از کم خرچ کرے گا، تاکہ روپیہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرے، اور یہی اصول انسانی جمہوروں پر بھی صادق آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تعلیمی یا مدراس کی جماعت مقننہ کے ارکان کا احمد نگہ یا گمراہی کو کم کے باشندوں کی تعلیم و تربیت، آرام و آسائش سے اس قدر لگاؤ نہیں ہو سکتا جتنا خود احمد نگہ یا گمراہی کو کم والوں کو۔ علاوہ ازیں آج کل کی عمومی پسند و ناپسندوں میں، جب سیاسیات کی کیفیت اس درجہ پیچیدہ ہو گئی ہے، ان مقامی رقبوں کا انتظام بہتر لہ سیاسی تعلیم گاہوں کے ہے اور جو لوگ مقامی مجلس کے معاملات میں منجھ کر نکلتے ہیں ان کے لئے مرکزی جماعت کے مقننہ کا کاروبار اچنبھا نہیں معلوم ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جتنا مختصر مقامی رقبہ ہو گا اتنی ہی اس کی انتظامی نوعیت برتر ہوگی، لیکن چھوٹے چھوٹے رقبوں میں کارکن نسبت کم ہوں گے، اور

جو ہوں گے ان کی نظر علی العموم اس قدر وسیع نہ ہوگی جتنی نسبت بڑے رقبوں میں، اس لئے کہ جن لوگوں کو باعث ہمارا اپنے علم یا منہر کے امتیاز حاصل ہے وہ چھوٹے رقبوں کے کاروبار میں حصہ لینا اپنے لئے ممکن ہے کہ باعث عار سمجھیں اور یہ رقبے ان کی رفیع خدمات سے محروم رہ جائیں۔

مقامی رقبے۔ مقامی انتظامات کے لئے جو رقبے عین کئے جاتے ہیں وہ کئی طرح کے ہو سکتے ہیں۔ اول تو بعض ممالک میں بعض رقبے تاریخی اعتبار سے گریابے بنائے ہوئے ہیں۔ انگلستان کے صوبے سیکڑوں سال قدیم ہیں اور یہاں ہر صوبے کے باشندوں کو باہمی تعامل میں کسی قسم کی دقت پیش نہیں آتی، چنانچہ صوبے ہی کو ایک حد تک مقامی حکومت کا مرکز بنادیا گیا ہے۔ فرانس کا صوبہ اور ضلع دونوں نسبتاً جدید ہیں یعنی ان دونوں کی تاسیس انقلاب فرانس کے زمانے میں ہوئی تھی، چنانچہ اس تاسیس کے بعد ان رقبوں سے مقامی انتظامات کا کام لیا جانے لگا۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ضلع کے اجزاء کمیون یا بلدیات میں جو نہایت درجہ قدیم ہیں اور جن میں قدیم فرانس کے مقامی سواراج کا (جس کی مطلق الغنائی کے زمانے میں بھی اتنی ہی اہمیت تھی جتنی جمہوریہ کے زمانے میں ہے) ایک پرتو نظر آتا ہے۔ تاریخی رقبہ جات کے علاوہ ممکن ہے کہ ملک قدرتی یا جغرافیائی رقبہ جات میں منقسم ہو، جیسے یونان میں، جہاں بڑی بڑی کھاڑیوں، پہاڑوں اور دریاؤں سے ملک کے قدرتی حصے بن گئے ہیں۔ پھر آبادی کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے بھی ملک کے ایک ٹکڑے کا نقطہ نظر دوسرے ٹکڑوں سے جدا ہوتا ہو

جس کی بدیہی مثال قصبات اور دیہات کے درمیان مفارقت ہے۔ آخر میں وہ رقبے آئے ہیں جن میں بعض مرتبہ کسی ملک کو کسی ظاہری اصول کے نسبت مساوی حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، جیسے ہندوستان کے بیشتر اضلاع یا ممالک متحدہ امریکہ کی ریاستوں کے ٹکڑے جنہیں کاؤنٹیاں کہتے ہیں اور بعض ریاستوں میں محض مستطیل شکلوں پر مشتمل ہیں۔

تقسیم اختیارات۔ جہاں تک مرکز اور مقامی ادارات کے درمیان تقسیم اختیارات کے اصول کا تعلق ہے، ہمیں تین انواع نظر آئیں گی پہلی قسم تو ایسے مقامی رقبوں کی ہے جس میں مقامی امور پر قانون سازی تو مرکز کرتا ہے لیکن ایسے قوانین کا نفاذ مقامی ادارات کرتے ہیں۔ جو اصول اس قسم کی صورت حال میں مد نظر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ملک کے مفاد کے لئے یہ ضروری ہے کہ قانون تمام رقبہ جات کے لئے ایک ہی وضع کا ہو، اور اگر مقامی محاسن کو اختیارات دے جائے تو وہ زیادہ تر محض ذیلی قاعدہ سازی کے ایسے

۱۔ ایک اعتبار سے یہ مفارقت محض ذریعہ نہیں بلکہ نوعی ہے۔ دیہات میں کھلی ہوا اور بانی کے انتظام کی اس قدر ضرورت نہیں جتنی شہروں اور قصبوں میں، نیز چونکہ بار بار ذریعہ اور سواروں کی موخر الذکر میں کثرت ہوتی ہے اس لئے سڑکوں اور سواروں کی روک ٹوک کا انتظام بھی لازمی ہے۔ اس کے برعکس گاؤں میں اکثر ذرا ملتی مالیات، دیہی پولیس کے انتظامات سڑکوں کی مرمت وغیرہ کے انتظامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیز چونکہ قصبوں اور شہروں کی آبادی گنجان ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں کے انتظامات کے لئے مقامی رقبے بہ نسبت دیہی رقبوں کے کم وسیع ہوتے ہیں۔

اختیارات ہوتے ہیں جو مقامی انتظامات میں مدد ہوں۔ یہ طرز کار ایک بڑی حد تک انجمنستان اور ممالک متحدہ امریکہ میں رائج ہے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ مقامی ادارات کو تھوڑی بہت قانون سازی کے اختیارات دے دئے جائیں لیکن جو عملہ ان قوانین کا نفاذ کرے وہ مرکزی حکومت کا مقرر کردہ اور اس کا عہدہ ہو۔ یہ طرز کار زیادہ تر فرانس میں رائج ہے جہاں صوبہ دار مقامی انتظام کے کم و بیش سیاہ و سفید کا مالک ہوتا ہے۔

تیسرے اصول کے تحت قانون سازی اور قوانین کا نفاذ دونوں کام مرکزی اور مقامی ادارات کے درمیان منقسم ہوتے ہیں، یعنی انہم امور پر مرکز قانون سازی کرتا ہے اور محض مقامی امور مقامی ادارات کے لئے چھوڑ دیتا ہے، اور اسی طرح زیادہ اہم عہدہ دار مرکز کے مقرر کردہ ہوتے ہیں۔ اس طرز کار کی طرف ممالک متحدہ امریکہ کی ریاستوں کا میلان نظر آتا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ اگر مرکزی حکومت کی طرف سے مقامی معاملات میں زیادہ مداخلت رہی تو باشندوں کی جو رہی سہی دلچسپی مقامی ادارات سے ہوگی وہ بھی کم ہو جائے گی اور باشندے خود بخود بے پرواہ اور آرام طلب ہو جائیں گے۔ ساتھ ہی اس کی بھی ضرورت ہے کہ مرکز مقامی معاملات سے آگاہ رہے تاکہ باشندوں کی تنگ خیالی کی وجہ سے مقامی رقبوں اور ان کی ترقی کو نقصان نہ پہنچے۔ اس اصول کے تحت مقامی ادارات کو بھی اختیارات قانون سازی یا قاعدہ سازی کے دئے جائیں وہ نہایت محدود ہوں تاکہ ملک کو قانونی تنوع کی وجہ سے زیادہ نقصان نہ پہنچے۔ حقیقت میں جیسا سبک

کہتا ہے، 'مقامی حکومت میں حکمت عملی کا سوال نہیں بلکہ عمل کی انتظامات کا سوال ہونا چاہئے' اور جو بھی اختیارات مقامی ادارات کو حاصل ہوں ان میں اسی اصول کو مد نظر رکھا جانا چاہئے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ممالک متحدہ جیسے عموماً پسند ملکیت میں بھی مقامی حکومت روز بروز غیر معمولی ہوتی جا رہی ہے اور جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی مجلس یا بعض مرتبہ تو ایک ہی ایک شخص کے قبضے میں آتی جا رہی ہے۔

لیکن اس کا بھی خیال رہنا چاہئے کہ 'جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے، مقامی ادارات کا ایک انفرادی پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے مقامی آبادی کو امور عامہ میں دلچسپی لینے کا موقع مل جاتا ہے اور انھیں امور عامہ کی تعلیم ہوتی ہے تاکہ رفتہ رفتہ وہ مرکزی امور میں بھی حصہ لے سکیں اور ان کے ذریعے سے ملک کی خدمت کر سکیں۔ ایسی حالت میں بہتر ہوگا کہ نہ صرف شہروں میں بلکہ دیہات میں بھی چھوٹی چھوٹی مجلس ترتیب دی جائیں جو منتخب شدہ ہوں، اور ان مجلس یا ان کی ذیلی جماعتوں کو مختلف مقامی امور کی کار فرمائی کا اختیار دیا جائے۔ راولپنڈی کا اہم مسئلہ تو اس کی شکل عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ یا تو مرکزی حکومت مقامی خدمات کے اغراض کے لئے بعض محال (مثلاً گنزاری) پر

شہر سبک، حسبِ بالا۔

شہر ممالک متحدہ امریکہ کے مقامی ادارات کی اصلاح کے لئے دیکھو مثلاً 'امریکی شہروں کی حکومت' Munro: Government of American Cities.

کچھ فیصد کی زیادہ محصول عائد کرتی ہے، جسے مرکزی عیال وصول کرتے ہیں، اور اس کے بعد اسے مقامی ادارات میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود مقامی ادارات بطور خود اس قسم کے محاصل عائد کریں، جیسے چنگی کا محصول، سائیکلوں پر محصول وغیرہ۔ لیکن جو روپیہ جمع ہو مناسب ہے کہ اسے سوائے قطعی طور پر مقامی ضروریات کے کسی دوسری مد پر خرچ نہ کیا جائے، ورنہ مقامی ضرورت پوری نہ ہو سکیں گی اور جس مقصد کے لئے یہ ادارات قائم ہیں وہی فوت ہو جائے گا۔

ضمیمہ باب ۱۹ مقامی حکومت کی تشکیلات

انگلستان - فرانس - جاپان - ممالک متحدہ امریکہ - ہندوستان -
انگلستان

انگلستان میں مقامی حکومت کسی خاص اصول پر مبنی نہیں ہے بلکہ امتداد زمانے کے ساتھ ساتھ جیسی جیسی ضرورتیں پیش آتی گئیں ویسے ویسے نئے نئے مقامی حلقے ان خاص ضرورتوں کو رفع کرنے کے لئے بنتے گئے اور یہ حلقے قائم رہے۔ یہ بھی نہیں کہ ایک سلسلہ حلقہ جات دوسرے سلسلے کی قسمیں ہوں بلکہ ان میں سے اکثر سلسلے ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں اور ہر ایک سلسلہ اپنے اپنے انتظامات میں مصروف ہے۔

سٹوڈنٹس ویل: "انگلستان کی مقامی حکومت" *Manuvelt: English local Government* بیرس: "مقامی حکومت بہت سے ملکوں میں" *Harris: local Government in many land*. باب ۱۱۳ "مکرسٹ": "اصول مابیات" فصل ۳
سٹوڈنٹس ویل: "انگلستان کی مقامی حکومت" *Manuvelt: English local Government* بیرس: "مقامی حکومت بہت سے ملکوں میں" *Harris: local Government in many land*. باب ۱۱۳ "مکرسٹ": "اصول مابیات" فصل ۳
سٹوڈنٹس ویل: "انگلستان کی مقامی حکومت" *Manuvelt: English local Government* بیرس: "مقامی حکومت بہت سے ملکوں میں" *Harris: local Government in many land*. باب ۱۱۳ "مکرسٹ": "اصول مابیات" فصل ۳

اور دو ترجمہ (مطبوعہ جامعہ عثمانیہ) باب ۱۱۳ دیا ہوا ہے۔

(۱) انتظامی صوبے ۶۲۰۔ ان میں اور جزائی یا تانہ رنجی صوبوں میں یہ فرق ہے کہ ”انتظامی صوبے“ بعض مرتبہ درجیے یا رکشاہ یا لکھن کشاہ میں انسانی الذکر کا جزو ہوتے ہیں۔ یہ آبادی اور رقبے دونوں میں غیر مساوی ہوتے ہیں یعنی رقبہ تقریباً ۸۰ مربع میل سے ۲۵۰۰ مربع میل تک اور آبادی تقریباً ۲۰ ہزار سے تقریباً ۲۰ لاکھ تک ہے۔ انتظامی صوبوں میں ایک مجلس صوبہ ہوتی ہے جس کے معمولی ارکان ۳ سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں اور یہ ارکان پچھ سال کے لئے آئڈرین کا انتخاب کرتے ہیں جن میں سے نصف ہر تین سال کے بعد برخاست ہو جاتے ہیں۔ معمولی ارکان اور یہ آئڈرین دونوں مجلس صوبہ کے رکن ہوتے ہیں۔ اس مجلس کا اجلاس سال میں ۴ مرتبہ ہوتا ہے لیکن ہر مرتبہ پورا اجلاس صرف ایک دن رہتا ہے اور کام ذیلی مجالس کے سپرد کر دیا جاتا ہے اسے ”شہری اضلاع“ قائم کرنے اور اضلاع اور پیرشوں کے حدود میں تبدیلی کا حق حاصل ہے۔

(۲) برو۔ صوبہ جاتی برو۔ یہ بڑے بڑے شہر ہیں جنہیں ”صوبہ جاتی بلدیات“ کہتے ہیں۔ یہ انتظامی صوبوں سے آزاد ہیں اور انہیں وہ تمام اختیارات حاصل ہیں جو صوبہ داری مجالس کو حاصل ہیں۔ ایسے بلدیات تعداد میں ۸۰ سے زیادہ ہیں اور ان کی آبادی علی العموم ۵۰ ہزار اور لاکھ کے درمیان ہے۔ بلدی برو۔ ان کی تعداد تقریباً ۲۵ ہے اور علی العموم ان کی آبادی ایک ہزار سے ایک لاکھ تک سمجھی جاتی ہے۔ مجلس برو (بلدی اور صوبہ جاتی برو دونوں میں) کی شکل تقریباً وہی ہے جو صوبہ جاتی مجلس کی ہے، سوائے اس کے

کہ دونوں قسم کی برو میں ایک میر بلدی بھی ہوتا ہے جسے مجلس برقیہ منتخب کرتی ہے۔
 (۳) اضلاع ابدی اضلاع برو سے ان اضلاع کو ذرا کم اختیار راست
 حاصل ہوتے ہیں۔ گونا گویہ بلدی کہلاتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر میں ذراستی
 آبادی بھی شامل ہے۔ ایسے اضلاع کی تعداد تقریباً ۸۰۰ ہے اور آبادی تقریباً
 ۲۵۰ سے تقریباً ۲ لاکھ تک ہے۔ ہر شہری ضلع میں ایک شہری ضلع داری مجلس
 ہے۔ اس کے سپرد ضلع کی حفظان و صحت کی نگرانی، ایسی سڑکوں کی نگہداشت
 جو براہ راست مجلس صوبہ کے ماتحت نہیں، اور تعمیرات کی نگرانی ہوتی ہے۔ اگر
 ۲۰۰۰۰ سے زیادہ آبادی ہو تو ابتدائی تعلیم بھی اسی کے سپرد کر دی جاتی ہے۔

دیہی اضلاع۔ تمام ملک، علاوہ شہری اضلاع اور برو کے دیہی اضلاع
 میں منقسم ہے۔ ان کی تعداد تقریباً ۶۵۰ ہے جن میں سے بعض کی آبادی ایک ہزار
 سے بھی کم اور بعض کی ۱۵ ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ ہر دیہی ضلع میں ایک دیہی
 ضلع داری مجلس ہے۔ جسے اپنے ضلع میں تقریباً دیہی اختیارات حاصل ہوتے
 ہیں جو شہری ضلعوں کے مجالس کو۔

(۴) سب سے چھوٹی اکائی پیرش ہے جس کی بنیاد قدیم ملک کی پیرش پر
 رکھی گئی ہے۔ دیہی پیرشوں کی تعداد تقریباً ۱۳ ہزار ہے، اور ان میں سے ہر ایک
 میں تمام ماٹے رہندوں کا ”جلسہ“ ہوتا ہے اور اگر اس کے رہندوں کی تعداد ۳۰۰
 سے زیادہ ہو، یا مجلس صوبہ کی اجازت لے لی ہو، تو ایک مجلس پیرش کچھ سال
 کے لئے منتخب کیا جاتا ہے، جس میں ۵ سے ۱۵ تک ارکان ہوتے ہیں۔ ہر پیرش
 کسی نہ کسی دیہی ضلع میں شامل ہوتی ہے، اور یہی واحد منظم شکل انتظام میں

مقامی تقسیم کی ہے۔

(۵) لندن کا انتظام

(۱) لندن کی صوبہ واری مجلس۔ اس میں ۱۴۴ ارکان ہیں جن میں سے ۱۲۴ کا انتخاب براہ راست تین سال کے لئے ہوتا ہے اور یہ ۲۰ آلڈرمن کو چھ سال کے لئے چنتے ہیں۔ اس کے فرائض نہایت اہم ہیں مثلاً مورچوں کا رکھ رکھاؤ، آتشیں رسالہ، پل، باغ عام، تعلیم، تعمیر، پاگل خانے، سرکاری دفینہ (۲ الف) بلدیہ لندن کا کارپوریشن۔ اس میں ۲۰۶ ”عام ارکان“ جن کا سالانہ انتخاب ہوتا ہے، اور ۲۶ عین حیاتی آلڈرمن ہیں۔ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ ایوانوں میں نشست کرتے ہیں۔ ایوان آلڈرمن ایک سال کے لئے ایک امیر بلکہ کا انتخاب کرتا ہے۔ اس بلدی جماعت کے ذمے منجملہ دیگر امور کے بلدی پولیس، پاگل خانے، پل، اوقاف اور بہت سے قدیم حقوق حاصل ہیں۔

(۲ ب) لندن کے ۲۶ بلدی برودیں ایک ایک مجلس ہے جس میں ۳۰ سے ۶۰ تک ارکان ہوتے ہیں جن کا انتخاب ۳، ۳ سال کے لئے ہوتا ہے، اور یہ ارکان ۶، ۶ سال کے لئے آلڈرمن کا انتخاب کرتے ہیں جن کی تعداد ارکان کی تعداد کا بائجواں حصہ ہوتی ہے۔ نیز ہر مجلس ایک سال کے لئے ایک امیر بلکہ کا انتخاب کرتی ہے،

تعلیم:- علاوہ جامعی تعلیم کے تمام تعلیم مقامی ادارات کے سپرد ہے، گو اس کی نگرانی صدر مجلس تعلیم کرتا ہے جو وزارت کارکن ہوتا ہے۔

مالیات ۱۔ مقامی اخراجات کا دار و مدار حسب ذیل محاصل پر ہے۔

(۱) البواب، جو مقامی ادارات زمین اور عمارتوں کی سالانہ قیمت پر لگاتے ہیں
 زرعی البواب اور ریلوں، نہروں وغیرہ کے البواب آمدنی پر ۲۵ فیصد کے
 حساب سے لئے جاتے ہیں، باقی البواب کی تعداد ہر جگہ مختلف ہے۔
 (۲) مرکزی خزانہ سے آبکاری کے مالیہ سے کچھ رقم مقامی اخراجات کے
 لئے دی جاتی ہے۔ نیز اسی طرح تعلیم، کوٹوالی، غربا، پاگلوں، حفظان
 صحت اور سڑکوں کے لئے بھی کچھ روپیہ ملتا ہے۔

(۳) تجارتی کاروبار، مثلاً بجلی، گیس وغیرہ کی آمدنی۔

(۴) قرضہ۔ لیکن اس کے لئے مرکزی حکومت کی اجازت لازمی ہے۔

عام ٹکرائی وغیرہ ۱۔

(۱) کسی حصہ ملک میں مرکزی حکومت کا ذاتی اختیار قائم مقام مثل صوبہ دار
 وغیرہ کے نہیں رہتا، جگہ مقامی مجلس پر اعتماد کیا جاتا ہے جو اپنا کام
 نہایت تندرستی اور کاروباری طرز پر انجام دیتی ہیں۔

(۲) قانون سازی کلیتہً مرکز کے قبضے میں ہے، اور جگہ ادارات مرکز کے

تالیف ہیں۔

فرانس

۹ صوبے۔ ہر صوبے میں ایک صوبہ دار ہوتا ہے جسے وزیر داخلہ کی سفارش پر

صدر جمہوریہ مقرر کرتا ہے۔ اس کی مدت عہدہ معین نہیں ہے۔ اور یہ مرکزی حکومت کا قائم مقام ہوتا ہے۔ یہ صوبے کے تمام معمولی عہدہ داروں کو مقرر کرتا ہے اور اسے صوبے کے پولیس اور حفظان صحت پر بہت اختیارات حاصل ہیں۔ نیز وہ بلدیوں پر بھی نگرانی رکھتا ہے۔

ہر صوبہ کے متعلق دو مجالس ہوتی ہیں ۱۔

(۱) مجلس صوبہ جس کے تین تنخواہ یاب ارکان ہوتے ہیں۔ لیکن انتظامی امور میں صوبہ دار اس مجلس کی رائے کا پابند نہیں ہوتا۔ یہ مجلس دراصل انتظامی عدالت زیرین بھی ہے جس کا مرافعہ مرکزی ”مجلس محکمات“ میں ہوتا ہے۔

(۲) صوبہ کی مجلس عامہ۔ اس میں ہر پرگنہ کی طرف سے ایک ایک رکن ہوتا ہے اور اس وقت ایسے کم از کم ۱۱ اور زیادہ سے زیادہ ۶۰ اراکین ہیں۔ یہ ارکان ۶ سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں۔ اس مجلس کے سپرد علاوہ مالی امور کے (جن میں سب سے اہم معاملہ

(بقیہ ضمیمہ ۱۹ کا) شو: ”برغظمی یورپ میں بلدی حکومت“ A. Shaw:

Municipal Government in Continental Europe. باب ۱۔

منز: ”یورپی شہروں کی حکومت“ of Munro: Government of European Cities. باب ۱۔

گلکرسٹ، حسب بالا، باب ۲۴ حصہ ۳

رام و شرما، حسب بالا۔

مختلف اضلاع میں محاصل کی تقسیم اور حصول قرضہ ہے) حسب ذیل اور بھی ہیں مدارس تعلیم و تعلیمات، صوبہ داری سڑکوں کی دیکھ بھال، یتیموں اور بیگس بچوں کی پرداخت، خیرات عامہ، پاگل خانے،

ضلع ۱۔ ہر ضلع میں ایک نائب صوبہ ہوتا ہے جسے صرف وہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں جو صوبہ دار اس کے تفویض کرتا ہے۔ نیز ایک مجلس ضلع بھی ہوتی ہے جس کے لئے ہر پرگنہ سے ایک ایک رکن منتخب ہوتا ہے۔ یہ مجلس کم از کم سال میں ایک مرتبہ نشست کرتی ہے اور اس کے سپرد یہ کام ہے کہ جو محاصل ضلع پر عائد کئے گئے ہیں انھیں پرگنوں پر تقسیم کر دے۔

پرگنہ ۱۔ یہ کئی بلدیات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اسے انتظامی اختیارات حاصل نہیں ہوتے اور اس سے صرف انتخابات اور عدالت کی اکائی کے طور پر کام لیا جاتا ہے۔

مدیات ۱۔ اوپر کے قسموں کے برخلاف (جو سب کی سب انقلاب فرانس کے بعد قائم کی گئی تھیں) بلدیہ فرانس کا قدیم ادارہ ہے۔ فرانس میں بلدیات کی تعداد تقریباً ۴۰ ہزار ہے۔ ان کی آبادی اور رتبے مختلف ہیں یعنی بعض کی آبادی ۵۰ سے بھی کم ہے اور بعض کی لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے بلدیہ کا رقبہ تقریباً دس ایکڑ اور بڑے سے بڑے کا ۱۰۰ مربع میل ہے۔ بلدیات خواہ دیہی ہوں یا بلدیہ دوڑوں کے ادارات ایک ہی طرز کے ہیں :-

مجلس بلدیہ میں ۱۰ سے ۲۶ تک ارکان ہوتے ہیں جو ہر سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں اور اکیس سال سے زیادہ عمر کے ہر فرانسیسی مرد کو رائے دہی کا اختیار حاصل ہے۔ انہیں اس سے زیادہ آبادی کے بلدیات انتخابات کے لئے حلقوں میں منقسم ہوتے ہیں۔ بلدیہ کا سب سے بڑا عہدہ دار میئر بلدی ہوتا ہے جسے مجلس بلدیہ منتخب کرتی ہے۔ یہ ایک طرف بلدیہ کا حکمران ہوتا ہے اور دوسری جانب مرکزی حکومت کی طرف سے قوانین وغیرہ کے نفاذ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کے ماتحت ایک یا کئی نائب میئر بلدی ہوتے ہیں۔

بلدی مالیات :-

بلدی اخراجات کا دار و مدار زیادہ تر ”الواب“ پر ہے۔ اور یہ براہ راست محصول پر کچھ فیصد اضافہ کا نام ہے۔ براہ راست محصول اراضی، مکانات، گراہنچا، ”دروازوں اور کھڑکیوں“ اور پیشوں اور تجارتوں کے محصول ہیں۔ ان الواپ کے علاوہ جنھیں ”معمولی الواپ“ کہتے ہیں، بعض دوسرے محصول بھی عائد کئے جاتے ہیں جنھیں غیر معمولی الواپ کہتے ہیں اور جو زیادہ تر کاروبار، موٹر دل وغیرہ پر عائد کئے جاتے ہیں۔ نیز بعض ضرورت مند صوبوں کو مرکزی طرف سے بھی مدد ملتی ہے۔

بلدیات کو ایسے محاسن جیسے گھڑا گاڑی، اکھل، معدنیات، چنگی، کتوں، شیشی وغیرہ پر بھی محاسن عائد کرنے کا اختیار ہے۔

تعلیم :- تعلیم کلیئہ مرکزی کے نگرانی میں ہے اور اس مقصد کے لئے زفیں، ”جامعی حلقوں“ میں منقسم ہے۔ ابتدائی تعلیم کی نگرانی صوبہ دار کے ذریعے سے کی

جاتی ہے اور ہر صوبہ میں ایک تعلیمی مجلس چوتی ہے جس کے زیادہ تر اساتذہ رکن ہوتے ہیں۔ مدارس کی عمارتیں بلدیات کے سپرد ہیں اور ان کی مرمت وغیرہ کے لئے مرکزی حکومت کچھ امداد دیتی ہے، نیز جملہ اساتذہ کی تنخواہیں مرکزی حکومت کی طرف سے دی جاتی ہے۔

جاپان

(۱) صوبہ۔ صوبے دو قسم کے ہیں ایک "فو" یعنی بلدی صوبے (توکیو، کیوتو، اوساکا، اور بائی ۳) "کین" یعنی دیہی صوبے کہلاتے ہیں۔ دونوں کے طرز انتظام میں کسی قسم کا فرق نہیں ہے۔

ہر صوبے میں ایک صوبہ دار ہوتا ہے جسے شہنشاہ نامزد کرتا ہے، اور مرکزی وزارت کے طرح اس کے ماتحت چند محکمے ہوتے ہیں، جیسے کاروبار، مندی، کاروائی، امور داخلی (تعلیم)، امور عامہ، حساب کتاب، اصلاح کی نگرانی، زراعت و حریت کو توڑالی (حفظان صحت)، امن عامہ، حفاظت عامہ، اجانب، کارخانے اور گرتیاں)۔

۱۵ سیرس، حسب بالا، باب ۱۶

پیرڈ: "توکیو کا انتظام اور سیاسیات" Beard: Administration

and Politics of Tokio باب ۲، ص ۴۰

نام و شرف، حسب بالا۔

مسعود جنگ: "جاپان اور اس کا تعلیمی نظریہ" Masood: Japan & its

Educational System. باب ۱۵۔

ہر صوبے میں ایک صلاح کار مجلس انتظامی ہوتی ہے جس میں سرکاری اور غیر سرکاری رکن ہوتے ہیں اور جس کی صدارت صوبہ دار کرتا ہے۔ اس میں کم سے کم ۲۰ ارکان ہوتے ہیں، جنہیں صوبے کے ایسے ۲۵ سالہ جا پانی مرد ۴ سال کے لئے منتخب کرتے ہیں جو محصول ادا کرتے ہوں۔ اس کے اجلاس کم از کم سال میں ایک مرتبہ ہوتے ہیں جس میں صوبہ کا سالانہ موازنہ پیش ہوتا ہے۔ اس مجلس کو صوبہ کے معاملات کے متعلق صوبہ دار کو صلاح دینے کا بھی اختیار ہے، مگر ہر اور میں وہ صوبہ دار کی مرضی کی تابع ہے۔ اگر مالی معاملات میں مجلس اور صوبہ دار کے خیالات کے درمیان مستقل اختلاف ہو تو معاملہ وزیر داخلہ کے سامنے پیش ہوتا ہے اور اس کا فیصلہ قطعی سمجھا جاتا ہے۔

(۲) دیہاتی اضلاع (گن)۔ ان میں ہر ایک میں ایک نائب صوبہ دار رہتا ہے، ۱۹۲۱ء کے بعد یہاں کی مجالس کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔

(۳) شہر (شہری)۔ جن شہروں کی آبادی تیس ہزار سے زیادہ ہے ان میں ایک ایک میئر ہوتا ہے۔ اس کے انتخاب کے لئے مجلس بلدیہ (جس کا انتخاب ہم سال کے لئے ہوتا ہے) تین نام وزیر داخلہ کے سامنے پیش کرتی ہے اور یہ وزیران میں سے ایک کا انتخاب کر کے تقرر کے لئے شہنشاہ کے سامنے پیش کرتا ہے، میئر بلدیہ اور مجلس بلدیہ کے اختیارات کلیتہً صوبہ دار اور وزیر داخلہ کی مرضی کے تابع ہیں۔ صوبہ کی طرح یہاں بھی ایک مجلس انتظامی ہوتی ہے۔

(۴) قصبوں اور گاؤں کے انتظامات کا طریقہ بھی اسی کے مثل ہے۔ ان میں

اعلیٰ عہدہ دار رکھیا ہوتا ہے۔ جس کا انتخاب مقامی مجالس کرتی ہیں لیکن اس کے تقرر کے لئے صوبہ دار کی منظوری لازمی ہے۔

مالیات کا دار و مدار حسب ذیل مدات پر ہے :-

- (۱) ابواب۔ اس کی دو صورتیں ہیں :- سرکاری محصول کے ساتھ زائد محصول کی وصولی۔ ان دونوں کی تحصیل بغیر وزیر داخلہ اور وزیر مالیات کے نہیں کی جاسکتی، گوچھ بڑے بڑے شہروں میں اس اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔
- (۲) سرکاری خزانے کی طرف سے امداد خصوصاً پولیس اور لازمی تعمیرات، متعدی امراض، شاہراہوں، آب رسانی اور زراعتی زمین کی ترقی کے اُسے میں دی جاتی ہے۔

(۳) قرضہ صرف اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب مقامی جماعت اس امر کی قرارداد منظور کرے اور وزیر داخلہ و وزیر مالیات بھی منظور کر لیں۔

ممالک متحدہ امریکہ

ممالک متحدہ امریکہ کی ہر ریاست میں مقامی حکومت کے اصول مختلف ہیں اور ان اصول کے تحت انتظامات میں بہت کچھ فرق پایا جاتا ہے۔ سب سے پہلے امریکن شپن کر لینا چاہئے کہ یہاں جو لفظ Fown یا Fownship استعمال ہوتا ہے اس سے مراد قصبہ نہیں بلکہ ویدہ ہے، اور اس کے برعکس لفظ City

۳۵ ہیرس، حسب بالا، باب ۱۵۔ ٹکرسٹ، حسب بالا، باب ۲۵۔ سٹرو، حسب بالا، باب ۲۵۔ ٹکرسٹ، "The State of Woodrow Wilson: The State" باب ۹۔

یا شہر میں بعض ایسے چھوٹے چھوٹے رقبے اور آبادیاں شامل ہوتی ہیں جنہیں بعض دوسرے ممالک میں گاؤں سے زیادہ وقعت نہیں دی جائے گی۔ ممتاز فرقوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مقامی حکومت کے اعتبار سے ریاستوں کو چار مجموعوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) نئے انگلستان کی ریاستیں۔ یہ سب شمال میں ہیں۔ یہاں کی مقامی حکومت کی اکائی دیمہ ہے اور صوبہ دراصل بہت سے دیہات کا مجموعہ ہے اور اسے نسبتہ کم اختیار حاصل ہوتا ہے۔

(۲) جنوبی ریاستیں:- یہاں کے صوبوں کے مقامی اختیارات نہایت درجہ وسیع ہیں۔

(۳) شمالی وسطی ریاستیں:- یہاں دیہات کو معینہ مقامی اختیارات حاصل ہیں۔ جو صوبہ جاتی اختیارات سے ممتاز ہیں۔

(۴) جنوبی وسطی ریاستیں:- یہاں دیہات صوبوں کے بالکل ماتحت ہیں اور حقیقت میں صوبوں کے اضلاع سے بہت زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

عام اصول:- بالکل حال کے زمانے تک انتخاب کے اصول کو بہت کچھ اہمیت دی جاتی تھی، یہاں تک کہ آج بھی علی العموم نخواستہ یا ب عمدہ داروں کا انتخاب ہوتا ہے۔ حق رائے وہی تقریباً ہر شخص کو جس کی عمر ۲۱ سال کی ہو حاصل ہے، مگر بعض ریاستوں میں محصول ادا کرنا اس حق کے لئے لازم قرار دیا گیا ہے۔ بعض دوسرے حدود بھی مقرر کئے گئے ہیں جیسے سکونت اور

میائے تعلیم (جس کے ذریعے سے جنوبی ریاستوں میں کالوں سے حق سلب کر لیا جاتا ہے)

اکثر مقامی ادارات میں ہدایت، مزاجہ اور حق برخواست مقامی مشوروں میں نظر آتا ہے۔

(۱) دیہہ - نئے انگلستان کے پرگنوں کا رقبہ علیٰ العموم ۲۰ سے ۳۰ مربع میل تک ہوتا ہے۔ یہاں مقامی حکومت کی اکائی یہی ہیں، درآئیکہ شمالی اور وسطی ریاستوں میں پچھن صوبوں کی قسمیں ہیں اور بالکل جنوب میں پرگنوں کا ذکر بھی نہیں سنئے ہیں۔

نئے انگلستان میں پرگنہ کے حصے میں تمام راستے (ہندے جمع ہوتے ہیں اور یہ اپنے عدد اور پرگنہ کے عمدہ داروں کو جنہیں "فنجین" کہتے ہیں، چننے میں یہ فنجین پرگنہ کے املاک، شرکوں اور نالیوں، بعض قسم کے جائزہ دار ہوتے ہیں اور چند چھوٹے چھوٹے دیہات میں حفظان صحت اور غربا کی نگرانی بھی انہیں کے سپرد ہوتی ہے۔

(۲) خصوصی اضلاع - حال کے زمانے میں خاص خاص مقامہ کے لئے مخصوص اضلاع بنائے گئے ہیں جیسے مدرسوں کے لئے، حفظان صحت کے لئے، موریوں، شرکوں، پانی اور زراعت کے شعبے، ان غلہ داروں کو تحصیل حاصل اور بعض مرتبہ بلدیوں کے سے کس اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔

(۳) شہر، ٹاؤنک متحدہ امریکہ میں شہر بننے کے لئے کسی بڑی آبادی کی ضرورت

نہیں ہے اور بعض جگہ دس ہزار سے کم آبادی کے مقامات شہر نہیں بن سکتے، بعض ریاستوں میں ۲۵۰ سے زیادہ کے مقامات بھی شہر کہلانے کے مستحق مہر جاتے ہیں۔ بعض شہر اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ان میں صوبہ کا صوبہ شامل ہوتا ہے۔ ایسے شہروں کی بہترین مثالیں نیویارک، سان فرانسسکو اور بالٹی مور ہیں۔ شہر ماحولی دیہہ سے بالکل جدا گانہ سمجھے جاتے ہیں، اگر انھیں صوبہ کا جزو قرار دیا جاتا ہے۔

بلدی انتظامات کے تین طریقے رائج ہیں :-

(الف) میر بلد اور مجلس بلدی کا طریقہ :- یہ طریقہ بڑے بڑے شہروں میں سے زیادہ تر میں رائج ہے۔ میر بلد عام طور پر دو سال کے لئے عوام انتخاب کے ذریعہ سے منتخب ہوتا ہے اور خواہ یا ب ہوتا ہے۔ یہ مجلس بلدیہ کے سامنے قواعد کی مندرجہ کرتا ہے اور اسے مشروط اقتدار کا حق بھی حاصل ہوتا ہے۔ مجلس بلدی کے اختیارات بتدریج کم ہوتے جا رہے ہیں، چنانچہ ذیلی مجلس کا تقرر بھی علی العموم صدر مجلس ہی کرنے لگا ہے۔

(ب) ماموریہ کا طریقہ :- اس طریق سے تمام مقننہ اور عاملانہ اختیارات ایک ہی مجموعے کے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔ عام طور پر ۵ مامور ۲ یا ۳ سال کے لئے مقرر ہوتے ہیں اور ان میں سے یہ مجلس ایک کو میر بلد منتخب کر لیتی ہے۔ باقی مامور ایک ایک صیفہ کا جائزہ دار ہوتا ہے۔

(ج) بلدی ناظم کا طریقہ :- یہ اس میں (ب) ہی کی ارتقائی شکل ہے۔ اس

میں مجلس یا اس کے ارکان کو عالمانہ اختیارات نہیں بلکہ صرف مباحثہ کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اس مجلس میں علی العموم ۵ ارکان ہوتے ہیں، ماحورو یا چار سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں۔ مجلس قواعد منظور کرتی ہے اور ایک ہدی ناظم کو مقرر کرتی ہے جس کے سپر انتظام ہدیہ کر دیا جاتا ہے۔

(۵) صوبہ ۱۔ ہر ریاست میں تقریباً ۱۰ سے ۲۵ تک صوبے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے انتظام کے لئے ایک "مجلس صوبہ" ہوتی ہے اس کے ارکان علی العموم ۲ سے ۴ سال تک کے لئے منتخب ہوتے ہیں اور ارکان کو معاوضہ ملتا ہے۔ تقریباً ہر عالمانہ عہدہ دار کا عام انتخاب مختصر زمانے کے لئے ہوتا ہے اور جو اختیارات ہیں وہ زیادہ تر عادلانہ ہیں یا بحیثیت عمیل حکومت کے ہیں۔

مالیات (۱) عام محصول اٹاک۔ یہ اٹاک کی قیمت پر لگایا جاتا ہے۔ زیادہ تر اسی محصول پر دارو مدار ہوتا ہے۔

(۲) ذاتی محصول، پیشوں پر محصول، اجاروں پر محصول۔

(۳) ریاستی حکومت سے امداد۔ یہ نہایت کم ہوتی ہے اور جو ہوتی ہے وہ زیادہ تر تعلیم کے لئے ہوتی ہے۔

(۴) قرضہ۔ لیکن مقامی حکومتوں کو قرضہ لینے کے بہت کم اختیارات ہوتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ علاوہ اس تحدید کے باقی امور موقوفہ میں مقامی ادارات تقریباً آزاد ہیں۔

تعلیم کا انتظام براہ راست مقامی ادارات کے نگرانی میں نہیں بلکہ تقریباً ہر جگہ تعلیم کے انتظام کے لئے جداگانہ مجالس مقرر کی جاتی ہیں۔

ہندوستان

مقامی حکومت: (۱) شہری (۲) دیہی۔

دیہی ادارات:-

(۱) گاؤں۔ یہ ہندوستانی نظم کی قدیم ترین اکائی ہے، اور گواضلاع کے مستقروں میں حالتوں اور عہدہ داروں کے اجتماع کی وجہ سے اس کی اہمیت کم ہو گئی ہے، تاہم اس وقت بھی اسے کافی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے عہدہ دار پنچ (جو تین یا پانچ ہوتے ہیں) سر پنچ یا کھیا، پٹواری (دیہاتی ٹیل) اور چوکیدار (یا پولیس ٹیل) ہوتے ہیں جس میں سے پنچ یا سر پنچ بلاخواہ کے ہوتے ہیں اور پٹواری اور چوکیدار کو سرکاری طرف سے بھی کچھ خواہ ملتی ہے اور گاؤں والے بھی بہت توفیر کچھ دیتے ہیں۔

شاہ و بہادر جی: ”ہندوستانی بلدیات کا دستور“ نصاب اور الیات“

Shah and Bahadurjee: Constitution, functions and finances of India Municipalities.

مکرجی، حسب بالا، باب ۲۰۔ رستم و شرا، حسب بالا، باب ۱۰۔ گلکرسٹ، حسب بالا، باب ۲۳۔

دیکھو ہندوستانی سالنامہ *Indian Year Book* ۳۹-۱۹۳۸ء

۳۷۵ تا ۳۷۶

حال ہی میں قدیم باضابطہ پنچایت کے طریقے کا احیاء خصوصاً پنجاب میں اور ان صوبوں میں جہاں رعیت داری طرز رائج ہے، کیا گیا ہے، اور بعض انتظامی اور چھوٹے چھوٹے عدالتی امور منتخب شدہ پنچوں کے سپرد کرنے کے گئے ہیں۔

(۲) گاؤں کے مجموعے - یہ زیادہ تر ہنگامہ میں نظر آتے ہیں۔ اختیارات اور طرز کار تقریباً وہی ہے جو گاؤں میں۔ خیال ہے کہ بالآخر ان مجسٹریٹوں کے سپرد گاؤں کی حفاظت، سڑکیں، پانی کا انتظام، حفظانِ صحت، ابتدائی مدارس وغیرہ کر دئے جائیں گے۔

(۳) لوکل بورڈ - اس کا حلقہ عام طور پر ایک تحصیل یا تعلقہ ہوتا ہے اور اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ ڈسٹرکٹ بورڈ ہوتا ہے جو اپنی صوابدید پر لوکل بورڈ کی مالی مدد کرتا ہے۔ لوکل بورڈ خود اپنا صدر منتخب کرتا ہے۔

(۴) ڈسٹرکٹ بورڈ - اس میں منتخب شدہ اور نامزد کردہ دونوں قسم کے ارکان رہتے ہیں لیکن اب منتخب شدہ ارکان کی اکثریت ہوتی ہے اور سرکاری ارکان تقریباً انصیدی سے زیادہ نہیں ہوتے۔ رکنیت کے لئے ذاتی اور مالی حیثیت کی وقعت ہے۔ پہلے صاحبِ مناع صدر ہوتا تھا لیکن اب تقریباً ہر جگہ صدر منتخب شدہ ہوتا ہے۔ بورڈ کے سپرد حسب ذیل امور

۱۷ صوبہ جات متحدہ کے پرگئے، جو مختلف دینیت و قہبات کے مجموعے ہوتے ہیں، صرف جنرالی انتظامات اور دیہی حسابات کی کیسائی کے لئے ہوتے ہیں۔

ہوتے ہیں :- حفظانِ صحت، موریوں، امور عامہ مثلاً بازار، چھچک، کامیکہ، مختلف مقامات میں درخانوں کا قیام، تحفظِ ذروں کا انتظام، تعلیم خصوصاً ابتدائی تعلیم۔

مالیات کا دار و مدار حسب ذیل مدات پر ہے :-

(۱) ارباب جس کی مقدار مالگداری پر تقریباً ۱۰ فیصدی ہے۔ (۲) سڑکوں کے محاصل۔ (۳) کانچی میس اور گھاٹوں کی آمدنی (۴) صوبہ دار حکومتوں کی طرف سے مدد۔

بلدی ادارات :- برطانوی ہند میں تقریباً ۸۰۰ بلدیات ہیں جن میں سے تقریباً ۵۰ کی آبادی ۵۰ ہزار سے کم ہے۔

(۱) معمولی بلدیات :- مجلسِ بلدیہ کے اکثر ارکان منتخب شدہ اور کمتر نامزد کردہ ہوتے ہیں نامزدگی عام طور پر قلیتوں کی نیابت کے لئے یا ایسے لوگوں کے تقرر کے لئے عمل میں آتی ہے جو باوجود قابلیت کے منتخب نہ ہو سکے ہوں تقریباً ۷ فیصد ارکان محض اپنے عہدہ کی وجہ سے رکن ہوتے ہیں۔ قواعد و ضوابط کے ذریعہ کا تعین صوبہ داری حکومتیں کرتی ہیں۔

عام طور پر مجلسِ بلدیہ کے ارکان تین سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں اور وہ خود اپنے میں سے صدر اور نائب صدر کا انتخاب کرتے ہیں۔ صوبہ داری حکومت کسی بلدیہ کو بد انتظامی، اختیارات کے پجا استعمال یا فرائض کی عدم پابندی کی وجہ سے معطل کر سکتی ہے۔ تمام کارروائیوں کی نقول ہمیشہ صاحبِ ضلع کے پاس روانہ کرنا ضروری ہے۔

ان کے اختیارات میں حسب ذیل شامل ہیں:- سڑکیں اور راستے، آتشزدگی سے بچاؤ، متعدی بیماریوں سے بچاؤ، ٹیکہ، حفظانِ صحت، موریائیں اور نالیائیں، شفا خانے، دوا خانے، دائیروں کی تعلیم، تفریح گاہیں، دھوبی گھاٹ، روشنی کا انتظام، آمدورفت کی سہولتیں، قبرستان اور مرگھٹ، تعلیم (جس میں وسطانی اور کلیاتی تعلیم بھی شامل ہے)، کتب خانے۔

مالیات کا دار و مدار حسب ذیل الواب پر ہے۔

چنگی، گھاٹوں، پلوں اور سڑکوں پر محصول، محصولِ اکمنہ، روشنی اور صفائی کے محاصل، گاڑیوں اور جانوروں کے اجارے، خانگی بازار۔

(۲) بلدی کارپوریشن:- مثلاً کلکتہ، بمبئی، مدراس۔ اس میں سے کلکتہ کا نمونہ بطور مثال کے پیش کیا جاسکتا ہے۔

(الف) مجلس کارپوریشن:- ۸۵ ارکان ہیں جن میں سے ۵، منتخب شدہ اور ۸۰ نامزد کردہ ہیں یہ سب مل کر ڈالڈین کا انتخاب کرتے ہیں۔ ۵، منتخب شدہ ارکان مسلم یا غیر مسلم طبقات کی طرف سے منتخب ہوتے ہیں اور عورتوں کو بھی حق رائے دہی حاصل ہے۔ حال ہی میں قاعدہ رائج ہوا ہے کہ بجائے علیحدہ علیحدہ انتخاب کے مسلم اور غیر مسلم دونوں کا انتخاب سب رائے دہندے مل کر کریں لیکن مسلم اور غیر مسلم نشستیں محفوظ رکھی گئی ہیں۔

(ب) مجلسِ خصمیر اپنے میر بلڈ، نائب میر بلڈ، عالمانہ عہدہ دار اور نائب عالمانہ

عہدہ دار کا انتخاب کرتی ہے۔ ان میں سے اول الذکر دو عہدہ دار ارکان میں سے اور ثانی الذکر دو عہدہ دار باہر سے منتخب کئے جاتے ہیں۔ عملاً عہدہ دار کے انتخاب کے لئے صوبہ واری حکومت کی رضامندی لازمی ہوتی ہے۔

(ج) مالیات کا دار و مدار تقریباً انھیں ملات پر ہے جن پر ہدایات کے مالیات کا دار و مدار ہوتا ہے۔

بعض بڑے بڑے ہدایات اور تنصیات (مثلاً بمبئی، کلکتہ، مدراس، حیدرآباد، کھنڈ وغیرہ) میں مجلس آرائش بلکہ قائم کی گئی ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ شہر کو زیادہ بہتر بنائیں اور نہ صرف امیروں کے قیام کی سہولتیں پیدا کریں بلکہ عمارتوں، صفائی، ہوا، پانی وغیرہ کے انتظامات ایسے کریں کہ غربا کی بھی حالت درست ہو جائے۔

چھاؤنیوں کی مجلس۔ ایسے مقامات کے انتظام کے لئے جہاں انگریزی انواع کی چھاؤنیاں ہیں (جیسے سکندر آباد) وہیں مقامی مجلس قائم ہیں لیکن ان کی صدارت کوئی سرکاری عہدہ دار کرتا ہے اور آخری اختیارات

محکمہ فوج کو حاصل ہوتے ہیں۔

16 University of Agriculture
16 University of Agriculture
16 University of Agriculture

باب ۲۰

توالج

توالج کی وجہ وجود۔ آئینہ کی ماہیت۔ طرز کار۔ تابع کی مخالفت۔ نوآبادیاں۔ نوآبادیوں

کی تاریخ۔ انگلستان، ہندوستان، موجودہ طرز کار۔

توالج کی وجہ وجود۔ اس سے قبل جن سیاسی ادارات کا ذکر کیا گیا ہے وہ ایسے ادارات تھے جن کے ذریعے سے کسی آزاد ملک پر حکومت کی جاتی ہے لیکن جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے جو صلہ مند اور جانناز مالک کا ہمیشہ قاعدہ رہا ہے کہ اپنی ملک و در صرف اپنے ہی ملک تک محدود نہیں رکھتے بلکہ دوسرے ملک پر بھی سیاسی یا معاشی اثرات قائم کر لیتے ہیں۔ یہ اثرات دو طرح کے ہوتے ہیں بعض مرتبہ تو ایسا ہوتا ہے کہ کسی ملک کو بظاہر آزاد رہنے دیا جائے لیکن عہد ناموں کے ذریعے سے اسے شکنجے میں کس لیا جائے اور بعض مرتبہ اس ملک کو بالکل تابع بنا دیا جاتا ہے۔ ایک تیسرا طریقہ یہ ہے کہ جب طاقتور ممالک کی آبادی میں اضافہ ہو یا اسے خام پیداوار کی ضرورت ہو یا کسی دوسرے حصہ دنیا پر سیاسی اثر قائم کرنے کی خواہش ہو تو وہ صرف دوسرے ملک پر اثر قائم کرنا یا حکومت کرنا کافی نہیں سمجھتا بلکہ دلوں اپنی فالتوا آبادی کو بھیج کر نوآبادی قائم کر لیتا ہے جو اس دوسرے ملک

میں اپنے مادری ملک کا گویا نمونہ قائم کر لیتی ہے اور اپنے وطنی اصول زندگی کا دہاں چربہ تار لیتی ہے۔ سلطنت قائم کرنے کا یہ طریقہ ہر زمانہ میں مختلف صورتوں سے قائم رہا ہے۔ مدت دراز تک یہ ایشیائی ممالک کا دتیرہ رہا اور اب یورپی ممالک نے اسے اپنا بنا لیا ہے۔ کسی زمانے میں تو یہ ہوتا تھا کہ آباد کاری صدیوں چند افراد کے ذریعے سے نہیں کی جاتی تھی بلکہ قوم کا بیشتر حصہ وطنی ملک کو چھوڑ کر نئے ملک میں چلا جاتا تھا اور اسی کو اپنا وطن بنا لیتا تھا۔ اس کی مثالیں تقریباً ہر براعظم میں ملیں گی۔ چینیوں کا ایران کے بعد منچوزوں کا مشرقی ایشیا میں پھیلاؤ، یونانیوں کی سواہل ایشیا کے کوچک پر آباد کاری، عربوں کی عراق، مصر اور اندلس میں آباد کاری، ہندوستانیوں کا جزائر جاوا، سائرہ، اور جزائر شرق الہند کا استعمار، فرنگیوں کا فرانس میں جرمنوں کا بلجئیم کے کئیں سے، تاتاریوں کا جنوبی روس میں اور قوطیوں کا جنوبی یورپ میں انتشار اور حال ہی کے زمانے میں ہندو قوم کا جنوبی افریقہ میں بس جانا، یہ سب اسی قسم کی قومی آباد کاری کی مثالیں ہیں۔ ان میں بعض کی آباد کاری معاشی اسباب کی بنا پر ہوئی تھی، یعنی جب کسی قوم کو اپنے وطن میں کھانے کی تنگی ہوئی تو اکثر افراد نے اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر دوسرا وطن اختیار کر لیا۔

آباد کاری کے اسباب تو اکثر معاشی ہی ہوتے ہیں، لیکن ہر جگہ یہ ضروری نہیں کہ سامان خوردنوش ہی کی کمی ہو۔ کون کدہ سکتا ہے کہ جب رومنوں نے اپنی نوآبادیاں مشرق، مغرب، شمال و جنوب میں قائم تھیں تو روما

میں سامان خورد و نوش کی تنگی تھی ؟ یا اس وقت جرمنی اور اٹلی جو ملحقہ اثر میں وسعت پیدا کر لے کی کوشش کر رہے ہیں اور انگلستان اور فرانس اپنی اپنی سلطنت کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو کیا یہ ممالک مرفہ الحالی کے صف اول میں نہیں ہیں ؟ لیکن غور کیا جائے تو ان مثالوں اور عمومی ترک وطن کے اسباب دونوں میں ایک طرح کی مماثلت پائی جاتی ہے ۔ استعماری ملکوں میں یقیناً سامان خورد و نوش کی تنگی نہیں ہے ، بلکہ ہمارے اعتبار سے بحد افراط ہے ، لیکن یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ معیار زندگی جسے وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں موجودہ معیار سے بھی اعلیٰ ہے اور اس کے لئے جس خام پیداوار کی ضرورت ہے وہ ملک میں بہا نہیں ہو سکتی ، چنانچہ یا تو آباد ممالک کو وہ کسی نہ کسی حد تک اپنے تابع کی کوشش کر رہے ہیں ورنہ اپنی زائد آبادی غیر آباد ممالک میں یا ایسے ممالک میں بھیج رہے ہیں جہاں کی آبادی آسانی سے قابو میں آ سکتی ہو ۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی طاقتور ملک اپنے دور افتادہ جنسوں سلطنت کے راستوں میں جو ممالک ہیں انھیں محض اپنی فائنت قائم رکھنے کے لئے اپنا تابع کرنا چاہے ۔ اسی اصول پر انگلستان نے جبل الطارق ، مالٹا ، نہر سوئس اور عدن پر قبضہ کیا ہے ۔

انتباہ کی اہمیت ۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ تابع بنانے کے لئے صرف اثری کافی نہیں بلکہ سچی تفوق ضروری ہے ۔ آج کل کے چھبڑے تمدن میں تقریباً ہر ملک ہر دوسرے ملک کا کسی نہ کسی طرح سے زیر اثر ہے ، لیکن یہ نہیں کہ اس سے انتباہ لازم ہو جاتا ہو ۔ اگر کسی ملک کا کسی دوسرے ملک پر

محض اثر ہو تو جب کبھی وہ دوسرا ملک اس قابل ہو جائے گا کہ اس اثر سے اپنے آپ کو آزاد کر سکے تو وہ فوراً آزاد کر لے گا۔ لیکن تابع کی نوعیت دوسری ہوتی ہے۔ اتباع کے معنی یہی ہیں کہ تابع کا طرز عمل جداگانہ نہ ہو بلکہ اسے قبوع کے طرز عمل کی ہی پیروی کرنا پڑے۔ اس صورت حال کے پیدا کرنے میں جبر کا عنصر لازمی ہے ورنہ کون ایسا ملک ہوگا جو بغیر کسی نہ کسی طرح سے مجبور کئے ہوئے اپنی قسمت کی باگ دوسروں کے قبضے میں دیدے۔ انسان سے انسان جو خدمت لینا چاہتا ہے اس کے دو طریقے ہیں یا تو جبر کر کے، ورنہ جس سے خدمت لینا چاہتا ہے اسے اپنا بنا کر ایک طاقتور شخص کے لئے (اگر اس کی طاقت ناقابل مدافعت ہو تو) سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ جس سے خدمت لینا چاہے اسے خدمت کے لئے مجبور کرے۔ بخشمیہ ہی حالت اقوام کی ہے۔ اکثر مملکتیں دوسرے رقبہ جات پر ابتدا میں جبراً قبضہ کرتی ہیں، اور گویا اپنے زمانے کا فاتح اپنی نیکی تلوار پر ہی حکمرانی کے حق کا دار و مدار رکھتا تھا لیکن آج کل جب کوئی طاقتور مملکت کسی کمزور پر قبضہ کرنا چاہتی ہے تو اس کے مدبر بڑے دل بھانے والے الفاظ میں اخلاق پر کچھ دیتے ہیں اور دنیا کو یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہم جو قبضہ کر رہے ہیں اسے مفاد کی خاطر نہیں بلکہ کمزور آبادی کے مفاد کے خاطر کر رہے ہیں۔ آج کل کی فتوحات اور آباد کاری کا یہ پیرایہ بنایت دلچسپ ہے۔ جاپان کہتا ہے کہ میں منچوریا اور چین کو اپنے تصرف میں صرف منچوؤں اور چینوں کے خاطر لانا چاہتا ہوں، اٹلی، اطالیہ، جتیش اور البانیہ پر صرف اطالیوں

جشنوں، البانیوں کے فائدہ کے لئے قبضہ کرتا ہے، بلجیم کے قول کے مطابق کوئٹو پر قبضہ کرنے کا واحد منشا یہی تھا کہ کوئٹو والوں کو ستمدن بنایا جائے۔ یہ عجیب بات یہ ہے کہ بعض نہایت سنجیدہ علماء سیاسیات بھی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ کسی ملک کی کسی ملک پر قبضہ کرنے کی بنیاد اخلاقی ہوتی ہے بشمول عالمِ دکنستان، ڈچی کاٹ انجلیٹو کہتا کہ "بلاشبہ ایک قوم کی دوسری قوم پر سیادت کا نہیں ہمارے اخلاقی شعور کے خلاف جاتا ہے، لیکن اگر یہ خیال کیا جائے کہ اس سیادت میں کوئی اخلاقی عنصر نہ ہوتا ہے جس کے اعتبار سے طاقتور کا فرض ہو کہ کمزور کی خدمت کیسے تو پھر اس لوٹ کی سیادت حق بجانب ہوگی بشرطیکہ اس سیادت کا واحد مقصد ایمانداروں کے ساتھ اس اصول کا اتنا ہا جو یہ پہنائی کسی غرور یا ثنوت یا تلقین پر ہی نہ ہوئی چاہئے کہ کسی ایسی خواہش پر جس کا مقصد دوسروں سے فائدہ اٹھانا ہو بلکہ اس کی بنیاد محض احساسِ فرض شناسی ہونا چاہئے۔" معلوم نہیں فاضل مولف کے پیش نظر کس ملک کی سیادت اور کس ملک کا مفاد ہے!

۱۱۔ افزائیدہ پروپریٹاریوں کے بتدریج قبضے کے حالات کے لئے دیکھو جون "شہنشاہیت اور سیاسیات" نام: *Imperialism & World Politics*. باب ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶،

لیکن یہ امر یقینی ہے کہ یہی وہ خیال ہے جسے عرب عام میں ”سفید فاموں کا بار“ کہا جاتا ہے اور جس کے تحت بیان کیا جاتا ہے کہ سفید فام لوگوں پر اس کا بڑا بوجھ ہے کہ وہ بھورے، کالے، زرد اور سرخ باشندوں کو قهر مذلت سے نکال کر تمدن بنائیں۔ انجیلینو خود ایک آباد کار ملک یعنی ولندستان کا باشندہ ہے اور اس مقولے کے چند ہی صفحے بعد وہ ایک دوسرا اصول مثال کے طور پر پیش کرتا ہے جس کا بعض مرتبہ اعادہ کیا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ”جادو جیسے ملک سے اگر ولندیزی فوراً عمل گئے تو ہزاروں لاکھوں جادوی ایک دوسرے کو ہلاک کر دیں گے، چنانچہ سیاسی اختیارات حاصل کرنے کا بہترین طریقہ وہی ہے جو نوآبادی کی حکومت اختیار کر رہی ہے جس کے ذریعے سے ایک طرف تو ملک میں امن و امان کو دوسری طرف نوآبادی والوں کو خود اپنی حفاظت کرنے کا سبق دیا جاتا ہے۔“ دراصل یہ اعادہ اسی اصول کی ایک شاخ ہے کہ دوسرے ملک پر جو حکومت کی جاتی ہے وہ حاکم ملک کے فائدے کے لئے نہیں بلکہ محکوم ملک کے مفاد کے غرض سے ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں اس مسئلے پر بحث کی گنجائش نہیں ہے کہ آیا کوئی ملک کلیتہً تابع ملک کی خاطر اس پر حکمرانی کر سکتا ہے یا نہیں، اس لئے کہ اس کا تعلق سیاسیات سے نہیں بلکہ اخلاق سے ہے۔ سیاسیات ادسط اخلاق کے انسانوں اور ادسط اخلاق والے ملکوں پر بحث کرتا ہے۔ ایسے انسانوں کا وجود ممکن ہے

جن کے اخلاق غیر معمولی طور پر ارتق و اعلى ہوں اور جو اپنے عادات و اطوار میں اپنا نہیں بلکہ صرف دوسروں کا خیال رکھتے ہوں۔ اسی طرح ایسے ممالک کے وجود کا شاید امکان ہو جو محض دوسرے ملکوں کی خاطر ان ملکوں پر حکومت کرتے ہوں اور اپنے مفاد کا خیال نہ کرتے ہوں۔ لیکن عموماً ایسے اشخاص کتنے ہوں گے، اور ایسا ملک تو کوئی نظر نہیں آتا جو اکثر انجینیئروں کے معیار پر ٹھیک اترتا ہو۔

استعماری طرز کار۔ اس کے برعکس حقیقت تو یہ ہے کہ آج کل کے ممالک اپنے بحری مورچوں کی تعمیر اور زائد آبادی کے دگان اور خام پیداوار کے لئے دوسرے ممالک پر قابو حاصل کرنے کے واسطے طرح طرح کے طریقے اختیار کر رہے ہیں۔ پروفیسر سچک نے میریوٹی کی رائے سے اتفاق کر کے اپنی مشہور آفاقی کتاب ”سیاسیات“ میں اس کی کتاب کا ایک اقتباس دیا ہے کہ ”متقدم انسان نے جو تعلقات وحشیوں سے قائم کئے ہیں ان کی تفسیر کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں ہمیت اور کمزور ذریعہ صاف نظر آئے گا“ اور خود سچک اس پر لکھتے ہیں کہ ”تاریخ حالیہ“ کا یہ باب سب سے دردمند و آہستہ آہستہ سے ہے۔ یہ بالکل نظری امر ہے کہ طاقتور مملکت اس علاقے کے باشندوں کے ساتھ

سچک: ”مبادی سیاسیات“ Sidgwick: Elements of
 Political Science. باب ۸، فصل ۸، جہاں میریوٹی کی کتاب ”آبادی“
 Meuvale: Colonization. کا اقتباس دیا ہے۔
 یہ ایضاً۔

جنہیں وہ اپنی حکوم بنانا چاہتی ہے، یا تو سختی کا در نہ ترغیب کا برتاؤ کرے گا۔ ایسے تو بہت کم خط جاسد دنیا میں رہا رہ گئے ہیں جو غیر آباد ہوں اور کسی کے ماتحت ہوں اور میں بھی تو وہ اغنیا بے کار ہوں گے یا ان کی آباد کاری کسی نہ کسی وجہ سے دقت طلب ہوگی۔ خود امریکہ دریا نٹ ہوا تھا تو وہاں کے کم سے کم وسطی حصے میں دو عظیم الشان سلطنتیں، یعنی میگزیکو اور پیرو کی سلطنتیں قائم تھیں جنہیں ہسپانوی مسندوں نے نہایت ظلم و ستم کے ساتھ ختم کیا۔ اگر جس ملک کو زیر کرنا ہے وہ کسی دوسری طاقتور مملکت کا مقبوضہ ہے تو اس سے یہاں بحث ہی نہیں، اس لئے کہ وہاں تو گویا براہ کی چوٹ ہے، اور جنگ کا جو نتیجہ ہوگا اس کے مطابق معاملہ طے پائے گا۔ سوال تو اس حصہ دنیا کا ہے کہ جہاں برابری کا سوال نہیں بلکہ جہاں کے باشندے نوجی قوت یا تمدن میں پست ہیں۔ وہ ملک آباد ہے تو ایسی حالت میں وہاں کے باشندے اپنی آزادی قائم رکھنے کے لئے حتی الامکان مدافعت کریں گے، خصوصاً ایسی حالت میں جب غالب ملک وہاں اپنی نوآبادی قائم کرنا چاہے گا اور نہ صرف روپیہ بلکہ مزدوروں کو بھی وہاں آباد کرے گا۔ اگر ملک گنجان طور پر آباد ہے تو نوآبادی قائم کرنے میں اور بھی زیادہ دقت پیش آئے گی، اور رفتہ رفتہ وہاں کی اصلی آبادی کے لئے ”محفوظات“ قائم کرنے پڑیں گے اور اصلی باشندوں کو سمجھانے کے لئے ایک طرف تو نوآباد کاروں سے یہ کہا جائیگا کہ تم محفوظات میں آزادی سے آباد نہیں ہو سکتے اور دوسری طرف اصلی باشندوں کو محفوظات سے باہر زمین حاصل کرنے اور آباد ہونے کی ممانعت

کر دی جائے گی۔ بظاہر یہ طرز عمل انصاف پر مبنی معلوم ہوتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں کہیں بھی اس قسم کے محفوظات ہیں وہاں ”مخصوص“ رقبے نہایت کم ہیں اور ”غیر مخصوص“ رقبے جو آبادکاروں کے لئے بالکل کھلے ہوئے ہیں، بہت زیادہ ہیں۔ دوسرے ”غیر مخصوص“ رقبوں میں اصل باشندوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا اور انھیں لیکہ ”مخصوصات“ آبادکاروں کے بھی زیر اقتدار ہوتے ہیں۔

توابع کی مخالفت۔ بہر حال آبادکار ملک کو شدید مخالفت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ بعض مرتبہ نوآبادکار ملک مخالفت کی پردہ نہیں کرتا اور سختی سے پست تر ملک کو کھل دیتا ہے، جیسے حال ہی میں اٹلی نے ملک حبشہ میں کسی قاعدے یا قانون انسانیت کی پردہ نہیں کی اور ہر طرح کا ظلم و ستم کر کے مخالفت کا خاتمہ کر دیا۔ کہیں اکثر یہ ہوتا ہے کہ ملک جو دوسرے ملک کو اپنا زیر نگین کرنا چاہتا ہے، ترکیبوں سے کام لیتا ہے، اصل باشندوں میں دو فریق دیکھ کر یا فریق بندی کر اگر اپنے آپ کو ایک فریق کا دوست بناتا ہے اور اس سے مراعات حاصل کر کے اپنا تفوق بڑھاتا ہے، یہاں تک کہ وہ ملک پر تسلط ہو جاتا ہے۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملک میں اصل باشندوں کی حکومت، قواعد و قوانین حسب حال

سے ایزت، جنوبی افریقہ میں اسیوں کے بابت حکمت علی "Evano Native Policy in South Africa."

چھوڑ دئے جاتے ہیں اور محض فوجی یا بحری تفویض کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ نیز جیسا اور پرکھا گیا ہے، بعض مرتبہ رعایا کو یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ سیاسی تبدیلی کی وجہ یہ ہے کہ مقتدر ملک مفتوح ملک میں امن و امان قائم کرنا چاہتا ہے اور اسی کے مفاد کے غرض سے اس پر حکومت کرنے کا خواہاں ہے۔ ان اصول کو مد نظر رکھ کر ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مختلف ممالک مختلف طریقوں سے دوسرے ممالک کو اپنا تابع بناتے ہیں۔ سب سے پہلے شانہ سب سے سادہ طریقہ فتح کا ہے جس کے بعد فاتح قوم مفتوح ملک میں اپنی چھان بنائیتی ہے، اس کی مثالیں منجور یا کے قبضہ چین، عربوں کے قبضہ عراق و شام اور روم کے قبضہ اٹلی و دیگر اقطاع سلطنت روم سے ملتی ہے۔ ان میں سے بعض ممالک پر قبضہ امن کے ساتھ ہوا اور بعض پر بزور شمشیر کیا گیا۔ روم کی نوآبادیوں سے دونوں طریقوں کا اظہار ہوتا ہے، اس لئے کہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کسی ملک کا ایک حصہ بزور شمشیر کر لیا گیا اور اس کے بعد اندرون ملک میں نفوذ کی غرض سے نوآبادیاں قائم کر دی گئیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دو ملکوں کے درمیان لڑائی ہوئی اور ایک ملک نے دوسرے ملک کو اپنی سلطنت کا ایک حصہ دینے پر مجبور کیا۔ کنکڑا اسی طرح سے انگریزوں کے قبضہ میں اور بندرگاہ آرتھر اسی طرح سے جاپانوں کے قبضہ میں آیا۔ آج کل کے زمانے میں اکثر و بیشتر حصص دنیا پر کسی نہ کسی طاقتور ملک کا پرچم لہراتا ہے، اور شکل معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ملک کسی حصہ پر بغیر لڑائی کے قبضہ کرے گا۔ لیکن ہمیشہ ایسا نہیں تھا۔ (حاشیہ صفحہ ۴۸۹ پر)

چنانچہ حال ہی کے زمانے میں ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۰ء تک یورپی ملکوں کا، اُن حصص افریقہ پر جو اس وقت تک خالی تھے، بغیر جنگ ہی کے قبضہ ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ یورپی ممالک جرمنی، فرانس، انگلستان وغیرہ نے آپس میں عہد نامے کر کے تمام ایسے رقبات کو جو کسی متمدن ملک کے دست نگر نہ تھے، آپس میں تقسیم کر لیا۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی ملک کسی دوسری ملک سے حصہ خریدے، جس کی بہترین مثالیں ممالک متحدہ امریکہ کی روس سے الاسکا کی، اور ڈنمارک سے جزائر جزائر ڈنمیرہ کی خریداری میں ملتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خریداری کی بجائے کوئی حصہ ملک پٹہ پر لے لیا جائے جیسے ساحل چین کے بعض بندرگاہ ۱۹۰۹ء و ۱۹۱۰ء سال کے پٹہ پر فرانس، ہنگال، جاپان کے سپرد کر دئے گئے ہیں۔ آخر میں ”محفوظوں کا ذکر باقی ہے۔ یہ وہ ریاستیں ہیں جو کمزور ہوتے ہوئے اس درجہ پر پہنچ گئی ہیں کہ صاحب تلفیق سلطنت اُن کے خارجی امور کھینٹ اپنی نگرانی میں کر لیتی ہے اور داخلی امور پر بھی اس کے ریڈیٹس یا قائم مقام کا کافی طور پر اثر پڑتا ہے۔

نوآبادیاں۔ ظاہر ہے کہ ان سب سے زیادہ مستحکم قبضہ نوآبادیوں کے ذریعے سے ہوتا ہے اس لئے کہ حضرات اندرونی بغاوت یا خلفشار

سے اس کے علاوہ ایک اور بھی طریقہ ہے۔ یعنی محض دھکی کے ذریعے سے کمزور ملک کو اپنا تابع ہونے پر مجبور کرنا۔ حال میں اسکا نظارہ جرمنی کے قبضہ چچو سلوانا کی شکل میں ہوا۔

۱ ایک غیر آبادی کے قبضہ کی وجہ سے ہوتے ہیں وہ علی العموم نوآبادی میں نہیں ہوتے، اس لئے کہ نوآبادی والے خود اپنے ہی قوم کے ہوتے ہیں۔ بلاشبہ ایسے واقعات جیسے امریکی نوآبادیوں کی بغاوت اور آزادی بھی پیش آتے ہیں لیکن ایسے واقعات نسبتاً کم ہی ہوتے ہیں۔ نوآبادیاں کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ اگر ہم نوآبادیوں کی تاریخ پر غور کریں تو سب سے پہلے تو ہم فنیقیہ کی محض تجارتی نوآبادیاں مٹی ہیں، جن سے مراد زیادہ تر یہ بھی کہ جگہ جگہ تجارتی کوٹھیاں بنادی جائیں تاکہ تجارت میں آسانی ہو۔ یونانیوں کی نوآبادیاں اپنی مادری مملکت سے بالکل آزاد ہوتی تھیں اور ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ جن شہریوں کو وطن میں روٹی مشکل سے ملتی تھی وہ مشرقی یا مغربی ممالک میں جا کر دلوں زراعت کریں اور اپنی تہذیب و تمدن کی گویا چوکیاں قائم کریں۔ رومانیوں نے جو نوآبادیاں قائم کیں انھیں اپنا تابع رکھا، لیکن اکثر نوآبادیوں کو اندرونی انتظامات کے اختیارات دیدئے۔ عربوں نے اپنی نوآبادیوں کا ایک سلسلہ مشرق سے مغرب تک قائم کیا، لیکن اس کی بنیادیں پر نہ بھی بلکہ تمدن پر تھی، اور رفتہ رفتہ ایسی کیفیت پیدا ہو گئی کہ عربی لوگ تہذیب و تمدن میں عربوں سے بھی آگے نکل گئے، چنانچہ تاریخ اسلام میں بہت سے ایرانی، ترک، مغول، بربر اور حبشی عربوں کے دوش بدوش ہی نہیں بلکہ تمدن کی دڑ میں ان سے کہیں آگے نظر آتے ہیں۔

نوآبادیوں کی تاریخ۔ اگر یونان دردناک کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ دول یورپ نے نسبتاً حال ہی کے زمانے میں آباد کاری شروع کی ہے۔ اسپین اور پرتگال میدان میں ان سب سے پہلے آئے۔ ان کا مقصد ابتدا میں

زیادہ تر تبلیغ عیسویت تھا، لیکن اس پر دسے میں انھوں نے ایشیا، افریقہ اور امریکہ میں بڑی بڑی زیادتیاں کیں اور ایک وسیع رقبے پر اپنی دنیوی سلطنت قائم کئی، یہاں تک کہ ۱۴۹۲ء میں پوپ الکزانڈر ششم نے تمام نئی دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر کے مشرقی حصہ (جن میں برازیل ہے) پرتگال کو اور مغربی حصہ (جس میں تمام وسطی اور جنوبی امریکہ ہے) اسپین کے مندر کردے۔ اسپین اور پرتگال کے بعد ولندستان میدان میں آتا ہے اور ولندیزی شرکت شرق البند کے ذریعے سے اپنی نوآبادیاں جزائر شرق البند، جنوبی افریقہ اور ہندوستان کے ساحل پر قائم کر لیتا ہے۔ یہ شرکت ۱۶۰۰ء تک قائم رہی اور اس سنہ میں یہ سب نوآبادیاں ولندستان کی ملک ہو گئیں۔ ۱۶۰۰ء میں انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی اور ۱۶۰۲ء میں فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی بنیں اور ۱۶۰۰ء میں ورجینا کمپنی کے ذریعے سے انگریزوں نے امریکہ کی آباد کاری شروع کر دی۔ ان فرض زمانہ حال کی مملکتوں میں سے انگلستان نے تقریباً سب کے بعد آباد کاری شروع کی، لیکن تغریق اور سلطنت کی دہریں سب کو ہرا دیا۔

انگلستان۔ انگلستان کی سلطنت میں بہت کچھ بدرجہز ہوا ہے اور بڑے بڑے سبھوں کے بعد اب کہیں انگلستان کے استعماری طرز عمل کی معین تشکیل ہوئی ہے۔ سترہویں صدی میں نوآبادیوں پر اس طرح حکومت کی جاتی تھی گویا کہ وہ محض مادی ملک کے ذمے کے لئے قائم ہوئی ہیں، چنانچہ ۱۶۱۰ء سے ۱۶۱۲ء تک متعدد دنوں جہازانی منظور ہوئے جن کی رو سے صرف انگریزی جہازوں کو نوآبادی سے کسی قسم کی تجارت کرنے کی

اجازت دی گئی اور غیر ملک والوں کو ان نوآبادیوں کے ساتھ کسی قسم کا بیوپار کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔ تیز نوآبادیوں کی صنعت و حرفت پر طرح طرح کی رکاوٹیں قائم کی گئیں اور یہ طے کر دیا گیا کہ کوئی غیر جہاز بغیر انجمنستان ہوس کے کسی نوآبادی جاسے نہ وہاں سے آئے۔ اس طرز عمل کو جنگ آزادی امریکہ میں بڑا بھاری دھکا لگا۔ جنگ آزادی امریکہ میں مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ انجمنستان والوں کو محض اپنے نفع کی خاطر آبادکاروں پر محصول لگانے کا اختیار ہے یا نہیں، اور اس مسئلے میں انجمنستان نے شکست فاش کھائی اور اس کی قربتاً تمام آبادیاں ہاتھ سے جاتی رہیں پھر بھی جو کچھ باقی رہ گیا تھا، یعنی کنڈا، اس کی باگ بھی انگریز تنگ کئے رہے، اور اس طرز حکومت کا جسے ذمہ دار حکومت کہتے ہیں اسی وقت اجرا ہوا جب فرانسیسی عنصر کی شدید بغاوت کے بعد لارڈ ڈرہم کے مامور یہ نے ۱۸۴۱ء میں سفارش کی کہ کنڈا کی نوآبادیوں کو ذمہ دار حکومت کے اضنا رات دے جائیں۔ اس کے بعد انگریزوں کا طرز عمل یہ ہو گیا کہ ان نوآبادیوں میں، جہاں سفید نام عنصر تعداد میں زیادہ نہیں تو اہم ضرور ہو، پارلیمنٹی طرز کی ذمہ دار حکومت دے دی جائے، چنانچہ ذمہ دارانہ اختیار ۱۸۵۲ء میں نوآبادیستان کو، ۱۸۵۳ء میں راس امیر کو اور ۱۸۵۴ء سے ۱۸۶۰ء تک آسٹریلیائی نوآبادیوں کو دے گئے، اور جنگ جنوبی افریقہ کے بعد ڈرہم اور پیچ کو بھی پارلیمنٹی اختیار عطا کر دئے گئے۔ اس سلسلے کی آخری کڑیاں ہائے زمانے میں منسلک ہوئیں، یعنی ۱۸۶۰ء میں تمام آسٹریلیائی نوآبادیوں کو مارک دوت عامہ آسٹریلیا، اور ۱۹۱۱ء میں جنوبی افریقہ کی چار نوآبادیوں کو مارک اتحاد جنوبی افریقہ

بنایا گیا اور ۱۹۲۱ء میں جنوبی آئرستان کے باغیوں کے ساتھ ایک صلحنامہ پر دستخط کئے گئے جس کی برسرے اس حصہ ملک میں کٹاؤ کی وضع کی حکومت تسلیم کی گئی اور اسے ”آزاد ریاست آئرستان“ کا لقب دیا گیا۔

ہندوستان - ہندوستان کی نوعیت نوآبادیوں سے جداگانہ ہے۔ گو ہندوستان میں بہت سے غیر آباد قطعات ہیں، لیکن ان سے زیادہ تر تولید ہیں جن میں، موسمی اسباب کی بنا پر کسی قسم کی یورپی آبادی کا قیام قطعاً ممکن نہیں۔ ایسے قطعات کے علاوہ باقی ماندہ ملک میں ہندوستانیوں کی آبادی نہایت گنجان ہے اور یہ آبادی جنوبی افریقہ کے بھٹو یا آسٹریلیا کے اصلی باشندوں کی طرح غیر متدن نہیں بلکہ بڑی بڑی روایتوں کی حامل ہے اور گو ہندوستانی زیادہ تر آپس کے تفرقوں کی بجائے بہت کچھ کھو بیٹھے، لیکن اس وقت بھی ان میں غیرت و حمیت کے ٹھوڑے بہت اثرات باقی ہیں۔ ایسے لوگوں کو امریکی اندیاسیوں کی طرح ”محفوظ رقبوں“ کے اندر محدود کر کے ایک نوآبادی قائم کرنا ناممکن تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ابتدا میں محض ایک نجی کمپنی تھی، لیکن خود ہندوستان کے باہمی جنگ و جدال نے اسے مولفہ ہی نہیں دیا بلکہ میسر کیا کہ وہ ہندوستان کا سب سے اہم سیاسی عنصر بن جائے۔ مہتمی سٹیفن جیلسی صدی عیسوی کے وسط میں اپنا مشن یہ قرار دیا کہ تمام ہندوستان پر جا شریعت غیرت حکومت کرے، چنانچہ جیسلسٹہ شروع ہوا وہ یہ تھا کہ ایک گورنر جنرل و ایسٹون جگلوں یا دوسرے ذرائع سے ایک حصہ ملک پر قبضہ کر لیت اور اس کے بعد کہ گورنر جنرل عدم مداخلت کی حکمت برٹن پیرا ہو کر محض شدہ حصہ ملک پر حکومت کا مزید استحکام کا فی جمعیت۔

لیکن اس طرز عمل کو "غدر" ۱۸۵۷ء میں بڑا دھکا لگا۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ غدر کے دو سب سے بڑے مرکز یعنی دہلی اور لکھنؤ دو ایسی شمالی سلطنتوں کے پایہ تخت رہ چکے تھے جن میں سے ایک کا الحاق صرف ایک سال پہلے ہوا تھا اور دوسرے کو بالکل بے دست و پا کر دیا گیا تھا۔ غدر کی آگ سے حیدر آباد محفوظ

رہا اور احمد شہ بہاؤ کے فرمانروا کی حیثیت پہلے سے بھی زیادہ مستقل ہو گئی۔ انگریزوں کی آزادی کے بعد انگریزوں کی نوآبادی کی طرز عمل میں بھی ایک انقلابی کیفیت پیدا ہوئی، یعنی کمپنی کا خاتمہ کر دیا گیا، ملکہ وکٹوریہ اب براہ راست ملکہ ہند ہو گئیں اور ان کے مشہور فرمان ۱۸۵۷ء میں اس کا اعلان کر دیا گیا کہ تاج کے مقبوضات ہند میں وسعت نہیں کی جائے گی اور فرمانروایان ہند کے قبضے بدستور سابق رہیں گے۔ نیز اس طرز عمل سے گریز کر کے جولارڈ ڈیلمورزی کے زمانے میں "بازگشت" کا قرار پایا تھا، یعنی یہ کہ اگر کسی دہلی ملک کے ادلائہ ہو تو ایسی حالت میں اس کی ریاست انگریزوں کی املاک ہو جائے گی، لارڈ کیننگ

شہ دیکھو تھورنٹن، "انڈین گزٹیز" Indian Gazetteer for 1856
 ۱۸۵۷ء میں اعلان کیے دیکھو نائٹنگل ہندوستانی ریاستوں اور برطانوی شہنشاہی حکومت کے درمیان سیاسی
 تعلقات اور ان کا ارتقاء Shyamra Shankar: The Nature
 and evolution of the political relations
 between the Indian States and Imperial
 Government. باب ۴۔

نے جوئے انتظام کی رو سے نائب شاہ مقرر ہوا تھا، ہر ایک ہندو والی ملک کو
 "سنہیت" اور ہر مسلمان والی ملک کو "سندھو ریٹ" یا اصول شرع محمدی
 دے کر ذہنی غفلت کو فروغ دیا۔

موجودہ طرز کار۔ آج کل مختلف سلطنتیں اپنے مقبوضات کا طرح طرح
 سے انتظام کرتی ہیں، بعض جیسے فرانس، بظاہر مقبوضات کو خود مختار اور اختیار
 دیتی ہیں لیکن کچھ اس بیج سے کہ اسی اختیارات کے حامل اسی باغیہ سے نہیں
 ہوتے بلکہ آباد کار ہی ہوتے ہیں۔ انگریزوں کی نوعیت سب آباد کار ملک
 سے جدا گانہ ہے، اس لئے کہ اس کے مقبوضات تمام دنیا میں پھیلے ہوئے
 ہیں اور ان مقبوضات کی آبادی میں ہنس، مذہب اور تمدن کے لوگ پائے جاتے
 ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی سلطنت کے یہ جزیرہ انتظام کیسا طرز پر نہیں ہو سکتا، اسی
 نوآبادیال جن میں اکثریت یا اہم ترین اقلیت سفید فاموں کی ہے، انھیں مکمل سوراچی
 اختیارات دیئے گئے ہیں اور ان کو نام "قعدہ" قرار دیا ہے۔ ان کے
 بعد وہ نوآبادیال اور مقبوضات میں جنھیں قانون سازی کے اختیارات تو حاصل ہیں،
 لیکن مالا مال اختیارات کلینٹل انگریزی گورنر کے قبضے میں ہیں کچھ ملک ایسے ہی ہیں
 جنھیں "محفوظ" کا لقب دیا ہے یعنی جن پر ایسی حکمران فرما رہا ہیں لیکن اختیارات
 کا ایک حصہ برطانوی ریڈیوٹ قائم مقام کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ آخر میں
 "شامی" نوآبادیال کو درجہ ہے جن پر براہ راست انگریزوں کی طرف سے حکومت

ہوتی ہے۔

۱۔ ایضاً۔

حال ہی میں، یعنی جنگ عظیم کے بعد، سیادت پیدا کرنے کا ایک اور طریقہ نکالا گیا ہے، جس کی رو سے انجمن اقوام نے جرمنی اور ترکی کے بعض ایشیائی اور افریقی مقبوضات کو انتظام کی غرض سے سلطنت برطانیہ، فرانس، بیجیم اہل جاپان کے سپرد کر دیا۔ اس طریقہ کو ہم ”عکبرداری“ کہتے ہیں اور اس کی رو سے حکمران سلطنتیں اپنے اپنے انتظامات کی سالانہ رودادیں انجمن اقوام کے مامورِ عکبرداری کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ انجمن اقوام اور عکبرداری کا بیان اس کتاب کے آخری باب میں ملے گا۔ یہاں صرف یہ امر قابل ذکر ہے کہ کم از کم ان علاقوں کے متعلق جو عکبرداری (الف) کے زمرے میں آتے ہیں، یعنی جو کسی زمانے میں دولت عثمانیہ کے علاقے تھے یہ طرز عمل ہو گیا ہے کہ انھیں ایک حد تک آزادی دے دی جائے۔ اصل میں یہ علاقے وہ ہیں جو بقول ”موافقہ انجمن اقوام“ تمدن کے اس درجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ انھیں خود مختار اقوام قرار دیا جاسکتا ہے؛ گو انھیں ایک حکمران ملک سے اس وقت تک صلاح اور مدد لینی ہوگی جب تک وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ عراق اور شام میں یہ صلاح و مدد حکمران ملک یعنی انگلستان اور فرانس برابر دیتے رہے، یہاں تک کہ ۱۹۳۶ء میں عراق اور شام کی آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔ لیکن یہ آزادی بہت کچھ محدود ہے، اس لئے کہ بغداد کی عدالتِ عالیہ و عدالتِ اسٹے ابتدائی کے میرٹھس صاحبان انگریزوں نیز وزارتِ مدافعت کی صلاح کار مجلس ایک برطانوی فوجی مامور یہ ہے اور شہرِ بصرہ برطانوی ہوائی قوت کا اب بھی ایک بڑا مرکز ہے۔ (حاشیہ صفحہ ۴۹ پر)

شام کی آزادی بھی تقریباً انہیں اصول پر مبنی ہے۔ باقی ماندہ حکمرانوں کی علاقے
 (یعنی افریقہ اور بحر الکاہل کی سابق جہن نوابداریاں) اپنی اصلی حیثیت سے
 گرتے جاتے اور رفتہ رفتہ صاحب حکمرانوں کے ملحقہ علاقوں کی شکل اختیار
 کرتے جاتے ہیں۔

ضمیمہ باب ۲۰

تشیلات حکومت توابع

اٹلی - بحیم - اسپین - جاپان - ولندستان - ممالک متحدہ امریکہ - فرانس

انگلستان - ہندوستان اور ہندوستانی ریاستیں

اٹلی اور اسپین اپنے توابع پر براہ راست حکومت کرتے ہیں۔
توابع کو کئی قسم کے اندرونی اختیارات حاصل نہیں ہیں۔

جاپان اپنے مفوضہ جزائر اور ماتحت علاقوں پر براہ راست حکومت کرتا ہے۔ حال ہی میں اس نے چین سے لڑکر منچوریا اور مشرقی چین کے صوبوں کو چین سے جدا کر دیا ہے۔ منچوریا میں تو نفور چین کو تخت پر بٹھا کر منچو کو تو (منچو مملکت) قائم کی ہے جو ایک طرح کا محفوظ ہے جس کے انتظام کی دائمی باگ جاپانی "سفیر" کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح اس نے شمالی اور مشرقی چین کو غیر مسلح کر کے ایک طرح سے اپنا تفوق قائم کر لیا ہے۔

ولندستان۔ ولندیزی شرق الہندی نوآبادیوں پر ولندستان

۱۷ ولندستان کے توابع کی حکومت کا مفصل ذکر انجلیٹو کی کتاب، جلد ۲ میں ملے گا۔ مختصر بیان کے لئے دیکھو "سالنامہ مدیرین" ۱۹۳۵ء، ص ۱۱

کی طرح (دوطرزی حکومت ہوتی ہے یعنی بالواسطہ اور براہ راست ۔ سہارا اور جاوا مقامی سلاطین اور راجوں سے بھرا ہوا ہے جن کی رہنمائی مختلف و لندیزی ریز پرنٹ کرتے ہیں۔ جس حصہ ملک پر براہ راست و لندیزی حکومت ہوتی ہے اس میں گورنر جنرل اور ایک "مجلس عمومی" کو قانون سازی کے اختیارات حاصل ہیں۔ ۱۹۲۵ء سے پہلے اس میں منتخب شدہ اور نامزد کردہ دونوں قسم کے اراکین تھے اور اس مجلس کو اہم ترین معاملات پر گورنر جنرل کو صلاح دینے کا اختیار تھا۔ لیکن ۱۹۲۵ء کی اصلاحات کے ذریعے سے نوآبادی کو اندرونی سوراخ حاصل ہو گیا ہے، یعنی مجلس عمومی کی کنیت کو وسیع کر دیا گیا ہے اور ساتھ ہی منتخب شدہ عنصر کو بھی بڑھا دیا گیا ہے۔

مالک متحدہ امریکہ

جسے نوآبادی کہنا چاہئے وہ مالک متحدہ امریکہ کی ایک بھی نہیں اس لئے کہ خود وفاقی ریاستوں میں بعض ایسی ہیں جن کا رقبہ سیکڑوں مربع میل وسیع ہے اور آبادی بہت کم ہے چنانچہ خود مالک متحدہ میں آبادی کی ہمیشہ مانگ رہی ہے۔ جو مقبوضات انہیں امریکہ سے باہر تھے بعض ناقض ملکیت نے زیادہ سے اختیار دے دیے ہیں۔

(۱) گزیر سم و سموا بحری مرکز ہیں۔ سموا میں جو حکومت ہے اس میں

جدا اور وفاقی ضرورتوں سے جوئے ہیں۔

۱۹۰۷ء کی نوآبادیوں کی حکومت "Reinsch Colonial Government"

۱۹۰۷ء کی نوآبادیوں کی حکومت

۲۰۔ جزائر و شہزادہ "ان کے تمام باشندوں کو امریکی شہریت کے حقوق حاصل ہیں۔ دونوں میں حکومت جدید طرز کی ہے اور امریکی اصول پر جماعت قائم ہے۔ چند وزرا پر مبنی ہے۔ گورنر کا تقرر صدر ممالک متحدہ امریکہ کرتا ہے۔

۲۱۔ ممالک متحدہ امریکہ کا سب سے اہم غیر قطبی جزیرہ ایشیائی جزیرہ فیلیپائن ۱۹۳۴ء کے امریکی قانون کے ذریعے سے جس کی ۱۹۳۵ء میں فیلیپین قوم نے توثیق کی، اب "دولت قائمہ فیلیپائن" اندرونی امور میں بالکل خود مختار ہے۔ اس کا انتظام ایک صدر (جو چھ سال کے لئے منتخب ہوتا ہے) اور ایک ایک دو ایوانی معائنہ پر (جو تین سال کے لئے منتخب ہوتی ہے) مشتمل ہے۔ امریکہ اپنا ایک نامور اعلیٰ صدر تمام جزائر یعنی فیلیپائن رکھتا ہے۔ دس سال تک حسب ذیل امور امریکہ کے اقتدار میں محفوظ رکھے گئے ہیں: قرضہ سکہ سازی، درآمد و برآمد، امور خارجہ و ترک وطن، ترسیلات و ستوار اور حفاظت علی۔ پہلے یہ قرار پایا تھا کہ ۱۹۴۳ء میں فیلیپائن بالکل آزاد ہو جائے گا لیکن بین الاقوامی حقوق حال کے منظر اب فیلیپین قوم کی خواہش ہے کہ امریکی حفاظت کا سلسلہ قائم رہے، چنانچہ انکی استدعا کے مطابق جزائر کی مکمل آزادی کی تاریخ ۱۹۶۰ء تک ٹھادی گئی ہے۔

فرانس

۱۔ اصول: (۱) کسی نوآبادی کو مذکورہ دارانہ حقوق حاصل نہیں گو بعض نوآبادیوں میں نیابتی
 ۲۔ فیلیپائن کی سیاسی حیثیت کے لئے دیکھو سالنامہ برین ۱۹۳۸ء صفحہ ۶۷۔

مجلس ہیں۔

۲۔ الجوزائر کو فرانس کا ایک جزو تصور کیا جاتا ہے اور تونس ایک محفوظ ہے جس کا تعلق وزارت خارجہ سے ہے (۳) بعض نوآبادیاں پیرس کی مجلس میناٹ اور دارالائہین دونوں میں سے ارکان انتخاب کر کے بھیجتی ہیں اور بعض دارالائہین میں رہیں پیرس میں ایک مجلس اعلیٰ متعلق نوآبادیات ہے جس میں نوآبادیاتی ارکان دارالائہین و مجلس میناٹ خاص نوآبادیاتی وفید فرانس ایوان ہائے تجارت اور نوآبادیاتی انجمنوں کے وفید شامل ہیں یہ مجلس جن قانونی مشقوں پر

انواع توالیج فرانس ۱۔

۱۔ الجوزائر:۔ اصل عرب باشندوں کو مکمل نظر انداز کر دیا جاتا ہے اس لئے کہ نوآبادی کو فرانس کا ایک جزو قرار دیا گیا ہے جو اہلی باشندوں کے لئے نقصان رساں ہے۔ الجوزائر کے آباد کاروں کی طرف سے وائٹ اور سیاہی پیرس جاتے ہیں لیکن ان کے لئے صرف فرانسیسی ہی رائے دے سکتے ہیں اور چونکہ پارلیمنٹ میں بہت سے چھوٹے چھوٹے جموعے کام کرتے ہیں اس لئے ان لوگوں کو آزاد کو خاص اہمیت حاصل ہے جس کی وجہ سے آباد کاروں کو برابر مراعات ملتی رہتی ہیں۔ الجوزائر کے محکمات عدلیہ، تعلیمات، کالیاں اور خزانہ براہ راست پیرس کے ماتحت ہیں۔ اور نوآبادی کا موازنہ گورنر جنرل دزیر جنرل کے رائے بنا ہے۔ گورنر جنرل کے متعلق ایک مجلس بھی ہے لیکن وہ محض صلاح کار ہے اسے کوئی خصوصی اختیارات حاصل نہیں۔

۲۔ ٹونس۔ یہ محمیہ فرانس کے وزیر خارجہ کے متعلق ہے۔ یہاں برائے نام ٹونس کے ”بے“ کی حکومت ہے لیکن دراصل ہر امر کا دار و مدار فرانسسی ریزیدنٹ کے قبضے میں ہے جو ٹونس کا وزیر خارجہ باعتبار عہدہ بھی ہے دیگر اوزار میں سے، ذرا فرانسسی اور تین تونسوی ہیں۔

۳۔ اتام میں ”شہنشاہ اتام“ کے ماتحت ایک دارالنائینین ہے اور ایک وزارت بھی، لیکن حکومت ریزیدنٹ کی مرضی کے مطابق ہوتی ہے۔ ۴۔ فرانسسی ہند میں ایک منتخب شدہ مجلس ہے جو ہندوستانی علاقے کے متعلق قانون سازی کرتی ہے۔ انتخاب کے اغراض کے لئے اس کے دوسری حصے ہیں، ایک کو فرانسسی منتخب کرتے ہیں اور دوسرے کو ہندوستانی۔ جو ارکان پیرس کی پارلیمنٹ کے لئے منتخب ہوتے ہیں (یعنی ایک سیناتی اور دو نائب) انھیں صرف فرانسسی ہی منتخب کرتے ہیں۔

۵۔ ایک نوع ایسی نوآبادیوں کی ہے جو زیادہ تر جزائر غرب اہند میں پائی جاتی ہیں اور جن میں قانون سازی کا کام منتخب شدہ مجالس کے ہاتھ میں ہے لیکن ان مجالس کو کسی قسم کے عاملانہ اختیارات حاصل نہیں۔

۶۔ فرانسسی مراقش ایک محمیہ ہے۔ سلطان مراقش کا وزیر خارجہ (جہاں تک فرانسسی حصہ کا تعلق ہے) فرانسسی ریزیدنٹ ہے، اور اصل میں تمام حصہ ملک کا انتظام اسی کے قبضے میں ہے۔ قانون سازی شہنشاہی فرامن کے ذریعے سے ہوتی ہے لیکن ان فرامین کو اصل میں ریزیدنٹ

سی ترتیب دیتا ہے۔
انگلستان

(۱) شاہی نوآبادیاں - یہ وہ نوآبادیاں ہیں جن پر تاج کی طرف سے براہ راست حکومت ہوتی ہے اور جہاں قانون سازی اور عادلانہ اختیارات دونوں پر شاہی گورنر کو پورا قابو حاصل ہے۔ بعض نوآبادیوں میں جماعت مقننہ نہیں ہے، جیسے جبل الطارق اور سینٹ ہلینا، اور بعض میں جماعت مقننہ ہے صرف لیکن اس کا بیشتر حصہ نامزد کردہ ہر جیسے برطانوی ہونڈیوارڈ، ہونگ کانگ اور جزائر فاکستان۔

(۲) ایسی نوآبادیاں جہاں کی جماعت مقننہ قانون سازی کی حد تک ذی اختیار ہے لیکن عادلانہ اختیارات گورنر کی ذات میں مرکوز ہیں۔ ان میں بعض ترتیباً "نیابتی نوآبادیوں" کا بھی لقب دیا جاتا ہے۔

نوآبادیوں میں ہنگامہ کی ایک خاص نوعیت ہے۔ اس کی "محسوس مکت" کو نہ صرف قانون سازی کے اختیارات محسوس ہیں بلکہ یہ انتظامی امور میں بھی رائے زنی کر سکتی ہے۔ وزارت دس ارکان پر مشتمل ہے جن میں سے سات محسوس مکت کے منتخب شدہ ہوتے ہیں اتریں، یعنی متعینہ خصوصی، معتد قانون اور معتد مالیات اگر گورنر نامزد کرتا ہے۔ ساتوں منتخب شدہ وزرا کی صلاح کار ایک ایک محسوس شورے

۱۸۷۱ء پر مشتمل۔ حسب بالا باب ۸ اور انگلستان، حسب بالا باب ۱۸ رکنیہ، "فکری حکومتیں"
 میں "Keith: Dominion Autonomy in practice."

بھی ہوتی ہے جسے مجلس مملکت مقرر کرتی ہے۔ جس مملکت میں ۱۵ منتخب شدہ ارکان، تین نامزد کردہ ذرا، اور آٹھ مزید نامزد کردہ ارکان ہوتے ہیں۔
 (۳) قلمرویں۔ یہ تعداد میں پانچ ہیں، یعنی کناڈا، آسٹریلیا، نوڈریسٹان، جنوبی افریقہ اور آئرستان۔ پہلے میونادٹ لینڈ بھی ایک قلمرو تھی لیکن جزیرہ دالول نے اپنے جملہ اختیارات برطانیہ کو ہنگامی طور پر واپس کر دئے اور اب اس کا انتظام ایک ساموریہ کے سپرد ہے جس کا صدر گورنر ہوتا ہے اور جس میں تین انگریز اور تین آباد کار ہوتے ہیں۔

قلمروں کے خصوصیات۔

قلمرو ہر داخلی معاملے میں اور ایک حد تک خارجی معاملات میں خود مختار ہے اور اسے دل خارجہ سے براہ راست تعلق رکھنے کا اختیار حاصل ہے۔ قلمرو انجمن اقوام کا رکن ہے۔ کسی قلمرو کے حدود کے اندر انگریزی فوج نہیں ہے اور مسلاوہ آئرستان کے علاوہ جہاں کے علاوہ ۱۹۳۷ء کے دستور کے مطابق گورنر جنرل کا عہدہ

۱۹۳۷ء قلمروں پر برطانوی اقتدار کے لئے دیکھو کیتھ: ”برطانوی قلمروں کا اقتدار“

Keith: Sovereignty of the British
Dominions.

۱۹۳۷ء سالانہ مدبرین، حسب بالا، ص ۱۱۱

۱۹۳۷ء اس سے پہلے ہی، یعنی دسمبر ۱۹۳۷ء میں صدر اعظم آئرستان ویلیس نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ شاہ انگلستان کو سوائے بین الاقوامی تعلقات (بقیہ حاشیہ ص ۱۱۱) پر

تڑوڑا گیا ہے اور اس کی جگہ ایک نخب شدہ صدر مقرر کیا گیا ہے (ہر جگہ ایک ایک گورنر جنرل مقرر کردہ بادشاہ ہے، لیکن انگلستان کی طرح اسے حقیقی عاملانہ اختیار حاصل نہیں ہیں، بلکہ ان اختیارات کا حال دربر غلم ہوتا ہے جو قلمروی پارلیمنٹ کے سامنے ذمہ دار ہوتا ہے۔ ۱۹۲۱ء کے بعد قلمروی حکومتوں اور حکومت انگلستان کے امین رسل در سائل بجائے گورنر جنرل کے دو نامورین اعلیٰ کے ذریعے سے ملے ہوتے ہیں جن میں سے ایک قلمرو کی طرف سے لندن میں اور ایک حکومت لندن کی طرف سے مستقر قلمرو میں بطور سفیر کے رہتا ہے۔

۶۔ اپریل ۱۹۲۶ء اور تاؤن ویلٹ فیسٹر ۱۹۲۷ء نے یہ ملے کر دیا ہے کہ برطانیہ نکال اور قلمروں کی حیثیت بالکل سادی ہے کسی کو دوسرے پر کسی معاملے میں تغلق حاصل نہیں ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۵) اور سفر کے خطوط اعتبار پر دستخط کرنے کے اب آریستان کے متعلق کوئی حق باقی نہیں رہا۔ چنانچہ شاہ ایڈورڈ ہشتم کے ترک سلطنت کے بعد ہی ایک قانون آریستانی پارلیمنٹ میں منظور ہوا جس کے ذریعے سے بادشاہ یا گورنر جنرل کے حق اقتدار اور پارلیمنٹ کو طلب کرنے اور برخاست کرنے کے حق کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس قانون کی رو سے بادشاہ کو علاوہ خارجی معاملات مثلاً صلح ناموں اور قلمرو سفر کے اندرون امور میں کوئی اختیار باقی نہیں ہے۔ ۱۹۲۷ء کے آریستانی دستور میں بادشاہ کا نام ہے مذکور کہ کیرولان رجسٹر *Annual Register* ۱۹۲۷ء کے مطابق یہ ہے کہ ہر آریستان بیڑے اور زمین روں پر ایک پیسہ خرچ نہیں کرتا اور اس کی بیرونی حفاظت کا دار و مدار کلیئہ انگلستان پر ہے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ

۱۔ گورنر کے اقتناع کا اب استعمال نہیں کیا جاتا لیکن وہ مسودوں کو بادشاہ (یعنی علاقہ حکومت برطانیہ) کے حکم کے لئے ”محفوظ“ کر سکتا ہے۔ نیز بعض ایسے معاملات (مثلاً بعض قلمروں میں انگریزی پریوی کونسل میں مرفوعہ کے اختیارات) ہیں جن کے زمینی مسودہ جات کو اس طرح ”محفوظ“ کرنا لازمی ہے، جو مسودے اس طرح ”محفوظ“ ہوتے ہیں ان پر اگر ۲ سال تک بادشاہ کے دستخط نہ ہوں تو خود بخود غیر منظورہ سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ۱۹۳۷ء کے دستور کے بعد ایرسٹن کی حیثیت بالکل ممتاز ہو گئی ہے یہاں گورنر جنرل کا عہدہ ٹڑیا گیا ہے اور دستوریں بادشاہ کا کوئی اختیار باقی نہیں رکھا گیا۔ نیز اب یہ سمجھنا چاہئے کہ انگریزی پریوی کونسل کو ایرسٹنی معاملات میں مرآت کے کوئی اختیارات باقی نہیں ہیں۔

۲۔ جنگ دامن کے اختیارات برطانوی حکومت کو حاصل ہیں۔ لیکن قلمری حکومتیں رزبروز خارجی معاملات میں اپنی قوت دکھا رہی ہیں۔ مثلاً چچو سلوفاکیہ کے الحاق جرمنی کے بحران کے زمانے میں کناڈا نے صاف کہہ دیا کہ ہم صرف اس وقت لڑنے کے لئے تیار ہیں اگر خود برطانیہ یا سلطنت برطانیہ پر کوئی وار کیا جائے۔

۳۔ سلطنت برطانیہ سے علیحدگی کے مسئلے پر علمی مباحث کا دروازہ کھلا ہوا ہے

لیکن باقی تمام قلمروی دساتیر کی بنیاد تاج کا اقتدار اعلیٰ ہے۔ ایرستانی دستور
۱۸۰۱ء اپنی نوع کا انوکھا ہے اس لئے اس کی بابت برطانوی پارلیمنٹ کا
کوئی قانون منظور نہیں ہوا اور اس کے پیش لفظ کے مطابق اس کا فیصلہ خود ایرستانی
قوم کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں۔

۴۔ سلطنتی اعزازات مقامی وزارتوں کی سندش پر برقی نہیں ملے جاتے ہیں۔

۵۔ قلمروں کے خارجی حفاظت کی ذمہ داری برطانیہ ہی پر عائد ہے اور سولہ

آسٹریلیا اور کیناڈا کے چند جہازوں کے کسی قلمرو کے پاس جہاز نہیں

ہے، اور کیناڈا اور آسٹریلیا جہاز بھی تقریباً کھینچے برطانوی دہشت

بحری کے ماتحت ہیں۔

قلمرومی میں ایسی باشندوں کے سیاسی حقوق۔

جنہی قلمرو میں ہیں ان سب میں سیاسی حقوق کا درجہ سفید م آدمی ہے

۱۸۰۱ء میں کیناڈا کی پارلیمنٹ نے ایک قرارداد کے ذریعے سے ملک معظم سے

استعفا کی کہ کیناڈاؤں کو خطرات نہ ملے جائیں۔ یہ صورت حال ۱۸۰۱ء تک جاری

رہی۔ ۱۸۰۱ء کو جرنل ہرنزولڈ وزیر عظم جنوبی افریقہ نے پارلیمنٹ میں اعلان

کیا کہ نئے گورنر جرنل کوک ملنگٹن "سمر" کا جو خطاب دیا ہے وہ جنوبی افریقہ کی ذمہ دار وزارت

کی رائے سے دیا ہے، اور ۱۸۰۱ء میں جو ذرا داران مغربی تھے کہ جنوبی افریقہ والوں کو

بادشاہ خطاب عطا کریں اس سے یہ مراد نہیں کہ گورنر جرنل کوک کی سابقہ خدمات کے

بجائے پر خطاب نہ دیا جائے۔

ہے خواہ وہ کتنی اقلیت میں کیوں نہ ہو، اور علی العموم قلمرو کی حقوق اس وقت تک نہیں دئے جاتے تا وقتیکہ سفید فام آبادی کی کافی تعداد نہ ہو جائے۔ اصلی باشندوں یعنی ماؤریوں کو کٹاؤ اور اسٹریپیا میں مطلق کوئی سیاسی حق حاصل نہیں۔ نو کیسٹان کے اصلی باشندوں کی تعداد کل آبادی کا نصف ہے، لیکن بحکمہ اسی اراکین دارالنائین صرف چار ارکان ماؤریوں کی طرف سے منتخب ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ایک وزیر بھی، ماؤری ہوتا ہے۔ جنوبی افریقہ کی نوعیت اس اعتبار سے جدا گانہ ہے، اس لئے یہاں سفید فام باشندوں کی اقلیت ہے، اور جہاں ۵۵ لاکھ سیاہ فام ہیں وہاں صرف اٹھارہ لاکھ سفید فام ہیں، جن میں سے نصف سے کم انگریزی نسل کے ہیں باقی بوریٹلینڈی نسل کے ہیں بلکہ جنوبی افریقہ کے سیاہ فام باشندوں جس طرح حکومت کی جاتی ہے وہ حسب ذیل امور سے معلوم ہوگی۔

۱۔ الف، اتحاد جنوبی افریقہ۔ اتحاد یعنی راس امیہ، مثال، اور چیچ اور فوٹو کالہ میں حکومت بالکل متوازی طور پر گورنر اور کالوں کے لئے جدا جدا اصول چلتی ہے جب "فٹو" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو اس سے مراد صرف گورنوں کی

مثلاً جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے۔

۲۔ اس بارے میں جہد معنویت کتاب اول ۱۰۱۰ء "جنوبی افریقہ کی دیسی حکمت علمی"

J. d. Evans: Native Policy in South Africa

سے اخذ کئے گئے ہیں۔

حکومت ہوگی، سوائے ماس امید کے جہاں نمبر ۱۶ لاکھ کالوں کے ۱۲ ہزار کو حق رائے دی جا رہی ہے۔ گورنر جنرل میاں ٹرائسڈال اور اورینج کے کالے قبیلوں کا سردار اعظم تسلیم کیا جاتا ہے۔ کامینہ اتحاد میں ایک وزیر کو دیسیوں کی نگرانی کے لئے مقرر کیا جاتا ہے اور یہ دیسی امور کے ناموریہ کی صدارت کرتے ہیں جس میں تین سے پانچ تک تنخواہ دار رکھن ہوتے ہیں۔ جو دیسی روزی کمانے کے لئے شہروں میں آ جاتے ہیں ان پر مختلف قسم کی شرطیں عائد کی جاتی ہیں۔ ان کے لئے جدا گانہ ہوتے ہیں اور گورنر کے ان کی قیام گاہوں کی نگرانی کرتے ہیں۔

دیسیوں کے لئے عدالتی تنظیم بھی گورنر کی عدالتی تنظیم سے جدا گانہ ہے۔ ۱۹۲۷ء سے دیسی ناموروں کے عدالتیں قائم ہیں جن میں ان کے مراسم و رواج کا نفاذ ہوتا ہے اور یہاں سے مرافعہ دیسی عدالت مرافعہ میں جاتا ہے۔ ان عدالتوں کے حکام انگریز ہیں۔ لیکن اگر گورنر جنرل چاہے تو کسی دیسی حکمران کو دیسیوں کے باہمی مقدموں کے تصفیہ کے اختیارات دے سکتا ہے۔

صوبہ ماس امید میں صورت حال دو حصے تین صوبوں سے ذرا جدا گانہ ہے۔ یہاں ابتدا میں یہ طرز عمل تھا کہ کالوں کو یورپا دیے جائے اور اسی لئے بعض شرائط کے تحت یہاں کے کالوں کو رائے دی کا حق دیا گیا۔ آج کل جہاں ۲۰ لاکھ گورنر میں سے تقریباً ہر ایک مرد عورت کو حق رائے دی حاصل ہے وہاں نمبر ۱۶ لاکھ کالوں میں صرف ۱۲ ہزار کو یہ حق ہے۔ یہ حق قانون دستور جنوبی افریقہ کے بموجب اس وقت تک سب نہیں کیا جاسکتا تھا جب تک جنوبی افریقہ کے دہلوں اور ان مشترکہ نشست میں یہ اکثریت سے اس کے خلاف نہ ہو جائیں۔ یہ یہ اکثریت

بالآخر اپریل ۱۹۲۳ء کو حاصل ہو گئی اور اب صوبہ راس امید میں بھی کسی کالے کو حق راہ دہی حاصل نہیں۔ خود راس امید کی صوبہ داری مجلس میں تین سفید نمائندے کالوں کی طرف سے منتخب ہو کر رہ گئے، اور تمام اتحاد کے لئے ایک کالی مجلس شورے طے مقرر کی جائے گی۔

راس امید کے قطعہ ماورائے کائی میں جہاں تقریباً کلین کالوں کی آبادی ہے ہر ضلع میں کالوں کی مجلس قائم کی گئیں ہیں جس کا صدر دیسی معاملات کا مامور ہوتا ہے جو گورا ہوتا ہے۔ ان مجلس میں انتخاب کا طریقہ رائج ہے تمام ماورائے کائی کی ایک مجلس عامہ ہے جسے متحدہ ماورائے کائی کی مجلس عامہ یا دیسی زبان میں ”بنگا“ کہتے ہیں۔ یہ سب مجلس محض بجائے شورے ہیں، گو یہ کسی ضروری مسئلے پر اپنی رائے دے سکتے ہیں۔ بنگا کی بعض ذیلی جماعتیں بھی ہیں جو تعلیم، حسابات، قوانین، رواج، املاک وغیرہ میں گورنر جنرل کو مشورہ دیتی ہیں۔ قانون سازی ملکیت گورنر جنرل کے احکام کے ذریعے سے ہوتی ہے۔

دب (علاقہ علاقہ جات اتحاد کے بسوٹان، بھوٹان اور بھوٹان کے علاقے براہ راست گورنر جنرل کے ماتحت تھے جو ان پر بحیثیت حکومت انگلستان کے مامور خاص کے حکمرانی کرتا تھا۔ اب ۱۹۲۳ء سے یہ برطانوی مامور اعلیٰ کے سپرد ہو گئے ہیں۔ جس طرح اتحاد کے علاقوں میں دیسی رقبے مختص ہیں ایسے ہی ان ماموری علاقوں میں گوروں کے لئے رقبے مختص ہیں جو زیادہ تر بہتر قسم کے

ہوتے ہیں۔ ان علاقوں میں بھی کالوں کی صلاح کار مجس ہیں، لیکن کاروبار کا دلد مار گورے حکام پر ہوتا ہے۔

ہندوستان

(الف) قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کی رو سے برطانوی ہند کی حکومت پر برطانیہ کا اثر۔

(۱) یہ قانون (قلمروں کے دستور کی قوانین کی طرح، انگریزی پارلیمنٹ کا قانون ہے۔

(۲) مرکزی و ناقدہ بادشاہ باجلاس مجلس خاص کے اعلان سے وجود میں آئیگا بشرطیکہ انہی ہندوستانی ریاستیں شامل ہو جائیں کہ جس مملکت میں ۵۶ ارکان ان کی طرف سے آجائیں اور جبکہ ہندوستانی ریاستوں کی نصف آبادی شریک ہو جائے۔

(۳) گورنر جنرل کو تک معظم متقرر کریں گے اور وہ ان ہدایات پر عمل کرے گا جو وزیر ہند وقتاً فوقتاً اسے دیتا رہے۔ گورنر جنرل کو اختیار ہوگا کہ کسی مسودہ کو بادشاہ کی طرف سے منظور کرے یا منظور کر دے یا بارشا کے ایہا کے لئے محفوظ کرے (اسی حالت میں اگر ۱۲۰۰ کے اندر بادشاہ نے منظور کیا تو مسودہ نافذ ہو جائے گا، یہ فریہ غور کے لئے مسودہ واپس کر دے۔

گورنر جنرل کو اشد ضرورت کے وقت بشرطیکہ مقصد اجلاس نہ کر رہی ہو) احکام عبادت کرنے کا اختیار ہوگا۔ ایہ حکم صرف بتفقے نافذ رہے گا اور

مقننہ کے دونوں ایوانوں کے سامنے رکھا جائے گا اگر مسئلہ عام طور پر خود اس کی رائے پر منحصر ہو تا تو پھر ایسا حکم ۶ ماہ نافذ رہے گا۔ اور تجدید کی صورت میں اس کی اطلاع وزیر ہند کو دی جائے گی جو پارلیمنٹ کے سامنے اسے رکھے گا۔

اگر کسی خاص مسئلے میں قانون سازی ضروری ہو، اور مقننہ اجلاس کر رہی ہو تو دونوں لوگوں نے جنرل ایوانوں کو پیام بھیجے گا اور اس کے ساتھ جو قانون وہ منظور کرنا چاہتا ہے اس کا مسودہ بھی ہمیشہ کرے گا۔ پھر ایک ماہ بعد غور اپنے آپ اس مسودہ کو قانون بنا سکے گا۔ اس قانون کو گورنر جنرلی قانون کہیں گے۔ ایسے قوانین جلد از جلد پارلیمنٹ کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔

اگر دستور کی عمل کرنے سے رک جائے تو گورنر جنرل علاوہ دفاتی عدالت کے تمام یا چند اختیارات اپنے قبضے میں لے سکتا ہے، لیکن یہ تعطل صرف ۶ ماہ تک رہے گا، گو اس کے بعد پارلیمنٹ چاہے تو اسے تین سال تک جاری رکھ سکتی ہے۔

دفاعیہ کے قیام کے بعد گورنر جنرل دربار کا انتخاب کرے گا جن کی تعداد ۱۰ ہوگی۔ ان کا کام گورنر جنرل کو ”مشورہ دینا اور اس کی امداد“ ہوگا۔ گورنر جنرل ایسے شخص کو بھی وزیر مقرر کر سکے گا جو جماعت مقننہ کا رکن نہ ہو لیکن اسے پھر ۶ ماہ کے اندر کسی نہ کسی ایوان کا رکن بننا لازم ہوگا ورنہ تقلید ان وزارت اس سے لے لیا جائے گا۔

مدافعت اکیلیا اور خارجی معاملات کے متعلق گورنر جنرل تین مشیروں کا تقریر کرے گا۔

گورنر جنرل کی مخصوص ذمہ داریاں ایک ملک کی امن وامان، داخلی توازن، اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ، موجودہ یا سابق خدام کی کے حقوق کا تحفظ، سلطنت متحدہ و برطانوی کے لئے درآمد پر کسی قسم کے ممانعت و حدود کا افساد اور ہندوستانی ریاستوں کے حقوق و تقریر یا کسی ذمہ داریاں گورنر کی ہی ہیں۔ ساتھ ہی ملکہ متوسط کے گورنر کی مخصوص ذمہ داری یہ ہے کہ برسر پر ترقی و تہذیب کی مناسبت سے ترقی ہو اور یہ گورنر کی ذمہ داری ہے کہ ان شرائط میں "مستقلہ و نہایت" کا حاصل کیا جائے۔ گورنر جنرل اور گورنر اپنی مخصوص ذمہ داریوں کے بعد ایک صرف اپنے اختیارات و مفروضے کے

پابند ہیں۔

گورنر جنرل کو بھی اختیار ہے۔ عموماً ان پر خاص امور کے جو ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ گورنر کے اختیارات، تقریری میں صرف داخلی امور ہیں اور انصاف و کسب و کار کا تقریر و پولیس کے متعلق تو عدلیہ تہذیبی اور کسی سپریم جویم کے متعلق کا عدالت کو کسی شخص کو دیا جائے۔

گورنر کو اپنے عدویوں میں تقریر یا وہی اختیارات جس میں جو گورنر جنرل کو گورنر کی حکومت میں جس میں۔

مستقلہ و نہایت تقریر میں کوئی قانون نہ لگا سکیں جسے گا بلکہ ان رقبوں کی بہت گورنر کی حکومت کو دے گا۔ اس میں یہ کہ گورنر جنرل تقریر کرے۔

- (۵) حسب ذیل مرکزی قوانین کے بابت گورنر جنرل کی رادارہی کے
مثال صوبہ واری قوانین کی بابت گورنر کی (پیشگی اجازت لازمی ہے)۔
(۱) اگر یہ پارلیمنٹ یا گورنر جنرل یا گورنر کے مخصوص قوانین کے
غلاف ہوں (۲) گورنر جنرل کے اختیارات کے خلاف ہوں۔
(۳) پولیس کے قوانین کے خلاف ہوں (۴) یورپوں کے مخصوص
تجزیری ضابطے کے خلاف ہوں (۵) ایسے تاجروں یا شرکتوں پر
خاص محصول کے تحریک ہو جو ہندوستان سے باہر ہوں۔
(۶) پریوی کونسل کو مراعات جات اور بغیر اجازت کے 'یعنی خود بخود'
مراعات کے اختیارات اس وقت حاصل ہیں جب مسئلہ وفاقی عدالت
کے صیغہ ابتدائی میں ہو، اور اس کا تعلق کسی باجلاس مجلس شاہی یا
دست دیز شرکت یا کسی ہندوستانی ریاست میں کسی وفاقی
قانون کے لگاؤ کے متعلق ہو۔ باقی تمام امور میں 'خواہ وفاقی عدالت
کی خواہ پریوی کونسل کی' اجازت ضروری ہے۔
(۷) خدمات عالیہ یعنی سول سروس، آئی ایم ایس، پولیس سروس وغیرہ
کی اعلیٰ خدمات کابینہ وزیر ہند کے تابع ہیں۔
(۸) وزیر ہند اور اس کی صلاح کار مجلس :- وزیر ہند کی صلاح کار مجلس
میں تین سے چھ ارکان تک ہوں گے، اور اس کا کام عام طور پر یہ
ہوگا کہ تین امور پر وزیر ہند ان کا مشورہ چاہے اسے مشورہ دیں۔ ان
کے اراکین میں سے کم سے کم نصف ایسے ہوں گے جو کم از کم دس

سال تک سرکاری ملازم رہ چکے ہوں اور تقریر سے پہلے زیادہ سے زیادہ دو سال پیشتر تک ہندوستان میں برسرکار رہے ہوں۔ وزیر ہند کو اختیار ہوگا کہ وہ ان سے انفرادی طور پر یا مجموعی طور پر صلح لے۔

(ب) ہندوستانی ریاستوں پر برطانیہ کے تعلقات زمانہ موجودہ میں مثیلہ ہندوستانی ریاستیں ایک طرح کے محنوں میں اور ان تعلقات کی بنیاد عہد نامے فریقین کے مرضی اور مذاکرے ہیں۔ یہ نقطہ اس قدر قریب ہے کہ اصل عہد نامے ان سے بالکل ہی پس پردہ ہو جاتے ہیں۔ حسب ذیل امور قابل لحاظ ہیں:-

(۱) خارجی معاملات کلیہ حکومت ہند کے قبضے میں ہیں۔

(۲) اندرونی معاملات میں دلیان ملک بھارت آزاد ہیں، لیکن چند حالات کے تحت حکومت ہند مداخلت کرتی ہے بلکہ بعض مرتبہ دی ریاست کو تخت سے بھی اتار دیتی ہے۔ حال میں ایک نئی شکل پیدا ہو گئی ہے

شاہد دیکھو، شاستر ہندوستانی ریاستوں اور برطانوی شہنشاہی حکومت کے درمیان سیاسی تعلقات اور ان کا ارتقاء: Shyama Shankar:

Nature and evolution of the Political relations between the Indian States &

برطانوی شہنشاہی پر بادشاہی حکومت اور برطانوی بادشاہی حکومت کے درمیان

جب سے کانگریس نے بحیثیت ایک جماعت کے صوبہ داری حکومتوں کی باگ سنبھالنی شروع کی ہے اس وقت سے مختلف ریاستوں کی کانگریس کمیٹیاں ریاستوں میں عمومی حکومت کا مطالبہ کرنے لگی ہیں اور اب برطانوی حکومت نے بھی ایک حد تک اس بارے میں مداخلت شروع کر دی ہے۔ علاوہ دس ریاستوں کے (جن میں حیدرآباد کو خاص امتیاز حاصل ہے) انگریزی ڈاک خانہ تمام ہندوستانی ریاستوں پر عادی ہے اور تقریباً سبھی کے ڈھانے کا اختیار (علاوہ ایک حیدرآباد کے) کسی ریاست کو نہیں ہے۔ باوجودیکہ قانوناً ریاستوں کے شہری احباب سمجھے جاتے ہیں لیکن یہ مجلس مقننہ میں شریک ہو سکتے اور ہر عہدہ پر کر سکتے ہیں اور آئی سی ایس وغیرہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۷ کا) ۱۹۱۷ء اس کی شاید سب سے متاثرہ مثال مہاراجہ تاج کی تخت سر علیحدگی اور مہاراجہ آلور کی دو سال کے لئے جلاوطنی ہے۔ مہاراجہ آلور کا ۱۹۱۳ء میں اسی جلاوطنی میں انتقال ہو گیا۔

۱۹۱۷ء مارچ ۱۹۱۷ء کو وزیر ہند نے ایک تقریر میں کہا کہ ”میری رائے میں اب وقت آگیا ہے کہ بلا درست زیادہ مداخلت کرے یعنی نظم و نسق کے معیار کے بلند کرنے کے مقصد سے مشورہ دے۔“ کانگریس کی مداخلت کا سب سے ممتاز مظاہرہ مارچ ۱۹۱۷ء میں راجکوتھ کے واقعات اور گاندھی جی کے برت کی صورت میں ہوا۔

۱۹۱۷ء یہ دس ریاستیں حیدرآباد، ٹراونکور، اور کے پور، بے پور، کوچین، کشن گڑھ اور جھا، جونا گڑھ، شاہ پور چکھاری ہیں

(۳) کسی ریاست میں کسی غیر مملکت کے شہری بغیر انگریزی رضا مندی کے ملازم نہیں رکھے جاسکتے اور نہ کسی والی ملک کو کسی غیر مملکت کا خطاب یا سلامی مل سکتی ہے۔ غیر مالک کے اعتراض کے لئے ہندوستانی ریاستیں کلکتہ ہندوستان کا جزو تصور کی جاتی ہیں۔

(۴) ہندوستانی ریاستوں کے باہمی جھگڑے برطانوی ہندی حکومت طے کرتی ہے۔

(۵) صرف اندرونی حفاظت، تزک، راحت و امن اور ہندوستانی اغراض کے لئے ریاستوں کے پاس مستثنیٰ انواع ہیں جنکی تعداد محدود ہے اور جنہیں "ہندوستانی ریاستوں کی انواع" کہتے ہیں ان کے ہمسہ یا نکل برطانوی وضع کے ہیں اور دقتاً فوقتاً انگریزی عہدہ داران کا سامنا کرتے رہتے ہیں (۶) حکومت ہند کو ہندوستانی ریاستوں میں برطانوی رعایا، "جانب اور فوجی چھڑیوں پر اقدار حاصل ہے۔

(۷) ہر ریاست کے متعلق برطانوی ہندی حکومت کا ایک قلم مقام رہتا ہے جو بری ریاستوں میں ریڈیٹنٹ کہلاتا ہے۔ بعض مرتبہ کئی ریاستیں ایک ریڈیٹنٹ یا ایجنٹ کے ماتحت کر دی جاتی ہیں اور سب سے جھوٹی ریاستوں میں بعض مرتبہ نزدیک کے ضلع کا کنٹرول یا قسمت کا کنٹرول ایجنٹ کے ذرائع انجیم دیتا ہے۔

۱۱۔ جیسے کنٹرولنگ ایجنٹ ریاست رام پور کے لئے حکومت ہند کا ایجنٹ ہے۔

(۸) زبیر منڈل یا ایران والیان ریاست ۱۔ یہ گورنر جنرل کے صدارت میں سالانہ نشست کرتا ہے۔ لیکن جب سے وفاقیہ کا سوال پیدا ہوا ہے اس کی اہمیت کچھ گھٹ گئی ہے۔ باوجودیکہ اس میں انفرادی عہد ناموں پر بحث نہیں ہو سکتی تاہم اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ بہت سے چھوٹے والیان ملک کو اس بات کا احساس شاید پہلی مرتبہ ہوا کہ ان میں اور سرکار انگریزی میں کسی قسم کے عہد نامے بھی تھے۔ ۱۹۱۷ء میں زبیر منڈل کا آخر ہوا اور اس کے اقتتاحی جلسے میں دائرہ سے بہادر سنے لفظ ”مالا پستی“ استعمال کیا جو اس روز سے گویا انگریزوں اور والیان ریاست کے تعلق کو ظاہر کرنے لگا ہے۔

(۹) ریاستوں کے وفاقیہ ہند میں شرکت کا مسئلہ ۱۔ اس کے سیاسی اور معاشی دونوں پہلو سمجھنے چاہئے۔ جہاں برطانوی ہند کو ایسے محال جیسے بحری محس، نکسیدیں، چالو سکھ، دیاسلانی کا محصول، جنگی وغیرہ پر قابو ہے، وہاں والیان ملک کو محال کے تعین پر کوئی قابو نہیں، حالانکہ ان کا ہندوستان اثر ان کے ریاستوں پر پڑتا ہے۔ والیان ریاست پر وفاقیہ ہند کا داخلہ اختیاری رکھا گیا ہے۔ لیکن اغلب امر یہ ہے کہ اکثر ریاستیں وفاقیہ میں شریک ہو جائیں گی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت بھی حکومت ہند اور ریاستوں کے تعلقات ایک جذباتی وفاقی اصول پر مبنی ہیں۔ اس لئے کہ علاوہ ان امور کے جن کا بھی ذکر ہوا ہے مرکزی حکومت کو خارجی معاملات، محصول درآمد، فوج، ہسپتالوں اور

(ایک بڑی حد تک) سکھ اور ڈاک خانہ پر اختیارات عطا ہیں۔
 والیان ریاست دستاویزائے شرکت کے ذریعے سے وثا قیہ میں
 داخل ہوں گے جس میں ان امور کی صراحت ہوگی جن کی بابت قانون
 سازی کے اختیارات والی ریاست کی طرف سے دہاتی جماعت مقننہ
 کو تفویض ہو جائیں گے۔ ریاستوں میں قانون حکومت ہمسہ کا نفاذ
 دستاویزائے شرکت کی شرائط کے تحت ہوگا۔

Constitution

باب ۲۱

دساتیر

دساتیر کی نوعیت - دستور اور چکدار - ذراست - دستور اور دساتیر کی ضرورت -

تبدیلی دستور - عملدرآمد شکست دستور پر تبدیلی - تاویلی دستور

دساتیر کی نوعیت - اس سے قبل جب اقتدار اعلیٰ پر تبصرہ کیا گیا

تھا اس وقت یہ بتایا گیا تھا کہ ایک نوع قوانین کی وہ ہوتی ہے جس کے ذریعہ

سے حکومتی عمل پر زور کی تنظیم کا پتہ چلتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ قوانین سیاسی

اعتبار سے سب سے اہم قوانین ہوتے ہیں اس لئے کہ انہی پر ملک کی امن و امان

اور عافیت کا دارومدار ہوتا ہے اور انہی کے ذریعے سے ملک کی ہیئت حاکمہ کی

تنظیم ہوتی ہے۔ حکومت میں جو عناصر شریک ہیں ان کی کیفیت، حکومت کی

نوعیت کہ آیا وہ فردی ہے یا ذاتی، عمومی ہے یا عیدمی، اس میں بادشاہ ہے

یا اس کا انتظام جمہوری طور پر کیا جاتا ہے، اور اگر بادشاہ ہے تو اس کے کیا اختیارات

ہیں، ملک میں کوئی جماعت مقتدرہ بادشاہ کی ذاتی مجلس سے جدا گانہ ہے یا نہیں

اور بادشاہ اور اس مجلس کے باہمی سیاسی تعلقات کیسے ہیں، انتظام کے اغراض سے ملک کو کس قسم کے رقبات میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان رقبات کا انتظام مرکزی ادارات میں ادارات کرتے ہیں یا مقامی امور میں مقامی ادارات کو کچھ اختیارات حاصل ہیں، ملک کا عدلی انتظام ممکن اصول پر مبنی ہے یا عادلانہ دوسرے ادارات کے تحت ہیں اور میں تو کس حد تک، یہ سب امور میں جن کی نوعیت دستوری تصور کی جاتی ہے۔ اس سے بھی جواب میں ہونے چاہئے حکومت پر نظر ڈالی ہے، اب یہ باقی رہ گیا ہے کہ یہ وہ ہیں کہ کسی ملک میں یہ اعضاء حکومت کس حد تک منتقل ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت میں تبدیلی کرنے کے کیا طریقے رائج ہیں۔

سب سے پہلے دستاویز کی نوعیت پر غور کرنے کی ضرورت ہے، ہم دیکھ چکے ہیں کہ قوانین دوسرے ہوتے ہیں، ایک تحریری قوانین یعنی وہ قوانین جن کے اصول ضبط تحریر میں آئے ہیں اور دوسرے وہ قوانین جو زیادہ تر راجی ہیں، لیکن یہ کہ تحریری قوانین بھی قدیم رسم و رواج پر مبنی ہوں، لیکن جو نگہ سے لکھے ہوئے ہوتے ہیں اس سے ان کے الفاظ و مطالب کا تعین بہ سبب بعض رواجی قوانین کے زیادہ آسان ہوتا ہے اور شخص کو اس کا علم ہو سکتا ہے کہ ٹھیک وہ کیا اصول ہیں جن بنیاد قانونی پائیدار ہونی کی جا سکتی ہے۔ لیکن جب اس سے قبل دیکھا جا چکا ہے، تو ان قواعد کی ہی تحریر کی کہوں نہ ہو، یہ عادلانہ کی تجویز

سے پہلے طے کرنا ناممکن ہوتا ہے کہ وہ کس طرح کسی خاص حالت کی کیفیت پر منطبق ہو گا۔ پھر عادلوں کے نظائر کے وجہ سے تحریری قوانین میں رد و بروز وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اور جب تک ان پر نظر ثانی کر کے نئے سانچے میں نہ ڈھالا جائے ان کی حیثیت بھی کم و بیش اسی طرح سیالیت کی طرف مائل ہوتی ہے جیسے غیر مکتوبی قوانین کی جیسے

استوار اور یکپارہ۔ تقریباً یہی کیفیت دساتیر کی بھی ہے۔ بعض دساتیر مکتوبی ہوتے ہیں یعنی سیاسی ادارات کے باہمی تعلقات اور حکومت اور اس کے اعضاء کی نوعیت اجالا یا صراحتہ ایک دیشیے میں مندرج ہوتی ہے جسے دستور کہتے ہیں، اور اس خطرے سے بچنے کے لئے کہ کہیں جلد جلد تبدیلی کی وجہ سے دستور غیر معین نہ ہو جائے، اس میں ترمیمیں کرنے کا حق محدود ہوتا ہے یعنی اس میں ترمیمیں معمولی قوانین کی ترمیموں سے زیادہ دشواری کے ساتھ کی جاسکتی ہیں۔ اس کے برعکس دوسری قسم کے دساتیر ایسے بھی ممکن ہیں جو غیر موضوعہ قوانین

۱۔ اس اصول کا سب سے عجیب و غریب مظاہرہ تاتسی جرنی میں ہوا ہے۔ یہاں ایک وزارت قانون کے ذریعے سے، (جو جولائی ۱۹۲۵ء میں نافذ ہوا) اگر عادل سمجھے کہ ملزم کو عام تفسیری اصول یا "مدرسہ جذبہ عامہ" کے تحت سزا ملنی چاہئے تو اسے سزا دینے میں درجہ نہ کرنا چاہئے خواہ قانوناً نوزم سزا کاستحق نہ ہو۔ دیکھو "سالنامہ برین" ۱۹۲۵ء صفحہ ۹۶۔

۲۔ دیکھو بالا، باب ۷۔

کی طرح لکھے ہوئے نہیں یعنی جن کی بنیاد بعض رسم درواج اور نظام پر ہو یا ایسے
دلائل پر جن کی نوعیت تو دستور کی ہو لیکن جن کا رتبہ معمولی قوانین سے زیادہ نہ ہو
اور جن میں ترتیب معمولی قوانین کی طرح کی جاسکتی ہو۔ ایسے دساتیر کو ہم لکھا کہیں گے
اور ان دساتیر کو جن کی تبدیلی میں معمولی قوانین کی تبدیلی سے زیادہ دقت ہوتی ہے
انہیں استوار۔

یہ ضروری نہیں کہ مکتوبی دساتیر لازماً استوار ہوں اس لئے کہ یہ بالکل ممکن
ہے کہ ان ممالک میں جہاں تحریری دساتیر رائج ہوں ان دساتیر کی ترتیب معمولی قوانین
کی طرح ہو سکے۔ تحریری دساتیر میں ایک متنازع دستور ^{۱۸۴۳ء} کا اطلالی دستور ہے
جس میں تبدیلی یا ترتیب کا کوئی معین طریقہ نہیں دیا جواٹھ بس کی وجہ سے یہ خیال
پیدا ہو گیا کہ اس کی ترتیب معمولی قوانین کی طرح ممکن ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس دستور
کی ترتیب اتنی مرتبہ اور اتنے مختلف اصول کے تحت ہوتی ہے کہ اس کی صورت
بالکل سب ہو گئی ہے اور جس سے کوئی انصاف پسند شخص ہو سکا جو سمجھتا ہو کہ آج
کس کی ناشی اٹھی کہ وہی دستور ہے جو ^{۱۸۴۳ء} میں تھا کہ اس دستور کو نے اٹلی کو دیا
تھا۔ اسی طرح فرانس کے دستور کے رد حصے جو خاص طور پر قوانین اس ^{۱۸۴۵ء}
کے اجزاء میں ہیں جیسے محکمہ عدلیہ کی ترکیب یا وہ اجزاء جو اس دستور کے اجزاء
ہیں جیسے مجلس سنیات کی ترکیب ^{۱۸۴۵ء} لکھا کہ اس کے اجزاء ہیں اعلان انڈرٹس

^{۱۸۴۵ء} مجلس سنیات کی ترکیب اس ^{۱۸۴۵ء} قوانین کا جزو تھی لیکن ^{۱۸۴۵ء} میں اسے اس ^{۱۸۴۵ء}
قوانین کے زمرہ سے نکال کر "غضری قوانین" کر دیا گیا اور ترتیب وغیرہ کے (القیہ غنیہ ^{۱۸۴۵ء} پر)

کا دستور استوار تصور ہوتا ہے۔ انگلستان کا دستور غیر مکتوبی تصور کیا جاتا ہے، لیکن مشکل سے یہ صورت حال سمجھ میں آ سکتی ہے جس کے تحت ایسے دستاویزات جیسے مشورہ عظم اور عدالت حاکم کو معزلی قوانین کی طرح بدل دیا جائے۔

قدامت۔ اگر غور کیا جائے تو ہم محسوس کریں گے کہ یکبارہ دساتیر متوالہ سے زیادہ قدیم ہیں۔ یوں تو دستور کے معنی دو لفظوں میں طرز حکومت کے ہیں، اور کوئی ایسی ممکنات نہیں ہے جس کی حکومت کا ایک معین طرز نہ ہو، لیکن خاص طور پر دستور کا تخیل یعنی ایسے طرز حکومت کا تخیل جو قطعی طور پر دوسرے قوانین سے ممتاز ہو نسبتاً جدید ہے۔ آج کل جو دستور مانجے ہیں ان میں سب سے قدیم دساتیر سوئستان کے بعض کنیشنوں اور انگلستان کے دساتیر میں جن میں سے اول لکڑ کی تاریخ ۱۲۹۱ء کے کنیشنوتی اتحاد اور ثانی انڈر کی تاریخ ۱۲۶۵ء تک پہنچتی ہے۔ سوئستان کے کنیشنوں کے دستور سب کے سب استوار ہیں، یعنی ان میں تباری کے لئے چند خاص ضابطوں اور قاعدوں پر عملدرآمد لازم آتا ہے۔ قدیم دستور میں انگلستان ہی کا دستور ایسا ہے جو کم از کم جہاں تک انضاط قانون کا تعلق

(تفسیر حاشیہ صفحہ ۵) : غرض سے اس کا وہی رتبہ ہوگا جو جمہولی قوانین کا ہے۔ فرانس کے

قوانین کے لئے خاص طور پر لکھی "تمہید قانون دستوری" - Dicey: Intro-

duction & the Law of the Constitution (۱۹۰۱ء)۔

۵۲۵ : اس بحث کے لئے دیکھو برٹس : "دساتیر" - Bryce: Constitu-

tions. باب ۱۔

ہے بالکل یکجہدار ہے، یعنی دستور بالکل اسی غائبے سے بدل جا سکتا ہے جس غائبے سے معمولی قوانین یا میسوس اور میسوس صدی کے قوانین اصلاح، جن کی رو سے کروڑوں شہریوں کو رائے دی کا حق دید با گیا، بالکل اسی طرح بدلے گئے جیسے معمولی سے معمولی قوانین، حقیقت میں یہ انگریزوں کے قدامت پسند جہت کا ہی نتیجہ ہے کہ دستور کی شکل اس قدر دیر پا ہے اور انگلستان کے دستوری اصول ان کی خصلت میں داخل ہو گئے ہیں، ورنہ بالکل ممکن تھا کہ جیسے روز بروز قوانین میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ویسے ہی دستوری تبدیلیاں بھی ہوتی رہتیں۔

اگر نظر غائر سے دیکھ جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ دستور انگلستان کی یکجہداری ہی ہے کہ جس نے اس ملک کو فرانس اور برطانیہ کے دوسرے ملک کی طرح کے انقلابوں سے بچا ہے۔ بادشاہ و وزیر اور پارلیمان کا بند، محکمہ عدلیہ سب کی شکل تب ہی رہی ہے جو گھریزی انقلاب ۱۶۸۸ء کے بعد تھی، بلکہ سوائے جزوی تبدیلیوں کے وہی ہے جو سترہویں صدی کے ابتدا میں تھی، لیکن بریڈی ڈھپے کے سوا پورے نظام کی حقیقت بدل گئی ہے، اور کئی نئے کے کہ دستور کا مرکز نقل بادشاہ کی ذات ہو، اب و قطعی طور پر ایوانِ مہم یا مجلس کا بند کو منتقل ہو گیا ہے، اگر انگلستان کا دستور استوار ہوتا، یعنی اس میں تبدیلی کرنے کے لئے خاص طریقہ استعمال کرنے پڑتے یا اگر دستوری فنڈز کا حق نہ رکھتا، تو ممکن ہے کہ نئے

۱۔ آئینی حوالہ کے تحت بین کے ساتھ، اور کے ساتھ ہی دستبر : Strong

۲۔ Modern Political Constitutions. باب ۲۔

عمومی خیالات پیدا ہونے پر انقلاب ہو جاتا اور ملک کو اسی طرح کے مدوجز کا سامنا کرنا پڑتا جیسے فرانس کو ۱۷۹۳ء اور بعد کے سالوں میں۔ انگلستان کا جیسا لچکدار دستور اسی نئے بیج سے ہے کہ ایک طرف تو انگریزوں کے قدامت پسندانہ خصائل کی وجہ سے دستور کا ڈھانچہ قدیم اور ٹوٹی ہے، دوسری طرف دستوری دست وکشاہ کی وجہ سے اس ڈھانچے میں جو روح کا رخا ہے وہ جدید اور عمومی ہے۔

انفرض یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہر ملک میں لچکدار دستور ضرور کامیاب ہوگا، بلکہ ان ملک میں جہاں قدامت و روایت کی زیادہ وقعت نہیں یا جہاں کے باشندوں کے دلخ تلافی نظر کر اور اشکال کی زیادہ پرداہ نہیں کرتے، ایسے ملک میں لچکدار دستور کامیاب ہوگا۔ لچکدار دستور واسے ملک میں اگر جدت کرنے کی خواہش ہوگی تو منسوی بہت کافی سمجھی جائے گی نہ وہ نہ ہر کی شکلیں دہی قدیم رہیں۔ لیکن ان ملک میں جہاں دستور دستور کا رواج ہے وہاں نئے خیالات کے لوگ عام طور پر صرف معنوی نمبہ پر پکتفا نہیں کرتے بلکہ شکلیں بھی بدلنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی لچکدار قانون دے ملک میں اگر جہل و غورست کی باگ عوام کے قبضے میں ہوتا ہے حکومت کی شخصیات کا رد و بار ایک طرح کا ایمپلائمنٹ کے قبضے میں ہوتا ہے اس لئے کہ لچکدار دستور کی کارفرمائی کے لئے جس ذہانت، تدبیر اور معلومات کی ضرورت ہوتی ہے، ان کے حامل عام طور پر عوام الناس نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس دستور دستور دے ملک میں جو دستور بنایا جاتا ہے وہ عام طور پر طبقہ اوسط یا طبقہ انسانی کے اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے، چند نچر ایسے ملک میں بہ نسبت نول الذکر ملک کے عوام کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔

(لا خذہ ہو حاشیہ ص ۵۷۸ پر)

کا قانون ضرور لچکدار ہے، لیکن جیسا کہ اس سے قبل کہا جا چکا ہے اس ملک کے بعض اہم دستاویزات جیسے دستور اعظم، عرضداشت حقوق و شادی حقوق قانون بندوبست اور ایسے بعض دوسری دستاویزات جن اصول پر مبنی ہیں ان کی تبدیلی تقریباً اسی طرح ناممکن ہے جیسے فرانس کے انقلابی دساتیر میں تبدیلی اسی طرح استوار دستور والے ملک میں بعض دستوری، مورثیہ میں جہاں میں تبدیلی معمولی قوانین کی طرح ہو سکتی ہے، جیسے فرانس میں مجلس سبقت کی ترمیم اور دارالائمین کے انتخاب کا طریقہ۔ یہاں یہ بھی ذکر کر دینا مناسب ہے کہ بعض دستوری دستاویزات میں ایسے امور کا ارجاع بھی ہوتا ہے جن کا دستور سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک ان امور کو جس قدر ضروری اور لازمی تصور کرتا ہے کہ ان کی ترمیم کے لئے وہی ضابطہ لازمی کر دیا جاتا ہے جو ترمیم دستور کے لئے ہو۔ اس کی بہن مثال ملک متحدہ امریکہ کے ان دستوری ترمیموں سے دی جا سکتی ہے جن میں سے ایک کے ذریعہ سے شہریت سازی اور اس کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا اور دوسرے کے ذریعہ سے اسے جائز گردانا گیا یا سوسائٹیز کے دستور کا وہ جزو جس کے ذریعہ سے کسی جانور کے حقوق بحال کر یا داخل قانون قرار دیا گیا تھا۔

فقہ دیمونون: برٹش ریویو میں مضمون "Dowell's Government"

Parties in Continental Europe. نویسنہ کا بیان۔

Shiva Row: Modern

دساتیر کے متعلق

دستور سوسائٹیز ان ۱۵۔

Constitutions

عملدرآمد۔ یہ تو معین امور دستوری کا ذکر ہوا۔ علاوہ ان امور کو ہر ایک ملک میں، خواہ اس میں استوار دستور رائج ہو یا لچکدار، واقعی عملدرآمد کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ عملدرآمد ایسے رسم و رواج اصول یا ہدایات کو کہتے ہیں جن کی خلاف ورزی کی عانت میں خلاف ورزی کرنے والے پر کسی باضابطہ عدالت میں مقدمہ نہیں چلایا جاسکتا بلکہ غیر کمزوری دستور زیادہ تر ایسے ہی عملدرآمدوں پر مبنی ہوتا ہے۔ چنانچہ انگلستان میں ایسے اہم مسائل جیسے دارالعوام میں کسی اہم مسئلے پر غیبت رائے پر کسی کا جینہ کا استغفار کا جینہ کی مجبوری ذمہ داری، کسی ایسے سہارے پر دستخط نہ کرنا جو صرف دارالعوام کے اکثریت کے رائے کے مخالف ہو، یہ امور ایسے ہیں جن کا قانون میں کہیں تذکرہ نہیں۔ اسی طرح بادشاہ کے حق اقتدار کا استعمال، سوار و سواروں سے نہیں ہوا اور اب شاید کبھی نہ ہو۔ یہ کیفیت صرف لچکدار دساتیر ہی میں نہیں ہوتی بلکہ ان ممالک میں بھی نظر آتی ہے جن کے دساتیر استوار نوعیت کے ہیں۔ شاید دنیا میں سب سے زیادہ استوار دستور مملکت متحدہ امریکہ کا ہے۔ چنانچہ ریڈیو سوسائلی سے زیادہ عرصہ میں صرف میں ترمیمیں ہوئی ہیں جن میں سب سے پہلی دس ترمیمیں دہرے کے اندر لگیا رہی ہیں اور دہرے ایک ساتھ اور تین ایک عظیم الشان فائدہ جتنی کے بعد ہوئی، چنانچہ اگر دیکھا جائے تو امریکہ میں ترمیم کی کل سلسلہ سے اس وقت تک صرف و مرتبہ پہلی سب سے تا بعد عملدرآمد کا اثر امریکی دستور پر بھی یقیناً پڑا ہے۔ جیسا ایک نہایت

ممتاز ماہر دستور امریکہ نے کہا ہے، "یہ امید کہ الفاظ کا کوئی مجموعہ خواہ اس کی تشکیل کیسے ہی غور و فکر کے ساتھ کیوں نہ ہوئی ہو، لوگوں کے جذبات اور خیالات کو ہمیشہ کے لئے محدود کر دے گا، بالکل لاعلم امید ہے۔"

امریکہ میں جو خاموش تبدیلی قانون کے دستور کی تاویل میں ہو رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اشتداد زمانہ اور مختلف اثرات و ماحول کی وجہ سے بعض دستوری ادارات کے وہ معنی نہیں رہے جو اس کے مؤسس چاہتے تھے۔ مثال کے طور پر چند امور کا ذکر کافی ہو گا۔ مؤسسوں نے اس خیال سے کہ صدر جمہوریہ ملک کا اعلیٰ اور ممتاز ترین فرد ہونا چاہئے، "انتخاب کا اختیار ایک منتخب شدہ جماعت کو دیا تھا، لیکن سیاسی فریقوں کی جگہ ہندو اور انتہائی انضباط کی وجہ سے انتخاب کنندوں کو آزادانہ رائے دینے کا کوئی اختیار نہیں رہا۔ جس کی وجہ سے جس ذریعہ کی مجلس انتخاب کنندہ میں اکثریت ہوتی ہے اسی کا نتیجہ بالآخر امر صدر دستور ہوتا ہے، چنانچہ صدر کے واقعی انتخاب سرایت پہنچے، یعنی مجلس انتخاب کے اراکین کے تقرر پر ہی دنیا کو معلوم ہو جاتا ہے کہ صدر کون مقرر ہو گا اور مبارکبادوں کی بوجھار ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح گو دستور میں کہیں اس کا ذکر نہیں کہ کوئی شخص صدر جمہوریہ کہنے کے مرتبہ منتخب ہو گا لیکن رواج یہ چل گیا ہے کہ کوئی شخص دو مرتبہ سے زیادہ اپنے آپ کو صدارت کے لئے پیش نہیں کرتا، اور شاید آئندہ بھی کہیں نہیں کرے گا۔ تیسری تبدیلی یہ

ہوئی ہے کہ گو مجلس سبناٹ کو یہ حق حاصل ہے کہ جن اعلیٰ عہدہ داروں کو صدر نامزد کرے ان کے تقرر کو یہ نامنظور کر دے، لیکن اب اس حق کو کبھی استعمال میں نہیں لایا جاتا۔ اسی طرح ہر ایوان میں ہر فریق کی ایک بڑک ہے جس کے ہر چہ مہ کی تعمیل ہر رکن بر فرض ہو گئی ہے۔ اور یہ اسی قسم کے دوسرے رواج ہیں جو ملک میں اتنے ہی مستحکم ہو گئے ہیں جتنے خود دستوری دفعات گوان کی بنیاد کسی قانون اور آئین پر نہیں اور نہ ان کے توڑنے والے پر کسی قسم کی قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے۔

مستحکم دستور پر تہدید۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دستوری قانون کی خلاف ورزی پر کیا چارہ جوئی ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک عجیب و غریب مثال انجمن تان کے منشور عظم سے دی جاسکتی ہے جو اس زمانے کا ایک صرح کا مکتوبی دستور تصور کرنا چاہئے۔ منشور عظم کے دفعہ ۶۱ کی رو سے منتخب شدہ اور کو یہ باضابطہ اختیارات دیے گئے تھے کہ اگر شاہ جان منشور کے دفعات کی خلاف ورزی کرے تو وہ اس کے خلاف بغاوت کر دیں۔ یہ محض مثلاً بیان کیا ہے

ٹلے برنس: دولت عامہ امریکہ۔ *Bryce: American Common Wealth.* باب ۲۲

ٹلے اس کے لئے دیکھو ویل لینگ میڈ "تاریخ دستور انگلستان"

Taswell Langmead: English Constitutional History. باب ۴۔

اس لئے کہ حق بغادت اگر کوئی حق ہے تو وہ آج کل دستور سے باہر تصور کیا جاتا ہے۔ انگلستان میں بادشاہ کو قانونی دست برد سے مامون قرار دیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے چودھویں صدی عیسوی میں مواخذہ کا طریقہ رائج ہوا یعنی اگر کسی شاہی ملازم سے کوئی خلاف آئین کام سرزد ہو جائے تو اس کے دربار پر دارالعوام کی طرف سے دارالاعراض یا ضابطہ مقدمہ چلایا جاتا۔ اب آج کل یہ سمجھا جاتا ہے کہ مواخذہ کا طریقہ مسدود ہو چلا ہے اور اس کی بجائے محض اس پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ اگر ایوان عام کسی وزیر کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد منظور کر دے تو اسے مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ اگر کوئی وزیر مستعفی نہ ہو تو اس کا فوری اثر یہ ہوگا کہ دارالعوام اخراجات سلطنت کے لئے روپیہ کی منظوری نہیں دے گا اور نہ جو "قانون انواج" سال بسال منظور ہوتا ہے اسے منظور کرے گا جس کی وجہ سے ایک تو خرچ کے لئے ایک جیسے بھی محصول کا لینا خلاف قانون ہوگا دوسرے ملک کی حفاظت کے لئے فوج نہیں رہے گی۔

تاویل و دستور: جہاں تک تاویل دستور کا تعلق ہے یعنی یہ کہ آیا کسی ادارے کا کوئی فعل خلاف دستور تو نہیں ہے، تو اس بارے میں دو مختلف طرز عمل رائج ہیں۔ بعض ممالک مثلاً ممالک متحدہ امریکہ میں اس مسئلہ پر تجویز ناظرین کا اختیار عدالت عظمیٰ کو حاصل ہے، گو بدن کسی خاص مقدمہ کے عدالت عظمیٰ کے سامنے جانے کے عدالت عظمیٰ کسی منظور شدہ قانون کو خلاف آئین نہیں کہہ سکتی۔ عدالت عظمیٰ کے جامعیت متفقہ پر اس تفوق کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وفاقیہ کا جو دستور ہوتا ہے وہ دراصل مرکزی ادارات اور ریاستوں کے مابین ایک طرح کی

مفاہمت اور عہد نامہ ہوتا ہے، اور اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی ادارہ ایسا ہو کہ دونوں فریقوں کے مابین نزاع کی صورت میں غیر جانبدارانہ اور منصفانہ فیصلہ کر سکے اس کے برعکس ان ممالک میں جہاں فروی طرز حکومت رائج ہے وہاں علی العموم دستوری تغوی کسی عدالت کو حاصل نہیں ہوتا بلکہ دستور کے تحت جماعت مقننہ کو حاصل ہوتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ یہاں اگر جماعت مقننہ کوئی ایسا "قانون منظور کرے جس کا اسے حق نہیں یعنی جو اس کے اقتدار سے باہر ہے تو ایسی حالت میں کیا ہوگا۔ مثلاً اگر فرانس کی پارلیمنٹ ایک قانون منظور کر دے کہ آئندہ بجائے دو کے ایک ہی ایوان ہو، یا یہ کہ صدر جمہوریہ بجائے سات سال کے آٹھ سال تک صدر رہے، تو کیا ہوگا۔ جواب یہ ہے کہ اس وقت تک نہ اس قسم کی صورت پیش آئی نہ عدالت کے کسی قانون کو خلاف آئین تصور کیا بعض ممالک میں خصوصاً ان ممالک میں جہاں انتظامی رائج ہے، عدالت کو دستوری معاملات میں کسی قسم کی مداخلت کا حق دینا "تفریق اختیارات" کے اصول کے خلاف اور آزادی قانون سازی کے منافی تصور کیا جاتا ہے۔ انگلستان جیسے ملک میں جہاں پارلیمنٹ ہی تمام ادارات اور اداراتی اختیارات کا منبع و مرکز ہے، خود اس کے حدود اختیار سے تجاوز کرنے کا مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا، اور جو کچھ پارلیمنٹ منظور کر لیتی ہے، خواہ وہ دستوری معاملہ ہو یا غیر دستوری، وہی ملکی قانون قرار پاتا ہے۔

۱۱۔ اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ "قانون پارلیمنٹ" (۱۹۱۱ء کے دفعہ ۵۳) پر

(بقیہ ماضیہ ۵۳۵)

بموجب صدر ایوان عام کی اس سند کے خلاف کہ کوئی خاص قانون، مالی قانون ہے یا کسی خاص قانون کے منظوری میں وہ تمام مدارج طے ہو چکے ہیں جو قانون پارلیمنٹ سلاسلہ کے معین کردہ ہیں، بالکل باطل قرار دی جائے گی اور کسی عدالت میں اس کے خلاف کوئی چارہ جوئی ممکن نہ ہوگی۔

Copyright © 1954 by the author

ضمیمہ باب ۲

تمثیلات دساتیر

الف، لچکدار دساتیر۔ انگلستان۔ فریستان۔ آٹلی۔ دب، اشتوار دساتیر۔
فرانس۔ سوئستان۔ مالک متحدہ امریکہ۔ انج، جنوبی افریقہ۔ آسٹریلیا۔
روس۔ ہندوستان

الف، لچکدار دساتیر، یعنی وہ دساتیر جن میں تبدیلی بالکل اسی طرح سے
مکن ہے جیسے معمولی قوانین میں ہے۔

(۱) انگلستان، یہاں دستوری قوانین اور معمولی قوانین کے درمیان
عام طور پر کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا۔ قوانین کی منظوری کے دو طریقے ہیں۔
(۲) ایران عام اور ایوان امرا قوانین کو ضابطہ کے مطابق منظور کر لیں اور

سلطہ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ دستوری رسم و رواج کے ماسخ ہونے کی وجہ سے انکی تبدیلی
شاید استوار دستوروں کی ترمیم سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ مثلاً بادشاہ اور دارلارام کے
اختیارات میں قطع و برید تو ہو سکتی ہے لیکن دارلارام کی ہیئت میں ترمیم اس وقت تک
مکن نہیں ہوئی ہے۔

بادشاہ کے دستخط ہو جائیں (۲) اگر ایوانِ امرا منظور کرے تو قانون پارلیمنٹ کے لئے روئے اگر ایوانِ عام کسی قانون کو (جو مالی قانون نہ ہو) تین متواتر اجلاسوں میں منظور کرے اور ایوانِ امرا اسے ہر دفعہ منظور کرے تو ایسا مسودہ براہِ راست بادشاہ کے دستخطوں کے لئے پیش کر دیا جائے گا بشرطیکہ پہلے اجلاس کی دوسری خواندگی اور تیسرے اجلاس کی تیسری خواندگی کے درمیان دو سال کا وقفہ ہو۔ ایسی حالت میں صدر ایوانِ عام ایک سند تسلیم کرے گا کہ قانون پارلیمنٹ کے لازماًت پورے ہو گئے ہیں۔ اس سند کے خلاف کسی عدالت میں چارہ جوئی نہیں کی جاسکے گی لیکن دارالامرا کی ترکیب میں تبدیلی بغیر خود ایوانِ امرا کے منظوری کے نہیں ہو سکتی۔

(۲) **نوزیستان** کے قانون دستوری ہیں جو انگلستان کی پارلیمنٹ کا ایک قانون ۱۸۵۸ء کا ہے، یہ صریحاً لکھا ہے کہ یہاں کی جماعت مقننہ اس قانون کو اسی طرح سے تبدیل کر سکے گی جیسے کسی دوسرے قانون کو۔

(۳) **اٹلی** میں تمام دستوری تغیرات کے مسودے اور درانت تخت و تاج تبدیلیوں کی تحریکات ناشی مجلسِ عظمیٰ کے سامنے آنے چاہئیں جس میں ۲۵ سے ۴۰ تک ارکان ہوتے ہیں جو سب کے سب ناشی زن کے

رکن ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ اٹلی میں کوئی قانون بھی بغیر اس مجلس کی رائے کے نہیں بن سکتا اس لئے (علاوہ دستور ۱۸۴۸ء کے جو ایک لچکدار دستور سے اور جواب بھی اٹلی میں برائے نام رائج ہے) یہاں کے ناشی دستور کو بھی لچکدار کہا جاسکتا ہے۔

(۴) جرمنی میں نالی فریق کے برسر اقتدار آنے کے بعد تمام قوانین کا خواہ وہ دستوری ہو یا غیر دستوری، منع ہٹلری کا مینہ ہے، اور وہ ہمہ تری دستوری قوانین کو تبدیل کر سکتی ہے بلکہ

(ب) استوار دساتیر

(۱) فرانس۔ استوار دساتیر میں سب سے لچکدار دستور فرانس کا موجودہ نہایت مختصر دستور ہے جو دراصل آن تین قوانین کا مجموعہ ہے جو فروری اور جولائی ۱۸۷۵ء میں منظور ہوئے تھے۔ یہ پورے دستور پر عادی نہیں ہیں، چنانچہ بہت سے ایسے معاملات ہیں جو حقیقت میں دستوری ہیں لیکن جنہیں معمولی قوانین کی طرح بدلا جاسکتا ہے، فالص دستوری قوانین کی

۱۵ اٹلی کے دستور کے لئے دیکھو پی لی نیائی: "اطالوی شخصیات کی ملکیت"

Pitilignami: The Italian Corporative

State. باب ۵۔

۱۵ دیکھو "سالانہ رجسٹر" *The Annual Register.*

۱۹۲۶ء ۱۵

تبدیلی صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ پہلے ترمیم ہر ایوان میں اکثریت سے منظور ہو اور اس کے بعد دونوں ایوان مشترکہ نشست و پرسائی میں کریں، اور ترمیم اس مجلس میں جسے قوی آہلی کہتے ہیں، اکثریت سے منظور ہو جائے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے، کہ فرانس کا دستور کبھی ایسے تبدیل نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی نوعیت بجائے جمہوری کے ملوکی ہو جائے۔

سویٹان۔ یہاں کا دستور ۱۸۷۷ء میں مدون ہوا۔ اس کی تبدیلی کے لئے حسب ذیل ضابطے کی ضرورت ہے:-(۱) اگر دونوں ایوان کثرت رائے سے دستوری تبدیلی کے موافق ہوں تو اس کی فیصلہ طلبی کیا جائے گا اور ساتھ ہی جملہ کینیٹوں کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ دونوں صورتوں میں اکثریت ہوئی تو ترمیم منظورہ تصور کی جائے گی (۲) اگر ۵۰ ہزار شہری کسی ترمیم کی تحریک کرنا چاہیں تو یا تو وہ مکمل ترمیم مسودہ کی شکل میں پیش کریں گے ورنہ صرف اصول پیش کریں گے۔ ادل الذکر حالت میں جمیعت وفاقی اس ترمیم کے ساتھ اپنے مسودہ کی بھی فیصلہ طلبی کر سکتی ہے، اگر ان ۵۰ ہزار شہریوں نے صرف اصول ہی پیش کیا تو وفاقی اسمبلی کی اصولی منظوری کے بعد وفاقی مجلس (یعنی جماعت عالمہ) اس کی تلافی

شہ دیکھو رام و شرما: "سیاسی نظریہ اور حکومت اے عالمیہ" Ram and Sharma: Political Theory and modern Government. - جلد ۲، باب ۹۔

نیکل میں لاکر فیصلہ طلبی کرے گی۔ اگر دفاعی اسمبلی نے ترمیم منظور نہ کی تو پہلے اس مسئلے پر فیصلہ طلبی ہوگی کہ آیا عوام کو ترمیم مجوزہ قابل قبول ہے یا نہیں۔
 بہر حال آخری فیصلہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ کینٹن میں لوگوں کی اکثریت دیکھی جاتی ہے اور اکثریت کو اس کینٹن کی ایک رائے قرار دیا جاتا ہے، اور پھر جس طرف کینٹنوں کی اکثریت ہوگی وہی ترمیم کا حشر ہوگا۔

ممالک متحدہ امریکہ، دستور کا نفاذ مارچ ۱۹۷۱ء میں ہوا۔ اس میں ترمیم حسب ذیل طریقے سے کی جاتی ہے۔ (۱) تحریک، (الف) کانگریس کے ہر دو ایوان کے اراکین کی پانچ اکثریت ترمیم کی تحریک پیش کر سکتی ہے یا (ب) ریاستوں میں سے پانچ کانگریس کو ترمیم کی درخواست کریں اور کہیں کہ کانگریس ترمیم کیلئے ایک مخصوص اجتماع طلب کرے۔ دونوں صورتوں میں آخری منظوری کے لئے ریاستوں کی تعداد کی پانچ اکثریت لازم ہے۔

انچا و جنوبی افریقہ۔ علاوہ مفصلہ ذیل امور کے باقی جملہ دستوری امور معمولی قوانین کی طرح منظور ہو سکتے ہیں۔ استثنائی امور حسب ذیل ہیں (۱) ملک کے دیسیوں کے حقوق (۲) دیسی علاقوں، مثلاً بوسوتان، بچوانا، سوانزیستان وغیرہ کے انتظامات۔ ان امور میں تبدیلی یا ترمیم کے لئے دونوں ایوان کی پانچ نشست کرتے ہیں اور آخری منظوری کے لئے کم از کم پانچ اکثریت

لازمی ہے۔

آسٹریلیا۔ (۱) اگر ترمیم پہلے ہر ایوان کی اکثریت سے منظور ہو تو اس کے بعد ہر ریاست میں جو مرکزی دارالنائین کے رائے دہندہ ہیں ان سے فیصلہ طلبی کی جاتی ہے۔ (۲) اگر صرف ایک ہی مرکزی ایوان منظور کرے دوسرا نہ کرے اور تین مہینے کے بعد پھر اسی ایوان سے منظور ہو جائے تو گورنر جنرل کو اختیار ہے کہ دوسرے ایوان کی رائے کے ساتھ یا اس کی رائے کے بغیر فیصلہ طلبی کرے۔ اگر ریاستوں میں سے زیادہ تعداد میں جو رائے دہندے ہیں ان کی اکثریت سے فیصلہ طلبی منظور ہوگی تو ترمیم منظورہ تصور کی جائے گی۔

لیکن اگر ترمیم سے کسی خاص ریاست کے حدود میں تغیر ہوتا ہو یا کسی ریاست کے ارکان جماعت متفہنہ کے تناسب میں کمی ہوتی ہو یا اس کے مخصوص میں کسی قسم کی ترمیم چاہی جاتی ہو تو ایسی حالت میں علاوہ فیصلہ طلبی کے خود اس ریاست کے رائے دہندوں کی اکثریت بھی ترمیم کے لئے ضروری ہوگی۔

روس کے جدید دستور کے تحت، جو ۱۹۱۷ء میں نافذ ہوا، "مجلس عالی" یعنی جماعت متفہنہ کو دستوری ترمیمات کرنے کا بھی اختیار ہے بشرطیکہ ہر ایوان کا ترمیم کے موافق ہو۔

شہ شرینگ: حسب بالا، باب ۱، ۵۔

۵۴۲

ہندوستان کا موجودہ دستور۔ برطانوی پارلیمنٹ کے "قانون حکومت" ہند ۱۹۴۷ء پر مبنی ہے اور انہیں برطانوی پارلیمنٹ ہی ترمیم کر سکتی ہے۔ ہندوستانی جماعت ہائے مقننہ کو اس کے بارے میں معمولاً سفارش کا بھی اختیار نہیں۔ لیکن بعض امور میں ایسی سفارش کا اختیار ہے، جس کے متعلق ایک خاص ضابطہ مقرر ہے۔ یہ وہ امور ہیں جن کی نوعیت صوبہ داری یا مرکزی جماعت ہائے مقننہ کی ترکیب، تعداد اراکین اور رائے دہی کے متعلق ترمیمات کی ہو، بشرطیکہ ان ترمیمات کا تعلق اس مناسبت سے نہ ہو جو دونوں ایوانوں کے اراکین کی تعداد سے یا مرکزی جماعت مقننہ کے برطانوی ہند اور ہندوستانی ریاستوں کے اراکان کے درمیان ہے۔

- ایسی ترمیموں کے متعلق جو ضابطہ قرار پایا ہے وہ یہ ہے کہ
- (۱) صوبہ داری یا مرکزی ذریعہ مجلس وزراء کی طرف سے دونوں ایوانوں میں تحریک کرے اور اس تحریک کی دونوں ایوانوں میں منظور ہو۔
 - (۲) دونوں ایوان گورنر یا گورنر جنرل کے سامنے ایک معروضہ پیش کریں اور استدعا کریں کہ پھر وہ ملک معظم کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ ملک معظم پارلیمنٹ کو ایوان کی خواہش سے آگاہ کر دیں۔

اللہ اس قانون کا ایک اچھا محض ایڈیٹر کرن کی کتاب "ہندوستان کا جدید دستور" Eddy and Lawton: India's new Constitution

یہ دیا ہوا ہے۔

(۳) گورنریا گورنر جنرل یہ معروضہ وزیر ہند کے پاس روانہ کریں تو اس کے ساتھ ساتھ اپنی رائے بھی بھیجیں کہ اس ترمیم کا کسی خاص اقلیت پر کیا اثر پڑیگا اور ساتھ ہی اقلیت متاثرہ کے خیالات کی بھی ترجمانی کریں۔

(۴) وزیر ہند تمام کاغذات کو پارلیمنٹ کے روبرو پیش کریں گے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس قسم کی ترمیم کا حق (سوائے عورتوں کی حق رائے دہی کے مسئلے کے) نفاذ دستور سے دس سال کے اندر حاصل نہیں ہوگا۔ گو پارلیمنٹ کو جب چاہے کسی قسم کی ترمیم کا حق حاصل ہے نیز کسی ریاست کی نیابت جماعت مشفقہ میں کوئی ترمیم اس ریاست کے دالئی ملک کی مرضی کے خلاف نہیں ہو سکے گی۔

Internationalism 4/10/11

باب ۲

بین الاقوامی ہمیت

ملکت کا مقصد اعلیٰ "قومی اور بین الاقوامی" نظریات۔ بین الاقوامی تعلقات کی تاریخ کا ارتقا۔ انجمن اقوام کا جنم۔ اعضاء انجمن اقوام نصفیہ تنازعات بین الاقوامی عدالت تنظیم مزید۔ تفویض۔ ملتیں۔ تہذیب۔ انجمن اقوام کا ارتقا۔

ملکت کا مقصد اعلیٰ۔ اس سے قبل ایک باب میں 'جہاں ملکت کا سطح نظر اور مقصد عظیم کا تجزیہ کر لے کی کوشش کی گئی تھی' وہاں یہ دکھایا گیا تھا کہ جو اصول ملکت کی کارفرمائی میں سب سے اہم ہے وہ عدل و مساوات کا اصول ہے، اور اگر اس خیال کو ترقی دی جائے گی تو نسلی، معاشری، لسانی قومی اور برعظیمی تنگی سے نکل کر دنیا کی ممکنہ ایک ارفع و اعلیٰ سطح نظر یعنی بین الاقوامی تختی پر کاربند ہو کر ایک عالمگیر بھائی چارے کی بنیاد ڈالیں گی۔ یہ ایک ایسا تختی ہے کہ بجائے اس کے کہ دنیا اس طرف آئے اس سے گریز کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور شاعر کا جو مقصد اور آرزو

نبی آدم اعضائے یک دیگر اند کہ از آفرینش ز یک جوہر اند
 چو عضوئے بدست آفرورزگار در عضو ارا نامند سترار

سے ظاہر ہوتا ہے وہ بظاہر صد بصحرا سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ تاہم اس میں
 شبہ نہیں کہ مدت دراز سے بڑے بڑے مفکروں کا خیال رہا ہے کہ انسان
 اور انسانی اجتماعات کو ایک دوسرے سے قریب تر لائیں تاکہ دنیا کے ایک
 ٹکڑے والے دوسرے ٹکڑے والوں کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس مقصد
 کے لئے انھوں نے طرح طرح کے اصول اور طریقے پیش کئے ہیں، چنانچہ
 بقول ایک سیاسی مفکر کے، شاید تاریخ عالم میں کوئی زمانہ ایسا نہیں آیا جس میں
 امن و امان کے دیوتا کے سامنے رہائی تسلیم و رضا کی مانا نہ جی گئی ہو۔ ان
 خیالات میں سے بعض لوگ موتی طور پر کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن بالآخر نسلی
 قومی اور ملکیتی خرد غرضیوں کا بول بالا رہتا ہے اور یہ جذبات، جو بعض کے نزدیک
 محض مصنوعی اور فی الجملہ نبی آدم کو نقصان پہنچانے والے ہیں، آخر اس پر غالب
 آجاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال کے اعتبار سے دنیا ہمیشہ ایک دائرے
 میں ہرگز گزرتی رہی ہے۔ جب کوئی ملک کسی جنگ یا اندرونی خلفشار کی وجہ سے
 مصیبت کی حالت میں ہو کر گزر چکنا ہے تو اس کے بعد اس میں ایک طرح کا عقل
 ہوتا ہے اور جنگ کے اصول سے نفرت کے ساتھ بین الاقوامی جذبہ بھڑھرتا ہے۔

۵ پولارڈ "تاریخ بین الاقوام" Pollard: The League
 of Nations in History.

رد عمل کے دور کے بعد وہ اپنی کھوئی ہوئی ثروت کو خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر واپس لانے لگتا ہے تو اس میں قومی جذبات موجزن ہوتے ہیں، خصوصاً اگر اسے شکست مل چکی ہو اور اپنی ترکیبوں سے اسے پھر بننے کا موقع مل گیا ہو۔ ایسی حالت میں ہمسایہ اقوام سے نفرت کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں اور جو بین الاقوامی جذبہ ہے وہ نسا ہو جاتا ہے۔ ابھی تک ”ہمسایہ کی محبت“ اپنے ہمسر کے ساتھ عدل“ اور ”مستقل جذبہ جس کے تحت انسان محض اپنے ماحول اور ملکی اغراض سے باہر دیکھ سکے، مفقود معلوم ہوتا ہے۔

”قومی“ اور ”بین الاقوامی“ بہر حال پختل کہ نبی آدم میں خواہ کہیں بھی رہتے ہوں، کسی نسل سے پیدا ہوں، کسی رنگ روپ کے ہوں، یگانگت ہونی چاہئے، اور انسان کو انسان کے خون کا پیاسا نہ ہونا چاہئے، برابر کار فرما رہا ہے، اور برگزیدہ انسان ہمیشہ ایسے قواعد کی ٹوہ میں رہے ہیں جن کے ذریعہ سے انسان میں اپنے بھائی کے خلاف ہمہیت کے جذبہ میں کچھ ٹھوڑی بہت کمی ہو جائے۔ یہی وہ قواعد ہیں جنہیں آج کل مجموعی طور پر بین الاقوامی قانون کا اختیار دیا جاتا ہے اور جو اس موجودہ دور میں رد و بروز اپنی اہمیت میں گزر رہے ہیں اس مسئلے پر بہت کچھ بحث ہو چکی ہے کہ آیا ان قواعد کو ہم قانون کا لقب دے سکتے ہیں یا نہیں۔ کسی منظم معاشرے میں وہ شخص یا جماعت، جسے حکم دے اور اپنا حکم ضرورت ہو تو جبراً منوانے کا اختیار ہو، اگر ایسے احکام نافذ کرے جسے معاشرے کے عام ارکان کو ماننا پڑے، تو یہ احکام قانون کہلا سکیں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا کوئی ایسا معاشرہ ہے جسے بین الاقوامی قانون ساز کہا جاسکے۔ اول تو کسی

مملکت کے شہری اور بین الاقوامی حیثیت سے کسی مملکت کی کیفیت میں تین فرق ہے، اس لئے کہ جہاں شہری قانون کا پاس کرنے پر مجبور ہے وہاں اگر کسی مملکت کے بین الاقوامی فرائض اور اس کی قومی مفاد کے درمیان تصادم ہو تو یہ مملکت کم از کم زیر بحث ضرور ہو جاتا ہے کہ مملکت کے لئے کون سا طرز عمل مناسب ہے، اور بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو حب وطن کو بین الاقوامی تحیل کی قربانگاہ پر چڑھانے کے لئے تیار ہوں۔ پھر جہاں مملکت میں ایک ادارہ ایسا ہوتا ہے جو خلافت قانون کارروائی کا جبراً انسداد کرتا ہے وہاں اس قسم کا بین الاقوامی ادارہ اس وقت تک ایجاد نہیں ہوا جو عملاً کسی غلط کار مملکت کو جبراً صحیح راستے پر لگا سکے خصوصاً ایسی مملکت کو جو قوت و سطوت میں کسی سے ہٹی نہ ہو یا جس کی بین الاقوامی حیثیت ایسی ہو کہ وہ مختلف مملکتوں کے درمیان حاجب کی ظہیر ہو۔ کسی نے خوب مثال دی ہے کہ جس طرح ایک نوجوان شخص پسند نہ کرے گا کہ اس کا کوئی ہمسر اس کے خاکی معاملات میں مداخلت کرے اسی طرح سے کوئی مملکت جو مستند ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور جس میں اس دعوے کی تائید کے لئے قوت بھی ہے، وہ اندرونی معاملات میں کسی قسم کی بیرونی جبری مداخلت کی تاب نہ لائے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی قوت دالی مملکت کسی مکرر مملکت کے معاملات میں

شع بک، "اصول سیاسیات" Sidgwick: Elements of

Politics. باب ۱۸ دفعہ ۱۔

مداخلت کیے یا اس پر جبر کرے یا اسے فنا کر دے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ بین الاقوامی معاملات زیادہ تر کسی قسم کی مشترک اجتماعی توت پر نہیں بلکہ چند طاقتور ملکوں کی توت پر مبنی ہوتے ہیں۔ مملکت کے اندر باشندوں کی تعداد اس قدر کثیر ہوتی ہے کہ ان میں مشکل سے کوئی ایک دو اشخاص ایسے ہوتے ہوں گے جن کا اقتدار قطعی طور پر بلا شرکت غیرے دوسرے تمام اشخاص سے بڑھا ہوا ہو۔ لیکن بین الاقوامی تعلقات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ملکوں کی تعداد نہایت تنہیل ہے۔ تمام دنیا کی ملکوں کو لیا جائے تو ساٹھ ستر سے زیادہ نہیں اور ان میں اکثر ملکیتیں ایسی ہیں جو چند مخصوص ملکوں، مثلاً انگلستان، فرانس، جرمنی، امریکہ، جاپان، روس، اٹلی وغیرہ سے کہیں کمزور ہیں، جس کی وجہ سے ہوتا رہی ہے جو یہ چند طاقتور ملکیتیں چاہتی ہیں اور باقی ملکیتیں ایک طاقتور مملکت یا دوسری طاقتور مملکت کا منہ دکھا کرتی ہیں۔

دردار رہیں ہیں جن سے کسی مملکت کے اندر شہری کی حیثیت اور بین الاقوامی

یہ مسئلہ جب جنگ جھٹہ کے موقع پر انگلستان اور فرانس نے چند تہدیدیں اٹھی پرعامد کرنا چاہیں تو ۲۰ھ ملکوں نے جو انجمن اقوام میں شامل تھیں یعنی علاوہ البانیہ، آسٹریا اور ہنگری کے باقی سب رکن ملکوں نے، تہدیدوں کو تسلیم کر لیا۔ لیکن عدیس اربابا کی فتح کے بعد جب انجمن اقوام میں انگلستان اور فرانس نے تہدیدوں کو واپس لینے کا ارادہ کیا تو جملہ ارکان کو بھی آتنا صدقنا کہنا پڑا۔ انجمن اقوام پر جنگ جھٹہ کے اثرات کے لئے دیکھو "سالانہ رجسٹر" Annual Register ۱۹۳۶ء حصہ ۱، صفحہ ۱۵۹۔

تعلقات میں ملک کی حیثیت میں گو نہ فرق پایا جاتا ہے، خانگی معاملات میں اگر کوئی فرد کسی دوسرے فرد سے جبراً کسی دستاویز پر دستخط کرے یا معاہدہ پر رضا مندی لے لے تو قانوناً یہ دستاویز یا معاہدہ کا عدم سمجھا جائے گا، لیکن بین الاقوامی معاملات میں اس اصول کا نفاذ دشوار ہے، اس لئے کہ یہاں تو بیشتر معاہدات پر ہر ایک فریق دوسرے فریق سے دب کر ہی دستخط کرتا ہے، اور ایسے معاہدات قطعاً جائز قرار دئے جاتے ہیں۔ پھر خانگی معاملات میں حفاظت خود اختیاری کے اصول کو صرف اس وقت کام میں لایا جاسکتا ہے جب کوئی شخص حکم کرے، لیکن بین الاقوامی معاملات میں اس حفاظت خود اختیاری کے اصول میں بڑی سست و کشادگی گنجائش ہے، اور بعض اس واسطے کی بنا پر کہ ایک ہمسایہ ملک شاید کبھی حکم کر بیٹھے، نہایت آسانی سے ادل تو اسلحہ جات میں بے انداز اضافہ کیا جاسکتا ہے اور بعض مرتبہ بغیر دوسرے کے حملے کی انتظار کے عین جس وقت پوری طور سے اسلحہ اور سامان جنگ کی طرف سے اطمینان ہو دوسرے ملک پر حملہ کیا جاسکتا ہے۔

انہی اسباب سے بعض مفکر قانون اقوام کا تعلق بجائے قانون کے محض اخلاق سے زیادہ تصور کرتے ہیں۔ ان کا یہ قول ہے کہ بجائے اس کے کہ پہلے اصول قائم کئے جائیں اور ان اصول کا واقعات پر انطباق ہو جیسا کہ قانون کے دائرہ میں ہوتا ہے، قانون بین الاقوام میں پہلے رواج پر غور کیا جاتا ہے اور

جو رواج عالمگیر ہوں یا زیادہ تر ملکوں کے باہمی تعلقات میں پائے جائیں ان سے اصول اخذ کئے جاتے ہیں، چنانچہ قانون بین الاقوام کا دارومدار زیادہ تر عہد ناموں، صلحناموں اور بین الاقوامی رسم و رواج پر ہوتا ہے۔

نیز جیسے اخلاقی تہذیبیں غیر معین ہوتی ہیں اسی طرح بین الاقوامی تہذیبیں خواد کاغذ پر کیسی ہی معین نظر آئیں دراصل غیر معین ہی ہوتی ہیں، اس لئے کہ عمل کے وقت ان کا دارومدار وقتی بین الاقوامی معاملات پر ہوتا ہے۔ باوجود اس کے بعض مفکرین قانون بین الاقوام کو قطعی طور پر قانون کہنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، اور ان کا یہ قول ہے کہ جس طرح زیادہ تر قوانین کا دارومدار رسم و رواج پر ہوتا ہے جن میں امتداد زمانہ سے قطعیت پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح قانون بین الاقوام بھی رسم و رواج پر مبنی ہے اور یہ بھی رشتہ رشتہ قانون کی طرح معین ہوتا جاتا ہے۔^۱ نظر پر بات۔ یہ سب نظریے اور خیالات حال ہی کے ہیں جب مفکرین نے قانون بین الاقوام کی ہیئت پر نظر ڈالنی شروع کر دی ہے۔ لیکن سب سے پہلے جس شخص نے قانون بین الاقوام کو ایک جداگانہ فن کا رتبہ دیا وہ ڈیلفٹ (Delft) کا باشندہ گروٹیوس تھا۔ لیکن بین الاقوامی قانون کو اپنے صحیح رتبے پر لانے کا

۱۔ اڈین ٹیم، "قانون بین الاقوام" *Oppenheim: International Law* جلد ۱، باب ۱۔ یہ خیال روز بروز آج کل کس قدر غلط ثابت ہوتا جا رہا ہے۔

۲۔ گروٹیوس ۱۵۷۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۲۵ء میں مرا۔ اس کے خیالات کے لئے دیکھو ڈونگ: "سیا

نظریات" (۱) آخر سے نوٹس کیونکہ *Dunning: Political Theories from Luther to Montesquieu* باب ۵، فصل ۴۔

سہرا گروتیوس ہی کے سر ہے۔ گروتیوس کا زمانہ یورپ میں مذہب کے نام سے
 بڑی بڑی خونریزیوں کا زمانہ تھا۔ عالمگیر عیسوی مملکت کا الزان گر چکا تھا، اس کی
 جگہ نئی نئی مملکتوں جیسے فرانس، اسپین اور انگلستان نے لی تھی اور پریشیا
 اور روس بھی ترقی کے زینے پر چڑھ رہے تھے۔ گروتیوس برجگور اور خونریزیوں
 کا بہت اثر ہوا اور اس نے محسوس کیا کہ گرجگ کا خاتمہ نہیں ہو سکتا لیکن اس کی
 قدرت کو کم کیا جاسکتا ہے، چنانچہ اس مقصد سے اس نے اپنی مشہور کتاب
 ”قانون جنگ و امن“ ۱۶۲۵ء میں لکھی۔ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے قانون
 فطری کے تقاضوں کو کام میں لایا ہے اور کہتا ہے کہ بین الاقوامی قواعد و مشقوں میں تقسیم
 کئے جاسکتے ہیں، ایک وہ قواعد جو اس قانون فطری سے ماخوذ ہیں اور دوسرے
 وہ جو مختلف مملکتوں کے مشترک قوانین فطری سے ماخوذ ہیں۔ لیکن وہ فطری قانون پر
 بہ نسبت اس دوسری مشق کے زیادہ زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ قانون فطری ہی ایسا
 اصل اور ازلی نظام ہے کہ اسی پر بین الاقوامی قواعد کی صحیح بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔ اگر ہم
 غور کریں تو محسوس کریں گے کہ بالآخر اس قانون فطری کا معیار سولے رسم و رواج
 کے کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن گروتیوس نے ایک ایسا تخلیق قائم کیا جو کئی صدیوں تک
 برابر زندہ رہا۔ اور گروتیوس کے مفروضوں کو اس کی حنفی مملکتوں نے تمام دیکھا منظور
 نہیں کیا تاہم جب بھی کسی مسئلے پر اختلاف رائے ہوتا تھا تو اس کی کتاب کا حوالہ
 دیا جاتا تھا۔ آج گروتیوس بین الاقوامی قانون کے اکہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

بین الاقوامی نظریے میں روسو کے خیالات میں گروتیس کے خلاف رد عمل نظر آتا ہے۔ روسو روایات سے سخت متنفر ہے اور کہتا ہے کہ اگر ہزاروں ظالم اقوام نے اپنے قیدیوں کو تہ تیغ کر دیا ہے..... تو بھی انسان کے ان جرائم سے متح کرنا ان کی ہیئت کو اخلاق سے کیا تعلق ہے؟ یہ نہ پوچھ کہ انسان نے کیا کیا ہے۔ یہ سوچ کہ انسان کو کیا کرنا چاہئے۔ ان لغو اور نقصان رساں "استاد" سے بچ جنھوں نے انسانوں میں غلامانہ ذہنیت پیدا کرنے اور انھیں خوشنوار اور مبذول بنانے میں مدد دی ہے۔ روسو کا خیال تھا کہ بین الاقوامی معاملات کو سلجھانے کا بہترین طریقہ یہ ہو گا کہ ملکوں کے درمیان ایک طرح کی عہدیت قائم ہو جائے جو اتحاد سے زیادہ محکم ہو لیکن دفاعیت کے حد کو نہ پہنچے تاکہ اس صورت حال کا فائدہ ہو جائے جس کے تحت یورپ میں امن کی بجائے محض التوائے جنگ ہوتی رہتی ہے اس لئے کہ کسی فریق کے دعائیہ کبھی دوسرے فریق دل کھول کر تسلیم نہیں کرتا۔ روسو کا خیال تھا کہ جنگ افراد کے درمیان نہیں بلکہ محض ملکوں کے درمیان ایک تنازعہ کی کیفیت کا نام ہے، چنانچہ متحارب ملکوں کے افراد کو بحیثیت افراد کے ایک دوسرے پر سختی کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

حکمیاتی کشمکشوں نے بھی بین الاقوامی جذبہ کو ترقی دی اور ایسے حکمیاتی کشف جیسے گالی لید، کورنیکوس، ٹیخو براسے، دیکارٹ، نیوٹن وغیرہ کا احسان

۱۵ روسو کے بین الاقوامی خیالات کے لئے دیکھئے ویل: "بین الاقوامی خیال کا ارتقاء"
 Stawell: Growth of International Thought. باب۔

کسی ایک ملک واسے پر نہیں بلکہ تمام عالم پر ہے۔ نیز علم انبیات کے اکتشافات سے یہ محسوس ہونے لگا کہ نبی نوع انسان میں ایک ایسا رابطہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ غالباً اسی خیال سے متاثر ہو کر جرمن فلسفی کانٹ ایک تجویز پیش کرتا ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ ہر دولت عاقہ اپنے ہمسایہ کے ساتھ "ایک غیر ذمہ دارانہ آزادی" کا برتاؤ کرتی ہے اور ہر دولت عامہ کو چاہئے کہ اس کے برعکس ایک ایسی لیگ میں شامل ہو جہاں چھوٹی سے چھوٹی مملکت محفوظ ہو اور امن و امان قائم رہے اور بڑی سے بڑی مملکت کو بھی کسی دوسری مملکت پر جبر کرنے کا ہمت پیار نہ ہو۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں قانون فطری کا نظریہ نفا ہوتا ہے اور ملکوں کا زیادہ تر رجحان انسانی قانون بین الاقوام کی طرف ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مختلف مملکتوں کے درمیان ایک لائق تہی سلسلہ باہمی عہد ناموں اور رضی ناموں کا شروع ہوتا ہے جن کے ذریعہ سے بین الاقوامی قواعد میں ایک قسم کی قطعیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ رجحانی صورت حال موجودہ زمانہ تک جاری رہتی ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ویسٹ لیک، لوریئر اور اپن آرم جیسے مفکر قانون بین الاقوام کو مدون

نہ ایضاً باب ۹

نہ اپن آرم باب ۲ دہدہ ۴۰

نہ لوریئر: "اصول قانون بین الاقوام" *Lorimer: Institutes of the*

Law of the Nations, ویسٹ لیک: "قانون بین الاقوام" *Westlake:*

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵۳)

کرتے اور اسے ایک قطعی حالت میں دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اس ماحول کے پیدا ہونے میں مدد ہوتے ہیں جس کے تحت انجمن اقوام ملہریں آئی۔ یہ مفکر قانون بین الاقوام کو ایک معین قانونی جامہ پہناتے ہیں، چنانچہ اوہن آئم نے قانون بین الاقوام کی تعریف جو کی ہے وہ یہ ہے کہ ”قانون بین الاقوام ایسے رواجی اور موضوعہ قواعد کا نام ہے جس کی مشن مکملتیں آپس کے معاملات کی حد تک قانوناً باندھ سبھی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس ایک دوسرا مؤرخ ذرا طعنے آمیز الفاظ میں کہتا ہے کہ ”قانون بین الاقوام صرف ادبیات اور اخلاقیات کے مجموعے کا دوسرا نام ہے۔“

بین الاقوامی تعلقات کا ارتقا۔ یہ مفکرین کے خیالات ہوئے۔

اب بین الاقوامی تعلقات کی تاریخ پر زرا نظر ڈالئے۔ یہودی قوم اپنے دشمنوں کے ساتھ انتہائی بے رحمی سے پیش آئی تھی، چنانچہ سمویں صک کے صحیفے میں مذکور ہے کہ انھوں نے طالت کو ہدایت کی کہ وہ جا کر دشمنوں کو مارے اور ”ان پر رحم مت کر۔“ بلکہ مرد اور عورت، ننھے بچے اور شیر خوار، بیل، بھیر، اور اونٹ اور گدھے تک، سب کو مار ڈالئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے عروج کے زمانے میں یہودی

دلیقہ جانشینہ ۵۵۳

International Law اور آئم ”قانون بین الاقوام“ Oppenheim

International Law

۱۱۱۱ اور آئم جلد انص

۱۱۱۱ پر لارڈ

۱۱۱۱ پرانا جلد نامہ، سمویں صک کا صحیفہ ۱۵۱۱۔

اپنے دشمن کے ساتھ کسی قسم کی روداداری کے لئے تیار نہ تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہے کہ غیر اقوام کے جو لوگ یہودیہ میں آباد تھے ان کے ساتھ اچھا سلوک ہوتا تھا۔ یونانی شہری ملکوں کے باہمی تعلقات قائم تھے اور اعلیٰ العزم ایک مملکت دوسری مملکت کے کسی شہری کو اپنی طرف سے ایک ”پردے کے ٹوس“ یا سفیر کے طور پر مقرر کرتی تھی جو اس کے مفاد کی نگہداشت کرتا رہتا تھا۔ یونانیوں کا قاعدہ تھا کہ جنگ شروع کرنے سے پہلے باضابطہ اعلان جنگ دیتے تھے اور بعض اشخاص وادارات (جیسے ندما اور بیت خانے) مامون سمجھے جاتے تھے۔

رومن سلطنت کی توسیع کے ساتھ بین الاقوامی ضرورت حال میں تبدیلی ہو گئی اور جہاں تقریباً ہر یونانی شہر کا رتبہ ایک مملکت کا تھا، اہل ایک بلدیہ یعنی روم نے اپنی حکومت بچھڑے روم کے ہر جہاں طرف شمال میں برطانیہ اور دکنستان تک، جنوب میں مصر، مشرق میں ایران تک وسیع کر لی۔ ظاہر ہے کہ ایسی مملکت کے وجود سے بین الاقوامی تعلقات صفر کے برابر ہوں گے، اس لئے کہ روم کسی دوسری مملکت کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتا تھا۔ تاہم رومن تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں بھی جنگ کی ابتدا خاص خاص ضابطوں کے تحت ہوتی تھی اور روم میں پجاریوں کا ایک خاص گروہ ایسا تھا جس کے سپرد خارجی معاملات کی دیکھ بھال تھی اور اگر کسی قوم سے جنگ چھڑتی تو اسی گروہ کے سپرد اعلان جنگ کا دینا ہوتا تھا۔ روم میں غیر مالک کے سفیروں کی ذات محفوظ سمجھی جاتی تھی اور اگر کوئی شخص کسی سفیر کو گزند پہنچاتا تو اس شخص کو سفیر کے مملکت کے حوالہ کر دیا جاتا۔ رومن سلطنت میں تقریباً تمام دنیا کے معلومہ کے باشندے آتے جاتے تھے

اور بعض روبا اور اس کے توابع میں رہ بھی پڑے تھے۔ چونکہ خاص قانون روبا کا اطلاق صرف زمین شہریوں پر ہوتا تھا، اس لئے اس کی ضرورت پیش آئی کہ غیر رومنیوں کے لئے بھی کسی قسم کے قانون کا لفا ذکر کیا جائے۔ اسی ضرورت کے تحت اس قانون کا رواج ہوا جسے ”قانون اجانب“ کہتے ہیں، جو دراصل مختلف اقوام کے قوانین کا گر یا پچوڑ تھا۔ رومن لوگ تو انہیں کے اس قدر دلدادہ تھے کہ انھوں نے جنگ جیسے ادارے کو بھی قانونی جامہ پہنا دیا اور یہ اصول قرار دیا کہ جنگ ایسی حالت میں قانوناً جائز ہوگی اگر کوئی قوم رومن سرحدوں یا سفیروں پر حملہ کرے یا عہد ناموں کو توڑے یا رومنیوں کے دشمنوں سے جا ملے۔

رومن قانون کے بعد سنوی اہتبار سے قانون اسلام کا زمانہ آتا ہے۔ اور جیسے اسلام نے ہر دوسرے انسانی ادارے میں عظیم الشان انقلاب برپا کیا، اسی طرح بین انوائی طرز عمل میں بھی بدیہی تبدیلیاں کیں۔ جس زمانے میں اسلامی اصول دنیا کے سامنے پیش کئے گئے ہیں وہ ایسا زمانہ تھا کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام نسب متحارب قوموں، فرقوں اور طبقات میں بٹی ہوئی تھی۔ اسلام نے اس تقیم کو محض اس وجہ سے حق بجانب ٹھہرا کہ اس سے شخصی قابلیتوں کی آزمائش کا پورا موقع مل سکے، لیکن ساتھ ہی وہ باہمی جھگڑوں، جنگوں اور تنازعات کی وجہ یہ قرار دیتا ہے کہ یہ دراصل قانون الہیہ سے انحراف یا شجاعت کرنے کی سزا ہے۔ مسلمانوں کے لئے جنگ کی اجازت اس حالت میں دی گئی ہے کہ مخالفین ان پر زیادتی کریں اور جنگ صرف ان لوگوں کے خلاف کی جائے جنھوں نے مسلمانوں پر ظلم کیا ہے، اور فتنہ کے ختم ہوتے ہی تلوار کو نیام میں ڈال دیا جائے، چنانچہ اگر دشمن صلح کی درخواست

کریں تو اس درخواست کو رد نہ کیا جائے۔ اس ضمن میں یہ امر قابل صراحت ہے کہ غیر مسلموں کی جماعت کی توقعیں کی گئیں ہیں، ایک وہ غیر مسلم جو مسلمانوں کے حلیف ہوں، اور اس صورت میں مسلمانوں پر لازم ہے کہ کسی حالت میں عہد شکنی کا ارتکاب اپنی طرف سے نہ کیا جائے، اور دوسری وہ جماعت ہے جو اس قسم کے عہد کو توڑے اور خود اپنے آپ مسلمانوں سے دشمنی مول ہے۔

اسلام نے جو اصلاح اسیران جنگ کی حالت میں کی وہ دنیا پر اس کا بڑا بھاری احسان ہے۔ جنگ بدر پہلی جنگ ہے جس میں اس قاعدے کی ابتدا ہوئی کہ قیدیوں کو آرام و آسائش سے رکھا جائے اور ایک قلیل فدیہ یا چھوٹی سی مدت کے عوض، (جیسے بچوں کو پڑھنا سکھانا) انھیں بالکل آزاد کر دیا جائے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نے اپنی ذاتی مثال سے ایک ایسا سبق اپنے ہم قوموں کو سکھایا جس کی نظیر آج بھی مشکل سے مل سکتی ہے، اور وہی عرب جن کے مرد تو مرد تھے، لیکن انہیں اور مقتولوں کی لاشوں پر ترس نہ کھانی تھیں، ایسے شریف بنائے گئے کہ جب پیغمبر اسلامؐ اپنے دس ہزار جاں نثاروں کے ساتھ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو آنحضرتؐ صلعم کے صریح احکام کی اطاعت میں انھوں نے ان ظالموں سے کسی کو ہاتھ نہک نہیں لگایا جنھوں نے آٹھ سال پیشتر خود حضرت محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کو نہایت درجہ ظلم و ستم کے ساتھ اپنے جہنم بھوم سے نکال دیا تھا۔

علامہ ابن بحث کے لئے دیکھو میرا کتابچہ "اسلامی دولتِ عامہ کی ابتدا" : Sherwani
 Origin of the Islamic Polity حیدرآباد دکن ۱۳۶۶ء، جس کا
 (تقریباً شش ماہ قبل)

یورپ میں روسیوں کا ڈھانچا باوجود اندرونی اور سیاسی تبدیلیوں کی پندرہویں صدی عیسوی تک قائم رہا، لیکن اس صدی کے وسط میں نئی حکومتوں کے قیام کی وجہ سے بین الاقوامی تعلقات کے تعین کی ضرورت پیش آئی، یہاں تک کہ ۱۶۴۸ء میں جنگ سی سالہ کے اختتام پر ان یورپی حکومتوں کے آزادانہ وجود کو "مقدس سلطنت" رونے بھی جو قدیم روسی روایات کی حال بھی تسلیم کر لیا، اور اس طرح عالمگیر سلطنت اور عالمگیر پائیت کا نظریہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو گیا۔ جہاں تک یورپ کا تعلق ہے، نیپولین کے عہد میں تقریباً وہی صورت حال پیدا ہوئی جو روسی سلطنت کے زمانے میں نظر آتی ہے اس لئے کہ نیپولین کی طاقت اور قوت یورپ پر اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ اس کا حکم ہمنہ قانون کے تھا خواہ وہ حکم اندرون ملک کے معاملات کے متعلق ہو یا بین الاقوامی معاملات کے متعلق۔ نیپولین کے بعد سے لے کر ۱۸۷۱ء تک کے دور کی ایک نہایت ممتاز کیفیت دول یورپ میں مخالفوں کی بہتات تھی۔ پہلا مخالف، جو مخالف "مقدس" کے نام سے مشہور ہے، ناروے کا اختراع تھا، اور اس کے ذریعہ سے یہ کوشش کی گئی تھی کہ عیسوی یورپ کو انقلاب کی زد سے بچایا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وقتاً فوقتاً کل یورپی کانفرنسیں اور کانگریسیں منعقد کر کے اختلاف یورپ کو ایک زندہ ادارہ بنانے کی کوشش کی۔ لیکن اس اختلاف کو پہلا دھکا ۱۸۶۲ء میں راجا بنگلہستان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵) ترجمہ رسالہ "ترجمان القرآن" حیدرآباد دکن کی اشاعت ربیع الاول و ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ میں طبع ہوا ہے۔

نے ہسپانوی امریکی نوآبادیوں کو جو اسپین سے باغی ہو گئیں تھیں، زیر کرنے کی تجویز سے اختلاف کیا، اور اُدھر ممالک متحدہ امریکہ کے طرف سے صدر جمہوریہ میزوں کی آواز آئی کہ امریکی معاملات میں یورپ مداخلت نہ کرے، چنانچہ آخر کار اس طریق کار کا جس کی ۱۸۹۸ء میں دانتا کی کانگریس میں ابتدا ہوئی تھی، ۱۹۰۴ء میں خاتمہ ہو گیا۔

اس وقت تک یورپ میں قسطنطنیہ میں الاقوامی معاملات میں یکسوئی پیدا کرنے کی ہوئی تھیں وہ سب عیسائی دول یورپ تک محدود تھیں۔ جنگ کریمیہ کے بعد ۱۸۵۶ء میں پہلی مرتبہ ایک ایسی مملکت کو جسے غیر یورپی تصور کیا جاتا تھا اور جو نہ عیسائی نہ تھی، اختلاف یورپ میں شامل کر لیا گیا۔ یہ مملکت ترکی تھی۔ حقیقت میں یہاں بجائے محض یورپی تخیل کے بین الاقوامی سیاسیات میں ایک سنساری تخیل کی ابتدا ہوتی ہے۔ جب ۱۸۶۶ء کے بعد جاپان پر وہ اٹھا کر میدان سیاسیات میں نمودار ہوتا ہے اور اپنی قوت کا سکھ جا کر اپنے ملک میں غیر ممالک اختیارات کا خاتمہ کر دیتا ہے، اور پہلے چین کو پھر روس کو شکست دیتا ہے، تو یورپی دول اس کی عزت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اسے اپنے پہلو میں جگہ دیتے ہیں۔

انیسویں صدی کے اختتام سے لے کر ۱۹۱۴ء تک کا زمانہ بین الاقوامی تخیل میں ترقی کا زمانہ تھا۔ زار روس نے ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء میں جو بین الاقوامی کانفرنسیں ولندستان کے پایہ تخت ہیگ میں مجتمع کی اس کے ارکان نے ایک معاہدہ پر دستخط کئے، جس کی رو سے قرار پایا کہ ایک مستقل عدالت نمائشی قائم ہو،

جس میں ہر متنازعہ مملکت کے چار متنازعہ متفقین مقرر کرے، اور اگر دو مملکتوں کے درمیان تنازعہ ہو تو ان متفقین سے ہر فریق دو دو تینوں کا انتخاب کرے جو ایک سربراہ کا خود انتخاب کریں۔ یہ بھی قرار پایا کہ ثالثی قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار فریقین کو حاصل ہو گا۔

جنگ روس و جاپان کے اختتام پر زار روس ہی کے ایسا ہیئتہ میں دوسری کانفرنس ہیگ ہی میں جمع ہوئی اور اس میں علاوہ اصول ثالثی کی توسیع کے قانون جنگ پر بحث ہوئی۔ یہ بحث ختم نہ تھی اس لئے انگلستان کی دعوت پر ۱۹۰۷ء میں ایک کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی جس نے بحری جنگ کے بعض قواعد پر طول طویل غور کر کے ایک "اعلان لندن" منظر کر کیا، لیکن اس اعلان کی اس وقت تک خود برطانوی پارلیمنٹ نے توثیق نہیں کی ہے اور اب اسے کالعدم تصور کرنا چاہئے۔

اس دوران میں ہیئت سے بین الاقوامی ادارے عدم سے وجود میں آئے، جیسے سنساری اتحاد تار برقی، سنساری اتحاد ڈاک، ادبیات اور فنون لطیفہ کے شاہکاروں کی حفاظت کا ادارہ، سکے، اوزان اور پیمانوں کی یکسانی کے لئے محالفے اور اتحاد وغیرہ۔ نیز حکمیاتی امکانات کے متعلق بھی بعض بین الاقوامی محالفے اور اتحادات قائم ہوئے ان ادارات میں شاید سب سے اہم صلیب احمر ہے جس کا اسلامی ممالک میں انجمن ہلال احمر نام سے لگایا اور جس کا مقصد جنگ کے زخمیوں کی نگہداشت اور مرہم بٹنی کرنا تھا۔ لیکن جنگ عظیم نے ان تمام کیفیات کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اور ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۹ء

کا زمانہ دراصل بین الاقوامیت، رواداری، حق پرستی اور انصاف کے خلاف رد عمل کا زمانہ تصور کرنا چاہیئے۔

بین الاقوامی تنظیم - پندرہویں صدی عیسوی سے برابر یورپ کے مختلف ملکوں، مثلاً فرانس، ہولینڈ، اٹلی میں بڑے بڑے مفکر اور دُعا کسی نہ کسی قسم کے بین الاقوامی ادارے کی تجویز پیش کرتے رہے تھے جو مختلف مملکتوں کے باہمی تنازعات کو طے کرنے میں مدد دیا جو اپنا حکم ان سے جبراً منوا سکے۔ لیکن یہ سب اتحاد پر ناقابل عمل ثابت ہوئیں اس لئے کہ یورپ میں اس قدر باہمی نفیض رہا تھے کہ کسی قسم کی مفہمت ممکن ہی نہ تھی۔ بین الاقوامی اصول کو سب سے پہلی عملی فتح امریکی اتحاد سے اور اس سے بھی زیادہ تقویت جرمن اتحاد کے وقت یعنی ۱۸۷۱ء میں حاصل ہوئی۔ امریکی اتحاد تو پھر بھی ایسی ریاستوں کے مابین تھا جو رقبہ، آبادی اور حیثیت میں تقریباً مساوی تھیں، لیکن جرمن وفاقہ غیر مساوی اور متنازع، ریاستوں کے مابین تھا۔ جرمن وفاقہ میں پرورشیا جیسی عظیم الشان بادشاہی، اور اولڈن برگ جیسی ناچیز امارت شامل ہو گئی۔ علاوہ پرورشیا کے اس میں تین دوسری ملکیتیں متعدد گرینڈ ڈچیاں اور ڈچیاں، استغنی علاقے اور ”آزاد شہر“ جن کی حکومت ایک طرح کی جمہوری اصول پر مبنی تھی، سب کے سب شامل تھے، اور یہ ترکیب ایک قسم کا اشارہ تھا کہ اگر کوئی

۱۸۷۱ء قلعہ ویرا کے بعد آج بھی پرورشیا کا رقبہ ایک لاکھ تیرہ ہزار مربع میل سے زیادہ اور شاؤمر برگ کا آبادی صرف سو سو میل ہے۔

کی جائے تو بین الاقوامی وفاقیہ بھی اسی طرح سے ترکیب دیا جاسکتا ہے۔
 انجمن اقوام۔ الغرض یہ وہ نظریے اور کیفیات تھیں جن کا انجمن اقوام
 کے قیام کے مسئلے پر اثر پڑا۔ جنگ عظیم کے دوران میں (جولائی ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء
 تک جاری رہی) بین الاقوامی ادارات کو بڑا زبردست دھکا لگا، اور جب
 نومبر ۱۹۱۸ء میں یہ جنگ ختم ہوئی تو حسب سابق بین الاقوامیت کی طرف ایک
 ردِ عمل پیدا ہوا، چنانچہ صمدی جمہوریہ، وڈر ولسن نے جو وہ نقاط جرمنی کے سامنے
 پیش کئے ان میں سے یہ بھی تھا کہ ایک انجمن اقوام قائم کی جائے جس کے ذریعے
 سے بڑی چھوٹی مملکتوں کی سیاسی آزادی اور علاقہ جاتی نفوذ کی ضمانت کی
 جاسکے۔ ولسن بین الاقوامیت کے معاملے میں بڑا مطمحہ تھا، اور وہ چاہتا تھا کہ اس
 انجمن کے علاوہ کسی قسم کی مجلس یا محافلے نہیں ہونی چاہئیں۔ بہر حال انجمن اقوام
 کے قواعد و ضوابط ایک ”موافقہ“ میں تدوین ہوئے، جو بالآخر ۱۹۱۹ء
 کو ہندنامہ دیرسائی کا جزو بنا دیا گیا اور اسی حیثیت سے جرمنی کو اسے تسلیم کرنا پڑا۔
 انجمن اقوام کے شلہ چار اعضاء ہیں، یعنی اسمبلی، مجلس، معتمدی، ان کے علاوہ
 بین الاقوامی عدالت کا ادارہ بھی ہے اور گویہ انجمن کے دھانچے سے باہر تصور کیا
 جاتا ہے لیکن اس کا انجمن کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اسمبلی میں ہر مملکت کے قائم
 مقاموں کی تعداد تین سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے، گو مملکتوں کو متبادل قائم مقاموں

شلہ اس کتاب کی پہلی اشاعت میں انجمن اقوام کا مفصل ذکر تھا۔ اس وقت تک انجمن مردہ
 نہیں ہوئی تھی۔ موجودہ اشاعت میں صرف اشارے کافی سمجھے گئے ہیں۔

باب ۲۲ احمد علی احمد ۵۶۸۰
بین اقوامی ہیئت

۱۹۱۰ء - ۱۹۱۱ء
کے بھینے کا حق حاصل ہے، اس کا جلسہ سال میں کم از کم ایک مرتبہ ماہ ستمبر میں ہوتا ہے اور اس کا صدر عموماً چھوٹی ملکوں سے چنا جاتا ہے۔
انجمن کا دوسرا اسم ادارہ مجلس ہے۔ مجلس میں ابتدا میں صرف چار مستقل اور چار غیر مستقل ارکان ہیں جن میں سے ہر تین کا انتخاب تین تین سال کے لئے ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اگر کسی ایسی ملک کا معاملہ مجلس کے سامنے پیش ہو جو اس کی رکن نہیں، تو اسی ملک کو دعوت دی جاتی ہے کہ انہی طرف سے ایک قائم مقام مجلس میں موٹی طور پر نشست کر لے کے لئے بھیج دے۔ مجلس کے معاملات محض اکثریت کے ذریعے سے طے نہیں کئے جاتے بلکہ ان میں سے اہم ترین کے لئے اتفاق رائے ضروری ہے۔ موافقہ انجمن اقوام کے ذریعے سے مجلس کے سپر بعض خاص معاملات کر دئے گئے ہیں جیسے تحدید اسلحہ، تفویضی علاقوں کا انتظام، کسی ملک کی سرحد پر حملہ ہونے کی صورت میں طرز کار کا تعین وغیرہ نیز اسی کے سپر و علاقہ جات سارو ڈائنٹرگ کا انتظام اور اقلیتوں کی حفاظت بھی کی گئی تھی۔
فیصلہ ادارہ متعدی ہے۔ انجمن اقوام کا ایک مستند اعلیٰ ایک نائب مستند اور

۱۹۱۹ء سے ملائے سارا ایک غنہ علی کے ذریعے سے جرئی کو داہن مل گیا ہے اور انجمن اقوام کا اس پر کوئی دخل نہیں رہا۔ ڈائنٹرگ کی مجلس متفقہ میں جرین نامی گروہ کی اکثریت ہے اور اس کا جرین سے الحاق ناگزیر ہے۔ دوسرے اختیاری دائروں کے تنگ ہو جانے کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کے مسئلے پر بھی مجلس کا قابو نہیں رہا۔

تین درگاہیں ہیں۔ متعدد باعث ہمارے اپنے عہدے کے جمعیت اور مجلس داروں کا
 کام متحد ہوتا ہے۔ یہی مجلس کے منظوری سے معتمدی کے جملہ عہدہ داروں کا
 (جن کی تعداد تقریباً ۷۷ ہے) تقرر کرتا ہے اور یہ عہدہ دار براہ راست اس
 کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔ معتمدی کا کام ۱۴ شعبوں کے ذریعے سے
 طے پاتا ہے ان شعبوں کے علاوہ ایسے امدادی اعضا بھی ہیں جیسے ماموریہ
 حکمہ داری، ماموریہ انیون، ماموریہ حفظان صحت وغیرہ۔ انجن کامواؤں، تعمیرات
 ۱/۲ کروڑ طلائی فرانک کا ہوتا ہے جو تقریباً ۲۵ ہزار طلائی فرانک کی تقریباً ایک
 ہزار اکائیوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور ہر مملکت کو ان اکائیوں کا ایک خاص
 مجموعہ دینا پڑتا ہے۔ مثلاً برطانیہ کلاں کے متعلق ۱۰۸ اکائیاں ہیں، فرانس
 کے متعلق ۸۰، ہندوستان ۵۶، کناڈا ۳۵، اور بعض غیر اہم مملکتیں مثلاً
 لائیبریہ، اور بعض وسطی امریکی مملکتیں ایک ایک اکائی یا دس سے بھی کم ادا
 کرتی ہیں۔

بین الاقوامی عدالت۔ جنگ عظیم کے بعد موافقہ انجن اقوام کے
 چودھویں دفعہ کا اتفاق ہوا کہ مجلس انجن ایک مستقل بین الاقوامی عدالت کے متعلق
 تجاویز پیش کرے۔ لیکن اس عدالت کا قیام ۱۹۲۲ء تک عمل میں نہیں آیا۔ چونکہ
 اس عدالت کی موسس دستخط کنندہ مملکتیں تھیں کہ انجن اقوام بحیثیت انجن کے،
 اس لئے عدالت پر (سوائے عادلوں کے) انتخاب کے مسئلے کے) انجن کو کوئی

تفرق حاصل نہیں، چنانچہ انجمن عادلوں کو برطرف نہیں کر سکتی، نہ اپنی قراردادوں کا انجمن کے ذریعے سے نفاذ کر سکتی ہے اور نہ عدالت کے قواعد میں کسی قسم کی ترمیم کر سکتی ہے۔ اس وقت بین الاقوامی عدالت میں پندرہ عادل ہیں۔ ان کا تقرر اس طرح ہوتا ہے کہ ہینگ کے مستقل محکمہ منافع میں جو مختلف ممالک کے طرف سے ارکان ہیں وہ امیدواروں کو نامزد کرتے ہیں اور انجمن اقوام کی جمعیت اور مجلس ان کا جدا جدا انتخاب کرتی ہیں اور جن امیدواروں کے حق میں دونوں مجالس زیادہ سے زیادہ رائے دیں وہ نو سال کے لئے منتخب ہو جاتے ہیں۔ باوجودیکہ عدالت میں ”نندن کے رسم اشکال اور دنیا کے خاص خاص قانونی نظاموں کی قائم مقامی ہونی چاہیے“ لیکن اس وقت تک اس کارکن نہ کوئی مسلمان ہوا ہے نہ ہندو۔ عدالت خود اپنا صدر اور نائب صدر کا انتخاب کرتی ہے اور اگر کسی مملکت کا کوئی معاملہ عدالت کے سامنے پیش ہو تو اسے موثقی طور پر اپنا ایک عادل مقرر کرنے کا بھی اختیار ہے۔^۱ عدالت کا ہر اختیار دو طرح کا ہے۔ اگر دو متنازع مملکتیں اپنی خوشی سے کوئی معاملہ عدالت کے سامنے پیش کریں تو ایسی حالت میں عدالت اس معاملے کو طے کرے گی اور پھر اس کی تجاویز پر فریقین کو عمل کرنا لازم ہوگا۔

۱۔ قانون عدالت، دفعہ ۲۔

۲۔ نام و مشربا! ہندوستان اور انجمن اقوام: Ram and Shreema:
India and League of Nations باب ۲۔

ساتھی، عدالت اپنی رائے ایسے معاملات کے متعلق مجلس اوجہیت کے سامنے پیش کر سکتی ہے جس کی بابت ان کی رائے طلب کی جائے۔ نیز اگر کوئی ملک ”اختیاری دفعہ“ پر دستخط کرے تو ایسی حالت میں عدالت کو جملہ امور متعلقہ پر خود بخود اختیار حاصل ہو جائے گا۔ وہ امور حسب ذیل ہیں: (۱) کسی عہد نامہ کی تعبیر (۲) قانون اقوام کے بابت کوئی مسئلہ (۳) کسی ایسے واقعہ کا وجود جس کی وجہ سے بین الاقوامی پیمانہ کی خلاف ورزی ہوئی ہو (۴) ایسی خلاف ورزی کی صورت میں یہ جرم کا تعین۔ ابتدا میں مختلف مملکتیں اس نوع کے دستخط کر لے سے ذرا ہچکچاتی تھیں لیکن اب بعض شرائط کے تحت ان مملکتوں نے اس فقرے پر دستخط کر دئے ہیں۔ بین الاقوامی عدالت کے لئے کوئی خاص قانون شخص نہیں ہے بلکہ قانون عدالت میں حسب ذیل ماخذ قانونی شمار کئے گئے ہیں: (۱) بین الاقوامی مفاسم جن کے متعلق قواعد فریٹین تسلیم کر لیں (۲) شرائط مختلف النوع ہیں۔ برطانیہ نے جو دستخط کئے ہیں تو صرف ۱۰ سال کے لئے یا اسے مزید زمانے کے لئے جس کی برطانیہ اس کی ضرورت سمجھے۔ نیز اس کی رضامندی اس پر مشروط ہے کہ اس دفعہ کا اشران معاملات پر نہیں پڑے گا (۱) اگر زمین کوئی دوسرا طریقہ تسویہ معاملات کا نکال لیں (۲) اگر تنازعہ کسی ایسے رکن انجمن اقوام سے ہو جو برطانوی دولت عامہ اقوام کا رکن ہو (۳) اگر تنازعہ ایسے معاملات سے ہو جو بالکل سلطنت متحدہ کے متعلق ہیں۔

۱۱۱۱ ”قانون عدالت“، باب ۳۸۔ یہ مصر پر کیمبرج کی کتاب ”بین الاقوامی تنظیم“
 Yorke - Hedges: International Organization.

سے لیا گیا ہے۔ ترمیم بلکہ رد باب ۷، بالا، حاشیہ ۱۹۔

(۲) بین الاقوامی رواج (۳) متمدن اقوام کے مسئلہ اصول قانونی (۴) بین الاقوامی نظائر (۵) مستند ترین متمدنوں کی تحریریں۔

مزدبی تنظیم۔ آخری بین الاقوامی ادارہ جس کا ایک طرح کا تعلق انجمن اقوام سے ہے بین الاقوامی تنظیم مزدبی ہے۔ اس کے متعلق دو ادارات ہیں، ایک تو بین الاقوامی مزدی کانفرنس اور دوسرے بین الاقوامی مزدی فیسٹر بین الاقوامی مزدی کانفرنس سال میں کم از کم ایک مرتبہ نشست کرتی ہے اور اس میں ہر رکن مملکت کے طرف سے چار وفد جاتے ہیں، دو حکومت کی طرف سے ایک آجروں اور ایک مزدوروں کے ناظم مقام کی حیثیت سے، موخر الذکر دو وفدوں کو بھی حکومت ہی مقرر کرتی ہے گواہیے ہی لوگ مقرر ہوتے ہیں جو آجروں اور مزدوروں کی انجمنوں کے لئے قابل قبول ہوں۔ اس کی قراردادیں زیادہ تر سفارشات کی شکل میں ہوتی ہیں جن کی منظوری کے لئے کم از کم پانچ ارکان کی اکثریت ضروری ہے۔ اور اس کے بعد یہ مختلف ممالک کے حکومتوں کے سامنے بغرض توثیق پیش کی جاتی ہیں۔ مزدبی تنظیم کا ایک اہم عنصر حکومتی ادارہ ہے جس کے سپر مزدبی تنظیم کی عام نگرانی ہوتی ہے اور جو کانفرنس کے لئے پیش نامہ تیار کرتا ہے۔ آج کل اس ادارے کے ۳۲ ارکان ہیں جو ایسی مملکتوں سے لئے جاتے ہیں جن کی ”صنعتی اہمیت“ دوسری مملکتوں سے زیادہ ہے۔ بین الاقوامی مزدی دفتر بین الاقوامی مزدبی تنظیم کی گویا متمدنی کے خزانہ انجم دیتا ہے۔ اس کے ناظم کو ”حکومتی ادارہ“ مقرر کرتا ہے اور اسے علمہ کے تقرر کے وسیع اختیارات حاصل ہیں۔

بین الاقوامی مزدی تنظیم کا سب سے بڑا مقصد یہ قرار دیا گیا ہے کہ ایک بین الاقوامی مزدی اخلاقی معیار قائم کیا جائے اور اس قسم کے قواعد بنائے جائیں جن کی وجہ سے آجروں اور مزدوروں کے معاملات میں سچی پیدا نہ ہو۔ مفہمہ انجمن اقوام میں ایسے معاملات کی ایک مختصر فہرست بھی دی ہوئی ہے جیسے کارکردگی کے گھنٹوں کا تعین، بے روزگاری کا افساد، مزدور بچوں اور عورتوں کی حیانت، بے روزگاری اور مرض کا بیمہ وغیرہ۔ لیکن جیسا زمانہ گزرتا جاتا ہے مختلف ملک اپنے اپنے نظریے قائم کرتے جاتے ہیں۔ دسبے ہی اس قسم کے بین الاقوامی ادارے کا اثر بھی کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس میں تنظیم زیادہ تر مزدوروں کی غالیست کو روکنے کی غرض سے قائم ہوئی تھی، لیکن ایک طرف تو آئی اور جرمنی نے اس غالیست کو روکنے کے لئے اپنے اپنے لئے جدید طریقے رائج کئے اور دوسری طرف روس جیسے ملک کے مزدی معاملات پر ایسے بین الاقوامی ادارے کا ابتداء ہی سے اثر کم ہوتا گیا۔ نیز جو کچھ بھی اس بین الاقوامی تنظیم کی کارگزاری ہو سکتی ہے وہ محض سفارش کی خدمت ہو سکتی ہے اور ان سفارشوں کو بروئے کار لانا نہ لانا مختلف ملکوں کا اپنا کام ہے جس پر سوائے اخلاقی اثر کے کسی دوسرے طریقہ کا اثر موجودہ حالات کے تحت ممکن نہیں۔

حکمرانی اور ایتھس۔ جنگ عظیم سے پہلے جو نہیں ہوئی تھیں اس میں غالب فریق اپنے دشمن کو زیر کرنے کے بعد اسے اپنا ماتحت بنالیا کرتا تھا۔ لیکن جنگ عظیم کے دوران میں کچھ ایسا ماحول پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے اس طرز عمل کو تبدیل کرنا پڑا۔ جب روس نے ۱۹۱۷ء میں زار کو تخت سے اتار کر ایک جمہوریہ قائم کیا تو

اس نے اعلان کیا کہ ہم جو صلح کریں گے اس میں نہ تو کسی ملک کا الحاق کریں گے اور نہ خیرچہ جنگ وصول کریں گے، تو اتحادیوں میں بھی یہ سوال پیدا ہو گیا کہ جنگ حق کے بول بالے کے لئے لڑی گئی ہے اور یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ مغلوب کو بالکل کھل ڈالا جائے، ورنہ اس سے ہماری خود غرضی ظاہر ہوگی۔ جنگ کے بعد آسٹریا کے تو حصے بخرے کر دئے گئے اور وسطی یورپ میں بجائے تیر تائی تقویٰ کے اسلامی اقوام کو تیر تائیوں پر فوقیت دیدی گئی۔ لیکن جب جرمنی اور ترکی علاقوں کا سوال پیدا ہوا تو دولت محسوس ہوئی۔ اس لئے کہ اول تو الحاق کے مسئلہ لے ایک نئی شکل پیدا کرتی تھی اور پھر دول اتحاد کے باہمی معاملات میں جو الجھاؤ زار روس کے خاتمہ پر پیدا ہوا تھا اس کے اور بھی زیادہ بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔ انرض بہت غور فکر کے بعد جنوبی افریقہ کے وزیر اعظم جنرل سمٹس نے اس طرز کار کی تحریک کی جو نظام حکمرانی نام سے موسوم ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو انتطاع یا ممالک اتحادیوں نے اپنے دشمنوں سے ایسیا اور افریقہ میں فتح کئے ہیں وہ ان سلطنتوں میں تقسیم نہ کئے جائیں بلکہ کسی نہ کسی زیادہ ترقی یافتہ قوم کے زیر ہدایت (یا زیر حکمرانی) کر دئے جائیں۔

اسی اصول کو مد نظر رکھ کر موافقہ انجمن اقوام کی دفعہ ۲ کی رو سے یہ قرار پایا کہ ایسے علاقوں کو جو جنگ عظیم کی وجہ سے اپنے قدیم سلطنتوں کے ماتحت نہیں رہے اور جو فی الحال اپنے پسروں پر نہیں کھڑے ہو سکتے، انھیں ایسے "ترقی یافتہ" ممالک کے تواریث میں رکھا جائے جو اپنے وسائل، اپنے تجربہ، یا اپنے جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے اس ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر لے سکتے ہوں

اور جو اس ذمہ دار کی کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں، اور یہ ملک فیاض تولیت کو انجمن اقوام کی جانب سے ادا کریں۔ تفویض تین نوع کی قرار دی گئی۔ ان علاقوں میں سب سے ترقی یافتہ وہ علاقے تھے جو سلطنت عثمانیہ کے جزو رہ چکے تھے اور اس بدنام سلطنت نے ان کی ترقی میں کوئی دقیقہ فرو گذار نہیں کیا تھا، چنانچہ ایسے علاقوں کو تفویض الف قرار دیا ہے اور یہ طے پایا کہ انھیں موثری طور پر خود مختار تصور کیا جائے گا اور صرف یہ شرط لگائی جائے گی کہ صاحب تفویض ملک انہی صلاح اور مدد ملک مفعضہ کو دیا کرے گا۔ ان شرائط کے تحت فلسطین اور عراق برطانیہ کلاں کو اور ملک شام فرانس کو تفویض کیا گیا۔ تفویض ب میں وسطی افریقہ کے وہ علاقے شامل کئے گئے جنہیں اہل تفویض ملک کو یہاں کی حکومت کا ذمہ دار قرار دیا گیا بشرطیکہ یہ متولی ملک ”ضمیر اور مذہب کی آزادی کی حفاظت کرے، ایسے افعال شنیعہ جیسے غلامی، تجارت اسلحہ اور تجارت مسکرات کا افساد کرے کسی قسم کے قلعہ بندی یا دیسیوں کو فوجی قواعد سکھانے سے احتراز کرے، ساتھ ہی دوسرے ملک کے آزاد تجارت میں خلل نہ ہو۔“ ان شرائط کے تحت ”لنگن ریک“ برطانیہ کلاں کو، ”رواندا اردن دی بلجیم اور کامے لون“ و ”لوگستان“ برطانیہ کلاں اور فرانس کو تفویض کئے گئے۔ تیسرے وہ علاقے تھے جو جنوب و مغربی افریقہ اور بحر الکاہل میں پھیلے ہوئے تھے اور جن کے ”قلیل رقبہ“ اور قلیل آبادی مراکز تمدن سے بچد یا متولی ملک کے قرب کی وجہ سے ”بہت

مناسب سمجھا گیا کہ انھیں اہل تفویض ملک کا جزو تصور کر کے اسی کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت کر دیا جائے بشرطیکہ ایسی آبادیوں کے متعلق ان شرائط پر عمل کرے جو تفویض ب کے تحت مذکور ہیں۔ اس تفویض کو تفویض ج قرار دے کہ جنوبی مغربی افریقہ کو اتحاد جنوبی افریقہ کے متعلق، مغربی سامرا کو لوزیستان کے متعلق، نیوگنی کو آسٹریلیا کے متعلق، جزیرہ ناؤرو کو برطانیہ کمال کے متعلق اور بحر الکاہل کے باقی ماندہ جزائر کو جاپان کے متعلق قرار دیا گیا۔

حکمرانوں کے متعلق یہ اصول قرار پایا کہ سر حکمران مجلس انجمن کے سامنے ہر سال ایک رپورٹ کارکردگی پیش کرے گا اور مجلس ایک مشکل ماموریت قائم کرے گی جس کا کام یہ ہوگا کہ ان رپورٹوں پر غور کرے اور مجلس کے سامنے اپنی سفارش پیش کرے۔ یہ امر قابل لحاظ اور نہایت اہم ہے کہ فلسطین کے ناظرین حکمرانی میں اس حکمت عملی کے الفاظ شامل کر دئے گئے ہیں جس کا سب سے پہلے ۱۹۱۷ء میں لارڈ بالفور نے اعلان کیا تھا اور جس کی رو سے فلسطین کو یہودیوں کا "قومی وطن" بنانے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس کے لئے ایک یہودی ایجنسی کو اس کا مختار گردانا گیا ہے کہ وہ حکومت فلسطین کے ساتھ تعامل کرے اور یہودی قومی وطن کے قیام کے لئے آسانیاں بہم پہنچائے۔ اس طرح اس کے تحت فلسطین میں یہودیوں کی آبادی جہاں ۱۹۱۷ء میں ۵۱ ہزار تھی، ۱۹۳۷ء کے مردم شماری کی رو سے ایک لاکھ کے قریب ہو گئی تھی اور اب تین لاکھ ۲۵ فلسطین کی تفویض کے احکام اور کب بھیجیں تہہ کے طور پر دئے ہوئے ہیں۔

۱۹۷۵ء سالانہ مدبرین ۱۹۷۵ء، ۱۹۷۶ء، ۱۹۷۷ء، ۱۹۷۸ء، ۱۹۷۹ء (بقیہ خانیہ صفحہ ۵۷۳ پر)

سے زیادہ ہے جو ایہ کہ تمام یورپی ملکوں میں متحمل یہودیوں کی ایک بڑی تعداد
 تھی جو اپنے ان ہم مذہبوں کو جن کی کسی وجہ سے ان کے ممالک میں کھپت
 نہیں ہو سکتی تھی، فلسطین جانے اور وہاں آباد ہونے کے لئے رقم مہیا کرتے تھے
 انرض بہت جلد یورپ کے تمام ممالک کے یہودی جن کے لئے کہیں ٹھکانا
 نہ تھا، فلسطین آنے شروع ہو گئے اور اپنے روپیہ کے زور سے یہاں
 مسلمانوں اور عیسائی عربوں کو آراضیات سسبے دخل کرنا شروع کیا جس کا
 نتیجہ وہ بے چینی اور بد امنی ہے جس کی ابتدا ۱۹۳۷ء کی ہڑتال سے ہوئی
 اور جس کے باعث اس وقت تک فلسطین سوٹ مار، قتل و غارت کا شکار ہو رہا ہے
 کئی مائوسے اور کائناتیں اے ہد سخت گریاں، پھانسیاں، کورٹ مارشل
 غداریاں اور روپیہ ان میں سے کوئی بھی فلسطینی عربوں کو اپنا ملک یہودیوں کے
 حوالہ کرنے پر مجبور نہیں کر سکے۔

دبقیہ حاشیہ ۵۷۳، حسب ذیل جدول سے موجودہ صورت حال معلوم ہو جائے گی۔

۱۹۰۹ء	۱۹۳۱ء	جون ۱۹۴۷ء
کل آبادی فلسطین	۶۷۵۰۰۰	۱۰۳۰،۵۳۸
یہودی	۱۵۰،۰۰۰	۲۸۶،۰۸۴

اس طرح ۱۸ برس میں یہودیوں کی آبادی بیس گنی سے زیادہ ہو گئی ہے اور جہاں
 ۱۹۳۷ء میں یہودی اور جلد آباری کا تناسب اور ۲۰ تھا اب وہ آبادی کا تقریباً چوتھا
 حصہ بن گئے ہیں۔

بہر حال اصول حکم داری کا دار و مدار انجمن اقوام پر ہے، لیکن انجمن اقوام کے اثر کے زوال کے ساتھ ساتھ یہ علاقہ جات، خصوصاً انفلٹیں، کئے بوج، براہ راست مقبضات کی نوعیت اختیار کرتے جاتے ہیں، چنانچہ جاپان، جواب انجمن اقوام کا رکن نہیں رہا، پہلے کی طرح جزائر مغوضہ پر قابض ہے اور انھیں چھڑانے کا نام نہیں لیتا۔

انفلٹوں کے تمدنی تحفظ کا مسئلہ چند سال پیشتر اہم تھا۔ لیکن اب جب آسٹریا اور چھوٹا سلوفاکیہ کا جرمنی میں الحاق ہو گیا ہے اور دوسرے ملکوں کی وہ جرمن اقلیتیں جن کے مفاد کو انجمن اقوام نے اقلیتی عہد ناموں کے ذریعے سے محفوظ کرنے کی کوشش کی تھی، اغلباً جرمنی کے ماتحت آجائیں گی یا کم از کم ان کا جرمنی ضامن ہو جائے گا، تو اس مسئلہ کی شکل اب بدل گئی ہے۔ انجمن اقوام کے عروج کے زمانے میں بھی باوجودیکہ مجلس انجمن کے سامنے خلاف درجہ عہد نامہ جات کے متعلق متعدد درخواستیں گزریں لیکن چونکہ ارکان محض کسی اقلیت کے خاطر کسی آزاد مملکت سے دشمنی مول لینا نہ چاہتے تھے اس لئے کبھی ان شکایتوں کے ازالے کے لئے انجمن نے فریق ثانی پر کبھی اثر نہیں ڈالا۔

۱۹۱۸ء وسط میں یورپی اقلیتوں کی ایک کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی جس میں بیلجیم، ڈنمارک، اسٹونیا، لیٹویا، لٹوانیا، پولستان، رومانیہ، چیکو سلوفاکیہ، یوگوسلاویہ، اٹلی اور ہنگری کے جرمن، رومانیہ اور چیکو سلوفاکیہ کے ہجرا، اٹلی اور آسٹریا کے اسلاوی (لقیدہ حاشیہ صفحہ ۵۷ پر)

تہدیدیں۔ اب صرف تہدیدوں کا ذکر باقی ہے جو یعنی جنگ جہنم کے زمانے میں خاص طور پر ناپاں ہو گئی تھیں۔ تہدیدیں دراصل موافقہ انجمن اقوام کے دفعہ ۱۶ کے تحت آتی ہیں، لیکن اس سلسلہ میں دفعت ۱۲ تا ۱۵ اور دفعہ ۷ کا ذکر بھی مناسب ہے۔ چونکہ انجمن اقوام کے پاس کوئی ایسی مرکزی ہیئت نہیں تھی جو کسی خطا کا مملکت کو سزا دے سکے اس لئے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس قسم کی کل اختراعات کی جائے جس سے جملہ ارکان انجمن خطا کا مملکت کو مجبور کر سکیں کہ وہ موافقہ انجمن اقوام کی خلاف ورزی نہ کرے۔ دفعہ ۲ کا مندرجہ ہے کہ اگر دو ارکان کے درمیان کوئی ایسا تنازعہ چھڑ جائے جس سے نقص امن کا اندیشہ ہو تو ان پر لازم ہو گا کہ وہ یہ تنازعہ ثالثوں یا بن اتوامی عادلوں کے سپرد کریں گے اور تجویز کئے تین ماہ بعد تک آپس میں جنگ نہ کریں گے۔ دفعہ ۱۳ میں ایسے جھگڑوں کا ذکر ہے جو معمولی تدبیر کے ذریعے سے طے نہ پاسکیں لیکن جنہیں فریقین اس قابل سمجھتے ہوں کہ وہ ثالثی یا عدالت کے ذریعے سے طے ہو سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ ثالثی یا عدالت کے سامنے پیش کر دئے جائیں گے۔ ارکان انجمن نے اس کا وعدہ کیا کہ جو فریق تجویز ثالثی یا تجویز عدالت کے موافق

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱) باشندے شریک ہوئے تھے۔ حساب لگایا گیا ہے کہ عہد نامہ دہائی کے بموجب وسطی یورپ کی تقریباً ایک چوتھائی آبادی ان اقلیتوں پر مشتمل تھی۔ لطف یہ ہے کہ ان میں خود جرمنی کے یہودیوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا حالانکہ یہ اقلیت آج کل دنیا کی سب سے مظلوم اقلیتوں میں سے ہے۔

عمل کرے گا اس کے خلاف جنگ نہیں کریں گے۔ دفعہ ۱۵ کے مطابق کسی ایسے تنازعے کی صورت میں جس میں نقص اس کا اندیشہ ہو، کوئی رکن اس مسئلے کو مستعد اعلیٰ کے ذریعے سے مجلس کے سامنے پیش کر سکتا ہے جس پر مجلس فریقین کے درمیان سمجھوتے کے لئے کوشش کرے گی، اور اگر سمجھوتہ نہ ہو سکے تو تمام واقعات اور اپنی تجاویز کو شائع کر دیگی۔

اگر کوئی مملکت دفعات ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵ کے اصول سے رد گردانی کرے تو یہ خیال کیا جائے گا کہ اس نے انجمن کے باقی ماندہ جملہ اراکان کے خلاف جنگ کی ہے چنانچہ باقی ماندہ جملہ اراکین انجمن نے اس کا اقرار کیا کہ وہ اس خاطی مملکت سے اپنے تمام تجارتی یا مالی تعلقات منقطع کر دیں گے، اپنے شہریوں اور خاطی مملکت کے شہریوں کے درمیان ہر قسم کے راہ در سہم کو ممنوع قرار دیں گے اور ہر طرح کے مالی، تجارتی یا ذاتی رسل و رسائل کو مسدود قرار دیں گے خواہ خاطی مملکت رکن انجمن ہو یا نہ ہو، نیز مجلس کا فرض تھا کہ ہر حکومت متعلقہ کو سفارش کرے کہ وہ فوجی، بحری یا ہوائی فوج اس خاطی مملکت کی سرکوبی کے لئے مہیا کرے۔ موافقہ اس سے بھی آگے بڑھنا ہے، اور دفعہ ۱۵ میں اس کا اعلان کرتا ہے کہ اگر تنازعہ کے ایک یا دونوں فریقوں میں سے کوئی رکن انجمن نہ ہو تو ایسی صورت میں ان شرائط کو تسلیم کرنے کی دعوت دی جائے گی، اور اگر دعوت قبول کر لی جائے تو ایسی حالت میں دفعات ۱۲ یا ۱۶ تک کا نفاذ ان ملکوں پر بھی ہو جائے گا۔ اگر کوئی مملکت جو رکن نہ ہو کسی رکن مملکت کے خلاف فوج کشی کرے تو اراکان انجمن دفعہ ۱۶ کا نفاذ اس پر کر دیں گے یعنی جملہ

تعلقات منتطع کر دیں گے۔

انجمن اقوام کا ارتقا۔ یہ انجمن اقوام کا ڈھانچا۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ عظیم کے ہولناک واقعات کے بعد یہ ایک فطری امر تھا کہ جنگ کے اصول سے دنیا اپنی کامل بیزاری کا اعلان کرے اور صرف اسی پر اکتفا نہ کرے کہ آئندہ کے لئے جنگ کے خلاف وعدہ وعید کئے جائیں بلکہ جہہ ملکیتوں کی اصول مساوات، اقلیتوں کے تمدنی تحفظ، انجمن اقوام کی زندہ نگہ رانی میں تفویضوں کے عمل، قومیت کے اصول کو مد نظر رکھنے، اور سب سے زیادہ یہ کہ جس طرح کسی مملکت میں قانون کی تہدیدیں ہوتی ہیں ایسی نوع کی بین الاقوامی نگہ رانی میں تہدیدوں کے سلسلے کو قائم کرنے سے مدبرین بعد از جنگ نے یہ تصور کر لیا کہ اب دنیا عمومیت کے لئے محفوظ ہے اور جنگ کا ہمیشہ کے لئے انسداد ہو گیا ہے۔ گو حالات اور واقعات نے مساعدت نہیں کی کہ کسی قسم کا بین الاقوامی لشکر بنایا جاتا، لیکن تہدیدوں کے سلسلے میں اس صورت حال کو ممکن تصور کیا گیا کہ خطا کار مملکت کے خلاف جملہ ارکان انجمن مکمل مقاطعہ کریں جس میں انفرادی مقاطعہ بھی شامل ہے، ہر قسم کے ریل و رسائل منقطع کر دیں اور ضرورت پڑے تو اپنے اپنے حصہ رسدی لشکر بھیجا کر کے غلطی مملکت کو سر جھکانے پر مجبور کریں۔

ابتداء میں یعنی تقریباً اس وقت تک جب تک لوگوں کو جنگ کے مہیب نتائج یاد تھے، انجمن اقوام کی کل خوب چلتی رہی۔ انجمن محض اتحادی فالتوں کی انجمن تھی، جس میں غیر جانبدار ملکیتیں دعوت دے کر شریک کی گئی تھیں لیکن رفتہ رفتہ

استدوازمانہ سے جب دشمنی کا احساس کم ہوا اور یورپ نے اپنی صحیح حالت کا اندازہ لگایا تو آسٹریا کو ۱۹۱۲ء میں، جارجسٹان کو ۱۹۱۲ء میں، بلغاریہ کو ۱۹۱۲ء میں، جرمنی کو ۱۹۱۲ء میں اور ترکی کو ۱۹۱۳ء میں انجمن اقوام میں شریک کر لیا گیا۔ روس ۱۹۳۶ء تک شامل نہیں ہوا، اگر اس سے پہلے بھی مختلف کانفرنسوں، مثلاً سنساری معاشری کانفرنس اور بے اسٹوکی کانفرنس میں وہ اور ملک متحدہ امریکہ جو اس وقت تک انجمن اقوام کا رکن نہیں بنا، اپنے اپنے قائم مقام درانہ کرتے تھے۔ جب تک جنگ کے خلاف جوش رہا انجمن اقوام نے واقعی متعدد جھگڑے طے کئے جن میں سے روس اور سوئیڈن کے درمیان جزائر آ لینڈ کا معاملہ ۱۹۲۱ء میں، تونس اور مراکش کی توسیت کا مسئلہ فرانس اور انگلستان کے درمیان ۱۹۲۵ء میں، یوگوسلاویہ کے مسئلہ کا تصفیہ ترکی اور انگلستان کے درمیان ۱۹۲۳ء میں اور یونان و بلغاریہ کے درمیان جنگ کے خطرے کا افساد ۱۹۲۳ء میں، سب سے نمایاں واقعات ہیں۔ نیز وہ مشہور عہد نامے جن میں لوکارنو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، یہ بھی ۱۹۲۵ء ہی کا کارنامہ ہے، ان عہد ناموں پر جرمنی، ہجیم فرانس، اٹلی، پولستان اور چیکو سلوواکیہ کے دستخط تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ اس سال میں جو بھی سرحدیں مختلف ممالک کی مقر رہیں، خواہ وہ کسی طرح سے بھی حاصل ہوئی ہوں، ان کی ضمانت و تحفظ کنندہ مملکتیں کرتی ہیں۔

تقریباً دس سال تک یعنی کم و بیش ۱۹۱۹ء تک تو جوش خروش کا یہی عالم رہا۔ لیکن اس کے بعد انجمن اقوام اور بین الاقوامیت کا ستارہ گردش میں آجاتا ہے۔ تقریباً اسی زمانے میں رد عمل کی ابتدا ہوئی ہے اور ایک طرف تو روس میں

بوشیوی طرز حکومت مستحکم ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف اٹلی اور جرمنی میں، بجائے
 بین الاقوامی ہیئت کے خالی توڑ پر ہی پیدا ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ مسکینی اور چند سال
 بعد شعلہ کی شخصیتیں نمایاں ہو جاتی ہیں، جن کا سب سے اہم پیش نامہ یہ ہے
 کہ اٹلی اور جرمنی طاقتور بنایا جائے اور کسی دوسرے ملک کے مفاد کی یا کسی
 عہد نامے کی، اگر یہ مفاد یا عہد نامہ تو می تری کی راہ میں حائل ہو، پرواہ نہ کی جائے۔
 انجمن اقوام کی بے بسی کا سب سے پہلا مظاہرہ مشرق اقصیٰ میں ہوا جب
 بغیر کسی غماہی، بہانے کے جاپان نے ایک دوسرے رکن انجمن اقوام یعنی چین
 کے پچھڑی صوبوں پر بڑا شمشیر قبضہ کر لیا۔ اور جب انجمن اقوام نے چین کی استدعا
 پر ایک مامور کو تفتیش واقعات کے لئے پجور یا روانہ کیا اور اس نے جاپان کے
 خلاف فیصلہ صادر کیا، تو بجائے اس کے جاپان اس تصفیہ کے مطابق عمل کرے
 اس نے انجمن سے علیحدگی کے لئے دو سال کا نوٹس دے دیا اور علحدہ ہو گیا۔
 جاپان نے یہ بھی کہا کہ گوچین انجمن اقوام کا رکن ہے لیکن وہ تمدن کے اس معیار
 کو نہیں پہنچا جو تمدن اقوام کے خاندان کا ایک ذرہ بننے کے لئے ضروری ہے،
 چنانچہ اس کی حد تک انجمن اقوام کا موافقہ کارآمد نہیں۔ یہ صورت حال پوچھو یا پر
 قبضہ کر لے کے وقت بھی ۱۹۳۷ء میں بغیر کسی مزید بہانے یا ضابطہ پر ہی کے
 جاپان نے دوبارہ چین پر حملہ کر دیا، لیکن اس مرتبہ چین نے کسی ہمدردی کی شکست
 یا انجمن اقوام سے اپیل نہیں کی اور خود وہ اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں
 مبتلا ہے۔ جس کو ”رہنما“ ہٹلر نے اس تمام اسس ہی کو اکٹھا کر پھینک دیا
 جن پر انجمن اقوام مبنی تھی، یعنی عہد نامہ ویرسائی کو بالائے طاق رکھ کر اپنے آپ کو

جرمن فوج، پڑے اور رضائیہ کا کلیہ مختار کر لیا اور یہ کہہ کر کہ عہد نامہ ویرسائی کے مطابق صرف جرمنی ہی کو نہیں بلکہ تمام دل کو اسلحہ میں کمی کرنی چاہئے، انجمن اقوام سے علیحدہ ہو گیا۔ انجمن اقوام کی بے بسی یا دعوئی کا حقیقی مظاہرہ جنگ حبشہ کے دوران میں ہوا۔ یہ شخص جانتا تھا کہ اعلیٰ حبشہ پر یغیر کرنے کے لئے جہاز پر جہاز، جو اسباب خورد و نوش آلات جنگ اور طیاروں سے لہے ہوئے تھے، مہینوں سے نہر سوئیس میں ہو کر لئے جا رہے ہیں، لیکن کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ اسے اس سے روکے، اور جب حبشہ نے (جو خود انجمن اقوام کا رکن تھا) تہذیبیں عائد کرنے کے لئے الحاح و التجا کی تو انجمن اقوام کے مجلس اور اسمبلی نے کمپیٹیوں پر کمپٹیاں بٹھانے پر اکتفا کیا۔ اُدھر تو یہ کمپٹیاں مباحثہ کہہ رہی تھیں اور ہر حبشہ کا خون چوسا جا رہا تھا۔ بجائے اس کے کہ ایسی تہذیبیں عائد کی جائیں جن کا بن اثر پڑے، زیادہ تر زبانی جمع خرچ کو کافی تصور کیا گیا۔ اور جب یہ خواہش کی گئی کہ تیل اور پٹرول کو رد کا جائے گا تو مسٹرینی نے عاف کہہ دیا کہ جو ہمارے تیل پٹرول کو روکے گا اسے ہم اپنا دشمن تصور کریں گے حبشہ فتح کر لیا گیا اور انجمن

حبشہ جو تہذیبیں جنگ حبشہ کے دوران میں عائد کی گئیں وہ اسلحہ اور دوسرے کے درآمد و برآمد کے متعلق تھیں۔ لیکن تہذیبوں سے مہینوں پہلے ہی اٹلی نے جس قدر سالانہ جنگ فراہم کرنا تھا اس میں سے اکثر فراہم کر لیا تھا۔ پھر ایک طرف مالک متحدہ امریکہ، جاپان اور جرمنی تو انجمن میں شریک ہی نہ تھے، البانیہ، آسٹریا اور ہنگری نے، جو لیگ میں شریک تھے، اعلیٰ کے منی لفٹ کر لے سے انکار کر دیا۔ الغرض اول تو تہذیبیں دیے ہی متعلق تھیں (بقیہ فیصلہ)

اقوام بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ اس کے بعد انجمن اقوام بالکل بے بس ہو جاتی ہے۔
 اسپین میں غارتگری ہوئی ہے اور جرمن و اطالوی ایک طرف تو روس و چین مخالف
 کی طرح علی الاعلان مدد کرتا ہے۔ جرمنی پہلے آسٹریا پر سوردھڑکی علاقہ اس کے بعد
 پورا چھوڑ سونپا گیا اور میکسیکو اور آرمینی البانیہ پر قبضہ کر لیتا ہے، لیکن انجمن اقوام
 جس میں آسٹریا، چھوٹا سلوواکیہ، لیتھوانیہ اور البانیہ سب ہی شریک تھیں، بیٹھی
 کی بیٹھی رہ جاتی ہے اور چھٹکی نہیں اٹھا سکتی تیسرے

حقیقت یہ ہے کہ جیسا ایک ممتاز مورخ کہتا ہے جب ایک لیگ
 اس پر مبنی ہوئی ہو کہ خواہ کچھ بھی ہو، جنگ آزمانی کی جائے تو پھر کوئی دوسری لیگ
 یا انجمن جنگ کو رد نہیں کر سکتی تیسرے انجمن اقوام کی تنظیم کو ۱۸ برس ہو گئے اور ایک
 ایسی نسل اب جوان ہو گئی ہے جو جنگ کی ہولناکیوں سے مطمئن واقف نہیں۔
 وسطی یورپ، خصوصاً جرمنی یہ تصور رکھتے ہوئے ہے کہ اس پر شدید نظام ڈھاسے

(لقبہ عاصیہ ص ۵۷) اور پیران باتوں کی وجہ سے وہ بالکل ہی بے نتیجہ ہو گئیں۔ اس بحث
 کے لئے دیکھو Foreign Affairs، جنوری ۱۹۳۵ء، ص ۳۵۳ مضمون بورن
 "تہدیدیں کیسے ناکام ہوئیں" Born: How sanctions failed.
 ۱۹۳۵ء کے لئے انجمن اقوام کا موازنہ تقریباً ۱۵ لاکھ پونڈ یعنی دو کروڑ روپہ کا ہے
 جس میں سے ہندوستان کو تقریباً دس لاکھ روپہ دینا پڑے گا۔
 لٹل پبلارڈ، صفحہ ۱۳۔

گئے ہیں۔ مطلق العنان اٹلی چاہتا ہے کہ جیسے سلطنت روما کے زمانہ میں بحیرہ
 روم اور بحیرہ احمر میں رہیں بھیلیں بن گئے تھے، ویسے ہی اب وہ اطالوی بھیلیں
 بن جائیں۔ یہ محض اپنی قوت اور دھمکیوں اور معاہدہ شکنیوں کے بن بوقتے پر
 انجمن اتوام کے علی الرغم اپنا حلقہ اثر وسیع کر رہے ہیں۔ "تاآنکہ جرمنی تمام وسطی
 یورپ پر چھا گیا ہے اور اٹلی بھی روز بروز زیادہ قوی ہوتا جاتا ہے۔ ان دونوں
 اور جاپان نے طعنے دیکر، مخالفت کر کے اور کامیابی کے ساتھ دنیا سے اپنا کہنا
 منکر کر انجمن اتوام کو مفلوج کر دیا ہے اب تو سب سے بڑے پشت پناہ یعنی
 برطانیہ اور فرانس بھی ایک طرح سے صبر کر کے بیٹھ رہے ہیں۔

Law of International

ضمیمہ باب ۲

بین الاقوامی قوانین کے چند نکات

(الف) بڑا زمانہ امن - قائم مقام - حق مداخلت - سمندر پر حقوق - (ب) بڑا زمانہ جنگ
(۱) فریقین جنگ - اعلان جنگ - جنگ آزماؤں کی تعریف جنگی تشدد کے حقوق -
محاصرے اور بیماری - جنگی قیدی - جاسوس - زخمی اور بیمار - دشمن کی املاک -
خاتمہ جنگ - (۲) غیر متحرک دار - جنگی ممنوعات - تاکہ بندی - غیر متحرک دار -
غنیمت - خاتمہ

(الف) بڑا زمانہ امن

قائم مقام - امن کے زمانے میں عام طور پر ہر مملکت دوسری مملکتوں
میں جن سے اس کے تعلقات ہوں، اپنے قائم مقام رکھتی ہے۔ اگر کسی مملکت

اس ضمیمہ کا بیشتر حصہ لارڈ برکن ہیڈ کی کتاب "بین الاقوامی قانون" Lord
Birkenhead, International Law. اشاعت ششم ۱۹۲۶ء

سے مختص ہے۔

حال میں جو بین الاقوامی حالات رونما ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں (بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۸۳ پر)

کا قائم مقام کوئی شخص مقرر ہو جو اس دوسرے ملک میں پسند نہ کیا جاتا ہو، تو ایسی صورت میں یہ دوسرا ملک اس قائم مقام کو واپس کر سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ کسی دوسرے شخص کو مقرر کیا جائے۔ غیر سلطنتوں کے قائم مقاموں کی ذمہ داری کی جاتی ہیں یعنی (۱) تدبیری قائم مقام اور (۲) تفصل۔ تدبیری قائم مقام تین طرح کے ہوتے ہیں، (۱) سفرا، جو اپنی حکومتوں اور ان کے معاملات کی نمائندگی کرتے ہیں (۲) ایلچی اور دہلائے اختیار جو غیر حکومتوں کے پاس بھیجے جاتے ہیں (۳) دہلائے مصالح جو سلطنتوں کے وزراء کے خارجہ کے پاس روانہ کئے جاتے ہیں۔

یہ سب قائم مقام اپنی واپسی تک قطعاً محفوظ سمجھے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اگر دونوں ملکوں کے درمیان جنگ بھی چھڑ جائے تو بھی یہ اپنے ملک تک پوری حفاظت سے بھیجے جائیں گے۔ عام طور پر ان کے غلاف کوئی مقدمہ دائر نہیں کیا جاسکتا، گویا انی معاملات میں علی الملوم سفیر کی ذاتی جبراً دہی ماموں تصور کی جاتی ہے۔ نیز ان پر کسی قسم کا محصول عائد نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن انھیں ملک کے اندرونی معاملات میں کسی طرح کی مداخلت کی قطعاً منع ہے۔

(تنبیہ حاشیہ ۵) ان کی وجہ سے بین الاقوامی قانون کی وقعت بالکل نہیں رہی۔ یہ حصہ ۱۹۳۳ء کا لکھا ہوا ہے لیکن باوجود حالات کے بدل جانے کے دلچسپی اور سبق آموزی کی خاطر اسے تقریباً حسب سابق دہرایا ہے۔

۵۸ لیکن اس قاعدے کی پابندی صرف اسی وقت کی جاتی ہے (تنبیہ حاشیہ ۵۸ پر)

فصل محض تجارتی عمل میں اور ساتھ ہی اپنے ہم ملک باشندوں کو مختلف معاملات میں صلاح دیتے ہیں۔ نیز ان کے سپرد غیر ملک میں اپنے ہم ملکوں کی فوجی پیدائش کے رجسٹر بھی ہوتے ہیں۔ چند سال پیشتر تک یورپی مصلحتوں کو بعض مشرقی ممالک میں پرکلی "اختیارات حاصل تھے، لیکن ان اختیارات کا ۱۸۹۹ء میں جاپان میں، ۱۹۲۳ء میں ترکی میں اور ۱۹۳۹ء میں ایران میں خاتمہ ہو گیا، اور اب یہ صرف چین اور سیام میں تھوڑے بہت موجود ہیں۔ فصل مذہبی قائم مقام کے برابر مامون نہیں سمجھے جاتے، چنانچہ ان پر دہائی اور فوجداری دونوں طرح کے مفاد سے چلائے جاسکتے ہیں لیکن ان پر محصول عائد نہیں کیا جاتا اور نہ انھیں گنہ گار سمجھا یا جاسکتا ہے، بشرطیکہ وہ کوئی دوسرا پیشہ نہ کرتے ہوں۔

حق مداخلت۔ یہ حق اس اصول پر مبنی ہے کہ اپنی حفاظت کے لئے دوسروں کی آزادی میں مغل ہونا جائز ہے۔ اسی اصول کے بموجب پھلی جنگ عظیم میں جرمنی نے بحیم اور انگریزوں اور صلیبوں نے یونان میں مداخلت کی، بعض مملکتوں کا دعویٰ ہوتا ہے کہ ہم دوسرے ممالک کے معاملات میں "نبی نوع انسان کے مفاد" کی خاطر مداخلت کرتے ہیں، لیکن اس طرز عمل کا اصل اصول اکثر خود انہی ہی بھلائی ہو تا ہے نہ کہ نبی نوع انسان کا مفاد۔ بعض مرتبہ جب

(نقیہ حاشیہ ۵۸۵) جب ایک مملکت کا دوسری مملکت پر کسی قسم کا دباؤ نہ ہو۔ حال میں جاپان نے چینی معاملات میں مسلسل غلطیوں کی ہیں اور ان کے زمانے میں بلیک کی معقول سبب کے محض دباؤ ڈال

عہدہ داروں تک کو بدلوایا ہے۔

۵۸۵ نمبر دوسرے دعووں کے جو اٹنی نے حبشہ کے خلاف کئے، ایک یہ بھی تھا کہ حبشہ متحدہ (نقیہ حاشیہ ۵۸۵) بر)

کسی ملک میں خاندانی جگہ ہوتی ہے تو طاقتور اقوام یا وہ قومیں جو اپنا اقتدار بڑھانا چاہتی ہیں، اس ملک میں مداخلت کرنے لگتی ہیں۔ اس کی بابت یہ تصور کرنا چاہئے کہ اگر یہ مداخلت صرف ایک فریق کے دعوت کی وجہ سے ہے تو یہ قابل اعتراض ہے، اس لئے کہ اس سے گریبا ملک کی اندرونی حکمت عملی میں مداخلت کی گئی، لیکن اگر فریقین کسی ملک کی مداخلت کی..... دعوت دیں تو مداخلت نامناسب نہ ہوگی۔

سمندر پر حقوق - اب یہ مسئلہ ہے کہ سمندر تمام اقوام کے لئے کھلا ہوا ہے۔ ساحل ہی اب تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ساحل سے تین میل تک کا سمندر ساحلی ملک کا ایک حصہ ہے اور ساحلی ملک اس میں دوسروں کے جہازوں کے آنے جانے کا جو انتظام چاہے کر سکتا ہے۔ ایسے دریاؤں، بھیلوں اور خلیجوں کے لئے جو دوسرا ملک کے درمیان عامل ہوں، عام طور پر جداگانہ عہد نامے ہوئے ہیں۔

دبقیہ حاشیہ ۵۴۴ نہیں اور اس کا فرض ہے کہ اُسے متدن بنائے۔ حقیقت میں اسی ادعا کی ایک شکل ”سفید خاموں کے بوجھ“ کا نظریہ ہے۔

۵۴۵ نامناسب ہونے کا مسئلہ تو اب گویا حل ہو گیا ہے۔ اسپین میں جرمن، دورڈینی کی جانب سے اندازہً نصف چھیوسو ناکہ کے سوڈینی علاقے میں جرمنی کی مداخلت اور حال ہی میں ایتالیہ میں آئی کی مداخلت اور قبضے نے اس اصول کا خاتمہ کر دیا ہے۔

۵۴۶ مثلاً درہ و انبال کے متعلق ۱۹۳۳ء میں بحرہ اسود، اور بحسن کے دل اور برطانیہ، فرانس، آسٹریا اور جاپان کے درمیان ایک ”آبنائے منامہ“ کی رو سے ڈراپا یا تھا کہ دبقیہ حاشیہ ۵۴۵ پر

فضائی حقوق۔ مفہمہ پیرس سلامۃ کے بموجب علاقہ مملکت اور علاقہ سمندر کے اور ہر کی فضا مملکت کی ملک ہے اور ہر ملک کو اس کی طیارہ رانی کے متعلق قواعد بنانے کا اختیار ہے۔

(ب) بزمائے جنگ

۱۔ فریقین جنگ۔ ایسے افعال جو جنگی افعال تصور نہیں کئے جاتے "بدلتہ" اور پھر ان ناکہ بندی ہیں۔ "بدلتہ" اس فعل کو کہتے ہیں جو معاندانہ افعال کے جواب

انتیہ حاشیہ (۱۵) (۱۱) ان کے ذمے ہیں ہر ملک کے تجارتی جہاز اور جنگی جہاز جو بحیرہ اسود کے علاقہ میں سے قوی ترس کے جنگی جہازوں سے زیادہ نہیں گئے درہ دانیال میں جو کہ گزر سکتے ہیں (۲) جنگ کے زمانے میں غیر مضبوط اور جہازوں کی اس وقت تک مدخلت نہ کی جائے گی جب تک اس میں منوعات جنگی نہیں (۳) بعض جہاز اور درہ دانیال کے ساحلی علاقے غیر مسلح کر کے گئے (۴) ایک یا دو یہ آہستہ ان امر کے نگرانی کے لئے مقرر کیا گیا۔ جون مسئلہ میں ترکی کی تحریک پر ایک کانفرنس کی گئی جس میں قرار پایا کہ تبدیلی حالات کی وجہ سے ترکی درہ دانیال کو مسلح کر سکتا ہے اور اس پر سے دو تمام قیود ہٹائی گئیں جو اس کے اقتدار ملی کو محدود کرتی تھیں۔ دیکھو سالانہ رجسٹر مسئلہ حصہ اول مسئلہ ۲۔

نہر پیرس کا انتظام مندرجہ ذیل مفہمہ پر مبنی ہے۔ اس کے بموجب (۱) نہر میں اور جنگ دولوں میں ہر مملکت کے جہازوں کے لئے مکمل ہے گی (۲) نہر یا اس کے دونوں طرف تین تین میں کسی قسم کا جنگی فعل سرزد نہ ہو گا (۳) نہر کے دروازے کی ناکہ بندی نہیں کی جائے گی (۴) نہر پر مکمل طور پر بندی "جائزہ ہو گی۔ کوئی جنگی جہاز یا بحری غنیمت کا جہاز اس میں ۲۴ گھنٹہ سے زیادہ نہ ٹھہرے گا۔ جنگ عظیم کے دوران میں نہر پر جو تین اور اس کے حلیفوں کے لئے بند کر دی گئی، لیکن جنگ جیسے ہیں یہ آئی کے لئے براہ کھلی رہی۔

میں کہا جائے، جیسے محصول درآمد و برآمد کی زیادتی۔ ”ضبطی“ اس فعل کو کہتے ہیں جس کے بموجب ایک مملکت کسی مخالفت کے فعل کے بدلے میں دوسری مملکت کی املاک پر قبضہ کرے۔ ”پرہیز ناکر بندی“ کے معنی یہ ہیں کہ کوئی مملکت جہازوں کی معاند مملکت کے کسی خاص بندرگاہ جانے سے عملدرودک لے۔ ظاہر ہے کہ اگر فریق ثانی چاہے تو ان تینوں افعال کو جنگ کا بہانہ بنا سکتا ہے۔

اعلان جنگ۔ قواعد جنگ ۱۹۰۷ء کے بموجب جنگ سے پہلے باضابطہ اعلان جنگ ضروری ہے۔ اعلان کے ساتھ ہی ساتھ فریقین کے شہریوں کے درمیان صلہ معادلات کا اندام ہو جاتے ہیں اور قرضہ جات امن تک ملتوی ہو جاتے ہیں۔ بعض مرتبہ کسی خاص شخص کو دشمن کے ملک میں ہو کر گزرنے کا اجازت دینے کا بھی طریقہ رائج ہے۔ اعلان کے ساتھ ہی دشمن ملک کے ہر باشندہ کے لئے ایک

مذمت حال۔ کہ زمانے میں پہلے جاپان نے اور پھر اٹلی نے ایک نیا نظریہ قائم کیا ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی مملکت کسی دوسری مملکت کو کالی مٹھن تصور نہ کرے تو ایسی حالت میں بغیر اعلان کے جنگ شروع کی جاسکتی ہے، چنانچہ جاپان نے چین کے خلاف اعلان جنگ کئے بغیر بالچرمنجوریا پر قبضہ کر لیا اور اس وقت تمام مشرقی چین میں براہ جنگ ہو رہی ہے، لیکن اعلان کا نام نہیں اسی طرح اٹلی نے لیبیریا پر قبضہ کر لیا لیکن اعلان جنگ کے حشر سے جنگ ٹھیکرادی اور حال ہی میں البانیہ پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا لیکن اعلان جنگ نہ ہوا۔

۱۹۱۵ء میں فون ہائین کو جرمن شہریت خاندان کا مقدمہ تھا، انگریزوں نے ایسا ہی اجازہ دیا۔

دقت مقرر کیا جاتا ہے تاکہ اس کے اندر وہ اپنے وطن چلا جائے، گو یہ بھی ممکن ہے کہ دشمن ملک کے شہریوں کو چند شرائط کے تحت ملک میں رہنے کی اجازت دیدی جائے اور انھیں غزوہ نظر بند کر دیا جائے ورنہ آزاد رہنے دیا جائے۔

اگر کسی ملک میں خاتمہ جنگی ہو رہی ہو تو باغیوں کو باضابطہ جنگ کا ذریعہ سمجھنا غیر اقوام کی صوابدید پر مبنی ہے۔ اگر جنگ کو باضابطہ تصور نہ کیا جائے تو پھر نہ کہ بندی منوعات جنگی وغیرہ کا اعلان ناجائز تصور کیا جائے گا۔

جنگ آزماؤں کی تعریف۔ جنگ عظیم سے پہلے یہ خیال جتنا جاتا تھا کہ دوران جنگ میں عام شہریوں کی جان اور آبرو محفوظ رہے گی اور جنگ صرف سپاہیوں کے درمیان ہوگی۔ چنانچہ جنگ سے پہلے ذیقین اس قسم کا اعلان کر دیا کرتے تھے۔ لیکن اس جنگ میں اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا اور اب تو چین، جتہ اسپین وغیرہ کے واقعات سے تو ایسے تو اعداد اب ناممکن سے ہو گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تو اعداد کا عدم تعین اسباب ذیل کی وجہ سے ہے۔

(۱) اب عورتیں جنگ میں باضابطہ حصہ لینے لگی ہیں۔ (۲) طیاروں نے جنگ کے طریقے میں انقلاب پیدا کر دیا ہے اور خطوط ریل و رسائل پر بمباری کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ (۳) جنگی ضروریات کے لئے صنعت و حرفت کا خاتمہ لازمی تصور کیا جانے لگا ہے (۴) یہ واقعہ ہے کہ بغیر شہریوں کی عام رضامندی اور تائید کے آج کل کوئی لڑائی نہیں لڑی جاسکتی۔

فوجوں کے ساتھ جو غیر جنگجو لوگ ہوتے ہیں، جیسے مذہبی رہنما، اطباء وغیرہ ان کے لئے یہ قاعدہ ہے کہ اگر وہ مسلح بھی ہوں اور انھوں نے بیماروں اور مجروحین

کے بچاؤ کے لئے اسلحہ اٹھائے بھی ہوں، تو بھی انھیں قید نہیں کیا جاسکتا۔ گو تارباؤ یا سرشتہ بہم رسانی کے عہدہ داروں کو قید کیا جاسکتا ہے۔ فوجیوں کی دردی کی خاص علامت لازمی ہے۔ اگر یہ علامتیں نہ ہوں یا ایسی ہوں کہ آسانی سے انھیں علیحدہ کر کے فوجی معمولی شہری کی حیثیت اختیار کر سکیں، جیسے بے قاعدہ سپاہی، تو انھیں گرفتار کر کے گولی سے مارا جاسکتا ہے۔ اگر ملک کا ملک خارجی حملے کے خلاف اٹھ کھڑا ہو تو قواعد ہنگ کے بموجب شہریوں کی حیثیت جنگجوؤں کی سی ہوگی، بشرطیکہ وہ توڑیں جنگ پر عمل کریں۔

جنگی تشدد کے حدود۔ ”جنگ میں صرف اتنے تشدد کی اجازت ہے جو حصول مقصد کے تناسب ہو“ مسئلہ کے قواعد ہنگ نے حسب ذیل کو ناجائز قرار دیا ہے۔ (۱) زہر یا زہریلے ہتھیاروں کا استعمال (۲) دغا کر کے قتل کرنا۔ (۳) جنھوں نے ہتھیار ڈال دے ہوں ان کا قتل۔ (۴) یہ اعلان کہ کسی کی جان نہیں بچائی جائے گی۔ (۵) بے ضرورت تکلیف دہی۔ (۶) علم توقف جنگ کا بیجا استعمال۔ (۷) املاک کی بے ضرورت بربادی۔ (۸) کسی ملک کے باشندوں کو اسی ملک کے خلاف لڑنے پر مجبور کرنا۔ اسی طرح پیمینے والی گولیوں کا استعمال، کنوؤں میں زہر ڈالنا اور شہری اور عرصہ پھیلا نا بھی عام اتفاق ذل سے ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ مسئلہ کے دانشور والی کا نفرنس میں برطانیہ، کلاں، فرانس، اٹلی، جاپان اور مانک متحدہ امریکہ نے بالاتفاق مانے یہ قرار دیا کہ آئندہ جنگوں میں یہ مہلک کسی طرح کی گیس استعمال نہیں کریں گے

لیکن اس اعلان کی اس وقت تک توثیق نہیں ہوئی اور نہ کسی جنگ میں جو اس کانفرنس کے بعد ہوئی، اس پر مطلق عمل کیا گیا۔ محاصرے اور بمباری تباہ فیکہ کوئی شہر یا مکان قلعہ بند نہ ہو اس پر بمباری کرنا ناجائز ہے۔ بمباری سے پہلے شہریوں کو آگاہ کر دیا جائے کہ بمباری ہونے والی ہے۔ ایسے مذہبی مقامات یا ایسے اہرامات جن کا تعلق طبی امداد، علوم و فنون وغیرہ سے ہو، بشرطیکہ وہ فوجی اغراض کے لئے استعمال نہ کئے جاتے ہوں، انھیں ہالود نہیں کرنا چاہئے۔ ۱۹۰۷ء کے ایک بین الاقوامی فضائی مامور نے قرار دیا کہ فضائی بمباری صرف فوجی عمارات پر کی جاسکتی ہے اور اگر وہ آبادی کے وسط میں واقع ہوں تو ان پر بھی بمباری نہیں کرنی چاہئے۔

۱۹۰۷ء کے موافقہ ہیگ سے قرار پایا کہ غیر قلعہ بند ساحلی مقامات کی بحری بمباری ناجائز ہے۔ ۱۹۰۷ء کے موافقہ ہیگ سے قرار پایا

شہ جنگ عظیم میں زلیقین نے زہریلی گیس کا دل کھول کر استعمال کیا، اور اب تو ہر ملک تقریباً یہ فیصلہ کئے ہوئے معلوم ہوئی ہے کہ آئندہ کسی جنگ میں وہ ان گیسوں کو استعمال بھی کرے گی اور ان سے اپنے بچاؤ کا بھی انتظام کرے گی۔ آئینی نے جتنے کو نہیں گیسوں کے ذریعے فتح کیا۔ ۱۹۰۷ء حالت جنگ میں جنگجو ذوق ایسی بات کیوں کی پر دائیں کرتے، چنانچہ جنگ عظیم میں جرمنی نے رابرٹ ڈیجیم کے جہاز کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور گوجر منوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے دشمنوں نے گرجاؤں سے فوجی کام لئے۔ مگر شہابی فرانس کے کہتے ہی ایسے گرجا میں جو توپوں کے گولوں سے ڈھا دئے گئے۔ آئینی نے جنگ جتنے میں متعدد مرتبہ (لغیہ ماشیہ ۵۹)

کہ آزاد خود بخود چلنے والی سرنگیں ناجائز ہیں۔ لیکن اگر آزاد ہونے کے ایک گھنٹہ بعد ہیکار ہو جائیں تو جائز ہیں۔ جنگ عظیم کے دوران میں فریقین نے نہایت وسیع اختیارات میں آبدوز سرنگوں کا استعمال کیا اور ان کی زرد سے غیر جنبہ دار و دل کے جہاز بھی نہیں بچ سکے۔

جنگی قیدی - موافقہ ۱۹۰۷ء کے بموجب قیدی مختلف پٹنوں اور سالوں کے قیدی نہیں بلکہ حکومت کے قیدی ہوتے ہیں، لہذا معمولی شہری قیدیوں کی املاک محفوظ رہتی چاہئے۔ ان سے کام لیا جاسکتا ہے، لیکن یہ کام فوجی نہیں ہونا چاہئے اور انھیں کام کا مناسب معاوضہ ملنا چاہئے جو ان کی حیثیت کی دستی میں صرف ہو سکے۔ اگر وہ فرار ہو جائیں اور پھر گرفتار ہو جائیں تو ان کے فرار ہونے کی انھیں سزا نہیں ملنی چاہئے۔

جاسوس - جاسوسوں میں وہ لوگ شمار نہیں ہوں گے جو علی الاعلان مراسلے لئے جا رہے ہوں، اور اگر واقعی کوئی جاسوس اپنی فوج تک پہنچ جائے اور پکڑا جائے تو وہ بھی جاسوس نہیں سمجھا جائے گا۔

زخمی اور بیمار - موافقہ جنیوا سے انجمن صلیب احمر کے بموجب یہ مسئلہ ہے کہ زخمی اور بیماروں کے علاج معالجے میں خواہ اسے ہوں یا دشمن کے، کسی قسم کا فرق نہیں ہونا چاہئے۔ اطباء اور جراح اگر پکڑے جائیں تو وہ آزاد

(فقہ حاشیہ صفحہ ۵۹۱) صلیب احمر کے کیمپوں، گرجاؤں اور ہسپتالوں پر بیماری کی اور ۱۹۴۹ء میں البانیہ کے تمام بندرگاہوں کی اینٹ سے اینٹ بیکسی قسم کے اعلان کے بجادی۔

تصور کئے جائیں گے گواہیں کماندار کا حکم ماننا پڑے گا۔ اسپتالی جہازوں کو گزرتا نہیں کیا جاسکتا، بشرطیکہ ان سے فوجی کام نہ لیا جاتا ہو۔
 دشمن کی املاک - برسی املاک کے متعلق قاعدہ ہے کہ خانگی ملک۔
 نیز ایسی املاک جو مذہب، حکمیات، فنون لطیفہ، خیرات و مہرات اور تعلیم کے لئے جو ضبط نہیں ہو سکتی، اور صرف ایسی املاک ضبط ہونی چاہئے جو املاک عامہ ہوں اور جو فوجی کاموں میں لائی گئی ہو، یہ بھی قاعدہ ہے کہ افراد کی حرکات کی پاداش میں پوری آمادی پر عام تعزیر کا بار نہیں ڈالا جاسکتا اور سامان رسد صرف اس قدر ضبط کرنے کا حکم دیا جاسکتا ہے جو فوجی ضروریات کے لئے کافی ہو اور جو ملک کی پیدوار کے قنا سب ہو۔ علاوہ فوجی ضروری اغراض کے کسی حصے کو برباد نہیں کرنا چاہئے۔

”اعلان لندن“ ۱۹۰۹ء میں یہ طے ہوا تھا کہ کسی مملکت نے اپنا کوئی جہاز جنگ سے پہلے کسی جنبہ دار مملکت کو منتقل کر دیا تو ایسی صورت میں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ منتقلی صرف آنے والی جنگ کے خطرے سے بچنے کے لئے تھی تو یہ ناجائز ہوگی اور جہاز ضبط کیا جاسکے گا۔ جیسا اوپر بتایا گیا ہے اس اعلان کی کبھی توثیق نہیں ہوئی۔

خاتمہ جنگ - جنگ کا خاتمہ تین طریقوں میں سے ایک کے ذریعے سے ہو سکتا ہے۔ (۱) التوائے جنگ (۲) ایک فریق کے دوسرے فریق کو

۱۹۱۱ء جنگ عظیم میں متعدد مرتبہ اس قاعدی کی خلاف ورزی کی گئی۔

منسوب کرنا یا ملک فتح ہو جانا (۳) دو فرقی معاہدہ - صلح کے بعد تمام ایسے خانگی حقوق کا احیا ہو جاتا ہے جو جنگ کے زمانے میں فنانہ ہو گئے ہوں۔
 علی العموم صلح نامہ کے حسب ذیل حصے ہوتے ہیں:-

۱۔ عام جس میں خصوصیت کا قاتمہ جنگی قیدیوں کی دہی، ناجائز نقصانات کے متعلق باز پرس سے دست برداری۔ اور عہد نامہ ماقبل کی موقوفی یا احیاء کا ذکر ہوتا ہے۔

۲۔ خصوصی جس میں ہر جہ جنگ اور الحاق کا اعلان ہوتا ہے۔
 ۳۔ متفرق جس میں بر فاشگی افواج، قلعہ جات کی مسماری، انہی ملکوں کا جنم اور اس قسم کی دوسری دفعات ہوتی ہیں۔

علاوہ ازیں بعض صلح ناموں میں خفیہ دفعات بھی ہوتی ہیں جو اس لئے خفیہ رکھی جاتی ہیں کہ ان کا اثر بعض دوسری ملکوں پر پڑتا ہے اور آشکارا کرنے سے مقاصد کے فوت ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔

۲۔ غیر جنبہ دار

نفاذ ہے کہ فریقین جنگ قواعد و قوانین کے اس قدر پابند نہیں ہوں گے جتنی غیر جنبہ دار ملکین۔ چنانچہ قانون بین الاقوام میں غیر جنبہ دار ملکوں کے متعلق جو قواعد ہیں وہ زیادہ معین ہیں۔ فی الحقیقہ غیر جنبہ دار ملکوں کو فریقین جنگ سے امتیازات رکھنے کا حق حاصل ہے۔ گو اس بارے میں کوئی قطعی قاعدہ نہیں، لیکن اگر ایک جنگجو فریق اور ایک غیر جنبہ دار کے درمیان پہلے سے سامان جنگ ہتھیار کے متعلق کوئی معاہدہ ہے تو اغلب ہے کہ معاہدے کی تکمیل کو دوسرا جنگجو فریق غائب یا پسندیدگی

سے دیکھئے، اور ممکن ہے کہ اس بہانے سے غیر جنبہ دار فریق سے جنگ چھڑے۔ اس اصول کے منظر موافقہ ہیک میں یہ طے ہوا کہ جنگجو ملکوں کو فائگی ترھے دئے جاسکتے ہیں۔ لیکن برطانیہ، فرانس، روس اور جاپان نے اس اصول کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اب اس کا کچھ اثر نہیں معلوم ہوتا۔

غیر جنبہ دار ملکوں کے شہریوں کو رضا کار بننا جائز ہے اور انہیں یہ حق بھی حاصل ہے کہ فریقین کو امداد دیا کریں، چنانچہ جنگ عظیم کے ابتدا میں ممالک متحدہ کے مستند حکومت نے مجلس سنیات کے روبرو اس حق کا اعلان کیا تھا۔

فریقین کو غیر جنبہ دار ملک یا سمندر کے فوجی استعمال کا کوئی حق نہیں، لیکن ہیک قواعد کے مطابق اس میں مضائقہ نہیں کہ کوئی جنگجو فریق غیر جنبہ دار ملک میں ہو کہ جہاز گزارے، گو ان جہازوں کو غیر جنبہ دار سمندر میں عام طور پر ۲۴ گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹھہرنا چاہئے۔ اگر کسی فریق کا کوئی جنگی قیدی غیر جنبہ دار ملک میں پہنچ جائے تو وہ خود بخود آزاد ہو جائے گا۔ غیر جنبہ دار علاقے میں ہو کر فوج گزارنے کے متعلق کوئی خاص قاعدہ نہیں، لیکن جنگجو فریق کو ضرورت کے وقت یہ حق حاصل ہے کہ غیر جنبہ دار ملک کو معاوضہ دے کر اس کی املاک اپنے قبضے میں کرے یا اسے جنگی ضرورت پر بر باد بھی کر دے۔

جنگی ممنوعات۔ نظر یہ غیر جنبہ دار کو فریقین جنگ سے تجارت کرنے کا اختیار ہے، لیکن جنگجو فریق کو یہ حق حاصل ہے کہ ممنوعات جنگی پر قبضہ کر کے انہیں بر باد کر دے۔ جنگی ممنوعات اس اسباب کو کہتے ہیں جس کی تجارت کو کوئی فریق غیر جنبہ داروں کے لئے بھی ممنوع قرار دیدے۔ یہ کسی غیر جنبہ دار ملک کا وہ سامان

ہوتا ہے جسے جنگی مدد کے لئے کام میں لایا جاسکتا ہو اور پرنسز حیدرآباد کے ضبط کیا جاسکتا ہے۔ ممنوعات دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک قطعی دوسرے مشروط۔ مشروط ممنوعات سے وہ اسباب مراد ہے جس سے کسی فریق کی جنگی مدد ہو سکتی ہو، لیکن اس کی ضبطی صرف اس وقت ہو سکتی ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ اس کا مقصد خاص طور پر فریق ثانی کو مدد دینا ہے۔ اس کے برعکس قطعی ممنوعات میں وہ اسباب شامل ہیں جس کا محض فریق ثانی کی طرف سے عاید ہونا اس کی ضبطی کے لئے کافی ہے، قطعی ممنوعات جنگی میں اسلحہ ہمیشہ شامل ہوتے ہیں، اور یہی حال اکثر مواقع پر گھوڑوں کا ہوتا ہے۔ روسیہ بھی کبھی کبھی قطعی ممنوعات میں شامل سمجھا جاتا ہے، حقیقت میں یہ امر کہ آیا کوئی سامان قطعی ممنوعات میں شامل ہے یا نہیں، موقع محل پر ہی ہوتا ہے۔ مشروط ممنوعات میں سامان خورد و نوش، جنگی پوشش، سونا چاندی، ریل کا سامان اسٹیشن متعلق تار برقی اور ایسی ہی دوسری چیزیں شامل ہیں۔ لیکن جنگ عظیم کے دوران کی انگریزی نظیریں اس قسم کی موجود ہیں جن کی رو سے کوئی چیز جس سے بالواسطہ بھی فریق ثانی کو فوجی مدد ملے، ضبط کی جاسکتی ہے، چنانچہ اس اعتبار پر تقریباً ہر چیز ہی آجاتی ہے ۱۱

۱۱۔ جنگ میں ممنوعات کے مسئلہ پر مختلف دہوں کے مابین لندن میں مفصل بحث ہوئی اور اس کے نتائج کو مشہور "اعلان لندن ۱۹۰۷ء" میں مدون کیا گیا، لیکن اس کی سرے سے توثیق ہی نہیں ہوئی، اور جو کچھ اس کا رہا سہا اثر تھا اس کا بھی ۱۹۱۷ء میں خاتمہ ہو گیا۔

جس غیر جنبہ دار جہاز پر ممنوعات ہوں، اسے بھی ضبط کیا جاسکتا ہے، اور اگر بالآخر اسے چھوڑ دیا جائے تو جو خرچہ اس کی گرفتاری میں ہوا اسے غیر جنبہ دار ملک کو پورا کرنا ہوگا۔ نیز اگر کسی جہاز پر ممنوعات ہوں تو اس کا اثر غیر ممنوع اسٹیوار پر بھی پڑے گا، اور وہ بھی ضبط کر لی جائے گی۔

ناکہ بندی۔ ناکہ بندی سے مراد یہ ہے کہ کوئی فریق جنگ غیر جنبہ دار ممالک کے ساتھ دشمن کے کسی خاص بندرگاہ کی تجارت کو اس کے دبانے پر اپنے جہاز کھڑے کر کے یا اپنے گولوں کے ذریعہ لاکر مسدود کر دے۔ ناکہ بندی کے نتائج اسی وقت جائز تصور کئے جائیں گے جب ناکہ بندی کا عمل ہو اور وہ ہر غیر جنبہ دار کے لئے ہو، یعنی اگر غیر جنبہ دار جنگی جہاز، ایسا جہاز جسے طوفان یا دوسری ناگزیر وجہ سے بندرگاہ میں جانا پڑا، تو ناکہ بندی پر اثر نہ پڑے گا۔

عام طور پر ناکہ بندی کے بعد غیر جنبہ دار ممالک کو پندرہ روز کی اطلاع دی جاتی ہے۔ اس کے بعد جو غیر جنبہ دار جہاز بندرگاہ میں جانا چاہے اسے ضبط کیا جاسکتا ہے

سلا جنگ عظیم کے دوران میں صرف ایک ایک بندرگاہ ہی کی ناکہ بندی پر اکتفا نہیں کیا گیا تھا بلکہ انگریزوں نے تمام جرمن ساحل کی ناکہ بندی کر دی، گو اس پر جنگ کے ابتدائی سالوں میں ممالک متحدہ امریکہ نے احتجاج کیا تھا۔ جرمنی نے بھی برطانیہ کے جہازوں کی طرف اور بعد ازاں اس اٹلی کے بھی جہازوں کی طرف آبدوزیں بھیجا کر بحیرہ شمالی، برطانیہ کے مغربی ساحل اور بحیرہ روم تک کی گویا ناکہ بندی کر دی تھی۔ لیکن دونوں صورتوں میں برطانیہ کے جہاز اور جرمنی وغیرہ کی طرف سے جو اعلانات ہوئے ان میں ناکہ بندی کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔

ناکہ ہندی اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب ناکہ بندی کرنے والا جہاز یا تو بین اختیار یا اضطراباً ہٹائی جائیں یا ناکہ بندی کرنے والی ملکیت بندرگاہ پر قبضہ کرے۔
 اگر غیر جنبہ دار جہازوں میں محض غائبی سامان ہو جو جنگی ممنوعات میں شامل نہ ہو تو اسے ضبط نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح اگر دشمن کے جہاز میں غیر جنبہ دار مالک کے شہریوں کا سامان ہو اور یہ سامان جنگی ضروریات کا نہ ہو تو اسے بھی چھوڑ دینا ہو گا۔
 کچھ سمندر میں جنگجو فریق کو حق حاصل ہے کہ غیر جنبہ دار تجارتی جہازوں کا معائنہ کرے اور اگر یہ جہاز تہمدی کریں تو انہیں ضبط کرے۔ اگر تجارتی جہاز کے ساتھ غیر جنبہ دار جنگی بردارہ بھی ہے تو برطانوی رائے یہ ہے کہ پھر بھی جنگجو فریق تلاش ہی لے سکتا ہے، لیکن برطانوی رائے اس کے مخالف ہے، یعنی اسی حالت میں محض جنگی جہاز کے کماندار کا یہ کہنا کہ کوئی قابل اعتراض شے لگاؤتی جہاز میں نہیں ہے کافی سمجھا جائے۔

غیر جنبہ دار بحری غنیمت۔ اس طرح جو غیر جنبہ دار جہاز گرفتار ہوں گے انہیں یا تو فوراً چھوڑ دینا چاہئے ورنہ اس کا معاملہ آخری حکم کے لئے باضابطہ عدالت غنیمت میں پیش کرنا ہو گا۔ اگر کوئی غیر جنبہ دار جہاز جنگی میں محسوس آئے یا ایسا رویہ اختیار کرے جس سے ایک ہی فریق کی جنگی مدد ظاہر ہو تو اس جہاز پر حملہ کرنا جائز تصور کیا جائیگا۔
 اعلان لندن ۱۸۶۴ء کی رو سے، جس کی توثیق نہیں ہوئی، غیر جنبہ دار جہاز کو اس صورت میں نابود کیا جاسکتا تھا اگر اسے گرفتار کر کے بندرگاہ میں لے جانے سے جنگ میں گرفتار کنندہ فریق جنگ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

خاتمہ۔ یہ سب بیان قانون انوار کا ہے۔ حال میں جاپانی اطالوی اور جرمنی

کی وجہ سے قانون بین الاقوام کی وقعت کا غذائی ناؤ کے برابر رہ گئی ہے۔ نیز اسپین کی خاد جنگی میں غیر جنبہ داروں کی حائداروں اور فریقین کی سخت ترین خونریزیوں کی وجہ سے اور ساتھ ہی اس عظیم الشال صورت حال کے باعث کہ یورپ کی بعض مملکتیں، جیسے جرمنی اور روس، باوجودیکہ بظاہر ان کے ایک دوسرے کے ساتھ امن وامان کے تعلقات میں، علی الاطلاق ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ایک کے سفیر دوسرے کے ملک میں موجود بھی ہیں، اور تجارتی تعلقات بھی قائم ہیں۔ ان سب باتوں سے قانون اقوام کا راسخا اثر بھی غائب ہوتا نظر آتا ہے اور بین الاقوامی نزاع کی کیفیت پیدا ہوتی جاتی ہے۔

حقیقت میں، جیسا قانون اقوام کے ایک بڑے عالم نے کہا ہے، یہ قانون صرف اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب مملکتوں کے درمیان توازن کی کیفیت ہو اور کسی ایک مملکت کو دوسری مملکت پر غیر معمولی تفوق حاصل نہ ہو۔^۱ اس کے نزدیک بین الاقوامیت کا احساس اسی وقت ممکن ہے جب عمومیت کا راج ہو۔ اول تو ”بین الاقوامی معاشرے“ ہی میں عمومیت کا خیال نہیں ہاں ہے۔ دوسرے مطلق العنانی ایک غیر ذمہ دار ادارہ ہے جس کے ساتھ بین الاقوامی

مئلہ مئلہ کے برسرِ اقتدار ہو جانے کے بعد سے جرمنی کا طرز عمل یہ ہو گیا ہے کہ جہاں متوجہ دیکھا بین الاقوامی کیفیت کی ہنسی اڑائی اور دوزخ متعادل کے دفعات کا از خود خاتمہ کر دیا۔

مئلہ ادین ہائم، جلد ۱، باب ۲، دفعہ ۴۔

ذمہ داری کا احساس باقی نہیں رہ سکتا، تیسرے، جنگ کے خطرے کا اندازہ
ایک محض اخلاقی مطلع نظر ہے، اور یہ اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب
تک ہر قومی سے قومی مہلکت پوری طرح سے اس کی قدر نہ کرتی ہو اور مختلف
مملکتیں ایک ہی اخلاقی معیار پر نہ پہنچ جائیں۔ بظاہر دنیا پھر اسی قدر کی طرف
والیں جا رہی ہے جس سے ایک اسی عرب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے
ساترے تیر سو برس پہلے بچا یا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ ابھی انسان کو حضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کا سبق یاد کرنے میں دیر لگے گی کہ

الناس من جهة التمثال الكفاء

ابوہم آں م و لا م و حواء

تسام شد

ضمیمہ کتاب ”مبادی سیاست“

ملخص

اصلاحات دستوری، نظم و سرکار نظام خلد الشہدہ
(نافذ شدہ ۱۹ جولائی ۱۹۷۳ء)

- ۱۔ حق اجتماع عامہ ۱۔ عام جلسوں کے لئے کسی قسم کی بیگنی اجازت کی ضرورت نہ ہوگی، صرف قبل از قبل اطلاع دینا کافی ہوگا۔ مقامی حکام کو صرف اس وقت ممانعت کا اختیار ہوگا جب کسی جلسے میں اس عام میں نقص، باغیانہ جذبات یا فرقہ داری منافرت پیدا ہونے کا امکان ہو۔
- ۲۔ عاملہ و ملازمت سرکاری ۱۔

(۱) ”مملکت کا صدر اپنی ذات میں عوام کی بلا واسطہ نیابت کرتا ہے اور اس کا تعلق عوام کے ساتھ نہایت جماعتوں کے اراکین کے تعلق کی بہ نسبت زیادہ فطری، گہرا اور مستقل ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ مملکت کا صدر بھی ہوتا ہے اور عوام کے اقتدار اعلیٰ کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ اس لئے اس قسم کے نظام سیاسی میں صدر مملکت ایک طرف تو دارا، قانون سازی کے دائرے میں تو بین اور امتناع کے اختیار

کا حال ہوتا ہے اور دوسری طرف عاملانہ حکومت کے دائرے میں کا بنیہ کی تخلیق اور شکست کا مخصوص اختیار بھی اس کو حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ اس وقت تک معمولاً ارکان حکومت ابرا اور عہدہ داروں میں سے مقرر کئے جاتے ہیں۔ آئندہ وہ مقننہ کے ایسے ارکان میں سے بھی چنے جائیں گے جنہوں نے ”اپنے اعلیٰ ضمیر اپنی وفاداری اور پبلک امور کی نسبت اپنی اہمیت رار سے“ اعلیٰ حضرت خسر و دکن و برار کا اعتماد حاصل کیا ہو اور اس کا ثبوت دیا ہو کہ ان میں وزارت کی گراں قدر ذمہ داریوں کو انجام دینے کی قابلیت ہے۔

۳۔ سرکاری ملازمت کے متعلق ہر سرشتہ میں ایک تقراتی مجلس ہوگی جو وزیر، مستند اور افسر متعلقہ پرستل ہوگی۔ حیدر آباد سول سروس کمیشن باب حکومت سی کی ایک ذیلی مجلس ہوگی جس کی صدارت صدر اعظم کریں گے اور جس کے اراکین میں کم سے کم ایک ہندو اور ایک مسلمان وزیر ضرور ہوں گے۔

۴۔ مجلس مقننہ: (۱) خصوصیات

۱۔ مفادات کی نمایندگی۔

۲۔ منتخب شدہ ارکان کی اکثریت نامزد کردہ پر۔

۳۔ مشترک حلقہ جات راد ہی۔

۴۔ ہندو مسلمانوں کے لئے پچاس پچاس فیصد نشستیں محفوظ ہوگی

لیکن ہندو امیدوار کو اپنے ہم مذہب رادو ہندوں کی اور

مسلمان امیدوار کر اپنے ہم مذہب راہروں کی ہم فیصد آراء و ضرورتوں
 حاصل کرنی ہوں گی۔

۲۔ ترکیب مہتممہ۔

(الف) پر بنار عہدہ :- وزراء
 (ب) منتخب شدہ :-

۱۶۔ میٹر دار کاشتکار، آٹھ آٹھ نمائندے
 ۴۔ والیان ریاست، اے، ماتحت و جاگیردار
 معاشرہ، مزدوری پیشہ، صنعت و حرفت، تجارت،
 بنک کاری، وکلاء، طبیب، طبیبانی (ریگریسٹ)
 مجلس اضلاع، بلدیات، قصبات، بلدیہ حیدرآباد
 ۲۲۔ نی اکائی دودو

۴۲۔ چار منتخب شدہ

(ج) نامزد کردہ :-

۱۴۔ سرکاری، منجانب حکومت
 صرف خاص مبارک منجانب ہر اگر الڈائنس خیر و کون۔
 ۳۔ منجانب ہر سہ پانچ گاہ (احول عظام)
 منجانب علاقہ پیش کاری (مہاراجہ کرشن پرنس دہلادہ)۔
 ۱۔ منجانب علاقہ سالار جنگ بہادر
 غیر سرکاری منجانب حکومت (ہر کین د، عیسائی، ۲، خواتین) ۹

مسودہ قانون
۱۹۴۷ء

جامعہ انگلیت، پاریس، ٹھیکہ دار، صفحہ ۱۲-۱۳

جلد نامزد کردہ ————— ۳۶

جلد ارکان مقننہ — ۸۵

(۳) اختیارات مقننہ:-

۱۔ سوالات کرنے کا حق، سوائے ان امور کے جو مقننہ کے حدود اختیار سے باہر ہوں۔

۲۔ مسودہ قانونیچہ بابت اختیارات مقننہ:-

- (۱) حسب ذیل امور کی بابت مقننہ میں کوئی مسودہ یا تحریک یا قرارداد یا سوال یا کارروائی نہ پیش کی جائے گی نہ پیش کئے جانے کی تحریک ہو سکیگی۔
جلد امور متعلق خانوادہ اصفی و خاندان شاہی و اختیارات شاہی تاج برطانیہ اور دیگر حکومتوں ریاستوں کے ساتھ تعلقات، امور تعلق برائے باب حکومت، فرج، قلمرو کی سرکاری زبان وغیرہ (۱۰ دفعات)
- (۲) حسب ذیل امور کی بابت صرف حکومت یا حکومت کے کسی رکن کی طرف سے ہی مسودات پیش ہوں گے۔ ریل یا ہوا کے ذریعے سے حمل نقل، اسلحہ یا آتشگیر مادوں کا قبضہ یا نقل و حمل، امن عامہ، احتساب اور راز، قلمرو آصفیہ میں داخلہ یا اس سے ترک وطن، حقوق و طینت، عدالتیں، کانیں، سرکاری ہیمہ اور سرکاری بینک کی سرکاری ملازمت، مقامی حکومت، سکس سائی، محصول بندی

ردم شمارى دغيره (۴۱ دفعات)

(۴) کوئى ايسا مسودہ قانون پيش نہ ہو سکے گا جو قلمرو آصفیہ میں رہنے والے کسی ملت یا فرقے کے مذہبی عقائد یا رسوم کو کسی طرح متاثر کرتا ہو سوائے اس صورت کے کہ محرک نے قبل از قبل حکومت سے تحریری اجازت لے لی ہو۔

(۵) حسب ذیل امور میں تحریکیں وغیرہ کرنے کا ہر رکن کو اختیار ہوگا۔
زرراعت، ماہی گیری، تجارت دیو پار، صنعت، کارخانے، مزدوروں کی بہبودی، غربا اور بے روزگاری، گداگری، ذرائع آمدورفت علاوہ ریلوں کے، پانی، تعلیم علاوہ اعلیٰ تعلیم کے، زرعیے اور عام تعلیم کے انتظام دیکھائی کے، کتب خانے، ملکی پمپس، رصدگاہ، شخصے، بینک کاری، بیمہ، صحت عامہ

شفاف خانے و اندامائیں وغیرہ (۵۳ دفعات)

۱- آئینی مشاوری کمیٹیاں حسب ذیل شعبوں کے لئے قائم کی جائیں گی:-

- ۱- زرعی ترقی - ۲- تعلیم - ۳- مالیات - ۴- صنعتی ترقی - ۵- صحت عامہ - ۶- ہندو مذہبی اوقاف - ۷- مسلم مذہبی اوقاف - ۸- امور مذہبی (متعلق عبادات و رسوم مذہبی) ان مجلس کے صدر ذریعہ متعلقہ ہوں گے اور چونکہ یہ مشاوری ہوئی اس لئے صدر کو رائے دینے کا حق نہ ہوگا۔ ان کے ارکان کی تعداد میں سرکاری اور غیر سرکاری ارکان کی مساوات ہوگی اور انھیں عام حکمت عملی کے مسائل پر رجحانیت

ان کے مشورے کے لئے روانہ کرے، بحث اور اظہار رائے پر
حق حاصل ہوگا۔ ان کی رودادیں راز میں رکھی جائیں گی۔

۵۔ مقامی حکومت (پرنسپل افسر کے ہاں نمائندگی مفاد رازی ہوگی اور
کے مائل انتخابات مشترکہ اور ہندو مسلمان ارکان کی تعداد مساوی ہوگی۔

(۱) مجلس اضلاع، ضلع میں ایک ضلعواری مجلس ہوگی جس میں حسب
ذیل مفادات کی نمائندگی کی جائے گی اس میں معمولاً ۲۵ ارکان ہوں گے
جن میں سے پانچ نامزد ہوں گے، والیائی مسلمان (۱) تحت ریاستیں
جاگیردار، معاشدار، دیہی انجمن، ٹکس دہندگان، مزدور، صنعت و حرفت
بنک کاری، وکالت و طبابت اناث وغیرہ۔ تقسیم کے مائل اس میں
بھی مسلم اور ہندو ارکان کی تعداد مساوی ہوگی۔ اس کے اختیارات
ذرائع آمدورفت، تعمیرات، صحت عامہ وغیرہ شامل ہوں گے۔
کے فرائض صاحب ضلع انجام دے گا۔ مالی وسائل میں پیشہ دار
محصول، معمول زیارات، محصول تفریحات، حکومت کے عطایہ
منفعت بخش کاروبار اور اجازتوں کی آمدنی۔

(۲) بلدیات اضلاع اور قصبائی کمیٹیاں، ایسے قصبے میں جو تحصیل
کے مستقر ہوں یا جن کی آبادی ۵ ہزار سے زیادہ اور ۱۵ ہزار
کم ہو قصبائی کمیٹیاں، اور ایسے قصبے میں جو اضلاع کے مستقر ہوں
جن کی آبادی ۵ ہزار سے زیادہ ہو بلدی کمیٹیاں تاکہ کم کی کمیٹیاں
اول الذکر کے ارکان کی تعداد ۱۰ سے کم اور ثانی الذکر کے ارکان کی

۴۴ سے کم نہ ہوگی۔ نہائندگی وغیرہ کے لئے وہی اصول برتے جائیگے جو مجلس اضلاع میں مد نظر ہیں۔

(۳) پنچائیتیں :- ان موامعات میں جن کی آبادی ۲۵۰ سے ۵۰۰ ہزار تک ہے، پنچائیتیں قائم کی جائیں گی۔ یہ پنچائیت کے ارکان کی تعداد ۵ سے ۱۱ تک ہوگی۔ مکانداروں کے کھلے جلسے میں تحصیلدار ایک فہرست مرتب کرے گا جس میں مطلوبہ تعداد سے دگنے نام ہوں گے اور اس فہرست میں سے صاحب ضلع مطلوبہ تعداد کو چن لے گا۔ پنچائیتوں کے سپردگاہوں کی آب رسانی، پلوں اور سڑکوں کی نگرانی، صفائی اور صحت عامہ برادری کی نگرانی، گاڑیوں کے اڈے، قبرستان مرگھٹ وغیرہ۔

۱۔ بلدیہ چیدرا آباد :- اس میں حسب ذیل ارکان ہوں گے :-

نامزد شدہ _____
۱۳
منتخب شدہ ۱۔

۴ علاقہ جات بلدیہ فی علاقہ ۱
۸ آزاد پیشے اور مالکان آرضی داکٹہ، چار چار
۸ پست طبقات، اثاثہ تجارت، جاگیر دار و دودو
منتظم مزدور، بینک کاری، صنعتی، طبیبی، دیگر پریسٹ
۳ ایک ایک

۲۶ جملہ منتخب شدہ ارکان

۳۰ جملہ ارکان بلدیہ

نمایندہ

۱۵ ضلع کانفرنس :- ہر ضلع میں ایک سالانہ کانفرنس زیرِ صدارت
صاحب ضلع منعقد ہوگی تاکہ اس میں ضلع دار اپنی ضروریات کا اظہار
کر سکیں۔

ادراۓ ضلع کانفرنس
Husain Ra
Xagura
چندیل کپڑے ہو جا بیزار

۳۲.۵۱

CALL No. { ۵۱۱۸ ACC. No. ۱۳۵۵

AUTHOR _____

TITLE _____

۳۲.۵۱

۵۱۱۸ ۱۳۵۵

کتابخانه شیروانی

مبانی سیکس

Date	No.	Date	No.	E TIME

THE BI



MAULANA AZAD LIBRARY

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

RULES:—

1. The book must be returned on the date stamped above.
2. A fine of **Re. 1-00** per volume per day shall be charged for text-books and **10 Paise** per volume per day for general books kept over - due.

